سچی کہانیاں

December
2015

سوسائٹی کا ڈاکٹر

☆ ''مسئلہ یہ ہے'' قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل
☆ ایم اے راحت اور کاشی چوہان کے تہلکہ خیز ناول

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

E-mail [illegible]ublications@[illegible]otmail.com

بانی سہام مرزا



[illegible] مارکیٹنگ

021-35[illegible]

منیجر [illegible]

[illegible]33-2269932

مدیر [illegible] منزہ سہام

[illegible]ان / دانیال شمسی

انکم ٹیکس ایڈوائزر

مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے

021-35893122

021-35893123

خط و کتابت کا پتا: [illegible] 88-C [illegible] فلور خیابانِ [illegible]

ڈیفنس فیز-7، [illegible] کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے ✻ جلد: 32 ۔ شمارہ [illegible] 2015

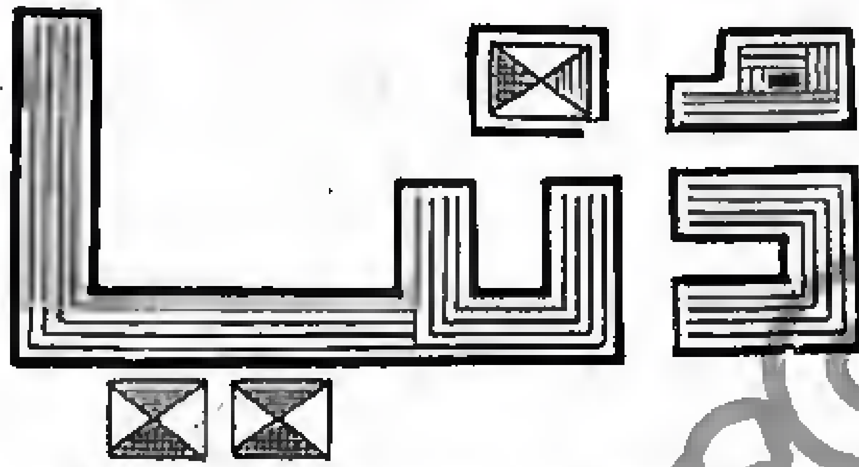
ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر [illegible]



فون: 021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس، OB-7 تالپور روڈ، کراچی



زر سالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے/افریقہ 65 ڈالر/کینیڈا/آسٹریلیا 65 ڈالر/ایشیا/یورپ 55 ڈالر/ قانونی مشیر جی ایم بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ



میں کس جگہ

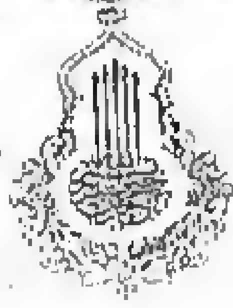
سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات، جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں، پرل پبلی کیشنز : 88-C-II فرسٹ فلور، خیابانِ جامی کمرشل۔
ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
فون نمبر: 021-35893121-35893122
ای میل : pearlpublications@hotmail.com



نابینا

شام میں دفتر سے نکلنے کے بعد جب گاڑی سگنل پر رُکی تو میں نے بہت غور سے ٹریفک پولیس اہلکار کو دیکھا۔ بغل میں چالان بک دابے وہ دونوں ہاتھوں سے مخالف سمت سے آنے والی ٹریفک کو رُکنے کا اشارہ دے رہا تھا۔ جو ٹریفک چلا آ رہا تھا اُن کا سگنل سرخ تھا مگر پھر بھی کوئی خود سے سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔ کہتے ہیں کہ اگر کسی قوم کی ذہنیت سمجھنی ہو تو وہاں کا ٹریفک دیکھنا چاہیے۔ میری جانب والا سگنل سبز ہو چکا تھا۔ جتنی دیر میں میری گاڑی آگے بڑھتی پیچھے کھڑی گاڑیوں نے بے دریغ ہارن بجانا شروع کر دیے اور پولیس والا بیچارہ پھر سے اپنے کرتبوں میں مشغول ہو گیا۔ ہم لوگ ہر بات کا ذمہ دار حکومت کو ٹھہرانے کے مشغلے میں مبتلا ہیں۔ اپنی خامی اور غلطی کو درست کرنے کا تو رواج عرصہ ہوا متروک ہوا لہٰذا میں اور شاید آپ بھی یہ دعا کریں یا نہ کریں کہ ہمارا ٹریفک کا نظام درست ہو جائے ہمارے لیے سگنل کا اشارہ ہی کافی ہو، ہم بے جا ہارن بجانے کے بجائے تحمل اور برداشت کا مظاہرہ کریں ...... مگر یہ دعا ضرور کرتے ہوں گے کہ یا اللہ دنیا کو نابینا کر دے تاکہ وہ ہمارا ٹریفک دیکھ کر ہماری ذہنیت کا اندازہ نہ کر سکے۔

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

پیارے ساتھیو! دنیا مضطرب تھی کہ آخر کراچی میں امن قائم کیوں نہیں ہوتا۔ حکومت نے فوج کو اختیار دے کر گھیرا تنگ کیا تو کراچی کی عوام نے سکھ کا سانس لیا۔ مگر یہ بتائیں کہ ہم جنگ و جدل کے میدان کا رونا روتے رہے۔ بوری بند لاشوں پر سینہ کوبی کرتے رہے۔ نامعلوم افراد جیسی عفریت کا شکار ہیں۔ بھتہ خوری سے ستائے ہوئے ہیں۔ اس جنگ خوں بہا کی کہانی بڑی طویل، حیرت انگیز اور مضحکہ خیز بھی ہے۔ تین عشروں سے لوگ خود کو محصور و محبوس کہتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ کس کا لایا ہوا ہے۔ یقیناً ہمارا ......اور ہم خود ہی ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہیں۔ فی الحال ستم رائی کا یہ سلسلہ بظاہر بند ہوگیا ہے مگر کب تک...... کچھ دن بعد ہم پاکستانی ایک دوسرے کے خون سے پھر ہولی کھیلنا شروع ہو جائیں گے۔

ساتھیو! ایک پاکستان کے لیے جی کر دیکھو۔ آزادی کو محسوس کر کے دیکھو اور پھر اپنے دل کی آواز سننا۔ ہر پاکستانی خواہ وہ سندھی ہو یا پنجابی، بلوچی ہو یا پٹھان، کشمیری ہو یا مہاجر ہر شخص آزادی حاصل کرنے والا 'مہاجر' جس نے اپنے چاروں صوبوں کے لیے نہیں بلکہ پاکستان کے لیے سر کٹائے، نسلیں قربان کیں، بہنوں، بیٹیوں اور بیویوں کی عزتیں لٹا کر یہ آزادی حاصل کی۔ پاکستانیو! پاکستان سے پیار کرو۔ بند یہ ظلم کا کاروبار کرو۔

آؤ اور عہد کرو۔ ہم اپنے اندر آج سے ایک سچے پاکستانی کی پرورش کریں گے۔ انشاءاللہ وہ وقت دور نہیں جب تعصب سے پاک پاکستان دنیا کے نقشے پر ابھر جائے گا۔ یہی میری آنے والے برس کے لیے دعا ہے۔ آیئے اس دعا کے ساتھ احوال کا آغاز کرتے ہیں۔

✉ ڈسٹرکٹ جیل کوہاٹ، خیبر پختونخوا سے یہ آمد ہے ہمارے نئے لکھاری ساتھی سید ملازم حسین کی، لکھتے ہیں۔ سب سے پہلے تو میں آپ کا بے حد مشکور و ممنون ہوں کہ ستمبر 2015ء کے شمارے میں میرے خط کو شامل کیا۔ یہ اور بات کہ میں 'احوال' میں اپنا خط نہ پڑھ سکا۔ قید میں انسان بے بس اور بہت مجبور ہوتا ہے۔ بہت کوشش کی کہ ستمبر کا پرچہ حاصل کروں۔ کوہاٹ شہر کے تمام بک اسٹالز پر معلوم کیا پرچہ بک چکا تھا۔ پشاور آدمی بھیجے نہ مل سکا۔ راولپنڈی سے منگوایا تو 'سچی کہانیاں' کی بجائے 'سچی کہانی لاہور' بھیجا گیا۔ امید ہے دو چار دنوں میں مل جائے گا۔ اکتوبر 2015ء کے دیدہ زیب اور خوبصورت شمارے میں (جو آج ہی ملا) اپنی سچ بیانی مجرم کون کو قابلِ اشاعت پایا بہت خوشی ہوئی۔ اس کے لیے آپ کو اور آپ کی پوری ٹیم (احباب) کو دعائیں دیتا ہوں۔ کبھی ہم بھی اس آزاد دنیا میں زندگی کی شاہراہوں پر گامزن تھے۔ آج جیل کی اندھیری بیرکوں میں اپنی بے بسی اور لاچاری پر نوحہ کناں ہیں۔ ایسے میں 'سچی کہانیاں' کا ملنا اور اسے پڑھنا روح کی تسکین کا باعث بنتا ہے۔ کہانیاں پڑھ کر (پرچہ آج ملا اور آج ہی

جواب لکھ رہا ہوں) انشاء اللہ اگلے ماہ تبصرے کے لیے حاضری دوں گا۔ محترمہ منزہ سہام صاحبہ کا اداریہ ’بدنصیب کون‘ آج کی بے حس دنیا کا نوحہ ہے۔ محترم کاشی چوہان صاحب’ دو گھڑی سکون کے درکار ہیں۔ اگر کلام و گفتگو چاندی ہے تو سکوت سونا ہے۔ مصیبت اور غم و آلام میں صبر کرنا باعث سکون ہے۔ اپنی زندگی کا ایک اور سچا واقعہ ارسال کر رہا ہوں آج کے بے روزگار‘ لاچار اور حالات کے شکار نوجوانوں اور اچھے مواقع کے متلاشی جو راتوں رات امیر و کبیر بننے کے خواب دیکھتے ہیں۔ اس سے سبق لینا چاہیے اور خود ساختہ اور دھوکہ باز کمپنیوں سے دور رہیں۔ جناب کاشی چوہان صاحب سچی کہانیاں سے میرا پرانا رشتہ ہے۔ لیکن غمِ روزگار اور حالات کی کروٹیں بدلتی زندگی نے دور رکھا۔ اگر آپ کی حوصلہ افزائی و تعاون شاملِ حال رہا اور قارئین کی محبتیں دامن گیر رہیں تو وقتاً فوقتاً حاضر ہوتا رہوں گا۔ آخر میں مقصود احمد بلوچ‘ مس منزل خان‘ سدرہ انور علی‘ اشفاق شاہین‘ ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا‘ راشد لطیف‘ فیصل ندیم بھٹی‘ دیگر سب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی دعاؤں میں یاد رکھا۔ حوصلہ افزائی کی ڈھارس باندھی جو میری تقویت کا باعث بنی۔ اگلی ملاقات تک کے لیے اجازت۔

☆: لیجیے صاحب! آپ کا تبصرہ شاملِ احوال ہے۔ ہمیں آپ کی مشکلات کا علم ہے۔ انشاء اللہ یہ پرچہ آپ کو ہم خود ارسال کر دیں گے۔ خوش رہیے۔ کہانیاں فوراً ارسال کریں۔ میں منتظر ہوں۔

✉: سرگودھا سے ہمارے بہت پیارے لکھاری ساتھی ممتاز احمد عرض گزار ہیں۔ خوبصورت ٹائٹل سے مزین نومبر کا شمارہ 30 اکتوبر کو مل گیا۔ معجزہ کے عنوان سے اداریہ میں منزہ سہام کی نئے اسلامی سال کی مبارکباد اور ڈھیروں پُرخلوص دعاؤں سے دل بہت خوش ہوا۔ احوال کا آغاز کاشی بھیا کی میٹھی میٹھی اور پیار بھری باتوں سے ہوا۔ جی ہاں کاشی بھائی یہ یقیناً میرے اللہ ہی کا کرم ہے۔ اُس کی نوازشات بارش کی طرح برس رہی ہیں۔ سب سے پہلے نزہت ناز‘ کنزہ ملک‘ سونیا خان‘ احمد ندیم ضیاء، حسن عباس نیازی اور رانا مجاہد جمیل کو تہہ دل سے احوال میں خوش آمدید ویلکم۔ میں انتہائی ممنون و مشکور ہوں حنا بشریٰ‘ مسز نگہت غفار‘ علی حسنین تابش‘ عثمان بلوچ‘ چوہدری ابوزر سندھو‘ نزہت ناز‘ سلیمان شبیر‘ منزل خان‘ ایم افضل آزاد‘ فیصل ندیم بھٹی‘ فرح انیس‘ مجید احمد جائی‘ صائمہ مجید‘ ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا‘ کنزہ ملک‘ اور نفیسہ فضل صاحبہ کا جنہوں نے میرا ٹوٹا پھوٹا خط اور کہانی پسند کر کے میرا حوصلہ بڑھایا۔ پہلی سچ بیانی دل آباد‘ ایک لاجواب کہانی تھی۔ دوسری سچ بیانی ہانڈی وال نے دل بہت دکھی اور مغموم کر دیا۔ ارم خان کی وہ مانوس اجنبی شاندار کہانی تھی۔ منعم اصغر کی خوبصورت اور جاندار تحریرات خداداد ویر ایک سبق آموز کہانی تھی۔ مسز نوید ہاشمی کی دکھ کی فصل کٹ گئی دل کو چھو گئی۔ حمیرا خان کی کانچ کی گڑیا بہت

عمدہ تھی۔ پیارے مجید احمد جائی یار آپ کی کہانی قرض نے دل موہ لیا۔ اعجاز احمد فکرال کی کہانی کمپنی عبرت انگیز کہانی تھی۔ دھندا اور کرب اچھی کہانیاں تھیں۔ صنم بلوچ کا انٹرویو زبردست رہا۔ کنول عمران خان بہت عرصے کے بعد ایک عمدہ کہانی کے ساتھ موجود تھیں۔ ام عادل نے احوال کو عرصہ ہوا فراموش کر دیا ہے مگر شکر ہے کہ ایک طویل مدت کے بعد اُن کی شاندار کہانی دیر ہے اندھیر نہیں پڑھنے کو ملی۔ پھکی' مفاد' قصور کس کا' احتیاط ضروری ہے' مختصر مگر پُراثر اور اچھی کہانیاں تھیں۔ تاشون کے بعد شازلی سعید مغل نے انسانوں کے جنگل میں جیسی خوبصورت کہانی کا تحفہ دیا۔ ابو ہریرہ بلوچ کی ایک چھوٹی سی لو اسٹوری پسند آئی۔ نازیہ بتول کی قدرت اور جاوید راہی کی ندامت شاندار اور بہترین کہانیاں تھیں۔ شاہد رفیق سہو' پرویز سہو اور فہد سہو' برادرم مقصود احمد بلوچ آپ سب صاحبان احوال سے کیوں غیر حاضر ہیں؟ اب اس سے پہلے کہ کاشی چوہان کی تیز دھار والی قینچی اپنی سفا کی دکھائے میں اپنے خط کا اختتام کرتا ہوں انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی بشرطِ زندگی۔

☆: پیارے بھائی ممتاز! قینچی نے اپنا کام نہیں دکھایا کیونکہ آپ نے اپنا کام جو دکھا دیا تھا۔ امید ہے اگلے ماہ تبصرہ بھی مختصر اور آپ کی کہانی کی طرح باکمال ہوگا۔

✉: ہمارے ساتھی انیل حسین پٹھان، سندھ یونیورسٹی جامشورو سے بڑے عرصے بعد احوال کا حصہ بن رہے ہیں۔ اس عرصے میں انیل 'پٹھان' سے 'قمر' ہو گئے۔ یعنی انیل حسین قمر لکھتے ہیں، لگتا ہے آپ ناراض ہیں۔ ارے! بھائی ناراض نہ ہوں ہم سے۔ ہم آپ کے ڈائجسٹ میں واپس آ گئے ہیں۔ بس دنیا کی کچھ الجھنوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ خیر اب آتے ہیں۔ ڈائجسٹ کی طرف تو بھائی ڈائجسٹ بہت اچھا جا رہا ہے۔ آپ کی محنتیں اور کاوشیں رنگ لا رہی ہیں۔ سب لکھنے اور پڑھنے والوں کو اس ناچیز 'قمر' (ارے! ہمارا پٹھان کیا ہوا؟) کا جھکی پلکوں اور ادب کی آڑ (آڑ...... خیر تو ہے؟) میں سلام و محبت قبول ہو۔

☆: اچھے بھیا انیل! سب سے پہلے یہ تو بتاؤ کہ الجھنیں اور مصروفیات ہیں ہم مانتے ہیں، مگر بھلا کوئی اپنوں کو بھولتا ہے۔ ہمیں تم پر شدید غصہ تھا۔ لیکن اب اگر احوال سے غائب ہوئے تو پکی والی 'کٹی' ہو جائے گی۔ تبصرہ لازمی ہر ماہ آنا چاہیے۔

✉: فرمان علی کھوسہ کی سندھ یونیورسٹی جامشورو سے احوال میں یہ پہلی آمد ہے، لکھتے ہیں آپ کا ڈائجسٹ سچی کہانیاں بہت پسند آیا۔ میرے دوست انیل حسین قمر نے مجھے پڑھنے کو دیا جب میں نے پڑھا تو میں ڈائجسٹ سے بہت متاثر ہوا۔ بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ تمام کہانیاں' شاعری' بہت پسند آئے احوال میں پہلی بار شامل ہو رہا ہوں۔ امید ہے ضرور جگہ ملے گی اور اپنی شاعری بھی بھیج رہا ہوں۔ وہ بھی ڈائجسٹ کی ضرور زینت بنے گی اور اس کے ساتھ اب اجازت چاہتا ہوں سب قارئین اور لکھاری دوستوں کو میرا تہہ دل سے سلام۔

☆: پیارے بھائی! خوش آمدید۔ آپ کا خط تاخیر سے موصول ہوا۔ جلد از جلد ڈاک پوسٹ کرنے کی کوشش کیا کریں۔ اب ہر ماہ احوال کا حصہ بننا ہے۔ یہ ہمارا حکم ہے۔ خوش رہو۔

✉: لاہور سے خوشخط تحریر لیے زاہد حسین شریکِ احوال ہیں، لکھتے ہیں۔ معجزہ رونما ہوا آنکھوں میں آیا دل میں اترا روح میں سمایا سدا کے لیے یادگار بن گیا۔ عنوان کو تو قطعی اہمیت نادی پر دو نام اسماء اعوان اور سبین پسند آئیں اک نے کردار سازی کی دوسری نے کردار آرائی اتنی پیاری کی کہ سادگی میں

سانحہ ارتحال

ہماری ہر دل عزیز قاری اور لکھاری ساتھی زرینہ جونیجو اور تحسین جونیجو کے والد محترم گزشتہ ماہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ادارہ دکھ کی اِن گھڑیوں میں اُن کے ساتھ ہے اور مرحوم کے درجات کی بلندی کے لیے دعا گو ہے۔

بھی حسن و جمال کی بجلی کالے لمبے چمکیلے بالوں سمیت دکھائی دی۔ وہ مانوس اجنبی کامیاب رہا۔ بھرم‘ اتے خدا داد‘ ویرٹ‘ دکھ کی فصیل کٹ گئی‘ کانچ کی گڑیا‘ قرض بہترین کہانیاں تھیں جبکہ کمینی ناقص ہی رہی ہے۔ دھندا عجیب سی ٹیسیں دیتی داستان ہے۔ کرب‘ دوسری بیوی‘ میشا‘ دیر ہے اندھیر نہیں سچ ہے۔ پھکی‘ گھٹیا سوچوں کمتر جذبوں میں جکڑے ذہنی مریض عدیل کو موافق آ گئی بغیر پھانکے۔ مفاد‘ قصور کس کا ہے‘ اسی لیے تو احتیاط ضروری ہے بھی بہترین تھیں۔ انسانوں کے جنگل میں کچھ بھی نا ملا سوائے بنفشہ کے۔ ایک چھوٹی سی لو اسٹوری بس ٹھیک تھی۔ ندامت‘ واپسی کا سفر شروع ہوا جاوید اور یاسمین نے مل جل کر شکرانے کے نوافل پڑھے۔ رات سیاہ تھی اور عنبرین رات جیسا کالا منہ لے کے ہمارے لیے منتظر خیالی کی بینچ پر بیٹھی تھی۔ ہم سے ملی ہم نے پوچھا کیا گزری وہ سب بتانے لگی ہم نے پوچھا ہمارا کس نے بتایا اور کہاں جانا ہے تو کہا ممتاز احمد صاحب کی مہربانی سے آئی ہوں، جہاں آپ جا رہے ہیں مجھے بھی لے چلیں۔ ہم کہ سدا سے جی کہنے والے نا ناں کر سکنے دل پر جبر کر کے اس کے دل کی خوشی کے لیے ہمراہ لیے آپ کے پاس کراچی آ رہے ہیں۔ ایدھی ہوم بھی داخلہ دلوانا ہے میڈم کو۔

☆: پیارے زاہد! تبصرہ شاندار کیا۔ زبردست! اگلے ماہ تمہاری آمد کا انتظار رہے گا۔

✉: احوال میں یہ آمد ہے ہماری ساتھی شاعرہ اور لکھاری صائمہ بشیر کی سرگودھا سے، لکھتی ہیں۔ منزہ سہام نے تو ہمیں اندر تک ہلا کے رکھ دیا ہے سچ ہیں کہ مسلمان ممالک بے حسی کی چادر اوڑھے ہوئے ہیں۔ سب لوگوں نے اتنا اچھا لکھا ہے مجھے تو لگتا ہے ہمارے سب لکھنے والے انگوٹھی میں جڑے نگینے کی طرح ہیں۔ میں نے جو پڑھا ہے وہ سب بہت لاجواب تحریریں ہیں۔ کینسر‘ مجرم کون‘ ممتاز احمد کی قلم سے افسر تک‘ محسن علی شامی کی ابا کی بختاور‘ فرزانہ نگہت کی انصاف ڈھونڈو گے ہمیں زیبا بدر کی جیت‘ شیخ معظم الٰہی کی نیکی کرتا جا سب کی سب دل کو چھو لینے والی کہانیاں تھیں۔ اللہ سب کو سلامت رکھے اور زیادہ سے زیادہ اچھا لکھنے کی توفیق دے آمین۔ تبصرے سب کے بہت مزے کے ہیں۔ تحسین جونیجو کا تبصرہ میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ ریحانہ نسیم‘ ممتاز احمد‘ عاصمہ کوثر‘ نگین خلیل‘ میجر امتیاز‘ ماہین فاطمہ‘ ثمینہ ناز‘ سب کے تبصرے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ اور کاشی بیٹا نہ چاہتے ہوئے بھی احوال میں وقفہ آ جاتا ہے۔ جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ لائف بوائے بہت اچھا جا رہا ہے۔ سب لکھنے والوں کو صائمہ آپی کا بہت بہت پیار۔

☆: اچھی آپی! سلامت رہیے۔ آپ کی آمد کا ہمیں انتظار رہتا ہے۔ تبصرہ ضرور کریں۔ اس سے آپ کی دعاؤں اور محبت کی خوشبو ہم پر ہمہ وقت ہر پل سایہ فگن رہتی ہے۔

✉: ہمارے فوجی بھائی مقصود احمد بلوچ‘ میاں چنوں سے عرض کرتے ہیں۔ اکتوبر 2015ء کا سچی کہانیاں مورخہ 3 اکتوبر کو ملا۔ ٹائٹل تو بہت پسند آیا۔ لیکن ڈبل ورق سے کافی اُلجھن سی ہوتی ہے۔ پلیز کاشی بھائی‘ یہ ڈبل ورق اگر ہو سکے تو ختم کر دیں۔ کیونکہ پرچے کو پڑھتے وقت کافی اُلجھن محسوس ہوتی

ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ میری بات کو سمجھ گئے ہوں گے۔ (سمجھ جاتے تو لگاتے کیوں؟) میری نگارشات کو جن لوگوں نے پسند کیا۔ ان میں سب سے پہلے ادی زرینہ جونیجو کراچی سے میرے بھائی اشفاق شاہین بورے والا سے سجدہ صابر، بہن جی بہت شکریہ آپ کا خانیوال سے چوہدری پرویز سہو مس منزل خان، کراچی سے مسز نوید ہاشمی، کراچی سے ایک اور میری بہن صائمہ سحر ملتان سے ڈاکٹر خادم حسین، ڈاکٹر صاحب بہت شکریہ آپ کا، آپ نے جس محبت سے یاد کیا۔ سرگودھا سے ہمارے بہت ہی محترم لکھاری ممتاز احمد صاحب، سر آپ نے میری اسٹوری کے بارے میں لکھا کہ سسرال والے اپنی بیٹی کو گھر میں بٹھا کر پیسوں کی ڈیمانڈ کیوں کر رہے تھے۔ ممتاز بھائی اگر سسرال والے بے غیرت بن جائیں تو وہاں پر انسان کیا کر سکتا ہے۔ وہ تو شروع سے ہی اس فراڈ کے چکر میں تھے۔ بہر کیف آپ نے تعریف کی یا تنقید کی بہت شکریہ۔ آپ نے یاد تو رکھا، ملتان سے مجید احمد جائی صاحب اور ساتھ ہی ہماری پیاری بھابی صائمہ مجید، بھابی جی بہت شکریہ آپ کا۔ سرگودھا سے فیصل ندیم بھٹی، علی پور سے محمد جاوید، میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ میرے ان بہن بھائیوں نے میری اسٹوری کو پسند کرتے ہوئے میری حوصلہ افزائی کی۔ مجید احمد جائی آپ بابا کب سے بن گئے ہو۔ اس دفعہ کچھ لوگوں نے آپ کو بابا مجید احمد جائی کے نام سے پکارا ہے۔ اور میری یہ دلی دعا ہے کہ آپ بابا بن جائیں۔ اس دفعہ کہانیوں میں مجید احمد جائی ممتاز احمد، محمد سلیم اختر، نبیل جاوید، ارم ناز، راشد لطیف، جاوید راہی ان سب کی کہانیاں قابل تعریف تھی۔ میری طرف سے مبارک باد قبول کریں۔ تیر نیم کش ہیں۔ صائمہ مجید اور سدرا انور علی، ان دونوں کے شعر بہت پسند آئے۔ ہائیڈ پارک میں (پتھر کا بت) عظمیٰ شکور اسلام آباد ویری نائس۔ اس دفعہ گڈی آپا کی وفات کا سن کر بہت دکھ ہوا اللہ تعالیٰ ان کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے اور گڈی آپا کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ زندگی رہی تو اگلی دفعہ ملیں گے۔

☆: پیارے مقصود! لو تمہارے سارے گلے دور ہوئے۔ تبصرے میں سب کے پیغام اُن تک پہنچ گئے۔ وعدہ وفا کرو اور تحریر ارسال کردو۔

✉: فیصل آباد سے ملک علی رضا پہلی بار احوال کا حصہ بن رہے ہیں، لکھتے ہیں۔ عرصہ دراز سے میگزین کا خاموش قاری ہوں مگر پہلی بار کچھ کہنے اور لکھنے کو من کیا ہے۔ سو بڑی کوشش سے حوصلہ پایا کہ اس گلشن (سچی کہانیاں) کی کیاری احوال میں، میں بھی کوئی خط نما پھول کھلا پاؤں۔ (قارئین! ہوشیار باش) بہت سے رسالوں کو پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ مگر سچی کہانیاں کے علاوہ کوئی اور بھاتا نہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے پہلے صفحات پر منزہ سہام کی تحریر کے سوا کوئی تحریر بھاتی نہیں۔ سچی کہانیاں اپنی ٹیم کی ان تھک محنت کی بدولت دیگر تمام میگزین سے نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اور انشاء اللہ ہمیشہ اس مقام پر فائز رہے گا۔ اسماء اعوان کی تحریروں کا جواب نہیں۔ افضل آزاد کا نیا انداز خطوط میں بہت اچھا لگا۔ سلامت رہو بھائی جان۔ ویسے ایک بات کا افسوس ہے کہ خطوط والے صفحات پر زیادہ تر خطوط دوسرے شہروں کے ہوتے ہیں کیا کراچی میں خطوط نگاری کا رواج شوق نہیں رہا۔ (انہیں ہاتھ کے ہاتھ جواب دے دیا جاتا ہے) تحریروں میں فریدہ جاوید فری، شازیہ گل، مجید احمد جائی، روبینہ ناز روبی اور محترم رانا حبیب کی تحریریں بہت اچھی تھیں۔ رانا صاحب آپ کو خاموشی سلام کہ آپ اس حال میں بھی ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔

☆: بھائی علی رضا! خوش آمدید! زرا اس خاموش سلام کی وجہ بھی اگلے خط میں بیان کرنا۔ تبصرے

نیا سال، نئے رنگ

آپ کے اپنے سچی کہانیاں کے سنگ

انعام یافتہ کہانیاں:

پہلی تین کہانیاں، پہلے تین انعام

ہر ماہ کی تین منتخب کردہ، انعام یافتہ کہانیوں پر انعام پائیں۔

پہلی انعام یافتہ کہانی پر=/5000

دوسری انعام یافتہ کہانی پر=/4000

تیسری انعام یافتہ کہانی پر=/3000

بھارت میں بلیک لسٹ:

برطانیہ میں خزاں کے بعد ایشیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا اصل چہرہ بے نقاب کرتا ۔نامور صحافی محمود شام کے بے باک قلم سے سفر نامہ بھارت ..... ماہ جنوری سے سچی کہانیاں کے صفحات پر ملاحظہ فرمائیں۔

سپر ریڈر ایوارڈ:

سب سے زیادہ ٹوکن بھیجنے والے قاری کے لیے ہر ماہ اول میں 'سپر ریڈر رائٹر ایوارڈ' کی سند کا اعلان کیا جائے گا۔

ایک تصویر، ایک کہانی:

زندگی کے شب و روز میں کبھی کبھی نظریں بہت خاص تصویر کو دیکھ کر ٹھہر جاتی ہیں۔ آنکھ کے کیمرے میں Save ہو جانے والے ان مناظر کو آپ فراموش نہیں کر سکتے۔ ہر ماہ دیکھیے ،ایک تصویر ایک کہانی۔

کے لیے شکریہ جب کہوں گا جب اگلے ماہ تمہارا تبصرہ ملے گا۔

✉: ہمارے پیارے ساتھی ایم ارشد وفا گوجرانوالہ سے احوال میں اپنی حاضری لگوا رہے ہیں لکھتے ہیں کاشی بھائی میں پچھلے چار ماہ سے آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ ہمارے شہر میں ڈائجسٹ کی ترسیل بہت لیٹ ہو رہی ہے۔ مگر آپ میری بات پر غور ہی نہیں کر رہے ہیں (لو جی! کر لو گل) ہم اگر سرکولیشن والوں سے بات کریں تو وہ محترم بس ایک بار ہماری کال سنتے ہیں بعد میں بھول جاتے ہیں۔ آفس کے نمبر پر کال کر کے رپورٹ درج کروانے کی کوشش کرتے ہیں تو ٹال دیا جاتا ہے۔ (رپورٹ!) میرے خیال سے آپ بروقت رسائل پوسٹ کر دیتے ہیں مگر ایجنسی والے اس کو روک کر رکھتے ہیں۔ اگر مجھے اکتوبر کا شمارہ مل جاتا تو میں اُس پر تبصرہ لازمی کرتا۔ فی الحال موقع کی مناسبت سے دسمبر کے پُراسرار نمبر کے لیے ایک چھوٹی سی اسٹوری پوسٹ کر رہا ہوں اگر آپ اس کو جگہ دیں گے تو آپ کی محبتوں کا مقروض رہوں گا۔

☆: پیارے ارشد! تمہاری کہانی بہت زیادہ لیٹ ہوگئی۔ اور پرچے میں شامل نہ ہوسکی۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یقیناً پوسٹ آفس والوں کی 'ایمانداری' یہ تو کہانی تھی۔ یہ لوگ تو اپنے ملک کو اپنی ایمانداری سے دنیا بھر میں 'سند یافتہ' کر چکے ہیں۔ اب اس سے آگے ہم بھلا اور کیا کہیں۔ جانم سمجھا کرو۔

✉: بہاول نگر سے ہمارے نئے احوالی ابوذر غفاری بلوچ لکھتے ہیں شمارہ اکتوبر پر دسترس ہاتھوں کی زینت بڑھائے جا رہی ہے۔ 3 تاریخ کو سچی کہانیاں تک رسائی ممکن ہوسکی۔ ٹائٹل پر براجمان حسینہ کے لبوں و رخسار کی چھائی مسکراہٹ نے نوید سنائی کہ محنت کا ثمر موصول ہو چکا جزاک اللہ۔ بہت ممنون ہوں کہ آپ نے اشاعت کے سرٹیفکیٹ پر قبولیت کی مہر لگاتے ہوئے خط کو احوال کا حصہ بنایا۔ آپ کی شفقت شامل حال رہی تو اس خاندان سے منسلکی برقرار رکھوں گا۔ آپ ایڈیٹر کاشی چوہان صاحب آپ تن تنہا جتنی محنت اور مشقت کے ذریعے مغز مضامین اور مقامات کو لکھ کر تشنگان علم اور دیگر تعلیم یافتہ افراد کی دسترس ممکن کروائی یہ اسی کے ثمرات کا فوری ظہور ہے کہ احوال میں ہر مرتبہ نئے چہروں سے شناسائی ہوتی ہے خدا نے آپ کو واقعی وسیع و عمیق علم و فہم کے ساتھ ساتھ تالیف کی غیر معمولی اور مختار صلاحیت اور قدرت سے نوازا ہے۔ جس کا آپ واقعی حق ادا کر رہے ہیں۔ احوال کی محفل میں حاضری ہوئی تو سب کو نشستوں پر براجمان پایا۔ آپی نگہت غفار صاحبہ، سسٹر عظمیٰ شکور، آپی سدرہ انور علی، شاہد رفیق سہو، منشی محمد عزیز مئے، رانا حبیب الرحمان، علی حسنین تابش اینڈ سجدہ صابر علی کے احوال پسند آئے۔ نئے آنے والوں کو ویلکم۔ کہانیوں پر تبصرہ کریں تو جناب سب سے پہلے اسماء اعوان لائف بوئے لیے حاضر ہوئیں ویلڈن میڈم...... بعض قلم کاروں کا طریقہ رہا ہے کہ وہ اپنی کہانی میں فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ شاہکار بنتے ہوئے کہانی میں استحصال کرتے ہیں۔ یعنی ایسے الفاظ لاتے ہیں جو مقصود کی طرف رہنمائی کریں۔ راشد لطیف صبر ے والا کی اسٹوری پگلی اپنی الفاظ کی عکاس تھی زبردست لکھا بھائی۔ کاشی چوہان آپ تدقیق کے مینار کو بلند میں بہت اونچے مقام پر متمکن ہوئے ہیں۔ زہر عشق میں ایسے نوادر الفاظ کو استعمال کیا ہے جن کو فکر کے ہاتھوں نے چھوا تک نہیں۔ سماعت ان سے مبرا رہی ہے۔ نظر کی انگلیوں نے اس کی مشکلات کی گرہوں کو نہیں کھولا میں ان یکتا عمدہ موتیوں میں غوطہ زن ہوا جس کی بدولت الفاظ کے اشارے مجھ پر خزانہ بن کر ظاہر ہوئے۔ دیکھتی آنکھیں اعجاز احمد فکر ال رازہائے سربستہ کے انتہائی مقام پر جناب غلبہ حاصل کر چکے۔ آپ نے مقصود کو ضبط کرنے میں اختصار سے کام کیا۔ جس میں مکمل

کامیاب ہوئے ہیں۔ ندیم عباس سیوائی کی اسٹوری کتے کی موت پڑھ کر کانوں کی سیپیاں کھل گئیں اور ذہنوں کے پہلو جھومنے لگے۔ سبق آموز کہانی تھی۔ موسمی پرندے ریحانہ تنویر زبردست میڈم آپ کی اسٹوری پڑھ کر تو سست آدمی بھی نشاط میں آجائے زبردست لکھا جو لکھا چند احباب جن میں ندیم عباس سیوائی عثمان بلوچ اور دوستوں کی معیت میں تحقیقات کے دریاؤں میں غوطہ زن ہو کر ایسی تحریر لکھنے میں مگن ہوں جو قارئین کے دل میں سرگوشی کرے جس میں برادر اکبر ابوہریرہ بلوچ کی مدد بھی شامل ہے۔ اگلے ماہ پھر حاضری ہوگی حیات باقی ملاقات باقی جن کی تحریریں نہ پڑھ سکا اُن میں ارم ناز' جاوید راہی' عارف شہزاد ان سے معذرت ان پر تبصرہ اگلے ماہ کے لیے ادھار۔

☆: عزیزی ابوذر! تبصرہ بہت شاندار کیا۔ تمہاری تحریر کا انتظار ہے۔ مگر خیال رہے میرے قاری اتنے عمیق الفاظ ہضم نہ کر پائیں گے۔ اس لیے کہانی سادہ الفاظ میں لکھنا بھیا۔

✉: ہمارے ساتھی دوست عارف شہزاد صادق آباد سے عرض گزار ہیں مجھے بہت افسوس ہوا یہ سن کر کہ آپ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کا نگہبان ہو۔ آپ کو جلد از جلد صحت یاب کرے۔ آمین۔ اب چلتے ہیں ماہِ اکتوبر کے پرچے کی طرف، واہ کاشی چوہان آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری اسٹوری کو پاکستان کے نایاب رسالے سچی کہانیاں میں زینت بخشی اور پھر سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ ندیم عباس سیوائی کی اسٹوری دیکھی تو دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ میری طرف سے ندیم عباس آپ کو بہت مبارک اینڈ ڈھیروں دعاؤں کا تحفہ قبول ہو۔ سید ملازم حسین شیرازی کی مجرم کون؟ محمد سلیم اختر کی داری' جاوید راہی کی مغرور' نصرت سرفراز کی ڈھونڈو گے ہمیں ریحانہ تنویر کی موسمی پرندے حمیرا خان کی سماج سیوا ایم سلطان کی تم یاد آئی ہو رانا محمد شاہد کی ایمانداری کا ٹکٹ' زیبا بدر کی جیت سیدہ کاظمی کی وڈیری آفریں انیس کی صدقہ' راشد لطیف کی پگلی' ارم ناز کی عزت دار لازوال رہیں جبکہ کاشی چوہان صاحب اور ایم اے راحت صاحب آپ تو چھائے ہوئے ہیں۔ اللہ آپ دونوں کو مزید اچھا لکھنے کی طاقت اور ہمت دے آمین۔

☆: پیارے عارف! خدا نے بہت کرم کر دیا اور آپ کے سامنے ہوں۔ دعاؤں میں یاد رکھنا اور تبصرہ ہر ماہ آنا چاہیے تمہارا۔

✉: کراچی سے ہماری بہت پیاری لکھاری ساتھی مومنہ بتول عرض کرتی ہیں آج ابھی اکتوبر کا شمارہ منگوایا ہے۔ احساس ہے کہ تبصرہ لیٹ ہو رہا ہے مگر کیا کروں پرچہ ہی آج ملا ہے۔ اور تمہاری محنت کے لگائے شجر کو گلاب دیتے دیکھ کر تم سے باتیں کرنا خراجِ تحسین پیش نہ کرنا، نہ صرف تمہارے ساتھ بلکہ ہم اپنی ذات کے ساتھ بھی نقصان کر بیٹھیں گے سو فوری خط لکھ رہی ہوں۔ اللہ تمہیں مزید ہمت عطا فرمائے اس خوبصورت کاوش کو ہم تک پہنچانے کے لیے جو محنت تم کرتے ہو وہ قابلِ تحسین ہے۔ کاشی اس مرتبہ تم نے کاروانِ حجاز اور حجاز میں چودہ دن شمارے میں لگا کر اپنے مومن ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔ دل آنسو بن کر آنکھوں سے بہتا رہا، روح فکر فاقہ سے آزاد ہو کر لفظ بہ لفظ دعا بن کر میرے ارد گرد پھیل گئی۔ کعبہ کے بارے میں جناب باقر قادری شورش صاحب کے اعلیٰ وارفع جملے، دل کو رلاتے گئے، آنسو چشمے کو گیلا کرتے رہے مگر لفظ لفظ آنکھوں کے راستے دل میں اترتا رہا۔ سچ کاشی میں اس حرم پاک کے بارے میں پڑھتے پڑھتے وہیں پہنچ گئی۔ دل تڑپ تڑپ کر سوالی بننے لگا کہ کاش اے کاش میں بھی اُن لوگوں میں شامل ہو جاؤں جو سفر طیبہ میں گامزن ہیں۔ جانے کب مقدر یاوری کرے گا کاش میں زائر

طیبہ کہلاؤں ۔ جلد...... از جلد...... نہ جانے بلاوا ہے تقدیر میں یا دعا ہے کہ میں بھی زائر طیبہ کے قدموں کی خاک دھول بن جاؤں کیونکہ ابھی حالات تو بظاہر اسے نہیں ۔ بیٹے ابھی تعلیمی دور میں ہیں ۔

وہیں کی ہو مٹی وہیں کا کفن ہو☆☆ ہے میری چادرِ غبار مدینہ

آمین ۔ کاشی ابھی پرچہ ملے بمشکل گھنٹہ بھر ہوا ہے لہٰذا تبصرہ میرا احوال پر ۔ سب سے پہلے محترمہ گڈی آپا کے انتقال پر ملال پر فاتحہ لازم ہے ۔ خدا غریق رحمت کرے آمین ۔ سچ کہا تم نے کہ ہمیں کھوجنے کا عمل جاری رکھنا چاہیے ۔ ہر ہر زاویہ اک نئی دنیا سامنے لاتی ہے ۔ ادی زرینہ جونیجو' تحسین جونیجو' فرزانہ نگہت کی دعائیں تمہارے حق میں ضرور رنگ لائیں ۔ صائمہ بشیر اور سیدہ حجاب فاطمہ کا تبصرہ اچھا لگا ۔ چشتیاں کے ننھے تابش حسنین کا ادب سے لگاؤ دیکھ کر بے اختیار دعا کی کہ کاش ادب و اردو سے محبت ہماری نئی نسل کو بھی ہو جائے ۔ مسز نوید ہاشمی کراچی کا تبصرہ بھی مفصل اور جاندار لگا میں گزشتہ دو ماہ کی کاوشیں دیکھ ہی نہیں پائی مگر اب دوستوں کے تبصروں سے معلوم ہو رہا ہے کہ اچھا خاصا نقصان کر لیا ہے ۔ خیر جیسے موقع ملا پرانے شمارے ضرور پڑھوں گی ۔ سدرہ انور علی کا تبصرہ مسکرانے پر مجبور کرتا ہے بالکل ایسے جیسے سیاہ رات میں اک ننھا سا چمکتا ستارہ' روبینہ ناز صائمہ سحر کو ویلکم ٹو بیک ۔ گجرات کی انعم شہزادی سے عرض ہے لیجیے پیپں پانی کا ٹھنڈا گلاس حاضر ہے ہم کراچی والے بلا کے مہمان نواز ہیں ۔ پانی کی لوڈ شیڈنگ کے باوجود...... اسلام آباد کی عظمیٰ شکور' کا نٹ کھٹ تبصرہ بھی اچھا لگا ۔

☆: اچھی بہن' تفصیلی تبصرہ پڑھ کر آپ کی محبت نے میری آنکھیں بھی نم کر دیں خوش رہیے ۔ چا چی بانوری جلد شائع ہو گی ۔

✉: شازیہ گل ضلع مانسہرہ گاؤں بھیر کنڈ سے طویل غیر حاضری کے بعد احوال کا حصہ بن رہی ہیں ۔ پچھلے کچھ ماہ سے خط نہیں لکھ پائی کچھ طبیعت ناساز رہتی ہے پھر بھی آپ سب نے یاد رکھا جس کے لیے میں آپ سب بہن بھائیوں کی مشکور ہوں جنہوں نے اپنے خطوط میں مجھے یاد رکھا ۔ اس بار بھی بہت خوبصورت کہانیوں سے سجا گلدستہ سچی کہانیاں ڈائجسٹ دو تاریخ کو ملا ۔ بہت اچھا لگا ارے ہاں کاشی بھائی ایک گزارش ہے کہ میں نے تقریباً 11 ماہ پہلے آپ کو ایک کہانی بھجوائی تھی ۔ اکاذب کے نام سے جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی ۔ نا قابل اشاعت کہانیوں میں ہمیشہ نام دیکھا مگر وہاں اپنا نام نا پا کر کچھ حوصلہ ہوا کہ شاید وہ آپ کی ریجیکٹ لسٹ میں شامل نہ ہو اور پلیز نا قابل اشاعت کہانیوں کے نام ضرور لکھا کریں اس سے رائٹرز کو پتا چل جاتا ہے کہ اُن کی کون کون سی کہانیاں ریجیکٹ ہیں ۔ اس طرح وہ اپنی کہانیوں کو مزید بہتر کر سکتے ہیں اور اس امید اور انتظار میں بھی نہیں رہتے اگر میری رائے پسند نہ آئے تو پلیز معاف کر دیجیے گا ۔ منزہ جی جب بھی لکھتی ہیں کمال لکھتی ہیں احوال میں شامل سبھی کے خطوط بہت اچھے لگے ۔ گڈی آپا اب ہم میں نہیں رہیں یہ جان کر بہت دکھ ہوا ۔ خدا اُن کی فیملی کو صبر جمیل عطا فرمائے اور انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے باقی کہانیوں میں اسماء اعوان' لائف بوائے' دل آباد نعمان اسحاق' ہانڈی وال سید افتخار بھٹی' بی بی رضیہ فصیح احمد' وہ مانوس اجنبی ارم خان' بھرم محمد سلیم اختر' ات خدا داویر منعم اصغر دکھ کی فصیل کٹ گئی مسز نوید ہاشمی' کانچ کی گڑیا حمیرا خان' قرض مجید احمد جائی' ہم شکل ایم اے راحت' کمپنی اعجاز احمد' دوسری بیوی کنول عمران خان' یشار ئیسہ خالد' دیر ہے اندھیر نہیں ام عادل' پھکی انیل حسین پٹھان' مفاد جوریہ ملک' قصور کس کا؟ حاسم وقاص' احتیاط ضروری ہے' حنا بشریٰ' انسانوں کے جنگل میں شاز لی سعید مغل' ایک چھوٹی سی لو اسٹوری ابو ہریرہ بلوچ' قدرت نازیہ

بتول رضا' ندامت جاوید راہی' ممتاز احمد' واپسی اور ہمیشہ کی طرح زہر عشق کاشی بھیا بے مثال سلسلہ اور ہم شکل سبھی کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ تیر نیم کش میں نزہت ناز' اللہ رکھی۔ ایم افضل آزاد اور ثریا شاہد کا انتخاب بہت اچھا لگا۔ اچھا اب دیجیے اجازت جہاں رہیں خوش رہیں خوشیاں بانٹیں۔

☆: اچھی بہن شازیہ! دیکھو سب تم سے پیار کرتے ہیں۔ اب کوشش کرنا کہ احوال سے غیر حاضر نہ رہو۔ تمہارا تبصرہ بہت اچھا لگا۔

✉: ہماری آفت کی پڑیا، سدرہ انور علی جھنگ صدر سے احوال میں شریک ہیں، لکھتی ہیں۔ نومبر کا پرچہ یکم کو ملا۔ منزہ آنٹی کا اداریہ معجزہ پڑھ کر بے اختیار منہ سے آمین نکلا۔ احوال میں سبھی نے اچھا لکھا مگر سب سے زیادہ مجھے مس منزل خان کا خط پسند آیا۔ کیونکہ اُن کا خط آج سے دس سال پہلے کی یاد دلا گیا۔ اس کے بعد شمین ماہا کا خط پسند آیا۔ احمد ندیم' شمین ماہا' حسن عباس' رانا مجاہد' ابوذر' جمیل احمد' سونیا خان' کنزہ ملک کو احوال میں خوش آمدید' ملکہ احوال تحسین جونیجو ہمیں بھی آپ سے فون پر بات کر کے بہت خوشی ہوئی، سو سویٹ جاناں۔ منعم اصغر بھیا میں خیر سے ہوں آپ کیسے ہیں؟ اسماء اعوان کی لائف بوائے اچھی لگی۔ نعمان اسحاق کی دل آباد بہت اچھی تحریر ہے۔ افتخار بھٹی کی ہانڈی وال پسند آئی۔ ارم خان کی وہ اجنبی' انکل محمد سلیم اختر کی بھرم' منعم اصغر خدا داد ویر' مسز نوید ہاشمی' دکھ کی فصیل کٹ گئی' حمیرا خان کی کانچ کی گڑیا بہت خوبصورت تحریریں لگیں۔ مسٹر پرفیکٹ بھیا مجید احمد جائی کی قرض اس شمارے کی بہترین کہانی ہے۔ رُلا ہی دیا قسم سے، صائمہ بھابی کو بہت سلام۔ اعجاز احمد فکرال کی کمپنی بہت اچھی لگی۔ ملک عاشق حسین ساجد کی دھندا' عمارہ خان کی کرب' شوبزنس میں منعم بلوچ کو پڑھ کر اچھا لگا۔ کنول عمران خان کی تحریر دوسری بیوی' بیشا' رئیسہ خالد کی دیر ہے اندھیر نہیں، ام عادل جویریہ ملک کی مفاد' قصور کس کا حاسم وقاص' احتیاط ضروری ہے حنا بشریٰ' بہت ہی دلچسپ و سبق آموز تحریریں لگیں۔ تین مرد تین کہانیاں میں شازلی سعید مغل' بہت خوبصورت کہانی لے کر آئیں ویلڈن۔ ابوہریرہ بلوچ کی ایک چھوٹی سی لو اسٹوری' پہلی کہانی گڈ' نازیہ بتول رضا کی قدرت' انکل جاوید راہی کی ندامت' ممتاز احمد بھیا کی واپسی بہت اچھی کہانیاں لگیں۔ تیر نیم کش اور ہائیڈ پارک میں سبھی کے انتخاب پسند آئے۔ رانا محمد شاہد بھیا 20 دسمبر سال گرہ مبارک ہو۔ خط مختصر لکھنے کی تلقین کی گئی ہے سو اب اجازت۔

☆: اچھی گڑیا! تبصرہ مختصر کرنے کی تاکید بھی آپ سب ہی کے بھلے کے لیے کی گئی ہے۔ سلامت رہو۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔

✉: اکوال تلہ گنگ سے سلیمان شبیر لکھتے ہیں نومبر کا ماہنامہ 30 اکتوبر کو ملا۔ سب سے پہلے آنٹی منزہ سہام کا معجزہ پڑھا۔ اس کے بعد احوال میں بھائی ممتاز احمد' ادی تحسین جونیجو' پیاری بہن سدرہ انور علی' انیس الرحمٰن' مسز نگہت غفار' بھائی علی حسنین تابش' مور شاہد حسین' بہن ارم خان' بہن منزل خان' بہن عظمیٰ شکور' محترم مجید احمد جائی اور باقی تمام لوگوں کے تبصرے بھی جاندار تھے۔ احوال میں نئے شامل ہونے والوں کو خوش آمدید۔ اس مہینے کی سب سے زبردست تحریر' واپسی' ممتاز احمد کی تھی۔ اسماء اعوان بھی لائف بوائے میں ہر دفعہ انوکھی تحریر لاتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھرم محمد سلیم اختر' ات خداداد ویر منعم اصغر' کانچ کی گڑیا حمیرا خان' کمپنی اعجاز احمد فکرال کی تحریریں بہت زبردست تھیں۔ پردیس میں جا کر ہی ہمیں اپنے وطن کی قدر یاد آتی ہے۔ قدرت نازیہ بتول رضا' اللہ پاک ہمیشہ محنت کا صلہ دیتا ہے۔ ندامت جاوید راہی کی قلم سے ایک اور زبردست شاہکار اس کے علاوہ بھی تمام مصنفین نے اچھی تحریریں پڑھنے کو دیں

اور اللہ پاک اس سچی کہانیاں کے خاندان کو اسی طرح محبتوں سے آباد رکھے۔ آمین۔ ہم شکل اور زہر عشق تو ہیں ہی لاجواب۔ تعریف کرنا بہت مشکل ہے کاشی بھیا اور ایم اے راحت صاحب کی۔ اس کے ساتھ ہی اجازت بہن منزل خان کے لیے مشورہ کہ سالانہ خریدار بنیں ورنہ پرچہ اس سے پہلے ہمیں بھی سات آٹھ تاریخ کو ملتا تھا۔

☆: پیارے سلیمان! تمہاری محبت کے ہم دل سے معترف ہیں۔ تبصرے کی باقاعدگی تمہاری محبت کا ثبوت ہے۔

✉: کراچی سے یہ آمد ہے ہماری بہت پیاری لکھاری ساتھی نزہت ناز کی، لکھتی ہیں۔ آپ سب کا وارم ویلکم بہت اچھا لگا۔ کئی منٹ تک بولڈ حرف میں لکھے۔ وارم ویلکم کو دیکھتی رہی۔ اور یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اتنا وارم ویلکم مجھ ناچیز کے لیے؟ کاشی بھائی آپ کی نظم انجام بہت خوبصورت ہے۔ اس نظم میں سنہری پیڑوں کے تذکرے نے دسمبر کی خنک راتوں کی خنکی اور بھی بڑھا دی۔ اور اک نیا کام کرنے کے جذبہ نے جنوری کی آمد کی خواہش اور بڑھا دی۔ سنہری پیڑ سے جھڑتے پتوں کا مٹی میں دفن ہونا یہ سکھا گیا کہ گزرتے سال کے سارے غم ہم سب مل کر دفن کر دیں اور ایک نئے جذبے کے ساتھ جنوری کا وارم ویلکم کریں۔ آپ کی نظم نے چند لائنیں لکھنے پر مجبور کر دیا کہ

دسمبر کی خنک راتوں میں ☆☆ اکثر یہ خیال آتا ہے
جنوری کی آمد ہے ☆☆ نئے دنوں کی چاہت ہے
دسمبر بعد دنیا میں ☆☆ جنوری جب آئے گی
اپنا رنگ جمائے گی ☆☆ کیا کیا رنگ دکھائے گی

شکریہ! شکریہ آپ سب کا شکریہ کاشی بھائی آپ کا شکریہ، واقعی آپ تو عام لوگوں کو بھی سوچنے، سمجھنے اور لکھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ہمارے پیارے لکھاری محمد سلیم اختر کی بھرم بہت اچھی تھی۔ حمیرا خان کی کانچ کی گڑیا بہت نازک تھی۔ ملک عاشق حسین ساجد کا دھندا معاشرے کی سچی عکاسی کرتی ایک ناگفتہ بہ کہانی ہے۔ صنم بلوچ کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ ذیشان فراز کو مبارکباد۔ کنول عمران خان کی دوسری بیوی واقعی بہت اچھی ہے۔ حنا بشریٰ نے لکھا احتیاط ضروری ہے واقعی بہت ضروری ہے۔ ام عادل واقعی دیر ہے اندھیر نہیں۔ شازلی سعید مغل کی کہانی انسانوں کے جنگل میں بہت پُراثر رہی۔ جاوید راہی کی ندامت عصر حاضر کی ترجمان ہے۔ ممتاز احمد کی واپسی بہت اچھی ہے۔ کاشی بھائی آپ کا زہر عشق تو بڑا قاتل ہے۔ ایک ایک جملہ رگ جاں میں اترتا محسوس ہوتا ہے اور ہر پل یہ بے چینی کہ اب کیا ہوگا اور تیر نیم کش کا تیر تو دل میں پیوست ہو گیا کہ فتح جنگ سے نزاہت افشاں کا شعر بہت پسند آیا۔ وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے۔ ہم ہر سال اپنی سال گرہ مناتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ عمر بڑھ رہی ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ کاسۂ زندگی کے ماہ و سال لمحہ بہ لمحہ کم ہوتے جا رہے ہیں۔ 30 ستمبر کے حادثہ کا جان کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ آپ کو عمر خضر عطا کرے اور اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ ہم سب کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

☆: اچھی بہن! تبصرہ شاندار رہا۔ خدا اپنوں سے محبت کا یہ تعلق ہمیشہ قائم رکھے۔

✉: چشتیاں سے ہمارے پیارے ننھے ساتھی (ڈاکٹر) علی حسنین تابش لکھتے ہیں۔ ماہ نومبر کا شمارہ 29 اکتوبر کو ہی موصول ہوا۔ وہ اک معمول کی صبح تھی میں اپنے کام میں مصروف تھا۔ اچانک سے ڈاکیا

خواتین کی محبوب قلم کار

رفعت سراج کا تازہ ترین شاہکار "دامِ دل"

رفعت سراج کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔
معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں جو قارئین کی دھڑکنیں بے ترتیب کر رہی ہیں۔

"ایمن" ایک ایسی بہو کی کہانی، جسے دو بیٹیاں پیدا کرنے کے جرم میں ہر لحہ ساس، سسر کے طنز اور طعنوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

تازہ ترین قسط سے کچھ اقتباس

اے ہاں اپنے ان تحفوں کو اوپر ہی رکھا کرو۔ وہ تو شکل ہی دوسری ہوتی ہے جو چاند سا پوتا کھیلنے کو دیتی ہے۔ مشکل سے پچاس ہزار کا جہیز لائی ہوں گی۔ پانچ لاکھ کے خرچے ڈال دیے ہم پر۔" فردوس کی بڑبڑاہٹ زہر کی کڑواہٹ کے برابر تھی۔

"ارے پانچ لاکھ کہاں! جب تک یہ شادی کی عمر کو پہنچیں گی۔ ایک کی شادی پندرہ لاکھ میں پڑے گی۔" حامد حسین نے لقمہ دیا۔

"پ...... پ...... پندرہ لاکھ......" فردوس نے دھپ سے سینے پر ہاتھ مارا اور صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئیں۔ یوں گویا کوئی ان پر بندوق تانے کھڑا ہو اور کہہ رہا ہو۔ نکالو پندرہ لاکھ۔

"ارے کہاں سے لائے گا ہمارا بچہ تیس لاکھ؟" وہ گویا پچھاڑیں کھانے لگیں۔

"آ ہر ارکھو، دو تین اور ہو گئیں تو کروڑ کا بندوبست کرنا ہوگا۔" حامد حسین نے زینہ چڑھتی ایمن کی پشت پر تاک کر نیا تیر چھوڑا۔ ایمن کو پاؤں اٹھانا دوبھر ہو گیا۔

جی تو چاہا پلٹ کر کہہ دے کہ جس نے انہیں ماں کے پیٹ کی اندھیری کوٹھڑی میں رزق دیا۔ آگے بھی وہی ذمہ دار ہے۔ جسے رب العالمین کہتے ہیں۔ جو ہماری تقدیر لکھتا ہے۔ جس کے لکھے کو نہ کوئی مٹا سکتا ہے نہ تبدیل کر سکتا ہے۔ مگر جی کی جی میں رہی۔ کچھ کہنے کا مطلب تھا کم از کم پندرہ دن کی جنگ تو چھڑ گئی۔ وہ شوہر کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ کو بھی ترس جائے گی۔ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔"

آج کے جدید دور میں بھی ایسے کردار ہر دوسرے گھر میں موجود ہیں۔ رفعت سراج عام بات کو خاص بنانا جانتی ہیں۔

"دامِ دل" ہر ماہ دوشیزہ ڈائجسٹ میں مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

انکل کی آمد ہوئی۔ دوڑتا ہوا ان کے پاس پہنچا۔ سچی کہانیاں کا تازہ شمارہ ان کے ہاتھ میں دیکھ کر دل کے تار زور سے بجنے لگے۔ سرورق سچ مچ دل کو بھا گیا۔ کاشی بھائی رب کریم کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے آپ کو صحت عطا فرمائی۔ دعا گو ہوں اس پاک رب سے کہ ہمیشہ آپ کو صحت یابی اور خوشیاں عطا فرمائے آمین۔ احوال میں تمام دوست خوبصورت الفاظ کا چناؤ لیے حاضر تھے۔ اور ہاں منزہ آنٹی کے قلم سے نکلے الفاظ تو دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ معجزہ خوب صورت اداریہ تھا سر سلیم اختر صاحب خدا وند کریم آپ کی عمر دراز کرے۔ بہت خوب لکھتے ہیں اسٹوری بہت پسند آگئی۔ مجید بھائی' ذیشان فراز' جاوید راہی' منعم اصغر اور دیگر رائٹرز کی کاوشیں بھی بے حد پسند آئیں۔ اتنا خوبصورت لکھنے پر مبارکباد قبول فرمائیں۔ زہر عشق اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی سحر انگیزی نے جکڑ رکھا ہے۔ ویلڈن ڈیئر کاشی چوہان ہم شکل اور مستقل سلسلے بھی خوب اچھے سے اپنی منزل پر رواں دواں ہیں۔ پرچے میں خوبصورتی اور قارئین کی بے حد پسندیدگی کاشی بھائی آپ کی روز و شب کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ احوال کے اختتام پر نظم بے حد پسند آئی۔ اجازت لینے سے قبل دعا گو ہوں کہ سچی کہانیاں رات دن ترقی کی راہ طے کرتا رہے آمین۔

☆: پیارے حسنین! ڈاکٹر بننے کی مٹھائی کہاں ہے؟ اور ہاں تمہارا تبصرہ اچھا لگا۔

✉: ہماری ساتھی لکھاری مجید احمد جائی، ملتان سے شریک احوال ہیں، لکھتے ہیں۔ ماہ نومبر 2015 کا سچی کہانیاں، فیض آباد اڈے سے خریدا۔ اداریہ معجزہ بہت خوب رہا۔ احوال میں قدم رکھتے ہی آپ کے لیے ڈھیروں دعائیں لبوں پہ گردش کرنے لگیں، اب طبیعت کیسی ہے۔؟ حنا بشریٰ کہانی کی پسندیدگی کا شکریہ، پیارے ممتاز احمد، تحسین جونیجو، منعم اصغر، بہنا سدرہ انور علی، نزاہت افشاں، حسن عباس نیازی، پیارے علی حسین تابش، عثمان بلوچ، مور شاہد حسین، اشفاق شاہین، ارم خان، منزل خان، عظمیٰ شکور، پیاری آپی فریدہ جاوید فری، فیصل ندیم بھٹی، فرح انیس، راشد لطیف صبر بے والا، سونیا خان، کنزیٰ ملک، نفیسہ فضل، سبھی کا بہت شکریہ کہ آپ لوگوں نے میری کہانیوں کو سراہا۔ مسز نگہت غفار صاحبہ، میری کہانی سوگ زندگی، بالکل سچی ہے اور اس کا چشم دیدہ گواہ میں خود ہوں۔ پیاری منزل خان صاحبہ، میرے پاس تین رسالے سچی کہانیاں آتے ہیں، بیگم الگ پڑھتی اور میں الگ، حملہ آور ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، خوش رہیں، مسز نوید ہاشمی دعائیں دینے کا شکریہ، تمام احوالی بہت خوبصورت انداز میں شرکت فرما رہے تھے، نئے آنے والوں کو خوش آمدید، ست بسم اللہ! کہانیوں میں لائف بوائے، دل آباد، ہانڈی وال، می بی می، بیٹا، دوسری بیوی، دیر ہے اندھیر نہیں، پھکی، مفاد، کرب، کمپنی، کانچ کی گڑیا، مصحف، دکھ کی فصیل کٹ گئی، بھرم، ات خدا داویر، قدرت، ندامت، ایک چھوٹی سی لو اسٹوری، احتیاط ضروری ہے، وہ مانوس اجنبی، زبردست رہیں، پلیٹ فارم کہانی، واپسی میں ممتاز احمد صاحب نے خوب انصاف کیا، ہر تحریر خوب سے خوب تر ہوتی ہے، جیتے رہیں، دھندا، ملک عاشق حسین ساجد، کافی عرصے بعد زبردست کہانی لائے۔ صنم بلوچ سے ملاقات اچھی رہی، قرض کے بارے میں قارئین ہی بتائیں گے کہ میں کہاں تک کامیاب ہوا، ہم شکل چودھویں قسط خوب رہی، زہر عشق، رگوں میں زہر بھرتی آگے کو بڑھتی جاتی ہے۔ انسانوں کے جنگل میں خوب رہی، اس کے بعد مسئلہ یہ ہے، ہائیڈ پارک، تیر نیم کش زبردست چل رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حامی و ناصر رہے۔ ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اجازت، کہیں قینچی حرکت میں نہ آجائے۔

☆ پیارے! اگر قینچی حرکت میں نہ آئے تو قینچی کیوں کہلائے۔ تبصرہ...... تمہاری مزید توجہ چاہتا ہے۔ امید ہے سمجھ گئے ہوگے۔

✉: اعجاز احمد فکرال، لاہور سے عرض کرتے ہیں۔ جناب کیا حال ہے، آپ اتنی اچھی کہانیاں پیش کرتے ہیں کہ میرے پاس آپ کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ میرے تمام دوست بھی آپ کے رسائل کی کہانیوں پر تعریف کے پل باندھتے رہتے ہیں۔ ہر کہانی تجسس اور چاشنی سے بھرپور داستان سے کم نہیں ہوتی۔ جی چاہتا ہے تمام رسالے کو ایک ہی نشست میں پڑھ لیا جائے۔ فرداً فرداً ہر کہانی کی تعریف بیان نہیں کرسکتا۔ تمام کہانیاں ہی اچھی تھیں۔ اللہ کرے تمام لکھاری اسی طرح محنت کرکے ادب کی خدمت کرتے رہیں اور قاری فیض اٹھاتے رہیں اور آپ کا ادارہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتا رہے۔ نئی کہانی حاضر خدمت ہے۔ امید ہے آپ اس کو جلد کسی شمارے میں جگہ دے دیں گے۔ خدا حافظ۔

☆ بھائی اعجاز! آپ نے AOne تبصرہ کرکے ہماری گزارش کی لاج رکھ لی۔ ہماری خواہش ہے کہ ہمارے قاری چھوٹی چھوٹی باتوں سے زندگی کی بڑی بڑی خوبصورتیاں سیکھیں۔

✉: ہماری بہن صائمہ مجید، ملتان شریف سے عرض کرتی ہیں۔ کیسے ہیں آپ سب؟ اللہ تعالیٰ ہمیشہ خوش و خرم رکھے، اور خوشیاں ہی خوشیاں ہوں، دسمبر لوٹ آیا ہے۔ سردی نے اپنے باز پھیلا دیے ہیں، مونگ پھلیاں آگئی ہیں، اور ہم سچی کہانیاں کے ساتھ باتیں کررہے ہیں۔ ماہ نومبر کا سچی کہانیاں، جلد مل گیا، مجید! اسلام آباد گئے ہوئے تھے اور ہم سچی کہانیاں کے ساتھ مصروف رہے۔ اداریہ میں منزہ سہام نئے سال کی مبارک باد دے رہی تھیں۔ احوال میں آپ کے بارے پڑھا تو رب کے حضور آپ کی صحت یابی کے لئے دعائیں مانگنے لگے۔ شالا نظر نہ لگے میرے بھیا کو۔ حنا بشریٰ، انکل ممتاز احمد، عائشہ نور، سعدیہ عابد، تحسین جونیجو، منعم اصغر، احمد ندیم، سدرہ انور علی، یمین غزالہ، شبین ماہا، انیس الرحمٰن، فرزانہ نگہت، علی حسنین تابش، عثمان بلوچ، نزہت ناز، مور شاہد حسین (دعائیں دینے کا شکریہ، اللہ تعالیٰ آپ کی زبان مبارک کرے اور میری گود ہری ہوجائے آمین) جمیل احمد، بھیا اشفاق شاہین، سلیمان شبیر، ارم خان، منزل خان، عظمیٰ شکور، پیاری آپی فریدہ جاوید فری، ایم افضل آزاد، فیصل ندیم بھٹی، فرح انیس، راشد لطیف صبر ے والے، سونیا خان، ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا، کنزیٰ ملک، نفیسہ فضل کے تبصرے شاندار تھے، نئے لوگوں کو خوش آمدید، فیصل ندیم بھٹی، عظمیٰ شکور، منزل خان، مسز نوید ہاشمی، دعاؤں کیلئے شکریہ۔ کاشی بھیا، بہت جلد اپنی تحریر بھی روانہ کردوں گی، بس تھوڑا سا انتظار...... کہانیوں میں انکل ممتاز احمد کی 'واپسی' بہت پیاری تحریر تھی، بھرم، دھندا، کرب، کمینی، کانچ کی گڑیا، ات خدا دا ویر، پھنگی، مفاد، دیر ہے اندھیر نہیں، ندامت اور قدرت شاندار کہانیاں تھیں، زہر عشق پُراسراریت کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ ہم شکل خوب جارہی ہے۔ ہائیڈ پارک، تیر نم کش، مسئلہ یہ ہے، اچھے چل رہے ہیں، اس کے علاوہ باقی کہانیاں بھی خوب رہیں، صنم بلوچ سے ملاقات کرکے دل خوش ہوا۔

☆ اچھی بہن! تبصرے کا شکریہ۔ تحریر بھی جلد روانہ کریں۔ خدا تمہاری ہر مراد پوری کرے گا۔ آمین۔

✉: سونیا خان، بستی شاہ گردیز سے شاملِ احوال ہیں، لکھتی ہیں۔ میں بہت خوش ہوں کہ میرا پہلا لیٹر سچی کہانیاں میں شائع ہوا، شکریہ کاشی بھیا۔ میں تو ہواؤں میں اڑتی پھرتی ہوں، سہیلیوں کو دکھاتی پھرتی ہوں۔ سرورق پر دوشیزہ بھلی لگ رہی تھی۔ نیچے کونے میں صنم بلوچ بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ منزہ سہام

'معجزہ' کی بات کر رہی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کرم کرے تو معجزے آج بھی ہوتے ہیں۔ میں مر جاؤں، کاشی بھیا، کیا ہوا تھا؟ اب صحت کیسی ہے۔؟ حنا بشریٰ صدارت سنبھالے ہوئے تھیں۔ مبارک باد قبول ہو۔ ممتاز احمد، عائشہ نور، تحسین جونیجو، سدرہ انور علی، مور شاہد حسین، منعم اصغر، ارم خان، شین ماہا، نزابت افشاں، انیس الرحمان، مسز نگہت غفار، مسز نوید ہاشمی، بھابی صائمہ مجید، ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا، علی حسنین تابش، راشد لطیف، پیارے محترم مجید احمد جائی، اشفاق شاہین، منزل خان، فریدہ جاوید فری، عظمیٰ شکور، فیصل ندیم بھٹی، کنزیٰ ملک، نفیسہ فضل ساتھ ساتھ سبھی کے تبصرے بہترین تھے۔ نئے آنے والوں کو خوش آمدید، پرانے احوالیوں کو خلوص دل سے سلام۔ کہانیوں کی وادی میں سب سے پہلے اپنے استاد محترم مجید احمد جائی کی کہانی ''قرض'' پڑھی، بہت خوب لکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو سلامت رکھے آمین۔ دھندا، کرب، واپسی، پھکی، مفاد، قدرت، ندامت، دل آباد، ہانڈی وال، دوسری بیوی، بیٹا، دیر ہے اندھیر نہیں، بی بی جی، وہ مانوس اجنبی، بہت اچھی لگیں، باقی بھی بہت تھیں، زہر عشق، ڈرائی رہی، کمال تحریر ہے، جس نے اپنے سحر میں قید کر لیا ہے۔ ہم شکل اچھی جا رہی ہے۔ صنم بلوچ سے ملاقات بہت خوب رہی، باتیں کرتے ہوئے مسکراتے رہے، ہائیڈ پارک، تیرنم کش، مسئلہ یہ ہے، سچی کہانیاں کی رونق بڑھا رہے ہیں، نومبر کا سارے کا سارا رسالہ پڑھ لیا، کاشی بھیا، آپ کی محنت رائیگاں نہیں جاتی، ہر زبان پہ سچی کہانیاں کے چرچے ہیں، یقین نہیں آتا تو مختلف شہروں کے سفر کر کے دیکھیں، سروے کریں، اللہ تعالیٰ سچی کہانیاں کے ساتھ وابستہ ہر شخص کو سلامت رکھے آمین۔

☆ بہت پیاری سونیا! تم کو پرچہ پسند آیا۔ ہماری محنت وصول، سلامت رہو۔

✉ اسلام آباد سے ہماری شریر نٹ کھٹ عظمیٰ شکور لکھتی ہیں۔ آداب عرض، لیں جی آنکھیں بند کرو تو مہینہ ختم اور شمارہ ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ زندگی بہت تیزی سے سفر میں ہے۔ سرورق پر ماڈل کی بولتی آنکھیں اُف قیامت ڈھا رہی تھیں۔ کچھ لوگ تو رسالے خرید کر ہی گر پڑے ہوں گے کچھ رحم کھایا کریں کمزور دل حضرات پر۔ منزہ سہام کی خوبصورت مبارکباد نئے سال کی، خوب! پھر کاشی کے حسین خیالات، واہ! اینڈ مہکتا احوال، کمال۔ احوالیوں کے گلے شکوے پیار محبتیں، انت، اور پھر کہانیوں میں سچائیوں کے گہرے پُراثر رنگ۔ اُف اللہ مر نہ جائیں کہیں۔ ہائیڈ پارک کے سردی میں ٹھنڈے جھونکے، سردی لگ گئی ہے۔ تیرنیم کش میں حساس لوگ پیارے جذبات، حسین تصورات، زندگی حسین ہے تو جی لیتے ہیں۔ یہ تھیں رسالے کے ساتھ جڑی محبتیں اب آتے ہیں تبصرے کی طرف ایڈیٹر صاحب آپ ایک گلاس پانی پی لیں۔ تاکہ تبصرے کی تفصیل پر غصہ نہ آئے۔ سید افتخار بھٹی صاحب قسم سے کمال کر دیا۔ ہانڈی وال لکھ کر۔ میں آخر تک اسے ہانڈی دال ہی سمجھی اُف میں بھی کتنی سادہ ہوں (احوالیو! ہوشیار!) بی بی جی لیے حاضر ہو میں، رضیہ فصیح احمد صاحبہ پتا ہے کیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اُس بچے کی آواز میں بھی سن رہی ہوں۔ اور میں بھی سردی میں کانپ رہی ہوں۔ میری آنکھوں میں اس وقت آنسو تھے معاشرے کی بے حسی پر۔ تو یہ رائٹر کی کامیابی ہوتی ہے کہ اُس کے لکھے کا اتنا اثر ہو کہ قاری پہ اثر نواز ہو۔ وہ مانوس اجنبی ارم خان بس تھوڑا سا اختلاف ہے جب کسی عورت کی شادی ہو جائے تو اُس کی روح تک اپنے مجازی خدا کی ہوتی ہے۔ اُس کی سوچیں اس کے خیالات بس ایک کے ساتھ بندھ جاتے ہیں۔ یہی ہے 'مشرقیت'۔ بھرم محمد سلیم اختر، ایسا فرشتہ انسان کہاں ہے جی؟ قسم سے انسانیت پر پیار آ گیا۔ واہ کمال! ات خدا دا ویر منعم اصغر اُف ماریں گے کیا؟ ایسا بھی ہو رہا ہے معاشرے میں حد ہے۔

قیامت قریب ہے جناب بس۔ انسان درندہ بن چکا ہے کہاں جائیں۔ اس معاشرے سے کیسے چھپائیں خود کو۔ پھر ہائیڈ پارک میں گئے واہ خوب رونق تھی۔ جی خوش ہوگیا جی ایڈیٹر صاحب قسمیں۔ شاعر عتیق صاحب کی مونا لیزا اچھی لگی۔ ثبات ترنم ریاض کی شاعری اچھی لگی۔ ''مٹی کا دیا'' کوثر اسلم بہت زبردست بات کی آپ نے، اثر کرگئی قسم سے۔ تیرنیم کش میں چپکے چپکے کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سے بڑھ کر ایک ہے شعر وہاں۔ اجی کس کس کو سراہیں۔ سعدیہ عابد کیا کہنے۔ سدرہ انور علی خوشی لکھیے۔ شازیہ ظہیر کمال گہری بات۔ تو ایڈیٹر صاحب خوش ہو جائیں تبصرہ ختم ہوا اور نہیں تو کیا۔ خود ہی تو بولتے ہیں تبصرہ مختصر۔ میرے ساتھی لکھنے والوں کو میری طرف سے بے انتہا دعائیں اینڈ یہ جو صاحب مسکرا رہے ہیں نا۔ (کاشی) اِن کے لیے بھی بے پناہ مخلص دعائیں، وفائیں اد کے جی! آپ تبصرہ انجوائے کرو میں ذرا بادلوں سے چار باتیں کرلوں تو ملتے ہیں پھر 'دسمبر' کی یخ بستہ سردی میں کہ جب لفظ بھی جم جم جائیں گے سچی کہانیوں کو میرا پیار۔

☆: ارے لڑکی! سردی سے ڈرا دی گیا...... قسم سے اور ہاں قسم سے آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔

✉: چوکی سے ہمارے بہت پیارے ساتھی محمد ندیم عباس میواتی اپنے تبصرے کے ساتھ شاملِ احوال ہیں، لکھتے ہیں نومبر کا شمارہ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ تیس اکتوبر کو ملا۔ بھائیوں کیا حال ہیں۔ پنجاب میں تو بلدیاتی انتخابات اور وڈیروں میں دھینگا مشتی کا کھیل جاری ہے۔ سب کو چھوڑیں ہم اپنی بارونق محفل کی طرف چلتے ہیں۔ جہاں گلشن احوال میں ہر طرف رنگ برنگے پھول اور کلیاں فضا کو معطر کرتی خوش باش نظر آ رہی ہیں۔ کچھ نئی کلیاں بھی اپنے نازک پر کھول رہی ہیں۔ سب کو ایک مسکراہٹ کے ساتھ خوش آمدید جن میں بہن عائشہ نور عاشا، سعدیہ عابد، احمد ندیم ضیاء انعم شہزادی، شیبن بابا، انیس الرحمان، حسن عباس، رانا مجاہد جمیل، ابوذر غفاری، اینڈ ابوذر سندھو، سونیا خان، کنزہ ملک امید کرتا ہوں سدا یونہی اس گلشن کو آباد کرتے رہیں گے۔ پھر میں ان دوستوں کا بے حد مشکور ہوں جنہوں نے میری کہانی کو پسند کیا۔ مجھے مزید لکھنے کی ہمت دلائی۔ بالخصوص انعم شہزادی، عثمان بلوچ، ابوہریرہ بلوچ، شعبان کھوسہ، بابا مجید جائی، حنا بشریٰ، سدرہ انور علی، بگ برادر راشد لطیف، علی حسنین تابش، اشفاق شاہین، فیصل ندیم، آپی صائمہ مجید، نفیسہ فضل، سب کا پھر ایک بار شکریہ۔ آپی مسز نوید ہاشمی سلام اینڈ اللہ کے فضل سے دونوں طرح کے ایگزام میں 72% مارکس سے کامیابی حاصل کرچکا ہوں اور یہ سب آپ قارئین اور خصوصی بھیا کاشی کی دعاؤں کا ثمر ہے۔ کہانیوں کی طرف سے زہر عشق، بیسٹ جا رہی ہے۔ دیکھو بھیا کس کو محبت دیتے ہیں اک ووٹ دو امیدوار (ہاہاہا) ایک چھوٹی سی محبت ابوہریرہ بلوچ ویری گڈ، زورِ قلم اور زیادہ، قرض بابا مجید جائی، ندامت جاوید راہی کی، ات خدا داویر منعم اصغر کی وہ مانوس اجنبی ارم خان، واپسی ممتاز احمد احتیاط ضروری ہے حنا بشریٰ کی دیر ہے اندھیر نہیں، دوسری بیوی، مفاد، انسانوں کے جنگل میں، دکھ کی فصیل کٹ گئی، بڑی آپا مسز نوید ہاشمی کی بہت پسند آئیں۔ باقی تیرنیم کش اور ہائیڈ پارک شاندار رہے۔ مسئلہ یہ ہے زبردست سلسلہ ہے۔ سب کو سلام اور نیک تمناؤں کی التجا۔

☆: لو جی! تمہارا تبصرہ خدا خدا کرکے ہم تک پہنچ ہی گیا۔ کوشش کرو کہ جلد حوالہ ڈاک کیا کرو۔ ہمارے ملک کے ڈاک کے نظام کو تو تم اچھی طرح جانتے ہونا۔

✉: کراچی سے مس منزل خان عرض کرتی ہیں محترم کاشی بھیا آداب اور بہت ہی پیارے احوالیوں کو میرا سلام۔ ٹائٹل نہایت ہی حسین تھا۔ اس کے بعد اشتہارات سے گزرتے ہوئے معجزہ پر پہنچے۔

احوال ہمیشہ کی طرح قارئین کے خوبصورت تبصروں کے ساتھ جگ مگاتا نظر آیا۔ حنا بشریٰ، تحسین جونیجو، سدرہ انور، مسز نگہت، مور شاہد حسین، ارم خان، مسز نوید ہاشمی، مجید احمد جائی، صائمہ مجید، ڈاکٹر خادم حسین، نفیسہ فضل بہت ہی خوبصورت تبصروں کے ساتھ شاملِ احوال تھے۔ اس کے بعد نو واردوں کو جی آیاں نوں جن میں کنزہ ملک، سونیا خان، نزہت ناز، چوہدری ابوذر سندھو، عثمان بلوچ، حسن عباس، شمین ماہا، احمد ندیم، شامل ہیں۔ ممتاز احمد! پوری کوشش ہے کہ احوال میں اپنی آمد ممکن بناؤں، منعم اصغر، امتحانات میں کامیابی کے لیے دعا گو۔ مگر یاد رکھنا اچھا رزلٹ آنے پر مٹھائی کھلانا مت بھولنا۔ کیمیں غزالہ، بالکل صحیح کہا آپ نے۔ نزاہت افشاں، آپ کا شعر بہت خوبصورت ہے۔ اشفاق شاہین، یاد کرنے کا بہت شکریہ۔ سلمان شبیر وعلیکم السلام۔ عظمیٰ شکور تبصرے کے چکر میں تو بڑے بڑے کام رہ جاتے ہیں فیصل ندیم تمہارے خطوط واقعی تعریف کے قابل ہوتے ہیں۔ فرح انیس شکریہ میں بھی اتنی کنجوسی جو تبصروں میں یاد نہیں کرتے مگر دلوں میں آپ موجود ہیں۔ راشد لطیف بھیا سچ بولتے وقت یہ ضرور یاد رکھیے گا کہ دل کانچ کی طرح ہوتے ہیں اور زبان سے نکلی بات اور کمان سے نکلا تیر واپس نہیں ہوتے۔ آخر میں معذرت کیونکہ بیٹے کی طبیعت کی ناسازی کے باعث کہانیوں کا مطالعہ نہیں کر پائی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک ہوگی۔ اس دعا اور امید کے ساتھ اجازت کہ جہاں رہیں خوش اور پُرسکون رہیں۔

☆: اچھی منزل خان! آپ کی ہمارے احوال میں شرکت ہی ہمارے لیے بہت ہے۔ بیٹے کی طبیعت کے لیے دعا گو۔ لیجیے اس ماہ آپ کی کہانی بھی رسالے کا حصہ بن رہی ہے۔

✉: ہمارے نئے ساتھی لکھاری ابو ہریرہ بلوچ بہاول نگر سے عرض گزار ہیں۔ ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد پھر سے بزم کا حصہ ہوں۔ پچھلے ماہ احوال میں شرکت نہ کر سکا، جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ دراصل مصروفیات نے اس قدر جکڑا کہ خط لکھنے کا موقع بھی میسر نہ آسکا۔ خیر نومبر کا سچی کہانیاں 28 تاریخ کو اعزازی کاپی کے طور پر ملا، جس کے لیے ایڈیٹر صاحب کا مشکور ہوں۔ ٹائٹل پر بیٹھی حسینہ نے خوشخبری دی کہ محنت کا ثمر وصول ہو چکا۔ ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری کہانی کو رسالے میں جگہ دی۔ دوستوں کی آراء کا منتظر رہوں گا۔ احوال میں پہنچے تو سب کو اپنی نشستوں پر براجمان پایا۔ کچھ نئے چہروں سے بھی شناسائی ہوئی۔ جن احباب نے یاد کیا اُن کا شکریہ۔ کہانیوں کی جانب پیش رفت ہوئی تو اسماء اعوان صاحبہ کو لائف بوائے کے ساتھ موجود پایا۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی کہانی انوکھی اور دلچسپ تھی۔ اس کے بعد دیر ہے اندھیر نہیں ام عادل صاحبہ نے بھی اچھا لکھا۔ قسط وار اسٹوری زہر عشق کاشی چوہان کی، کامیابی سے منزل کی جانب گامزن ہے۔ اسٹوری محبت، سسپنس اور خوفنا کی جیسے کئی اور پہلوؤں سے لبریز ہے۔ بس اجازت چاہوں گا۔

☆: پیارے ابوہریرہ! تمہاری کہانی اچھی تھی اس لیے اُس نے اپنی جگہ آپ بنالی۔ تبصرہ بہتر کیا تم نے۔ امید ہے ہمارا ساتھ ہمیشہ قائم رہے گا۔

✉: آبادی سجان شاہ سے ایم تحسین جی کی احوال میں پہلی آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ قارئین کرام! میرا یہ سچی کہانیاں میں پہلا قدم ہے امید ہے کہ سب لوگ مجھے اچھے سے ویلکم کریں گے۔ میں پہلے تو صرف ہر ماہ پڑھتا تھا۔ دل میں لکھنے کی جسارت کی تو یاسر دکی نے مجھے حوصلہ دیا کہ آپ لکھو کاشی بھائی ہر نئے قاری اور لکھنے والے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اگر اس ماہ میرا لیٹر شائع ہوگیا تو انشاء اللہ باقاعدگی

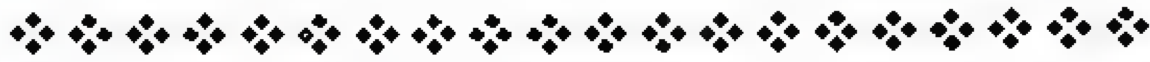
دسمبر 2015ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا/کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام: ....

مکمل پتا: ....



دسمبر 2015ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

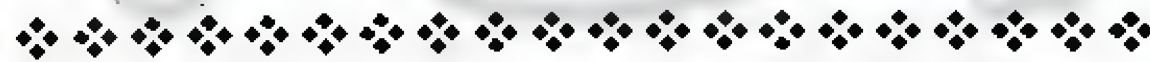
میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی: .... تعداد صفحات: ....

نام: ....

مکمل پتا: ....

فون/سیل نمبر: ....



دسمبر 2015ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: .... مصنف: ....

دوم، عنوان: .... مصنف: ....

سوم، عنوان: .... مصنف: ....

نام: .... شہر: ....

سے حاضری دیتا رہوں گا۔ امید ہے کاشی بھائی ناامید نہیں کریں گے اور امید پر دنیا قائم ہے۔ کاشی بھائی ہم دل سے مشکور ہیں کہ آپ اس رسالے کو دن بدن ترقی کی راہ پر گامزن کر رہے ہو۔ اللہ سچی کہانیاں رسالے کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

☆: اچھے تحسین! خوش آمدید، لو ہم نے تمہیں احوال کا حصہ بنا ڈالا۔ اب تم بھی اپنے وعدے پر قائم رہنا۔

✉: ہمارے نئے ساتھی انیس الرحمٰن، آئی بلاک بورے والا سے لکھتے ہیں آپ کے ایکسیڈنٹ کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ ماہ نومبر کا شمارہ جلد ہی مل گیا تھا۔ آپی منزہ ہم بھی آپ کو نئے سال کی ایڈوانس مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ احوال میں سب سے پہلے تو ان کا شکر گزار ہوں جن لوگوں نے میرے تبصرے کو پسند کیا۔ آپ سب کا بہت بہت شکریہ، سب سے بڑھ کر فیصل ندیم بھٹی کا شکر گزار ہوں جس نے ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھا۔ ممتاز احمد، عثمان بلوچ، اشفاق شاہین، فیصل ندیم، سدرہ انور علیٰ نزہت ناز، راشد لطیف اور صائمہ مجید کے تبصرے بہت اچھے لگے۔ کہانیوں میں ہانڈی وال، می بی می، اچھی تحریریں تھیں۔ ابوہریرہ بلوچ کی چھوٹی سی لو اسٹوری نے تو آبدیدہ کردیا۔ باقی کہانیاں تعلیمی مصروفیات کے پیش نظر وقتاً فوقتاً پڑھتے رہیں گے۔ کاشی بھیا زہر عشق تو ایسے ہی ہے جیسے ہمارے پنجاب میں بلدیاتی الیکشن ...... پتا نہیں کون جیتے گا۔ ویسے قلم آپ کے ہاتھ میں ہے۔ جو بھی فیصلہ کریں۔

☆: پیارے انیس، تبصرہ بہت اچھا لگا۔ امید ہے آپ کے پوچھے گئے سوال کا فون پر جواب آپ کو مطمئن کر گیا ہوگا۔ احوال میں اسی طرح حاضری باقاعدہ رہنی چاہیے۔

✉: لاہور سے ہماری بہت پیاری ساتھی فریدہ جاوید فری لکھتی ہیں۔ نومبر کا سچی کہانیاں ملا۔ معجزہ منزہ جی نے بے حد اچھا لکھا۔ بے حد طبیعت خراب ہے مگر سچی کہانیاں میں تو ضرور حاضر ہونا ہے۔ تمام احوالیوں کے تبصرے جاندار اور جامع تھے۔ کہانیوں میں دھندا ملک عاشق حسین قرض مجید احمد جائی آپ نے اس مرتبہ ہمیں یاد نہیں رکھا۔ ہمیں بہت محسوس ہوا اور یہ پڑھ کر اچھا لگا کہ صائمہ مجید آپ کی بیگم ہیں۔ دکھ کی فصیل کٹ گئی مسز نوید ہاشمی کی کہانی اے ون رہی۔ ات خدا داویر بہترین تحریر تھی۔ ہائیڈ پارک میں سدرہ انور علی کی ماں کا دکھ پڑھ کر بے حد روئی۔ بھائی سلیم اختر تو ہر مرتبہ بہترین تحریر لے کر آتے ہیں بھرم کی کیا بات ہے دل خوش ہو گیا۔ ارم خان نے بھی خوب لکھا وہ مانوس اجنبی، رضیہ فصیح احمد نے بھی کمال کا لکھا۔ دل آباد بھی بے حد اچھی لگی۔ کس کس کی تعریف کروں مسز نگہت غفار آپ کا تبصرہ بے حد اچھا لگتا ہے ہمیں یاد کرنے کا بے حد شکریہ۔ ہر ماہ حاضری ضروری ہے آپ کی۔ سدرہ انور علی، مسز نوید ہاشمی، عظمیٰ شکور، نگہت غفار۔ یاسمین اقبال اور سب بہن بھائیوں کو دعا اور سلام۔

☆: پیاری آپی! آپ کی طبیعت کے بارے میں پڑھ کر بے حد دل مغموم ہے۔ جلدی سے اچھی ہو جائیں۔ آپ کے تبصرے کا تو ہمیں انتظار رہتا ہے۔

✉: میانوالی سے ہمارے نئے ساتھی ملک محمد اکرم آہیر شریک احوال ہیں لکھتے ہیں۔ ماہ نومبر کا شمارہ ملا۔ ٹائٹل کے بھی کیا کہنے تھے۔ سردیوں کے موسم میں گرمی کا احساس ہوا۔ اداریے میں ہماری باجی منزہ سہام کا معجزہ حب الوطنی کا درس دے رہا تھا۔ اداریہ کے بعد قارئین کے سلگتے کچھ گلے شکوے اور کچھ خالص خلوص بھرے خط بھی پڑھے تو ہونٹوں سے یہی الفاظ نکلے کہ خالص ہی سب کچھ ہے۔ اس کے بعد میں ان

لوگوں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے میری کہانی پامسٹ کو پسند فرمایا۔ خاص طور پر حنا بشریٰ، ممتاز احمد، تحسین جونیجو، منعم اصغر، سدرہ انور علی، نزہت ناز، سلیمان شبیر، فیصل ندیم بھٹی، نفیسہ فضل نے میری تحریر کو پسند فرمایا۔ اب کہانیوں کی طرف آتا ہوں اس ماہ نومبر کی کہانی کی طرف پہلی کامیابی کمرشل کہانی لائف بوائے کے ساتھ اسماء اعوان اچھی سوچ کو اجاگر کیا اس کے بعد نعمان اسحاق کی کاوش دل آباد، آہنی سلاخوں اور جیل کی اندھیری نگری میں دبی ایک زندہ جاوید تحریر ہانڈی وال سید افتخار بھٹی اس کے بعد ماں کی ممتا میں لپٹی تحریری ی ی رضیہ فصیح احمد، انسان میں خلوص بھری کہانی وہ مانوس اجنبی ارم خان، راولپنڈی سے بھرم تحریر محمد سلیم اختر وغیرہ دیگر تحریر بھی اپنی مثال آپ تھیں۔ کاشی چوہان آپ کی وجہ سے تحریر مختصر کردی ہے۔ ورنہ آپ چوبیس گھنٹے بغل میں قینچی دبائے رکھتے ہیں۔ (کیوں الزام لگاتے ہو) آپ کی کہانی زہر عشق واقعی میرے وجود میں سرسری پیدا کرتے ہوئے میرے خون میں کیسٹرول بن کر جم رہی ہے۔ ایم اے راحت جن کا تو نام ہی کافی ہے ان کی تحریر ہم شکل واقعی لاجواب ہے اور خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے روحانی سلسلہ بھی خوب رنگ جمارہا ہے۔ تیرنیم کش لوگوں کے اظہار کا بہترین ذریعہ ثابت ہورہا ہے۔

☆: اچھے بھائی! تبصرے کا شکریہ۔ اب حاضری باقاعدہ ہو۔ اور ہاں اس ماہ اپنی کہانی کا بھی بھرپور مزہ لو۔

✉: ڈی جی خان سے یہ آمد ہے ہماری بہت پیاری بہن ارم خان کی لکھتی ہیں۔ بھیا جی اس ماہ جو گفٹ آپ نے ہمیں دیا ہے، اسے پاکراتنی خوشی ہوئی کہ میں بتا نہیں سکتی۔ بھیا جی بہت بہت اور بہت شکریہ۔ ویسے آپس کی بات ہے بھیا ہماری کہانی اس ماہ شامل کر کے آپ نے رسالے کو چار چاند نہیں آٹھ چاند لگادیے ہیں۔ ہاہاہا۔ اور ہر پڑھنے والے سے مجھے اتنا کہنا ہے کہ میری حوصلہ افزائی ضرور کرنی ہے سب نے، ورنہ...... ہاں ہاں دھمکی دے رہی ہوں۔ اور بھیا ممتاز احمد آپ کی کہانی واقعی اچھی تھی۔ شکریہ کی ضرورت نہیں۔ بھائی منعم اصغر تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ آنٹی مسز نگہت غفار میرا شعر پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ اچھی اچھی بہنا منزل خان کیا خوب مشورہ دیا ہے کان پکڑنے کا، جسے پڑھ کر ہنسی آ گئی۔ خوش رہو۔ سسٹر فرح انیس بہنوں کو شکریہ نہیں کہتے۔ یہ بتاؤ دو ماہ غائب کہاں رہیں۔ کہانیوں میں دل آباد، ہانڈی وال، می می بھرم، ات خداداد یہ، کانچ کی گڑیا، قرض، کمینی، دھندا، کرب، پھکی، اچھی تھیں۔ تیرنیم کش میں ملازم حسین، ماہین فاطمہ، ملائکہ حریم، مسز نگہت غفار، عظمیٰ شکور، فرح انیس، ثمرین راجپوت، مور شاہد حسین، اللہ رکھی، نسرین یاسین کے اشعار پسند آئے۔ اب اگلے ماہ تک کے لیے اللہ حافظ۔

☆: پیاری ارم! تمہاری احوال میں باقاعدگی تمہاری محبت کا ثبوت ہے۔ یقین کرو۔ تم سب ہمارا مان ہو۔

✉: کراچی سے طویل غیر حاضری کے بعد ہماری پیاری بہن حجاب فاطمہ پھر سے شاملِ احوال ہیں، لکھتی ہیں جہاں سچی کہانیاں میں بہت سی بہترین تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں وہیں۔ یقیناً اس کو ہم تک پہنچانے کے لیے آپ کی محنتوں میں بھی اضافہ ہوا ہے جسے نہ سراہنا سراسر زیادتی ہے۔ اور اب مزید ایک ذمہ داری کا بار سجائے آپ نے جو وعدہ احوالیوں کی بہترین کاوش پر سند دینے کا لیا ہے۔ عمدہ ہے۔ کاشی بھیا! پُراسرار نمبر 3 اور ماہ دسمبر کی پراسراریت نے ابھی سے ہمیں محوِ انتظار کردیا ہے۔ ایک کہانی میں بھی اسی حوالے سے ارسال کررہی ہوں اگر قابلِ اشاعت ہو تو ناچیز کی طرف سے قبول فرمایئے گا۔ اب کچھ بات ان ساتھیوں کی ہوجائے جنھوں نے بڑی محبتوں سے ویلکم بیک کہا۔ پیاری تحسین جونیجو یہ تمہاری اور بھائی شعبان کھوسہ

کی محبت اور مجھے دیا گیا حوصلہ ہی تو ہے جو آج میں پھر خود کو اس محفل سے دوبارہ جوڑ سکی ہوں۔ اب کیونکہ کاشی کی نگاہوں کی خفگی نے ہمیں باور کرادیا ہے کہ محترمہ کچھ تبصرہ ادھر بھی تو کہانیوں کی طرف آتی ہوں۔ سرورق ہمیشہ کی طرح بہت خوبصورت رہا۔ ذرا جو آگے بڑھے تو منزہ کا معجزہ پڑھ کر بے ساختہ دل آمین کی صدا بلند کی۔ نئے احوالیوں کو میرا سلام۔ لائف بوائے اسماء اعوان کی اچھی کاوش تھی۔ منعم اصغر، اعجاز احمد فکرال کی بتول رضا، شازلی سعید مغل کی اور مجید احمد جائی کی کہانیاں زبردست رہیں۔ رضیہ فصیح احمد اور عمارہ خان کی تحریریں بہترین بھی تھیں۔ ابھی تک اتنا ہی پڑھ سکی ہوں اور اب اجازت اس امید کے ساتھ کہ زندگی نے ساتھ دیا تو اگلے ماہ پھر حاضری یقینی ہے۔

☆: پیاری بہن! اب احوال سے دور نہ ہونا آپ۔ ہمارے لیے اپنی اہمیت کو دل سے محسوس کریں۔

✉: اپنی خوبصورت تحریر میں محمد قاسم خان بلوچ، ضلع ٹوبہ چک 184 گ ب، سے پہلی بار احوال میں شامل ہو رہے ہیں، لکھتے ہیں۔ پیارے قارئین میں سچی کہانیاں کی پُر رونق محفل میں پہلی بار شرکت کر رہا ہوں امید ہے کہ بھائی کاشی چوہان صاحب مجھے اس پیاری محفل میں ضرور شامل کریں گے۔ مقصود احمد بلوچ بھائی نے مجھے مشورہ دیا کہ قاسم بھائی تم سچی کہانیاں پڑھا کرو۔ یہ بہت اچھا رسالہ ہے۔ تو میں نے پھر یہ رسالہ بلال نیوز ایجنسی ٹوبہ ٹیک سنگھ سے خریدا۔ ٹائٹل بہت سندر تھا۔ احوال میں قارئین کے اچھے اور معیاری تبصرے پڑھے تو بہت پسند آئے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ احوال میں سبھی کے خطوط شامل کیے ہوئے تھے جبکہ دوسرے رسالوں میں ایسا ہی ہوتا۔ کسی کا خط شائع ہوتا ہے اور کسی کا نہیں۔ لیکن یہاں ایسی بات نہیں تھی اس کے بعد سب لکھاریوں کی دلچسپ اور عمدہ کہانیاں پڑھیں تو بہت پسند آئیں۔ یہاں میں نے ایک بات نوٹ کی ہے کہ سچی کہانیاں میں سب کہانیوں کی کمپوزنگ بھی اچھی اور عمدہ تھی اور اس کے ورق بھی پائیدار مطلب ہر لحاظ سے یہ رسالہ اچھا ہے۔ بھائی کاشی چوہان جی! میں جتنی بھی اس رسالے کی تعریف کروں کم ہے۔ بھائی کاشی جی میرا تعلق ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ہے میرے علاقے میں سچی کہانیاں بہت پسند کیا جاتا ہے اور یہ سب کچھ اس کی مقبولیت کی اچھی اور زندہ مثال ہے۔

☆: پیارے بھیا قاسم! خوش آمدید جگ جگ جیو۔ پرچے کی پسندیدگی پر شکریہ۔ یار یہ بتاؤ پرچہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اتنا زیادہ پسند کیا جاتا ہے تو ہمارے پاس سے اتنی کم کاپیاں کیوں وہاں جاتی ہیں؟ امید ہے اس تبصرے کے بعد ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہماری سرکولیشن ضرور بڑھے گی۔

✉: عثمان رضا اوکاڑہ سے پہلی بار ہمارے احوال کی زینت بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ پہلی بار محفل میں شرکت کی جسارت ہے۔ دو ماہ قبل آپ کی خدمت میں ایک کہانی بعنوان 'انوکھا راز' ارسال کی تھی۔ یہ میری پہلی کوشش ہے۔ امید ہے آپ میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے مجھے ضرور سچی کہانیاں کا حصہ بنائیں گے۔ رسالے کا تعارف چند احباب کے توسط سے ہوا۔ جن کے لیے ان کا مشکور ہوں۔ آپ کا رسالہ دیگر رسائل سے بالکل ہٹ کر ہے۔ دلچسپ کہانیاں، احوال کی محفل اور دوسرے سلسلے آپ کے رسالے کو پُر رونق بنائے ہوئے ہیں۔ وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ آپ کی خدمت میں بھیجتا رہوں گا۔ چونکہ رسالے میں میری انٹری نئی ہے اس لیے ایک اجنبیت سی ہے۔ امید ہے خط کو شائع کر کے بندے کی ہمت کو مزید ہوا دیں گے۔ تاکہ مزید کچھ لکھ سکوں۔

☆: پیارے عثمان! خوش آمدید، بھیا تمہاری کہانی ناقابلِ اشاعت ہے۔ تمہیں دیگر نئے لکھاریوں کی طرح بے حد مطالعے کی ضرورت ہے۔ ہمیں امید ہے کہ تم ہماری بات کو مثبت انداز میں لو گے اور جلد

ہمیں تمہاری صورت میں ایک نیا لکھاری میسر آ جائے گا۔ اور ہاں اجنبیت کیسی! تم اب ہمارے قلم قبیلے کی فیملی کا حصہ ہو جم جم آؤ۔

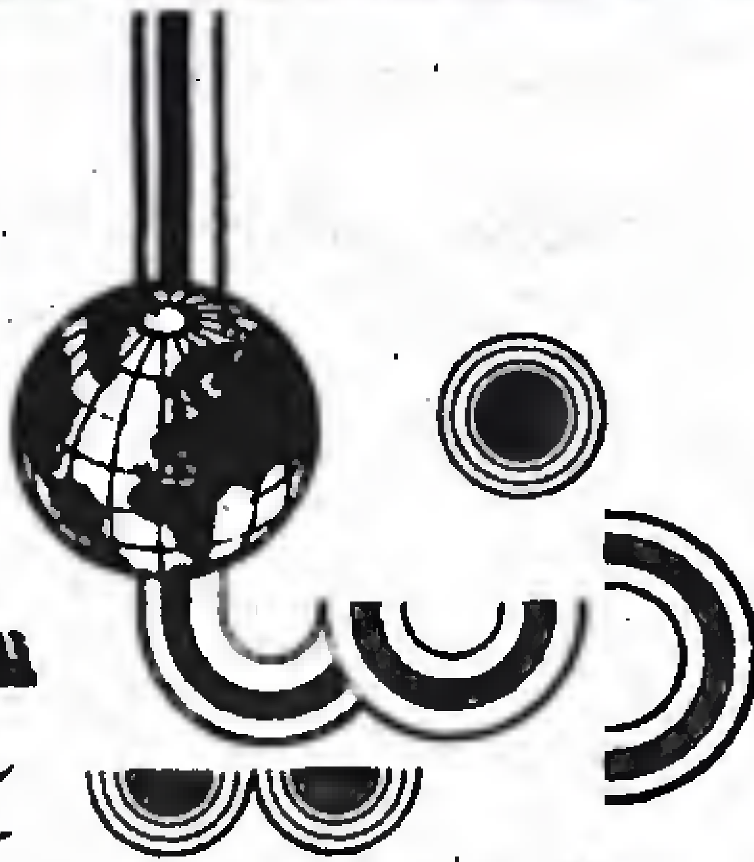
✉ ہماری بہت پیاری بہن فصیحہ آصف خان، ملتان سے پہلی بار ہمارے احوال میں حاضری دے رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ آپ سے فون پر بات ہوئی، سوئی کہانی حاضر خدمت ہے۔ امید ہے کہ پسند آئے گی اور جگہ پائے گی۔ باقی سب خیریت ہے۔

☆: پیاری فصیحہ جی! یہ کیا...... اپنی بات کی اور یہ جا وہ جا! امید ہے اگلی بار آپ کی آمد بھرپور تبصرے کے ساتھ ہوگی۔

✉: ایم افضل آزاد، ساہیوال سے عرض کرتے ہیں۔ اسلام علیکم کاشی بھیا کیسے ہوا اللہ آپ کو صحت یابی دے آمین آپ کے ایکسیڈنٹ کا سن کر بہت دکھ ہوا اب آپ کی صحت کیسی ہے۔ نومبر کا شمارہ ساہیوال سے ملا۔ جس کی دوشیزہ بہت خوبصورت تھی۔ منزہ آپی کا معجزہ پسند آیا۔ خوبصورت انداز میں کاشی بھیا نے احوال کا آغاز کیا۔ احوال میں اپنی انٹری دیکھی مہربانی آپ کی بھیا۔ اشفاق شاہین آپ نے ویلکم کیا آپ کی مہربانی آپ کو بھی آزاد خوش آمدید کہتا ہے۔ زہر عشق پڑھی زبردست گڈ بہت اچھی لگی۔ دھندا، دوسری بیوی، بیٹا، مفاد، احتیاط ضروری ہے، انسانوں کے جنگل میں، واپسی، ندامت، دیر ہے اندھیر نہیں، قصور کس کا، ات خدا دا ویر، بھرم، ہانڈی وال، قرض، کرب، دل آباد بہت گڈ تھی۔ بہت اچھا لکھا۔ سب نے اور ایم اے راحت کی اسٹوری ہم شکل سنسنی خیز بنتی جا رہی ہے۔

☆: پیارے بھائی افضل! خدا تعالیٰ آپ جیسے محبت کرنے والے جسے عطا کرے اُسے بھلا کیا ہو سکتا ہے۔

✉: ہماری آپا مسز نوید ہاشمی نارتھ ناظم آباد کراچی سے شریک احوال ہیں لکھتی ہیں۔ کاشی میرے بھائی کے لیے دعا ہے اللہ جلد کاشی کو صحت عطا فرمائے احوال میں خطوط کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے یہ کاشی کی محنت محبت کا نتیجہ ہے۔ احوال کی رونق آپ کے جوابات جو سب کو اتنا پیار، مان دیتے ہیں اس وجہ سے قائم ہے۔ اکتوبر میں پلیٹ فارم میں ممتاز احمد کی کہانی قلی سے افسر تک بہت شاندار تھی تین مرد تین کہانیاں میں ہوئی پرندے پہلے نمبر پر، ڈھونڈوں گے ہمیں پھر سماج سیوا تھی۔ جیت اچھی کہانی تھی مگر کچھ تشنگی باقی رہی۔ حکایت میں ایمانداری کا ٹکٹ، استاد، وڈیری، نیکی کرتا جا، صدقہ پسند آئی، پگلی، عزت دار بہت شاندار کہانی تھی۔ ارم ناز لاجواب، گڈی آپا کو خراج تحسین بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ سچ بیانی میں پاسٹ چھائی بہت شاندار تحریر تھی۔ کینسر بھی اچھی تھی، روگ عمر بھر کا ہے، نرالے یہ بھید ہیں۔ اس ڈائجسٹ کی جان تھی۔ بہت شاندار تحریر تھی۔ ابا کی بختاور، دیکھتی آنکھیں، مجرم کون بہت بہتر رہیں۔ نومبر میں معجزے والی منزہ سہام کی دعا ہر مسلمان کی دعا ہے۔ کچھ پرانے ہمارے بھائی بہن احوال سے غائب ہیں، واپس آ جاؤ اس احوال کا لطف دوبالا کر دو۔ کہانی پڑھنے کا اپنا مزہ ہے۔ احوال کا اپنا مزا، آپ سب کی محبت کی وجہ سے احوال میں جان ہے۔ ممتاز احمد سعدیہ عابد، منعم اصغر، سدرہ انور علی وعلیکم اسلام نزہت ناز اچھی کہانی خود اپنی پہچان ہوتی ہے۔ مور شاہد حسین آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ اپنا بہت خیال رکھیں میرے بھائی ارم خان آپ کی تعریف ہمارا حوصلہ ہے۔ لائف بوائے اسماء اعوان بہت خوبصورتی سے پیش کر رہی ہیں ہر کہانی لاجواب ہوتی ہے۔ نعمان اسحٰق، سید افتخار بھٹی، رضیہ فصیح احمد، ارم خان، بھرم، منعم اصغر کی تحریر تھی۔ کانچ کی گڑیا، مصحف، مجید احمد جائی، کی بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ شعلہ



دنیا میں کس جگہ **سچی کہانیاں** کے چرچے نہیں

آپ سچی کہانیاں کے خریدار بن کر ملک کو

زرِ مبادلہ بھیجیے

اندرون ملک =/890 روپے

ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

زرسالانہ

کویت	55 امریکی ڈالرز	ایران	55 امریکی ڈالرز
سعودی عرب	55 امریکی ڈالرز	سری لنکا	55 امریکی ڈالرز
یو اے ای	55 امریکی ڈالرز	جاپان	55 امریکی ڈالرز
مصر	55 امریکی ڈالرز	لیبیا	55 امریکی ڈالرز
یونان	55 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	55 امریکی ڈالرز
فرانس	55 امریکی ڈالرز	جرمنی	55 امریکی ڈالرز
برطانیہ	55 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	55 امریکی ڈالرز
ناروے	55 امریکی ڈالرز	پولینڈ	55 امریکی ڈالرز
امریکہ	65 امریکی ڈالرز	کینیڈا	65 امریکی ڈالرز
افریقہ	65 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	65 امریکی ڈالرز

آج ہی رابطہ کیجیے II 88-C فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121 - 35893122

ساماں میں اعجاز احمد فکرال کی کمپنی اور ملک عاشق حسین سجاد کی کہانی واقعی شعلہ تھی۔ کنول عمران خان، عمارہ خان، ام عادل، انیل حسین پٹھان، جویریہ ملک' حاسم وقاص، حنا بشریٰ سب کی تحریر پیاری اور اچھی تھی۔ شاذلی سعید مغل، ابوہریرہ بلوچ، نازیہ بتول رضا تینوں کی تحریر پسند آئی کارجہاں میں جاوید راہی چھاگئے۔ زہر عشق بہت شاندار جارہا ہے۔ ہم شکل اچھی جارہی ہے۔ خط بے حد لمبا ہوگیا ہے ہمارے علاوہ اور لوگ بھی احوال میں شامل ہیں میں اپنے بھائی کو کسی امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

☆: اچھی آپا! تھوڑا سا مزید مختصر! اپنا بہت خیال رکھیں۔ احوال میں آپ کی آمد کا ہمیں بھی انتظار رہتا ہے۔

✉: بورے والا سے سندس صبا کی پہلی پہلی آمد ہے، لکھتی ہیں۔ ادب ایک سمندر ہے جس سے سیرابی کبھی نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کنارا بحر میں اپنی استطاعت کے مطابق ہر ایک غوطہ زن ہوکر موتیوں کو چن رہا ہے۔ اس دور میں کوئی آگے ہے تو کوئی پیچھے۔ جرائد کا مطالعہ میرا جنون ہے۔ جس کی تکمیل میں ہر ایک رسالے کو پڑھا اور پرکھا۔ اپنے تئیں ہر کوئی بہترین کی کوشش کرتا ہے۔ تاکہ قارئین تک ایک معیاری رسالہ پہنچا سکے۔ زیرِ نظر آپ کا جریدہ ان سب سے ہٹ کر ہے۔ کہانیوں کا انتخاب خطوط کی محفل، انعامی سلسلہ اور اسلوب قابل داد ہے۔ ہر ایک کو آگے بڑھنے کا وسیع موقع مل رہا ہے۔ جس سے کئی ایک نے خوب دامن بھرا ہے۔ تو میں نے بھی سوچا کہ اپنی حاضری لگوالوں۔ چونکہ میں پہلی بار احوال میں حاضر ہوں اس لیے مجھے تمام احوالیوں کو سلام کہنا ہے۔ خدا آپ سب کو سلامت رکھے۔ کاشی بھائی میرا خط ضرور شامل کیجیے گا۔

☆: پیاری بہن سندس! یقین کرو ہمارا دل خوش ہوجاتا ہے۔ جب بھی کوئی ہمیں اپنی محبت سے نوازتا ہے۔ خوش آمدید، امید ہے اب ہمارا اور آپ کا ساتھ پائیدار رہے گا۔

✉: احوال میں یہ خط آیا ہے مونگر، کوٹلی لوہاراں، سیالکوٹ سے ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب کا لکھتے ہیں میں نے آپ کو جو کہانی پہلی دفعہ بھیجی تھی وہ ناقابلِ اشاعت تھی۔ اس لیے کافی دفعہ SMS کرنے کے بعد آپ نے فرمایا کہ وہ ردی میں چلی گئی ہے۔ اس کے بعد ایک اور کہانی بھیج چکا ہوں۔ جس کے متعلق آپ نے کوئی جواب نہیں دیا کہ وہ کس رسالے میں شائع ہوئی۔ (ارے......ارے) آپ قابل اشاعت کہانی کا معاوضہ وغیرہ کیا اور کیسے دیتے ہیں۔ منی آرڈر بھیجتے ہیں یا کوئی اور طریقہ ہے اس دفعہ شائع کروانے کے لیے دو عدد غزلیں بھیج رہا ہوں جو میں نے ایک شائع شدہ رسالے سے لی ہیں۔ یہ میرے نام کے ساتھ شائع فرمادیں۔ (چوری اور سینہ زوری) میں جوابی لفافہ بھیج رہا ہوں۔ (مطلب؟)

☆: پیارے عبدالقدیر! کہانی شائع نہ ہونے کا بتا کر ہم آپ کو بار بار دکھی نہیں کرنا چاہتے۔ خدا آپ کو صحت دے آمین۔

✉: اڈا اصالحوال، اوکاڑہ سے ہمارے ساتھی یاسر وکی، کئی ماہ کی غیر حاضری کے بعد احوال کا حصہ بن رہے ہیں۔ عرض کرتے ہیں احوال میں تحسین جونیجو کا لیٹر پڑھنے کو ملا قدرے بہتر تھا۔ فرزانہ نگہت آپ کی اسٹوری کا ہم بے صبری سے انتظار کریں گے۔ ان کا مختصر لیٹر بھی اچھا تھا۔ کراچی سے ہمارے بھائی اشفاق شاہین کا خط پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ مقصود بلوچ صاحب آپ کا لیٹر بھی احوال کی شان تھا۔ کاشی بھائی کی بات مانو اور بادام ضرور کھایا کرو۔ سلمان شبیر کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ ریحانہ نسیم جی کا تبصرہ بھی کمال تھا۔ سر کاشی صاحب آپ سے میرا بھی یہی سوال ہے کہ آپ اتنا کام کیسے کرلیتے ہو۔

احوال میں شامل ہونے والے نئے احوالی


ایم افضل آزاد، ساہیوال


فرمان علی، جامشورو


حمید علی، نیو سعید آباد، ہالا


محمد قاسم خان بلوچ، ٹوبہ ٹیک سنگھ


سیدہ حجاب فاطمہ، کراچی


ملک محمد اکرم آہیر، میانوالی

پلیز بتاؤ نا خیر اب آتے ہیں ہمارے نیو رائٹر بھائی افضل آزاد صاحب کی طرف تو بھائی جان ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کو حاضر دیکھ کر اور اب اسٹوریوں کی طرف آتے ہیں تو ادھوری کہانی گریٹ تھی۔ ارم ناز جی کیا کمال کی اسٹوری تھی آپ کی ویسے واقعی ہمارے معاشرے میں کوئی بھی لڑکی اپنی مرضی سے کوئی غلط کام نہیں کرنا چاہتی بلکہ یہ معاشرہ اسے مجبور کرتا ہے۔ ایسے کاموں کے لیے۔ اچھا احوالیو! اب اجازت۔

☆ :پیارے یاسر! تمہاری غیر حاضری اچھی نہیں لگتی پلیز بیٹا اس احوال سے زیادہ دن دور نہ رہا کرو۔

✉ :ہمارے پیارے مور شاہد حسین قمر شہداد کوٹ سے عرض گزار ہیں۔ نومبر کا تازہ شمارہ اکتوبر کے آخری دن موصول ہوا۔ سرورق دیدہ زیب تھا۔ ہمیشہ کی طرح اگلے اشتہارات نظر انداز کرتے ہوئے آنٹی منزہ سہام کا اداریہ معجزہ پڑھا۔ احوال میں سب سے پہلی آمد حنا بشریٰ کی تھی۔ ممتاز احمد بھیا آپ نے یاد کیا بے حد ممنون ہوں۔ سلامت رہیں۔ احمد ندیم ضیا، شین بابا، حسن عباس نیازی، رانا مجاہد جمیل، ماریہ یاسر، سونیا خان، کنزہ ملک، جمیل احمد بھیا بھلی کرے آیا۔ آپ سب سے مل کر دلی خوشی ہوئی۔ مسز نگہت غفار، نزہت ناز، اشفاق شاہین، سلمان شبیر، ارم خان، منزل خان، عظمیٰ شکور، مجید احمد جائی، آپ سب کے تبصرے شاندار تھے۔ گڑیا رانی سدرہ انور علی وعلیکم السلام خوش رہیں بہنا۔ لائف بوائے متاثر کن تھی۔ دل آباد، ہانڈی وال، می می، وہ مانوس اجنبی، بھرم، اعلیٰ اور عمدہ تحریریں تھیں۔ ایم اے راحت ہم شکل عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ کمینی، دھندا، کرب، انداز بیاں پسند آیا۔ شوبز لس صنم بلوچ سے ملاقات بہت اچھی لگی۔ ہائیڈ پارک، تیر نیم کش، پسندیدہ سلسلے ہیں۔ پُراسرار نمبر کا بے چینی سے انتظار ہے۔ آخر میں تمام چاہنے والوں کے لیے ڈھیروں نیک خواہشات۔

☆ :محترم مور! کہاں کی سیروں کو نکلے ہوئے ہو۔ اپنے آشیانے میں واپس آجاؤ اور ہر ماہ احوال میں حاضری لگواؤ۔ سمجھ گئے نا......

✉ :ثناء ابڑو جیکب آباد سے پہلی بار احوال میں شریک ہیں لکھتی ہیں ایک عمدہ رسالے میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں ماہانہ سچی کہانیاں ان خوبیوں سے مزین ہے۔ یہ ایک زبردست معیاری پرچہ ہے۔ احوال کی محفل محبتوں سے بھی اپنے عروج پر تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی محفل میں شرکت کے لیے لکھنے پر مجبور ہوئی ہوں۔ میں شکر گزار ہوں مور شاہد حسین کی۔ جناب نے سچی کہانیاں سے تعارف کروایا اور احوال میں لکھنے پر مجبور کر دیا۔

☆: پیاری ثناء! خوش آمدید! مور کو تو ہم نے احوال میں پابند کر دیا ہے۔ بیٹا آپ بھی اب احوال سے دور نہ ہونا۔

✉: عثمان بلوچ، بہاول پور سے لکھتے ہیں۔ خوبصورت محرر شاہد رفیق سہو، تبصرہ نگار صائمہ بشیر میرے بہت پیارے دوست ایم یعقوب، جاندار تبصرہ نگار آپا مسز نوید ہاشمی، دلکش رائٹر سدرہ انور علی، ابھرتے ادیب ندیم عباس میوانی، صاحب قلم انیس الرحمٰن، ہر دلعزیز شخصیت ابوہریرہ بلوچ 'ارے واہ......آپ سب نے ہمیں اپنی تحریروں میں یاد رکھا۔ ہمیں بھی آپ سے یہی امید تھی۔ کاشی بھیا کا تو کام ہی محبتیں بانٹنا ہے۔ آپ کے ایکسیڈنٹ کا سن کر افسوس ہوا اللہ آپ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ سلامت رہیں۔ ندیم عباس میوانی اور ابوہریرہ بلوچ آپ کی تحریریں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ بہت اچھا لکھا۔ چلتے جائیں بڑھتے جائیں۔ منزل ضرور قدم چومے گی۔ مجید احمد جائی، جاوید راہی، حنا بشریٰ اور محترم کاشی چوہان نے بھی بہت خوب لکھا، دل آباد، ہانڈی وال، بی بی ی، وہ مانوس اجنبی، قدرت، سب رائٹرز نے اچھی کوششیں کی، کاشی بھیا خط کو طول دینے کا ارادہ تو نہیں تھا لیکن مشیت الٰہی میں ایسا تھا اس لیے تھوڑا لمبا ہو گیا، خوش رہیں آباد رہیں زندگی نے وفا کی تو اگلے ماہ حاضر ہوں گے۔

☆: پیارے عثمان! کچھ کام ہمیں بھی کر لینے دیا کرو یار! تم نے خط کو طول دیا ہم نے تمہاری مشکل آسان کر دی۔ حساب برابر۔ خوش رہو۔

ساتھیو! اس ماہ تک کی ہماری آپ کی ملاقات اختتام کو پہنچی، صرف ایک گزارش ہے کہ پرچہ پڑھتے ہی اپنا تبصرہ روانہ کر دیا کریں۔ آپ کے ایک دو دن کی دیری ہمارے لیے بڑے مسئلے پیدا کر دیتی ہے۔

31 دسمبر 2015ء

نہ دھوپ، نہ چھاؤں، نہ ہوا، نہ حبس
یہ کیسا موسم رہا، گئے برس میں
شاید یہ موسم تنہائیوں کا تھا
نہ نہ......اُداسیوں کا ہوگا
مگر......
اداسیاں تو ہمیشہ ہی نئے رنگ میں ڈھل کر نارنجی ہوا کرتی ہیں
پھر یہ کیسا موسم تھا
اُداسیوں کی حنا نے جس میں
رنگ نئے کھلائے تھے، سرخ سرخ
گیلے، چکیلے، شوخ شوخ،
گلی کے ہر نکڑ پر، وہ آنکھیں ہر پل زندہ تھیں
جو اُداسیوں کو ہر شب
خوش آمدید کہہ رہی تھیں
کیونکہ انہیں یہ خبر تھی
اُداسیاں ہی تو ہمیشہ نئے رنگ کی ہوتی ہیں
نہ دھوپ، نہ چھاؤں، نہ ہوا، نہ حبس
بس اداسیاں، تنہائیاں
اور اس دسمبر کی آخری شب
ٹھنڈے کمرے میں دھری ہیں
انٹرنیشنل افیئرز کی گرم کتابیں
ٹھنڈی کوفی سے جذبات کی گرم گرم دھونکنی سانسیں
اور میرے ہاتھ میں سلگتا، دھیرے دھیرے راکھ ہوتا
تجدید بے وفائی کا سگریٹ

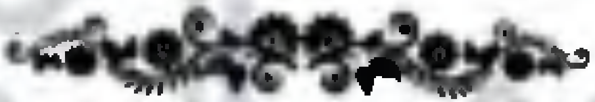
آپ کا اپنا
کاشی چوہان

میری کامیابی، لائف بوائے کے ساتھ

"لائف بوائے شیمپو... سب کا یقین کامل بنائے"

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

ہر لڑکی کا ارمان ہوتا ہے کہ اپنے سسرال جانے سے پہلے اپنے بھیا کی شادی میں خوب دھوم دھڑکے سے شرکت کرے اور شادی کے بعد اپنی بھابی کے خوب نخرے اٹھائے بھی جائیں اور اپنے نخرے اٹھوائے بھی جائیں۔

ہائے ہائے! سارے ارمانوں پہ اوس اُس وقت پڑ گئی جب بھیاجی نے شادی کے لیے فرمائش رکھ دی کہ دلہن تو ہم کسی کو بھی بنالیں گے مگر...... اُس کے بال ویسے ہونے چاہئیں جیسے لائف بوائے شیمپو میں ماڈل کے لہراتے ہیں۔

لو بھلا اب کس طرح لائف بوائے شیمپو والی بھابی ڈھونڈی جائے۔ جی ڈولنے لگا کہ جانے اب کیا ہو! ایک تو اتنی مشکل سے بھیا جی نے ہاں میں گردن ہلائی تھی۔ ورنہ تو وہ "ابھی کیا پڑی ہے" کا ورد جاپتے پھرتے تھے۔

"اللہ میاں جی! جلدی سے ایسی لڑکی ہماری بھابی بنادے جس کے بال لائف بوائے والی ماڈل جیسے ہوں۔"

اب لڑکی دیکھنے کے لیے ہم نے کمر کس لی اور کوئی ایسی جگہ نہ چھوڑی جہاں سے بھی کوئی امید بر آنے کی توقع نہ ہو۔

☆......☆......☆

اُس دن اچانک ہی بڑی پھوپو کی آمد ہوئی تھی۔

"علیشا! چندا ایک بہت خوبصورت لڑکی دیکھی کل میں نے۔" بڑی پھوپو نے میرے شوق کو ہوا دی۔

"ارے پھوپو! لڑکی دیکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہمارا 'لڑکا' اپنی لائف بوائے شیمپو گرل کے علاوہ کسی سے شادی پر راضی نہیں۔" میں نے منہ بسورتے ہوئے کہا تھا۔

"ارے گڑیا! ایسا کرتے ہیں آج بی جان (امی کو وہ شروع سے بھابی جان کے بجائے، بی جان...... کہا کرتی تھیں) کے ساتھ چل کر نوین کے گھر کا چکر تو لگاتے ہیں۔"

"آف کورس پھوپو جانی! مگر آپ کو اپنے لاڈلے بھتیجے کی......" میرا جملہ درمیان سے اچکتے ہوئے پھوپو جانی بول پڑیں۔

"ارے سب جانتی ہوں۔ بچپن اِن ہی ہاتھوں میں گزرا ہے تم دونوں کا۔ اچھے سے جانتی ہوں تم دونوں کو۔" پھوپو نے پیار سے میرے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔

"لو یو پھوپو! دعا کریں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو اور ہمیں ہمارے بھیا کی مراد مل جائے۔"

"ارے بھیا رے! تم دونوں مل کر کون سے ہوائی قلعے بنانے لگی ہو۔"

"ارے میری پیاری بی جان! ہم ہوائی قلعے میں دلہن اڑا رہے تھے۔ آپ کی قسم آج میں ایک ہیرا آپ کے محل میں جڑنے کو دکھانے لے جارہی ہوں۔"

"اے بی بی! تم اپنے اِن لاڈلوں سے واقف ہونا۔ جنے کیسے کیسے شوق پال رکھے ہیں۔ لونڈیا ہے تو اس کو کسی کے کپڑے جوتے پسند نہ آئیں۔ بال الگ دوسروں کے نوچ نوچ کر گھونسلہ بنادے ہے۔ اللہ معاف کرے شدو کی لونڈیا کی بارات میں میرے بالوں کا وہ حشر کیا کہ لائف بوائے شیمپو کے پانچ ساشے جنے کہاں بالوں میں جاکر کھوئے تو کہیں جاکر بال سلجھے۔"

"ارے میری بھولی میا! بیک کومبنگ میں تو ایسا ہو ہی جاتا ہے۔" علیشا ماں کے گلے کا ہار بنتی بولی تھی۔

"بی جان! ایسی بہو دکھانے جارہی ہوں جو آپ کے بال بھی ایسے بنائے کہ دنیا دیکھے۔"

"ارے کیا بیوٹی پالر والی کی لونڈیا کے ہاں رشتہ دیکھ لیا ہے تُو نے بھتو۔"

"نہیں بھئی! بہت اچھا خاندان ہے۔"

"ارے اوپر اوپر سے سب ہی اچھے دکھے ہیں۔ بعد میں اصل دکھے ہے بھیا۔"

"بی جان! آج ہم ان کے گھر جاکر سب کچھ ٹھیک سے، اپنی آنکھوں سے دیکھ آئیں گے۔ پھر کوئی فیصلہ کرلیں گے نا۔"

"چلو بھیا ٹھیک ہے۔ چلے چلیں گے تمہارے سنگ۔"

☆......☆......☆

نوین کے گھر جاکر سب کو اطمینان ہوگیا کہ واقعی بڑی پھوپو سنگیتا نے بالکل ٹھیک گھرانہ پسند کیا تھا۔ جلد ہی دونوں طرف سے چھان بین کا مرحلہ نپٹا اور جھٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوگیا اور نوین، علیش احمد کی دلہن بن کر آگئی۔ علیشا کو نوین کی شکل میں بھابی کے بجائے بہن مل گئی تھی۔ دونوں کی خوب انڈر اسٹینڈنگ تھی۔

☆......☆......☆

"مجھے بہت اچھا لگتا ہے بھابی! جب آپ سوٹ کے ساتھ میچنگ استعمال کرتی ہیں؟" علیشا نے لان میں واک کرتے ہوئے نوین کے سجے سنوریے نکھرے روپ کو دیکھا۔

ان کے بالوں سے اٹھتی لائف بوائے شیمپو کی خوشبو نے اُن کو مزید معطر کیا ہوا تھا اور شیمپو کیے ہوئے لہراتے، چمکدار، لانبے بال نوین بھابی کی شخصیت کو مزید چار چاند لگا رہے تھے۔ وہ تو بس دیکھتی ہی رہ گئی تھی اپنی بھابی کو۔

"اچھا۔" وہ ہنس دی۔

"یہ تو عام سی چیزیں ہیں۔ دراصل نک سک سے تیار رہنے کا مجھے ہمیشہ سے شوق ہے۔" نوین نے اپنے ہاتھوں میں سبز چوڑیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور چوڑیاں تو مجھے ہمیشہ سے ہی بہت خوب صورت لگتی ہیں۔ رنگ برنگی شائن کرتی، چھن چھن کرتی، اپنے ہونے کا احساس دلاتی۔" کلائی سامنے کر کے چوڑیوں کو بجایا۔

"علیش بھائی کو بھی چوڑیاں بہت پسند ہیں۔"

"اچھا!" ایک دبیز حیرت اس کے وجود میں اترنے لگی۔

"میرے لیے تو کہیں بھی جائیں، چوڑیاں ہی لاتے ہیں حالانکہ......" علیشا اس کی جانب جھک کر مسکرائی۔

"مجھے چوڑیاں اتنی زیادہ پسند نہیں، مجھے کڑے اور فینسی بریسلیٹ زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ علیش بھائی تو آپ کے ہار سنگھار کے دیوانے ہوں گے۔" شرارت سے اُس نے بھابی کی چوڑیوں کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

بھیگا سا احساس اس کے دل میں اترنے لگا۔

"پلیز، رات کو یہ سب شور شرابہ اتار کر سویا کرو، میں بہت ڈسٹرب ہوتا ہوں۔" ابتدائی دنوں کی ایک شب علیش احمد نے بڑے روڈ سے انداز میں کہہ کر اُس کے سلکی بالوں میں منہ چھپایا تھا اور اب علیشا کہہ رہی تھی کہ اسے چوڑیاں پسند ہیں۔

"آؤ ذرا اندر چلیں، لونگ پلے شروع ہونے والا ہے۔" نوین جانتی تھی کہ ابھی علیشا کا 'بھابی نامہ' شروع ہو جائے گا۔ سو اندر کی جانب قدم بڑھائے۔

اندر ساس سسر کی نوک جھونک اپنے عروج پر تھی۔ وہی قصہ تھا، علیشا کے لیے جو رشتہ آیا ہوا تھا، اسے قبول کرلیا جائے یا ابھی انتظار کیا جائے۔

علیشا مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب چلی گئی۔

"تم کیا کہتی ہو بیٹا؟" نوین کے سسر کامل احمد اس کی جانب متوجہ ہوئے۔ وہ ایک دم سے گڑبڑا گئی۔ اس سے

بڑے موجود تھے اور یہ رشتہ بھی بڑی پھوپو کے جاننے والوں میں سے آیا تھا۔ انکار کی گنجائش نہیں نکلتی تھی اور اس سے مشورہ...... اُس نے ایک نگاہ میں دونوں کو دیکھا۔ دونوں ہی اس کا جواب سننے کے منتظر تھے۔

''میری مرضی......؟''

''ہاں' تم بھی اس گھر کی فرد ہو۔'' کامل احمد نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

''آپ لوگ زیادہ اچھا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ دیکھنے میں تو لڑکا اچھا لگ رہا ہے' لوگ بھی اچھے ہیں' باقی آپ دیکھ لیں۔''

''علیش احمد آ جائے تو اسے بھی دکھا دیتے ہیں۔''

علیش احمد' اس نے نگاہ چرائی۔ 'تمہارا تو نہ آنا ہی بہتر ہے۔ بے حس انسان' گہری سانس لے کر وہ اٹھ گئی۔

''آپ لوگ چائے پئیں گے؟''

''نیکی اور پوچھ پوچھ؟'' کامل احمد مسکرائے۔

''مجھے مت دینا بھیا' نیند نہیں آئے گی پھر ساری رات۔ جنے کیسے رات کو چائے پی کر سو جاتے ہیں سب '' رفعت بیگم لیٹ گئیں۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ نیند کا چائے سے کیا تعلق ہے۔'' کامل احمد انہیں چھیڑ رہے تھے۔

''ارے میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتی ہوں کہ ہے تعلق اور وہی ہے جو کھانسی کا سگریٹ سے ہے۔'' انہوں نے جوابی کارروائی کی۔

نوین ہنستے ہوئے باہر نکل گئی۔

ان لوگوں کی یہی نوک جھونک اسے اچھی لگتی تھی۔ ان کے گھر میں ابو تو کمانے کے محاذ پر سرگرم رہے اور امی' افہام و تفہیم کی فضا استوار کیے رہیں اسی لیے جھگڑنا اسے بھی نہیں آتا تھا بلکہ اسے تو کیا' اس کی دونوں بہنوں کو بھی نہیں آتا تھا۔ بھائی کوئی تھا ہی نہیں۔ بہت سلجھی ہوئی طبیعت تھی ان سب کی۔

کاش اس کا بھی کوئی بھائی ہوتا۔ کم سے کم چھان بین ہی کر لیتا۔ علیش احمد سے مل کر ان کی نیچر کا ہی اندازہ لگا لیتا اور اب...... اپنے بیڈ پر نیم دراز ہو کر اُس نے کشن چہرے پر رکھ لیا۔

زندگی کیسے گزرے گی۔ یوں تنہا' اکیلے' اداس چہرے پر ملمع چڑھا کر' دن میں ہنسنا' راتوں کو رونا۔

آنسو آنکھوں سے نکل کر تکیے میں جذب ہونے لگے۔

اس کی قسمت اتنی خراب کیوں ہے۔ اگر علیش احمد اس کا نصیب نہیں تھے تو ان کا ملن کیوں ہوا' کیوں یہ رشتہ طے ہوا' میری جیسی زندہ دل لڑکی تو مر جائے گی۔

یک لخت ہی بھرا ہوا دل پھٹ گیا۔ دوسرے لمحے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

الٰہی! کیوں وہ لوگ مل جاتے ہیں جن سے قسمت کے ستارے نہیں ملتے۔

☆......☆

''بھائی' رمضان آنے والے ہیں؟'' کوئی اسائنمنٹ بناتے ہوئے علیشا نے اس کی جانب دیکھا۔

''ہوں۔'' وہ بڑے غور سے ٹاک شو دیکھ رہی تھی۔

''پھر عید' بقر عید۔ کتنی جلدی سال گزر رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ وقت کو پہیے لگ گئے ہیں۔''

''ہاں۔'' اس کی جانب سر گھما کر دیکھا۔ ''یہ تو ہے۔''

''آپ کی شادی کو ایک سال ہو گیا ہے۔''

''ہیں؟'' وہ چونک گئی۔ ''ایک سال! اتنی جلدی؟ ابھی تو...... ابھی تو......'' اس کا دل سناٹوں کی راہ گزر پر ٹھہر گیا۔

''آپ لوگوں نے سال گرہ نہیں منائی؟'' ایک اور سوال اٹھا۔

''سال گرہ!'' وہ تو پہلے ہی دھچکے سے نہیں سنبھلی تھی کہ یہ دوسرا جھٹکا۔

''آپ اتنی حیران کیوں ہو رہی ہیں؟'' کام کرتی علیشا کے ہاتھ رک گئے۔

''میرے بتانے پر یا بھائی کے بھولنے پر یا گفٹ موصول نہ ہونے پر؟'' انداز شرارتی تھا۔

اس نے چپکے سے نگاہ چرا لی۔ کیا بتاتی اسے کہ دل کیوں ٹھٹکا تھا۔ سانسیں کیوں تھم رہی تھیں۔

''اتنی جلدی وقت گزر جاتا ہے۔'' اس کے لہجے میں یاس تھا۔

''آپ کو یاد تھا نا؟'' علیشا اس کی شکل دیکھنے لگی۔

''مگر بھائی کو یاد نہیں رہتا' انہیں سال گرہیں یا اہم دن یاد دلانے پڑتے ہیں اور زبردستی کے گفٹ لینے پڑتے ہیں

اور آپ کو ان کے ساتھ زبردستی ہی کرنا ہے' یاد دلانا ہے۔" جنرل پر فیتہ لگاتے ہوئے علیشا بڑے موڈ میں باتیں کر رہی تھی۔

زبردستی کی یاد؟ اس کی انا' خودداری نے سر بلند کیا۔ محبت' اور وہ بھی مانگنے کی' نہیں' بالکل نہیں...... دل نے سرزنش کی۔

"اور میرے خیال میں شوہروں کو اس بات کا احساس دلاتے رہنا چاہیے۔" علیشا اپنی دھن میں مگن کہہ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ علیشا کو احساس ہو اور وہ کچھ سوچے اور سوال کرنا شروع کر دے اور آگہی کا کوئی در اس پر وا ہو جائے اس نے ٹوک دیا۔

"بس بھئی' بس' جو حکم مس علیشا احمد کا!" نوین نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ علیشا ہنس دی۔ "تم بیوی ہو اور نہ شوہر کے رتبے پر فائز ہو اس لیے پلیز' آگے کچھ مت کہنا۔" اسے انگلی اٹھا کر وارن کیا۔ علیشا خفت زدہ ہو گئی۔

"میں تو اپنا تجزیہ......"

"شکریہ آپ کا!" شرارت سے نوین نے مزید جملہ روک دیا۔

"ویسے کوئی تگڑا سا تحفہ لیجیے گا پھر' عید بھی آ رہی ہے خالی جانے مت دیجیے گا۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔ انہیں یاد رکھنا چاہیے تھا اتنا اہم دن۔"

تبھی بڑی پھوپو بھی ادھر ہی آ گئیں۔ ان کا چہرہ کسی اندرونی خوشی سے دمک رہا تھا۔

"خیریت پھوپو' پھوپا جانی نے گلاب جامن دے دیے ہیں کیا؟" علیشا نے چہک کر اسے دیکھا۔

"ارے میری بنو' گلاب جامن تو کیا' انہوں نے مجھے پورا ڈبہ ہی پکڑا دیا ہے۔" پھوپو نے پہلے اس کا مطلوبہ لائف بوائے شیمپو کا ایکسٹرا لارج پیک اُسے پکڑایا اور پھر اُسے گلے لگا کر پیار کیا۔ اک حسین تصور سے علیشا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ چہرہ گلابی ہو گیا۔ نوین نے نگاہیں چرا لیں۔

یہ ہم مشرقی لڑکیاں......!

اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ کیسے مشرقیت کے نام پر لٹ جاتی ہیں۔

اسے اپنا وقت یاد آنے لگا۔ جب علیش احمد کا رشتہ اس کے لیے آیا تھا تو دل میں کتنی خوشی ہوئی تھی۔ اس کی ساس نے اسے پہلے ہی نظر میں پسند کر لیا تھا۔ اُس کی دونوں بھابیاں اُس سے اسی طرح سے چھیڑ خانی کر رہی تھیں۔ آتے جاتے ذو معنی گفتگو کرتیں' شرارتی انداز' معنی خیز مسکراہٹیں' اس کے دل میں کتنی ہی دیر تک گدگدی ہوتی رہتی۔ پلکیں نادیدہ خوشی سے لرز لرز جاتی تھیں۔ عارض گرم ہو کر دہکنے لگتے۔ ایسے میں چھوٹی بھابی اگر چٹکی کاٹ لیتیں تو رنگت دوآتشہ ہو جاتی تھی۔ سنہرے روپہلے سپنے آنکھوں میں جگمگاتے اور دل میں گنگناتے تھے۔

نوین کے دل میں یادوں کی پکڑ دھکڑ ہونے لگی۔ آنکھیں سپنوں کی تعبیر پر بھیگ گئیں مگر وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے اٹھی اور باہر آ گئی۔ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے ٹیرس پر آ گئی۔ موسم بھی اس کے من جیسا ہو رہا تھا۔ بھیگا بھیگا اور اداس' کسی بھی پل برسنے کو تیار۔ بادلوں نے آسمان کو اسی طرح سے گھیر لیا تھا جیسے اداسیاں اس کے دل کے اردگرد اپنے پر پھیلائے رقص کرتی تھیں۔ منچلے بادلوں کی طرح گول گول گھومتی تھیں اور ادھم مچاتی تھیں۔ آنسو نم پلکوں کی دہلیز سے نکل کر رخساروں پر پھیل گئے۔

"ہم مشرقی لڑکیاں کیسے مشرقیت کے نام پر مٹ جاتی ہیں۔ کیسی سیاہ ساعتیں ہوتی ہیں' کیسے خبیث لمحے ہوتے ہیں' کیسا زخمی' فگار وقت ہوتا ہے' جو کسی نوعروس کو وصل کی پہلی شب ہی ایک عظیم دکھ سے ہمکنار کر دے۔ اس کی ساعتوں میں زہر بن کر خوب صورت آواز دھیما لہجہ اور گمبھیر لہجے کے زیر و بم اترے۔

"تم اس گھر کی بہو ہو۔ اس گھر کی ہر چیز تمہاری ہے۔ سوائے میرے اور میرے دل کے' اِس کے دل میں تو......" اس کے آگے وہ کچھ کہہ نہ پایا تھا اور نوین نے اپنی آنکھ کا آنسو اپنی پور پر چنا۔

علیش کے دل میں لائف بوائے شیمپو سکے اشتہار میں لہراتے بالوں والی حسینہ گھوم رہی تھی۔ نوین کے بال اتنے لمبے نہ تھے لیکن ان زلفوں کو ناگن ضرور کہہ سکتے تھے۔ جن کو لائف بوائے شیمپو نے جادو کر کے بہت دیدہ زیب بنا دیا تھا مگر علیش اپنے دل کا کیا کرتا۔ سو وہ پہلی ہی رات اپنا مدعا نئی عروس سے بیان کر بیٹھا۔

"ہونہہ' بھلا دل کے بعد رہ ہی کیا جاتا ہے۔"

نوین کے سارے خواب بھربھری مٹی کی طرح ہاتھ سے پھسلتے چلے گئے تھے۔ اس کی حنا آلود ہتھیلیاں خالی رہ گئیں۔ ان پر کوئی بھی لمس کسی کے نام کا نہیں ٹھہرا۔ اس کی مہندی سے رچی ہتھیلیاں دید اور تحسین کی منتظر ہی رہ گئیں۔ علیش احمد تو کسی اور کی آنکھوں کا سپنا تھے۔ کسی اور کے دل کا خواب! خود ان کی آنکھوں میں بھی کسی اور کے خواب تھے اور اس کی ذات کسی قدر بے مایہ ہوگئی تھی کہ اس کا وجود ان چاہا ہے' ناپسندیدہ ہے۔ وہ سوچتی رہ گئی۔

☆......☆......☆

علیش احمد نے اسے بہو بنادیا تھا' بیوی نہیں اور جب بیوی کے حقوق' فرائض ادا نہ ہوں تو بہو کے فرائض کیسے ادا ہوں گے مگر شاید پھر ادھر سے ہی سمجھوتے کی راہ نکلتی ہے۔ اس نے بھی سمجھوتے کی نرم چادر کو اپنے وجود کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ واپس جانے کا اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ منزل سامنے نہیں تھی، دھند کے بادل تھے جو آکٹوپس کی طرح اسے گھیر رہے تھے مگر بات وہی، مشرقیت کی تھی۔ والدین کی عزت اور خاندانی وقار آڑے آجاتا ہے۔

ماں باپ جس وقت لڑکی کو رخصت کردیتے ہیں تو وہ پرائی ہوجاتی ہے۔ روز آئے' ملے' ویک اینڈ پر آئے' سو بسم اللہ! ادھر اس نے دکھ کی کہانی سنا کر منتظر نگاہوں سے ماں باپ کو دیکھا کہ آپ نے پسند کیا تھا' میں نے سر جھکا دیا۔ اب...... اب...... میں کیا کروں؟ اور وہ بیٹی دکھ کی سل کی طرح والدین کے سینوں پر گرجاتی ہے۔

ترحم اور ترسی ہوئی نگاہیں اس کی جانب اٹھتی ہیں اور وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی خود میں مجرم بن جاتی ہے۔

اس نے خود ترسی' ترحم کے بجائے سمجھوتے کی چادر وقار سے اوڑھ کر آنسوؤں کا آبشار' سسکیوں کا طوفان اور چیخوں کا شور اپنے وجود میں دفن کرلیا تھا۔ یہ اس کا مقدر تھا اور جو چیز مقدر میں نہ ہو تو مقدر سے لڑنا؟ عذاب جان بننے سے بہتر تھا کہ خود پر عذاب جھیل لیں۔ اسے اپنے ماں باپ، خود سے زیادہ عزیز تھے۔

دکھ گو کہ قیامت کا تھا۔ سوال نارسائی' انا' خودداری کا تھا مگر اس کے والدین کو معلوم ہوتا تو وہ جیتے جی مرجاتے اور امی' ابو اسے کتنے عزیز تھے' کوئی اس سے پوچھتا تو بتا نہ پاتی۔

اس کی آنکھ بھر آئی!

یہ جو اک نارسائی کا دکھ ہے
بیٹی سہتی ہے
بیٹی ہر پل
اس دکھ کی مایا
سینت سینت کر رکھتی ہے
یہ جو اک سمجھوتے کی چادر ہے
بیوی اوڑھتی ہے
ہر موسم میں
تن سے لگائے رکھتی ہے
زندگی تمام کرتی ہے
لحد میں لے کر اترتی ہے

مگر کب تک......؟ اس نے گرل پر کہنی جما کر بند مٹھی پر چہرہ ٹکا کر سامنے پھیلے سبزے کو دیکھا۔ ہل پارک کا پچھلا حصہ اس کے سامنے تھا۔ بچے کھیل رہے تھے۔ نوجوان جوڑے راز و نیاز میں مصروف تھے۔ سامنے ایک قدیم درخت تھا۔ جس کی گھنی چھاؤں کے نیچے ایک لڑکا اور لڑکی بیٹھے تھے۔ نوین نے نگاہ چرالی۔ نوبیاہتا جوڑا تھا۔ ایک دوسرے کو آئس کریم کھلاتے' ایک اسٹرا سے کولڈرنک ختم کرتے دیکھ کر اس نے ایک اور دفعہ نظریں چرالیں۔

اس کے دل میں ایسی خواہش کبھی نہیں تھی۔ جو محبت شادی کے بعد ہوتی ہے' وہ پہلے ہونے والی محبت کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ یہ اس کا یقین تھا مگر...... دل دکھ کی شدت سے ڈوبنے لگا۔

اس کے مقدر میں شاید محبت' محبت کا احساس' چاہت کا حصول اور چاہے جانے کا جذبہ ہی نہیں تھا۔ اس کے کھلے سلکی بال ہوا میں لہرائے تھے۔ جھٹ اس نے دوپٹا سر پر جمالیا۔

☆......☆......☆

علیشا کے لیے آیا ہوا پرپوزل قبول کرلیا گیا۔ سنہری خوابوں نے علیشا کی براؤن آنکھوں میں بسیرا کرلیا۔ لب ہمہ وقت مسکراتے رہتے۔ وہ اسے مسکراتے ہوئے دیکھے جاتی اور دل سے اس کے لیے دعا کرتی۔

"یااللہ! اس کا دل آنگن آباد رکھنا۔ اس کو دکھی نہ کرنا۔ اس کے خوابوں کو سلامت رکھنا۔ اسے سہاگن ہی رکھنا۔ اس کی راتوں کو شب قمر کی طرح رکھنا۔"

گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔

اس شب علیش احمد بھی آگیا۔ کئی دنوں سے آفس کی طرف سے کورس کے لیے وہ اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ گھر کی

گہما گہمی میں اضافہ ہو گیا۔ عید کے اگلے ہفتے شادی تھی۔ اس گھر میں نوین کا پہلا رمضان' پہلی عید اور پہلی تیاری تھی۔ ساتھ ساتھ علیشا کی شادی تھی۔ عید کی تیاری اور شادی کی تیاری ساتھ ساتھ تھیں۔ خوب بازار آنا جانا ہو رہا تھا۔ شاپنگ' عید کی تیاریاں!

علیش احمد کے آنے کے بعد نوین کی مصروفیات میں اضافہ ہو گیا تھا۔ جب تعلقات سرد مہری کا شکار ہوں اور بھرم بھی رکھنا ہو تو پھر مصروفیات ذریعہ نجات بن جاتی ہیں۔ وہ رات گئے کمرے میں آتی۔ علیش احمد سو چکے ہوتے۔ وہ فجر تک اپنی کمر سیدھی کرتی۔ خاموشی سے ضروری امور انجام دیتی اور علی الصبح کمرے سے باہر نکل جاتی۔ اپنی ذمے داریاں ادا کرتی اور علیشا کی تیاریوں کے چکر میں اس کے کمرے میں ہی قیام کرتی۔

"بھابی! بھائی ناراض نہیں ہوتے؟"

"کس بات پر؟" وہ تجاہل سے اسے دیکھتی۔

"اتنی رات گئے تک آپ میرے ساتھ ہوتی ہیں۔ دیکھیں رات کے دو بج رہے ہیں۔"

"تو کیا ہوا؟" اُس نے شانے اچکا کر کہا۔ "ان کی پیاری بہن کے پاس ہوں۔" اُس نے ہاتھ بڑھا کر علیشا کا رخسار چھوا۔

"حالانکہ اس وقت آپ کو میرے پیارے بھائی کے پاس ہونا چاہیے۔" وہ شرارت سے ہنسی۔ نوین کے دل پر چوٹ سی لگی۔

"پھر تم کہو گی کہ بھائی نے ادھر ہی رہنا ہے۔ میں نے چلے جانا ہے۔ کچھ تو خیال کریں۔" نوین نے مسکین سی صورت بنائی۔

علیشا نے لب بھینچ کر مصنوعی خفگی سے اسے دیکھا اور پھر دونوں ہنس دیں۔

"ارے بھابی! میرا شیمپو ختم ہو گیا ہے۔ پلیز کل بھیا سے لازمی منگوا دیں۔"

"اوکے! تم بھی تو میری طرح لائف بوائے شیمپو ہی استعمال کرتی ہو نا۔"

"بالکل بھابی! سب سے اچھا شیمپو تو ہے ہی ہمارا لائف بوائے شیمپو۔"

"سچ کہتی ہو۔ میرا یقین ہے لائف بوائے شیمپو۔ یقین کرو۔ جب پت جھڑ کے موسم میں بال جھڑتے ہیں تو بھی یہ لائف بوائے شیمپو اپنے اعلیٰ معیار کی بدولت ہی بالوں کو مضبوط اور توانا رکھتا ہے۔ سچی کبھی مجھے کسی موسم میں بھی لائف بوائے شیمپو کی وجہ سے بالوں کے مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔"

"بالکل بھابی! میرا بھی یقین لائف بوائے شیمپو ہی ہے۔"

پھر نوین نگاہ چرا کر اس کا دوپٹہ تہہ کرنے لگی۔ علیشا کی آنکھیں چمک رہی تھیں ہیرے کی کنی کی طرح۔

اے اللہ! ان آنکھوں کے خوابوں کی آبرو رکھنا۔ نوین کے دل سے دعا نکلی۔

☆......☆......☆

"ایک بات بتاؤں؟"

اگلے دن علیشا نے چمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"ہوں۔"

"ان کا فون آیا تھا۔"

"ان کا؟" تعجب سے دیکھا اور سمجھی نہیں "کس کا؟"

"وہ......وہ......عثمان کا!" جھجک کر اُس نے پلکیں جھکا لیں۔

"ہیں......سچ! کب......کب......کیا کہہ رہے تھے؟" وہ سیدھی ہو کر بیٹھی۔ دل میں وسوسے سے اٹھنے لگے۔

"کہہ رہے تھے کہ آپ بہت اچھی ہیں۔ کاش منگنی کے بعد ملاقات ہو سکتی۔" وہ درمیان میں رک کر ہنسی۔ اندرونی خوشی کا عکس اس کے چہرے پر جھلملا رہا تھا اور سکون نوین کی روح میں سرائیت کر رہا تھا۔

"اور کیا کہہ رہے تھے؟" شرارت سے چھیڑا۔

"کیا سب کچھ بتا دوں؟" ہنسی کا فوارہ سا فضا میں بکھر رہا تھا اور نوین نے صد شکر دل میں ادا کیا۔

"اور کچھ بھی تو کہا ہوگا؟"

"جی ہاں! اُن کو میرے بال بہت پسند آئے۔ میں نے بھی جھٹ کہہ دیا کہ اس سلسلے میں آپ ہمارے لائف بوائے شیمپو کا شکریہ ادا کریں۔"

"ہم سب کا یقین ہے لائف بوائے شیمپو۔"

علیشا کا نصیب اس جیسا نہیں ہے۔ ایک مکمل' بھرپور محبت کرنے والا رفیق' علیشا کا نصیب بننے والا ہے۔

☆......☆

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ وہ تیزی سے کچن میں

مصروف تھی۔ ایک چولہے پر بھجیا پک رہی تھی۔ دوسرے پر قیمہ آخری مرحلے میں تھا۔ پراٹھوں کے لیے آٹا گوندھ کر فریج میں رکھ دیا تھا۔ صبح پہلا روزہ تھا۔ سحری کے لیے وقت تھوڑا ہوتا ہے اس لیے نوین نے یہ ذمے داری اٹھالی۔ ویسے بھی علیش احمد سے بچنے کے لیے راہ فرار کا یہ بہترین راستہ تھا۔

"چائے۔" وہ کاؤنٹر صاف کر رہی تھی کہ آواز پر پلٹی۔

کچن کے دروازے پر ایستادہ علیش احمد اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ "مجھے فلو ہو رہا ہے' پلیز' ایک کپ چائے مل جائے گی؟"

چائے بنانا تو دور کی بات تھی' وہ مخاطب ہونے پر حیران تھی اور پھر توجہ...... نظریں چرا کر ایک کپ چائے بنا کر مگ اس کی جانب بڑھا دیا۔ علیش احمد نے کپ تھاما اور باہر نکل گیا۔ نوین ادھر ہی کھڑی رہ گئی۔

اس کا مخاطب کرنا...... دیکھنا...... ادھر ہی کھڑے رہنا...... سب نیا تھا۔

مگر کیوں' وہ تو دیکھنا' بات کرنا پسند ہی نہیں کرتا تھا۔

اس دفعہ جب سے علیش احمد واپس آئے تھے کچھ چپ چپ سے تھے۔ اپنی سوچوں میں گم' اکثر انہیں سگریٹ اور دھوئیں کی دھند میں گم ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے پاس حق نہیں تھا جو سوال کرتی اور مسئلہ پوچھ لیتی یا دکھے ہوئے دل پر محبت کا مرہم رکھتی۔

"ہوگی کچھ آفیشل وجہ؟" وہ خود کو تسلی دے کر پلٹی۔

مگر ان کا مجھے مخاطب کرنا......؟ وجود پر آگہی کی برف گرنے لگی جس نے احساسات کو سن کر دیا۔ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ رہا تھا مگر جب اسے لوٹنا ہی تھا تو راستہ کیوں بھولا؟

ہوسکتا ہے یہ اس کا وہم ہو۔ اس نے خود کو تسلی دی۔

ساری رات نیند نہ آسکی۔ صبح سحری کے لیے اٹھی تو دماغ اور طبیعت میں بوجھل پن تھا۔

اگلے گزرتے ہوئے دنوں نے اس کے احساس کو یقین دیا کہ علیش احمد اس سے مخاطب ہوتے ہیں۔ اس کی جانب دیکھتے ہیں۔ اس کی توجہ چاہتے ہیں مگر وہ اپنی ذات میں سمٹ گئی۔

اتنی ہتک کے بعد' اتنی بے عزتی کے بعد اب میری ضرورت کیوں؟ جائیں جہاں جانا چاہتے ہیں' میں نے پابند نہیں کیا اور کیوں کروں گی۔

☆☆......☆☆

نماز پڑھتے ہوئے بے اختیار آنکھیں نم ہو جاتیں۔ دعا کے لیے اٹھی ہوئی ہتھیلیاں بے دم ہو کر گود میں گر جاتیں۔

کیا دعا مانگے؟

کبھی اس شخص کے پلٹنے کی دعا مانگی تھی' کبھی اور نہ دل بدلنے کی۔ اگر اس نے سمجھوتہ کیا تھا تو صرف اپنے خاندانی' وقار' عزت اور والدین کی محبت کے لیے' ان کی لاج کے لیے...... اسے محبت کی بھیک چاہیے تھی اور نہ مانگے کی محبت۔ دل کو یقین ہو گیا تھا یہ شخص اس کا نہیں' اس کے لیے نہیں۔ پھر جبر کیوں...... زبردستی کیوں...... بس زندگی جیسے چل رہی ہے چلتی رہے گی تو اب...... اب کیوں؟

اس کے وجود میں آگ سی جلنے لگی۔

میری ذات اتنی ارزاں نہیں کہ یوں بے مول ہو جائے۔

بظاہر سوتی وہ سوچوں کے گرداب بنتی رہتی۔

نوین احمد! کوئی اس کے اندر بولا تھا۔ اگر علیش احمد واپس لوٹ رہا ہے اپنے گھر کی جانب' تمہاری طرف تو تمہارا رد عمل کیا ہوگا۔ تم کیا کرو گی۔ اس کی پذیرائی؟ یا تمہاری واپسی کا عمل شروع ہو جائے گا؟

اس کی ساری حسیات الرٹ ہو کر جاگ گئیں۔

☆......☆

"سنو' یہ کپڑے استری کر دو۔" علیش احمد اپنا شلوار قیص لے کر روبرو تھا۔

"علیشا سے کہہ دیں۔"

"تم...... تم کر دو۔" اب وہ اس کے پہلو میں بیٹھا تھا۔

بے اختیار چونک کر سر گھما کر اس نے اُسے دیکھا۔

"میں...... میں...... کیوں؟ مجھے حق تھا نہ اختیار ہے۔" اس نے واپس سر گھما کر ہتھیلیاں مسلیں۔

"تمہیں حق بھی دے رہا ہوں اور اختیار بھی اور......"

دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر اس کے یخ ہاتھوں کو تھام لیا۔

"اور میں شرمندہ بھی ہوں۔"

نوین کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

وہ دن' وہ لمحے' وہ ایک نئی دلہن کو ٹھکرائے جانے کی ذلت کا احساس' اس کے سنہری خواب اور خوابناک دن' ایک ناگواری کی لہر اٹھی۔ اور...... ازالہ کے طور پر صرف شرمندگی؟

اُس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور ایک نگاہ اس پر ڈالے بغیر کمرے سے نکل گئی۔ اب فیصلے کا اختیار اس کے پاس تھا۔

کچن میں آکر بریانی کے لیے پیاز کاٹتے ہوئے وہ بے تحاشا روئی۔ یہ اس کی اہمیت تھی۔ یہ اس کی حیثیت تھی اب کیوں...... اب بھی کیوں؟ ہتھیلیوں سے آنکھیں صاف کیں۔ اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑے علیش احمد نے بے حد ملال اور شرمندگی سے اس کے رنجور اور بھیگے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

کسی اور کی محبت نے اسے اس چہرے سے منہ موڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب لوٹا تھا تو اسی محبت سے رنجور ہو کر۔ کتنا دکھ دیا تھا اس کی محبت نے اور کس قدر اذیت ہوتی ہے جب ہمیں اس بات کا ادراک ہو کہ جس محبت کے لیے ہم ساری دنیا کو دکھ دے رہے ہیں' وہ محبت ہماری نہیں' کسی اور کے لیے ہے تو...... تو کیسے دل دکھی ہوتا ہے اور جب اپنا دل دکھی ہو تو دوسرے دکھے ہوئے دلوں کا احساس بھی ہوتا ہے اور شرمندگی بھی۔

☆......☆......☆

علیش احمد آج کل اسی مرحلے سے گزر رہا تھا۔ شرمندہ بھی تھا اور احساس بھی کر رہا تھا۔ اس کے لیے یہ مرحلہ پل صراط سے کم نہیں تھا۔ جس کمال ضبط' صبر اور شکر گزاری سے نوین نے یہ مرحلہ طے کیا تھا' اس کی کج ادائیوں بے وفائیوں کو برداشت کیا تھا۔ حرف شکایت لبوں پر لائے بغیر۔ کوئی ملامت کیے بنا نوین نے اس کے گریز اور جدائی کو برداشت کیا تھا۔ بے شک نوین ایک اچھی لڑکی تھی۔ گھر والوں کا انتخاب لاجواب تھا۔ وہی تھا جو اپنے پیروں پر کلہاڑی مار بیٹھا تھا اور...... اب......''

آزردہ دل کے ساتھ ٹیرس پر کھڑا وہ اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔

بادل ایک دوسرے سے ٹکرائے اور بوندوں نے شرارتیں کرنا شروع کر دیں۔ کن من کرتی بوندوں نے ہر طرف جل تھل کر دی تھی۔

ایسے میں نوین لان میں آکر اپنے تن من کو اس برکھا میں بھگونے لگی۔ علیش کا دل اُسے دیکھ کر اتھل پتھل کر رہا تھا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا وہ جا کر ابھی اُسے بانہوں میں بھر لے۔ اتنی دیر میں نوین نے اپنے بال پھیلائے اور لائف بوائے شیمپو کی بوتل سے مخصوص مقدار میں شیمپو لے کر گھنے بالوں کو شیمپو کرنے لگی۔ اُس کی عادت تھی۔ جب بھی بارش برستی تو وہ بارش کے پانی سے بال شیمپو ضرور کرتی تھی۔ اور پھر علیش کے لیے وہاں کھڑا ہونا دوبھر ہو گیا۔ وہ اب لان میں تھا۔ نوین بال شیمپو کر چکی تھی۔ ابھی وہ مڑ کر لائف بوائے شیمپو کی بوتل کور کھنے لگی ہی تھی کہ اچانک کوئی پتھر اُس کے نازک پاؤں میں چبھا اور وہ لہرا گئی۔ علیش نے اُسے سہارا نہ دیا ہوتا تو وہ کب کی زمین بوس ہو چکی ہوتی۔

وہ ٹکر ٹکر اُسے دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں حجاب اور سرخوشی، حیرت، مان، سمان سب کچھ تھا۔

''معاف کر دو!'' علیش نے اُسے بانہوں میں بھرتے ہوئے کہا۔ وہ کسمسائی مگر خود کو اس حصار سے الگ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ موسم کی جولانی نے اس رومان کو مزید دو آتشہ کر دیا تھا۔

''پلیز! میری لائف! تم میری لائف بوائے شیمپو والی وائف ہو! سو لو یُو۔'' یہ کہہ کر علیش نے اُس کے گلابی رخسار پر مہر محبت ثبت کر دی۔ عورت جب بیوی ہو تو اُس کے لیے یہ اتنی سی محبت ہی سب سے بڑا 'لوا یگریمنٹ' ہوتی ہے۔

اِس محبت کی مہر کے بعد وہ دنیا جہان کی دولت کے پیپرز بھی اپنے شوہر کے نام پر سائن کر دیتی ہے۔ اور...... علیش...... وہ تو واپس لوٹ چکا تھا۔ اِک محبت میں ناکام ہو کر دوسری محبت کا کلیئرنس سرٹیفکیٹ اُس کے پاس تھا۔ سو اب کسی چیز کی فکر ہوتی۔

''معاف کیا۔'' یہ کہہ کر نوین اُس سے دور ہوئی۔

''مگر یاد رکھیے گا۔ اب اتنے سارے دنوں کے تمام حساب آپ سے لوں گی۔'' وہ مسکرائی اور وہاں سے چل دی۔

باہر بارش کا شور بہت تیز ہو گیا تھا اور اِدھر علیش کا دل اپنی سچی محبت پا کر دھڑکنا بھول گیا تھا۔

اُس نے جب نوین کو بارش میں لائف بوائے شیمپو کرتے دیکھا تو...... اُس کے سامنے اُس کی لائف بوائے شیمپو والی گرل بالکل سامنے تھی۔ اُس نے بھی نوین کو گہری نظروں سے دیکھنے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔ ورنہ وہ کب کا اپنی منزل، اپنا یقین پا چکا ہوتا۔ اُس نے زوردار آواز میں ہاتھ لہرایا۔

''لائف بوائے شیمپو...... سب کا یقین کامل بنائے۔''

☆☆☆

اُن پری زادوں اور جن زادوں کے قصے
جو آدم زادوں پر عاشق ہو کر اُن کو فنا کر گئے یا اپنے ساتھ ہی لے گئے
لہو میں خوف دوڑاتی، سنسنی پھیلاتی پانچ حیرت ناک کہانیاں

بلی یا فردوس



محمد سلیم اختر

اُس نوجوان کا قصۂ حیرت جس نے پوشیدہ دنیا
میں شادی کر لی تھی، اور جب وہ اپنی دنیا میں لوٹا تو......

اُس پہاڑی اور جنگلی قصبہ میں تبدیلی کے آرڈر پا کر میں پریشان ہوگیا، مگر کیا کرتا سرکاری احکام کی

پابندی بھی تو کرنی تھی۔ اس لیے میں با دلِ نخواستہ اس قصبے میں جا پہنچا جہاں میرے محکمہ کے دفتر کی برانچ حال ہی میں کھولی گئی تھی۔ میں یہاں پہنچا تو مجھے وہ علاقہ بہت ہی خوبصورت لگا...... چاروں طرف بلند و بالا پہاڑ تھے۔ ان پہاڑوں میں کھائیاں بھی تھیں۔ جنگلی جانور اور مختلف قسم کے پودے تھے۔ موسم بہار میں جب درختوں پر سبزہ آتا اور رنگ برنگے پھول کھلتے تو ان کی مہک دل و دماغ کو مسحور کر دیتی اور وہ علاقہ جنت کا سماں پیدا کر دیتا۔ میری رہائش ایک ٹیلے پر بنے ہوئے ایک چھوٹے سے مکان میں تھی۔ جہاں سے پورے قصبے کا نظارہ ہوتا تھا اور وہ منظر دل کو بہت ہی بھلا لگتا تھا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد عموماً میں چہل قدمی کے لیے اِدھر اُدھر نکل جاتا تھا۔ کبھی اکیلا ہوتا اور کبھی کسی دوست یا ساتھی کے ہمراہ گھومتا رہتا۔ کبھی تو جلدی واپس آ جاتا اور کبھی رات دیر گئے واپسی ہوتی۔

وہ دسمبر کے آخری ہفتے کی سرد شام تھی۔ میں اکیلا ہی گھومنے نکل گیا تھا میں ایک سڑک کے کنارے ایک فلمی نغمہ گنگناتے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ اس سڑک پر کوئی آبادی نہ تھی۔ البتہ خاصے فاصلے پر لائٹیں لگی ہوئی تھیں۔ جن میں سے اِکا دُکا جل رہی تھیں اور زیادہ تر خراب ہونے کی وجہ سے بجھی ہوئی تھیں۔ ایک لائٹ والے کھمبے کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے کسی بلی کے کراہنے کی آواز آئی تو میں اس سمت متوجہ ہو گیا۔ جس طرف سے آواز آئی تھی۔

روشنی ہونے کی وجہ سے وہ مجھے نظر آ گئی۔ سردی کی وجہ سے اس کی حالت بہت خراب تھی۔ لگتا تھا وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ مجھے اس پر پیار کے ساتھ ساتھ رحم بھی آیا...... میں اُسے اُٹھا کر جلدی جلدی اپنی رہائش گاہ لوٹ آیا۔ میں نے ہیٹر آن کیا اور اسے تولیہ میں لپیٹ کر ہیٹر کے قریب رکھ دیا۔ کچھ ہی دیر میں اس کی حالت سنبھل گئی۔ میں اس کی صحت کی بہتری پر خوش اور مطمئن ہو گیا۔ لگتا تھا اسے بھوک بھی لگی ہوئی ہے۔ میں نے ڈبل روٹی کے ٹکڑے دودھ میں بھگو کر اسے کھلانے شروع کر دیے۔ کھانے کے بعد میں نے لائٹ بند کی اور سو گیا۔

وہ تین دن میرے پاس رہی۔ میں نے اس کی خوب خدمت کی۔ خوب دودھ پلایا تو اس کے مردہ جسم میں ایک نئی زندگی پڑ گئی۔ چوتھے روز وہ غائب ہو گئی۔ تو میں نے اس کی کمی شدت سے محسوس کی خوامخواہ ہی مجھے اس سے انس ہو گیا تھا۔ ایک ماہ گزر گیا۔ تو میں بھی اسے بھول گیا۔

☆......☆......☆

ایک روز وہ پھر مجھے اپنے مکان میں نظر آ گئی۔ میں نے اسے بلایا تو وہ میرے قدموں میں آ کر لوٹنے لگی۔ میں نے اس روز بھی اسے دودھ پلایا۔ اس نے دودھ پیا اور پھر بھاگ گئی اور میں اسے آوازیں ہی دیتا رہ گیا۔ میں حیران تھا کہ وہ کہاں غائب ہو گئی ہے۔ مجھے اس کی آنکھیں بہت ہی پیاری لگتی تھیں۔ اُن میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ لگتا تھا کہ وہ گہرا نیلا سمندر ہو۔ جن میں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے...... یہ سلسلہ چھ ماہ تک چلتا رہا اب وہ بلی بڑی ہو گئی تھی۔

ایک روز میں غنودگی کے عالم میں تھا کہ ایک نہایت ہی مسحور کن خوشبو میرے کمرے میں پھیل گئی۔ ایسی خوشبو میں نے اس سے قبل کبھی محسوس نہ کی تھی۔ میں نے فوراً آنکھیں کھول دیں تاکہ دیکھ سکوں کہ یہ خوشبو کہاں سے آ رہی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ میں رات کو لائٹ بند کر کے سویا تھا مگر اس وقت کمرہ ایک عجیب سی روشنی سے بھرا ہوا تھا۔ جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا کہ وہ روشنی سفید تھی۔ دودھیا تھی یا کوئی اور، میں نے بلب کی طرف دیکھا۔ وہ تو جل نہیں رہا تھا۔ تو پھر یہ روشنی کہاں سے آ رہی ہے...... میں اُٹھ کر بیٹھ گیا اِدھر اُدھر دیکھا تو نظر آیا کہ وہ روشنی کھڑکی کی جانب سے آ رہی تھی...... اس کھڑکی کے باہر ایک لڑکی کھڑی تھی جو بہت ہی حسین لگ رہی تھی۔ میں اسے دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ یہ کون ہے؟ اور یہاں کیوں آئی ہے؟ اگلے ہی لمحے مجھے خیال آیا کہ کھڑکی تو بہت اونچائی پر ہے اور کھڑکی کے باہر کوئی کھڑے ہونے کی

جگہ بھی نہیں ہے تو یہ کھڑکی کے باہر کیسے کھڑی ہے؟ میں نے اپنی آنکھوں کو اچھی طرح سے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے رگڑا کہ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ مگر وہ خواب نہیں بلکہ حقیقت تھی۔ اس لڑکی نے ہلکا سنہری قسم کا لباس پہن رکھا تھا۔ جو اتنا باریک تھا کہ اس میں سے اس کا تو بہ شکن جسم صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے بالوں کا رنگ بھی سنہرا تھا۔ ان کے سائے میں اس کا چہرہ چاند کی مانند جگمگا رہا تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ یوں لگا جیسے میں یہی آنکھیں پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔ اُس پُر جمال ہستی کے حسن نے مجھے اس قدر مسحور کر ڈالا کہ میں اسے ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ کچھ سوچنے اور سمجھنے کی مہلت ہی نہ مل رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے اس نے مجھے اپنے سحر میں جکڑ لیا ہو۔

''تم......تم......کون ہو تم؟'' میں گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

اس کے لبوں پر ایک دلنشیں مسکراہٹ پھیل گئی۔ جو میری روح میں اُتر سی گئی۔ ایسے لگا کہ جیسے کوئی رنگین سی پھوار پھوٹتی ہو۔ اس کی مسکراہٹ کے سامنے مونالیزا اور الزبتھ ٹیلر کی مسکراہٹیں بھی ہیچ نظر آئیں۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ ابھی تک بولی نہ تھی۔ اس لیے میں نے پھر پوچھا۔

''تم نے بتایا نہیں تم کون ہو؟''

وہ پھر اسی طرح مسکرائی اور بولی تو یوں لگا جیسے فضا میں جلترنگ سے بج اُٹھے ہوں۔

''میں فردوس ہوں۔''

''اندر آ جاؤ۔'' میں نے دھڑکتے دل سے کہا۔

''تمہاری اجازت کے بغیر میں اندر نہیں آ سکتی۔''

''اس میں بھلا اجازت کی کیا ضرورت ہے۔''

''اجازت کی ضرورت نہ ہوتی تو میں پہلے ہی اندر آ چکی ہوتی۔''

''آ جاؤ...... اجازت ہے!'' میں نے بے تابی سے کہا۔

''نہ جانے وہ کیسے لمحے بھر میں اندر آ گئی۔ میں حیران تھا کہ نہ ہی دروازہ کھلا اور نہ کھڑکی۔ تو وہ اچانک اندر کیسے آ گئی۔ میں خوفزدہ سا ہو کر اس کے حسنِ بلاخیز کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی جان گئی کہ میں پریشان اور خوفزدہ ہو گیا ہوں۔ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ گویا ہوئی۔

''میں......انسانی مخلوق نہیں ہوں، لیکن اس اللہ ہی کی مخلوق ہوں جو تمام جہانوں کا خالق اور مالک ہے۔''

''تو تمہارا تعلق جنات سے ہے۔'' میں اپنی پیشانی سے پسینہ صاف کرتے ہوئے بولا۔

''بے شک تم انسان اشرف المخلوقات ہوں۔ جنات بھی بے پناہ طاقت رکھتے ہیں۔ مگر اس کائنات میں ان دو کے علاوہ مخلوقات ہیں۔ میرا تعلق ان میں سے کسی کے ساتھ ہے۔'' وہ دھیمے اور پیار بھرے لہجے میں بولی۔

''تو پھر تم میرے پاس کیوں آئی ہو؟ میرا اور تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''ایک تعلق ہے۔ ہمدردی اور خلوص کا، میں اسی ناتے تم سے ملنے آئی ہوں۔''

''مگر کیوں؟'' میں روہانسا ہو کر بولا۔

''میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔ کیونکہ تم میرے محسن ہو۔ تم نے میری جان بچائی تھی۔''

''تم کیسا مذاق کر رہی ہو۔ میں تو تمہیں آج پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تمہیں وہ بلی تو یاد ہو گی جو تمہیں سڑک کے کنارے ملی تھی اور تم اسے گھر لے آئے تھے۔ دودھ پلایا تھا۔ ڈبل روٹی کھلائی تھی۔''

''ہاں یاد ہے۔ میں اُسے کیسے بھول سکتا ہوں۔''

''وہ بلی میں تھی۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''وہ تم تھیں...... اور اب یہ روپ...... میں سمجھ نہیں پا رہا۔''

''تم ڈرو نہیں...... میں جن بھوت یا چڑیل نہیں ہوں۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔''

میرے حواس کچھ بحال ہو گئے تو وہ میرے قریب

آ گئی۔ اس مجسمہ حسن ونور کو اپنے قریب پا کر میرے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہونے لگیں۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کی نیلی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے دلکش بدن سے اُٹھتی ہوئی مسحور کن خوشبو میرے حواس پر طاری ہونے لگی۔ اس کا حسن پاگل کر دینے والا تھا۔

''تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو؟ میں یہ ضرور جاننا چاہتا ہوں۔''

میں نے اس کی نیلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''میرا نام فردوس ہے۔'' وہ اپنے بارے میں بتانے لگی۔

''میں اپنی قوم کے سردار کی بیٹی ہوں اور تمہاری دنیا میں سیر کرنے آئی ہوں۔ ہماری اور تمہاری دنیا ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ لیکن ہماری زبان ومکان اور فضا تمہاری زمین سے بالکل مختلف ہے۔ مگر وہ تمہاری دنیا سے زیادہ آرام دہ ہے۔ آج میں تمہیں اپنی دنیا کی سیر کرانے لے کر جاؤں گی۔ چلو گے ناں میرے ساتھ۔''

وہ میری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں میں تمہاری دنیا ضرور دیکھوں گا۔'' میں نے بنا سوچے کہہ دیا۔

''تم میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھو۔'' وہ جادو بھرے لہجے میں بولی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اس کی آنکھوں کی چمک بڑھنے لگی۔ یوں لگا جیسے ہر سو نیلی اور گہری دھند چھاتی جا رہی ہو اور میں اس دھند میں ڈوبتا جا رہا ہوں۔ نہ جانے کتنی دیر میں اُس دھند میں ڈوبا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ دُھند کم ہونے لگی۔ میں ابھی تک اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

''اب ارد گرد دیکھو۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

میں نے دیکھا کہ ہم دونوں کھلی فضا میں ایک سرسبز پہاڑی پر بیٹھے تھے۔ اس کے چاروں طرف دور تک دلکش اور حسین قطعات تھے۔ رنگ برنگے پھول تھے۔ پھول سے لدے ہوئے درخت تھے۔

''کیسی لگی تمہیں میری یہ دنیا؟''

''بالکل تمہاری طرح حسین اور خوبصورت۔'' میں نے محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے میری طرح تم بھی مجھے چاہنے لگے ہو۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟''

''جی تو چاہتا ہے کہ تمہیں ان آنکھوں میں سمیٹ لوں۔ مگر میں انسان ہوں اور تم کوئی اور مخلوق ہو۔'' میں نے مسرت بھرے انداز میں کہا۔

''میں بھی تمہیں بے حد چاہنے لگی ہوں مگر...... ہم شادی کے بعد ساری عمر تڑپتے ہوئے جینا پڑے گا۔'' وہ اداسی بھرے لہجے میں بولی۔

''میں تڑپنے کے لیے تیار ہوں۔'' میں نے بے تابی سے کہا۔

''تو پھر تمہیں میرے بابا سے بات کرنی پڑے گی۔ جو اس قبیلے کا سردار بھی ہے۔''

''تم مجھے اس کے پاس لے چلو۔''

''ہاں ٹھیک ہے...... ہمیں ان کی عدالت میں پیش ہونا پڑے گا۔''

''کیوں؟ کیا ہم نے کوئی جرم کیا ہے؟''

''ہماری دنیا میں کسی آدم زاد کا بغیر اجازت آنا ایک جرم ہے۔''

''آؤ نیچے چلیں کیونکہ قبیلے کے لوگوں کو ہماری آمد کی خبر ہو گئی ہے۔ عدالت لگ چکی ہے۔ اگر ہمیں دیر ہو گئی تو وہ ہمیں خود ہی لینے آ جائیں گے۔''

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ ہم دونوں ان کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔

☆......☆......☆

''فردوس! یہ آدم زاد کون ہے؟ اور یہاں کیوں آیا ہے۔''

سردار گرجدار آواز میں بولا۔

''بابا! یہ میرا محسن ہے اور اسے یہاں میں لے کر

آئی ہوں۔" وہ پُر اعتماد لہجے میں بولی۔
پھر اس نے سردار کو تمام واقعہ بتا دیا۔ جب میں نے شدید سردی میں اس کی جان بچائی تھی...... وہ سب کچھ سن کر سردار بولا۔
"یہ واقعی تمہارا محسن ہے۔ اس وجہ سے ہم اسے بغیر اجازت اپنی دنیا میں آنے پر معاف کرتے ہیں۔ اب یہ ہمارا مہمانِ خاص ہوگا۔"
"بابا...... یہ مجھ سے شادی کا خواہش مند ہے۔"
وہ بلا جھجک بولی۔
"ٹھیک ہے...... اسے مہمان خانے میں لے جاؤ۔" یہ کہہ کر سردار اُٹھا اور ایک طرف چل پڑا۔ فردوس نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے لے کر ایک عمارت کے اندر داخل ہوگئی۔ وہ مجھے عمارت کے ایک خوبصورت اور آرام دہ کمرے میں لے گئی۔ اس کی آرائش کو میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ فردوس مجھے اس کمرے میں چھوڑ کر باہر نکل گئی۔ میں کمرے کے حسین نقش ونگار میں کھویا ہوا تھا کہ ایک حسین اور نو عمر لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے سفید اور باریک لبادہ پہن رکھا تھا۔
"معزز مہمان! غسل فرما لیجیے۔" یہ کہہ کر وہ مجھے ایک بہت بڑے غسل خانے میں لے گئی۔ طاس کے اندر بنے ہوئے تالاب سے خوشبو بھری بھاپ اُٹھ رہی تھی۔
وہ مجھے خود غسل کرانا چاہتی تھی مگر میں نے اسے منع کر دیا اور اس کے جانے کے بعد میں خوشبو دار تالاب میں اُتر گیا۔ میں غسل کر کے واپس کمرے میں آیا تو اس لڑکی جیسی دو اور نو عمر لڑکیاں کمرے میں قالین پر دستر خوان بچھا کر اس پر قابیں لا کر رکھنے لگیں...... وہ ایک بہت بڑی دعوت کا کھانا تھا۔ جو کئی لوگ کھا سکتے تھے مگر وہ دستر خوان صرف میرے لیے تھا۔ میں نے اپنی دنیا میں ایسے کھانے کبھی نہ کھائے تھے اور نہ ہی ان کے بارے میں کبھی سنا اور پڑھا تھا۔ کھانے کے بعد مجھے نہایت ہی عمدہ اور خوشبو دار قہوہ پیش کیا گیا...... کھانے اور قہوہ پینے کے بعد مجھ پر ایک قسم کی غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی کہ اچانک ایک

خادمہ آگئی اور کہنے لگی۔
"معزز مہمان...... آپ کو یاد فرمایا جا رہا ہے۔"
میں اس خادمہ کے پیچھے چلتا ہوا۔ ایک بہت بڑے ہال میں پہنچ گیا۔ اس ہال کو بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ ایک سرخ رنگ کا پھولدار قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ جس پر سنہری کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔ ایک طرف ایک بڑا سا پردہ لگا ہوا تھا۔ بالکل ایسے جیسے سینما گھروں کی اسکرین ہوتی ہے۔ ایک طرف ایک اسٹیج بنایا گیا تھا جہاں پر ان کا سردار درمیان میں ایک بڑی اور شاہی طرز کی کرسی پر براجمان تھا۔ اس کے دائیں طرف والی کرسی خالی تھی جبکہ بائیں طرف فردوس دُلہن کے روپ میں بیٹھی تھی۔ اسٹیج پر رکھی گئی دیگر کرسیوں پر قبیلے کے معزز لوگ بیٹھے تھے۔ ہال میں رکھی گئی دیگر کرسیوں پر ایک طرف مرد اور دوسری طرف عورتیں بیٹھی تھیں۔ مجھے وہ خادمہ سردار کے ساتھ والی کرسی تک لے گئی۔ سردار نے مجھے اس پر بیٹھنے کو کہا...... تو میں وہاں بیٹھ گیا۔ سردار نے نکاح خواں کو بلایا تو وہ بھی اسٹیج پر آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سردار نے اسے مخاطب کر کے کہا۔
"محترم...... شروع کیجیے۔"
نکاح خواں نے میرا نام پوچھا۔ پھر والد کا وہ سب کچھ ایک رجسٹر میں لکھتا جا رہا تھا۔ پھر اس نے مجھ سے ایک بار کہلوایا کہ
"تمہیں فردوس اختر سردار استجابت قبول ہے۔"
میں نے کہا۔ "قبول ہے۔"
پھر وہ اُٹھ کر فردوس کے پاس گیا اور اُسے بھی یہی کہا۔
"تمہیں...... شمس ولد نور احمد قبول ہے۔"
فردوس نے کہا۔ "قبول ہے۔"
اس کے ساتھ ہی ہال تالیوں اور مبارک باد کے شور سے گونج اٹھا۔ کچھ دیر بعد جب شور تھما تو ہال کا پردہ اٹھا دیا گیا۔ اور وہاں رقص وساز کا پروگرام شروع ہوا۔ حسین اور جوان لڑکیوں نے ایسا رقص کیا کہ لگا جیسے سب کچھ ساکت ہو گیا ہو۔ وہ سب ایک سے بڑھ کر ایک حسین تھیں۔ اوپر سے سفید اور نیم عریاں

لباس میں ان کا جسم قیامت ڈھا رہا تھا۔ اس جیسا رقص میں نے زندگی میں نہ دیکھا تھا۔ لگتا تھا سارے جہاں کا حسن اس پائل میں سمٹ آیا ہے۔ ایسی موسیقی میں نے کبھی نہ سنی تھی...... جی چاہتا تھا...... وہ یوں ناچتی اور گاتی رہیں اور میں سنتا اور دیکھتا رہوں...... لیکن دیر گئے وہ پروگرام بالآخر ختم ہو گیا۔

مجھے اور فردوس کو ایک خوبصورتی سے سجائی گئی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں آ کر فردوس نے دلہنوں والا لباس اُتار کر ایک سنہری لباس پہن لیا۔ اس وقت اس کا حسن قیامت ڈھا رہا تھا۔ اس نے لائٹ بند کی اور میری بانہوں میں سما گئی۔ پھر اس نیم تاریک خواب گاہ میں نہ جانے...... کتنا وقت گزر گیا۔ کتنے دن اور کتنی راتیں...... مجھے یہ معلوم نہ تھا۔ کیونکہ ہم دونوں اس خواب گاہ سے باہر ہی نہ نکلے تھے۔ ہمیں ہر آسائش اور ضرورت وہاں ہی مہیا کی جارہی تھی میری دنیا صرف فردوس اور اس خواب گاہ تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ مجھے صرف فردوس یاد تھی۔ اس کے علاوہ کچھ بھی یاد نہیں تھا۔

☆......☆......☆

''شمس! اب آپ کے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔'' ایک دن فردوس اُداس لہجے میں بولی۔

''کہاں جانے کا؟'' میں نے پریشان سا ہو کر پوچھا۔

''واپس تمہاری اپنی دنیا میں۔'' وہ سسکتے ہوئے بولی۔

''اب میں اور تم کبھی نہ مل سکیں گے۔''

''نہیں فردوس...... میں اب یہیں رہوں گا۔ میں اپنی دنیا میں واپس نہیں جاؤں گا۔'' میں نے اٹل لہجے میں کہا۔

''نہیں شمس! تمہیں جانا ہوگا...... ہماری اس دنیا کا یہی قاعدہ اور قانون ہے۔ یہاں کوئی آدم زاد آ ہی نہیں سکتا اور اگر آ جائے تو زندہ واپس نہیں جا سکتا۔ تم خوش قسمت ہو کہ میری پسند ہو۔ میرے شوہر بھی ہو...... اس لیے زندہ ہو...... تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم واپس چلے جاؤ۔ ورنہ تم زندہ نہ رہ پاؤ گے...... اس سلسلے میں...... میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گی۔''

''لیکن میں نہیں جاؤں گا فردوس! کیونکہ اب تم میری بیوی ہو...... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم نے مجھے محبت کے اس رنگ اور شدت سے روشناس کرایا ہے کہ اب مجھے اپنی دنیا کی کوئی چیز اچھی نہ لگے گی۔'' میں نے یقین سے کہہ دیا۔

''شمس! بے کار کی ضد چھوڑ دو۔'' وہ التجائیہ لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے میں یہاں نہیں رہوں گا۔ مگر تمہیں بھی میرے ساتھ جانا ہوگا۔''

''تمہیں کیسے سمجھاؤں شمس!'' یہ بھی ناممکن ہے کیونکہ اب میری اور تمہاری ملاقات کبھی نہ ہوگی۔ ہاں ہوئی بھی تو اگلے جہاں ہوگی۔ کیونکہ ہماری اور تمہاری دنیا بالکل مختلف ہے۔ مانا کہ ہماری شکلیں انسانوں جیسی ہیں۔ مگر اس کے باوجود ہم تم سے مختلف ہیں۔ تمہیں جانا ہوگا۔'' فردوس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''فردوس! یہ ظلم ہے۔ جو تم مجھ پر ہی نہیں اپنے آپ پر بھی کر رہی ہو۔''

میں نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

وہ روتے ہوئے بولی۔'' میں اب کبھی نہ ہی تمہاری دنیا میں جا سکوں گی اور نہ ہی تم سے مل سکوں گی۔''

''پھر میں اپنی دنیا میں جا کر کیا کروں گا، مجھے یہاں ہی مر جانے دو۔'' میں نے ہمت ہارتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر تم یہاں رہ بھی گئے تو ہم تمہیں تمہاری دنیا میں پھینک آئیں گے۔ آؤ میرے ساتھ۔'' وہ میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

''کہاں؟'' میں نے مایوسی بھرے انداز میں کہا۔

''اُسی پہاڑی پر...... جہاں ہم ملے تھے۔''

میں فردوس کے ہمراہ چلتا ہوا اسی پہاڑی پر

آ گیا۔ میں نے نیچے آبادی کی طرف دیکھا تو فردوس کے قبیلے کے تمام لوگ ایک جگہ جمع تھے اور ہم دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''شمس! اب تم اپنی دنیا میں جاؤ گے...... ورنہ میرے قبیلے کے لوگ قیامت بپا کر دیں گے۔''

''ٹھیک ہے فردوس...... مجھے تمہاری جدائی اب سہنی ہی پڑے گی۔''

''بس تم یہ سمجھ لینا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ہاں ایک بات اور یاد رکھنا......اب تم اپنی دنیا میں جا کر کسی عورت سے شادی مت کرنا۔ ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔'' فردوس یہ کہہ کر میرے قریب تر آ گئی۔ وہ اُداسی بھرے لہجے میں بولی۔

''میری آنکھوں میں دیکھو۔''

میں نے اس کی گہری نیلی جھیل جیسی آنکھوں میں دیکھا۔ تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر نیلی دھند میرے چاروں طرف پھیلنے لگی اور میں اس میں ڈوبنے لگا۔ میں نے فردوس کو پکڑنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلائے......مگر وہ نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ میں خلا میں ہاتھ پیر مارتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ دھند چھٹنے لگی۔

☆......☆......☆

مجھے ہوش آیا تو میں اپنے کمرے میں تھا اور شدید بخار کی شدت سے سلگ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد میں پھر بے ہوش ہو گیا۔

میں تین ماہ بیمار رہا۔ مجھے عجیب قسم کا بخار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں کی سمجھ میں اس کا علاج ہی نہ آ رہا تھا۔ دن بدن میں کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے فردوس اب بھی یاد آتی تھی۔ لگتا تھا وہ سب خواب تھا۔ مگر نہیں......اتنا بھرپور اور مسلسل خواب وہ حقیقت تھی فردوس سے جدائی کا دکھ میرے اندر کروٹیں لینے لگا۔ میں اس کے بغیر اُداس سا رہنے لگا۔ تین ماہ بعد میں تندرست ہو گیا۔ آہستہ آہستہ میری کمزوری دور ہوتی گئی۔

ایک سال بعد میری صحت پھر ویسی ہی ہو گئی۔ جیسے پہلے تھی۔ فردوس کے ہمراہ گزرے ہوئے لمحات میں نہ بھول پایا تھا۔ وہ میری زندگی کا حاصل تھے۔ میری تبدیلی اب اپنے شہر ہو گئی تھی۔ گھر والوں کو اب میری شادی کی فکر تھی۔ جبکہ میں شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں فردوس سے شادی کر چکا تھا۔ میں اس کے علاوہ اب کسی کا تصور ہی نہ کر سکتا تھا۔ میں گھر والوں کو فردوس کے بارے میں انہیں بتانا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ میری اس بات پر کوئی یقین نہ کرے گا۔ بلکہ مجھے پاگل سمجھا جانے لگے گا۔ اس لیے میں نے کسی کو بھی نہ بتایا کہ میں ایک دوسری مخلوق سے شادی کر چکا ہوں۔

☆......☆......☆

گھر والوں کے بے حد اصرار پر مجھے ہتھیار ڈالنے ہی پڑ گئے۔ سعدیہ میری بیوی بن کر آ گئی۔ سعدیہ میرے قریبی رشتہ داروں میں سے تھی۔ پوری برادری میں اس جیسی حسین لڑکی نہ تھی۔ میں اسے پسند کرتا تھا۔ مگر فردوس سے ملاقات ہونے سے پہلے۔ اب مجبوراً مجھے اس کے ساتھ نباہ کرنا تھا۔

وہ ہماری سہاگ رات تھی۔ ارمانوں اور اُمنگوں بھری رات...... اس رات مجھے فردوس بہت یاد آئی اور ساتھ ہی اس کے آخری الفاظ بھی...... کہ اب شادی نہ کرنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔

مگر میں نے انہیں بھلا کر آگے بڑھ کر سعدیہ کا گھونگھٹ اُلٹ دیا۔ میں نے سعدیہ کو انگوٹھی پہنائی اور پھر محبت کی دنیا میں کھو گئے۔

وہ رات میرے اور سعدیہ کے ملن کی پہلی اور آخری رات ثابت ہوئی۔ سعدیہ نے مجھ سے طلاق لے کر کسی اور جگہ شادی کر لی۔ کیونکہ میں مردانہ صلاحیتوں سے محروم ہو گیا تھا۔ شاید اسی نقصان کا ذکر فردوس نے کیا تھا۔

میں اب بھی تنہا ہوں اور فردوس کی یادوں کو سینے سے لگائے جی رہا ہوں۔ میں اب بھی اس آس اور امید میں ہوں کہ شاید کبھی وہ حسن کی دیوی مجھ پر مہربان ہو جائے۔ میں نہیں جانتا...... کہ فردوس کون تھی۔ اس کا تعلق کس دنیا سے تھا۔ وہ مجھ پر کیوں مہربان ہوئی اور مجھے کس جرم کی پاداش میں مردانگی سے محروم کر دیا۔

☆☆☆

دوسرا قصہ حیرت

پری زاد

وقاص حسین

اُس نوجوان کی سچی بپتا، جسے ایک پری زاد نے چاہا اور......




''میں گھر جارہا ہوں تم جب پارٹی سے فری ہو جاؤ گی تو مجھے کال کر دینا۔ میں آ کر لے جاؤں گا۔'' میں نے اپنی بیوی کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

''کیوں تمہیں کیا ہوا؟ تم کیوں جارہے ہو؟''

''وہ میری طبیعت اچانک گھبرانے لگی ہے۔''

میری بیوی نے ایک نظر میرے چہرے پر ڈالی تھی اور پھر میری نظروں کا رُخ دیکھا تھا۔ جو سامنے اسٹیج پر کھڑی سفید سوٹ میں ملبوس لڑکی پر ٹکی ہوئی تھی۔ وہ لڑکی بے حد حسین تھی۔ بال اس نے کھلے چھوڑ رکھے تھے جو اس کو اور بھی حسین بنارہے تھے۔

میری نظروں کا رُخ دیکھ کر میری بیوی فوری سمجھ گئی تھی کہ مجھے کیا ہوا ہے کیونکہ وہ مجھ کو مجھ سے بہتر نہیں بلکہ بہت زیادہ بہتر طور پر جانتی تھی۔ وہ اس لیے کہ اس نے اپنی زندگی کی دس بہاریں میرے ساتھ گزاری نہیں بلکہ جی تھیں۔

''نہیں آپ رکو میں سونیا (سہیلی کا نام جس کی بیٹی کی سال گرہ تھی) کو بتا کر آتی ہوں پھر اکٹھے چلتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے تم بتا کر آجاؤ میں باہر انتظار کرتا ہوں۔'' مجھ سے ایک پل بھی وہاں اور کھڑے ہونا محال ہو رہا تھا۔

مجھے گاڑی میں بیٹھے تھوڑی دیر ہی گزری تھی جب مجھے میری بیوی بیٹے کے ساتھ گاڑی کی طرف آتی دکھائی دی۔ میں جو گاڑی کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا تھا۔ آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھول کر اپنی بیوی کو بیٹھنے کے لیے کہا تو اس نے خود بیٹھنے کی بجائے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔

''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ گاڑی میں ڈرائیو کرتی ہوں۔'' میں نے کسی بچے کی طرح اس کا حکم مان لیا تھا۔ میری بیوی نے پچھلا دروازہ کھول کر بیٹے کو بٹھایا اور پھر آ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ میں نے سیٹ کی بیک کے ساتھ سر ٹکا لیا اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔

میری آنکھوں کے سامنے دلشاد کا شاد سا چہرہ آن کھڑا ہوا تھا۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ میں جب بھی کسی حسین لڑکی کو سفید کپڑوں اور کھلے بالوں میں دیکھتا تھا میری طبیعت ہمیشہ خراب ہو جاتی تھی اور پھر دلشاد یاد آنے لگتا تھا۔

اور پھر دل میں افسوس جاگ اٹھتا تھا کہ کاش میں سب کچھ، سب کو بتا دیتا تو آج شاید دلشاد ہمارے



درمیان ہوتا۔ سب کو نہ سہی کم از کم ماموں کو ہی بتا دیتا تو دلشاد کے ساتھ ایسا کچھ نہ ہوتا اور شاید زندگی ایسی نہ ہوتی۔

مجھے لگتا ہے جب سے دلشاد گیا ہے میں نے زندگی جی نہیں ہے بلکہ گزار رہا ہوں۔ بلکہ اک میں نہیں اور بھی بہت سے لوگ ہیں جو زندگی کو جیا کرتے تھے جب دلشاد ہمارے درمیان ہوا کرتا تھا لیکن اب تو وہ بھی صرف زندگی کو گزار ہی رہے ہیں۔

میں نے ایک گہرا سانس لے کر چھوڑا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھومنے لگا تھا جب میں بھی زندگی کو جیا کرتا تھا۔ آنکھوں کے سامنے بارہ سال پہلے کے منظر گھومنے لگے تھے۔

☆......☆......☆

آج میرے فورتھ ایئر کے پیپر ختم ہوئے دو دن ہو چکے تھے اور ان دو دنوں میں، میں نے کسی کام کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ بس ایک ہی کام کیا تھا اور وہ تھا نیندیں پوری کرنے کا ان دو دنوں میں، میں خوب سویا تھا اور آج تیسرے دن میں نے ہاتھ کھڑے کر دیے تھے اور اعلان کر دیا تھا کہ میں گاؤں جا رہا ہوں نانی کے پاس...... اور مجھے کوئی روکنے کی کوشش بالکل بھی نہ کرے۔ کیونکہ میں رکنے والا نہیں۔"

دراصل میں پچھلے چار سال سے نانی جان کے پاس نہیں گیا تھا۔ اور وجہ صرف یہی پڑھائی تھی۔ لیکن اس بار میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ جانا ضرور ہے اور ویسے بھی گرمیوں کا اصل مزہ ننھیال میں ہی آتا ہے اور اگر ننھیال گاؤں میں ہو تو پھر تو مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔

میری بات سنتے ہی اماں جی کا بی پی ہائی ہو چکا تھا۔ دو دن وچ ای عقل ٹھکانے آ جائے گی۔ جب گرمی لگے گی تو شام کو ہی واپسی ہو جائے گی۔ یہاں تو اے سی نیچے سکون کر رہے ہو۔"

دراصل نانی لوگوں کو اے سی پسند نہیں تھا اس لیے انہوں نے اے سی نہیں لگوایا تھا۔

اور ویسے بھی اب بھولی اماں کو کیا پتا کہ میں نے کون کون سے پلان بنا رکھے تھے۔ مثلاً نہر میں نہانا،

کچے آم کھانا، مزے مزے کے کھیل۔ اگر میرے پلان کی اماں جی کو ذرا سی بھی بھنک پڑ جائے تو سر میں جوتے سو ماریں اور گنے ایک۔ بہر حال میں شام تک اپنا سامان پیک کر چکا تھا اور صبح کی ٹرین سے گاؤں جا رہا تھا۔ اور چھوٹے بھائی کو منہ بسورتے چھوڑ کر آتا تھا اور جب اس سے کچھ نہ بن سکا تو مجھے بددعاؤں سے نوازنے لگا۔

''اللہ کرے تمہیں سیٹ ہی نہ ملے یا پھر جب تم اسٹیشن پر جاؤ تو ٹرین جا چکی ہو۔''

چار سال کے بعد ٹرین کا سفر بڑا مزہ دے رہا تھا۔ ساڑھے تین گھنٹے کا سفر کھڑے ہو کر کرنا تھا۔ کیونکہ جلدی کی وجہ سے سیٹ بک کروا نہیں سکا تھا۔ اب میں ٹرین کو ناپنے میں لگا ہوا تھا کہ ایک ڈبے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں.....

اور پھر سامنے سے آتے سپاہی کو دیکھ کر کچھ سکون کا سانس آیا۔ پچاس کا نوٹ سپاہی کو دیا اور جناب نے ہم پر احسان کیا اور ایک سیٹ پر جا بٹھایا۔ ابھی بیٹھے دس منٹ بھی مشکل سے گزرے ہوں گے کہ تڑاخ کی آواز گونجی، پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک لڑکا گال پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا اور ایک لڑکی خونخوار نظروں اُسے گھور رہی تھی۔ آس پاس کھڑے لوگ کچھ مسکرا کر اور کچھ حیران نظروں سے اُدھر دیکھ رہے تھے۔ باقی کا سفر اللہ کا شکر ہے سکون سے گزرا۔ بس ٹرین نے ساڑھے تین کی بجائے پانچ گھنٹوں میں پہنچایا تھا۔ جس پر میں رب کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا تھا کہ پانچ گھنٹوں میں پہنچا تو دیا میں تو اسی خوشی میں شکرانے کے دو نفل بھی نیت کر چکا تھا ورنہ جو حالات چل رہے تھے میں نے سنا تھا لوگ دو دو دن کا کھانا لے کر ٹرین میں سوار ہوتے ہیں۔

ٹرین سے اُتر کر اسٹیشن سے باہر آیا وہاں سے رکشے کے ذریعے راوی اڈے پہنچا۔ اور بس میں سوار ہوا۔ یہاں سے آگے آدھے گھنٹے کا سفر تھا جو بس نے ایک گھنٹے میں طے کیا تھا۔ اسٹاپ پر اُتر کر اب میں گھر کی طرف جا رہا تھا۔ گاؤں میں زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی ماسوائے روڈ کے جو پہلے کچا تھا اور اب اس کی جگہ اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔

چلتے چلتے میں گھر کے دروازے پر پہنچ چکا تھا کہ اچانک مجھے ایک شرارت سوجھی۔ ویسے تو گاؤں میں ہر ایک کے گھر کا دروازہ کھلا ہی ہوتا ہے یہ صرف شہروں میں ہوتا ہے کہ دروازے بند رکھے جاتے ہیں میں نے دروازے پر دستک دی اور اب دعا کرنے لگا کہ یا اللہ وہی آئے، وہی آئے...... ''آخر میری دعا رنگ لائی اور اندر سے ایک پیاری سی آواز گونجی تھی۔

''جی کون ہے؟''

''بی بی جی کھانے کو کچھ ملے گا، بھوکا ہوں صبح سے۔'' میں نے آواز تبدیل کر کے صدا لگائی تھی۔ اندر سے آواز آئی۔

''جی اچھا بابا ابھی لائی۔'' میں باہر کھڑا مسکرا رہا تھا اس کو پاگل بنانے پر۔

تھوڑی دیر بعد ہاتھ باہر نکلا تھا ہاتھ میں آٹے سے بھری پلیٹ تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا۔ ہاتھ گھوما تھا اور سارے کا سارا آٹا میرے سر میں اور منہ پر تھا۔ اندر سے زوردار قہقہہ بلند ہوا تھا۔ اور پھر بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی تھی۔ میں بندر بن چکا تھا۔

''راحیلہ تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔'' میں دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوا تھا۔

''امی کاشی......'' وہ کہتی ہوئی کمرے میں گم ہوگئی اور پیچھے سے دروازہ بند کر لیا۔ میں جو اس کے پیچھے بھاگا تھا صحن کے درمیان میں رک گیا تھا۔ چھوٹی مامی راحیلہ کی آواز سن کر کمرے سے باہر آئی تھی۔ صحن کے درمیان میں مجھے کھڑا دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ شاید مامی نے راحیلہ کی آواز صحیح طرح سے سنی نہیں تھی۔

منہ اور سر تو آٹے سے اٹا پڑا تھا۔ میرے کندھے پر سفری بیگ دیکھ کر کچھ کچھ سمجھیں۔ جب صورت حال سمجھ میں آئی تو مجھے گلے لگا لیا۔

''یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟'' مامی پوچھنے لگیں۔

''میں نے نہیں بنائی یہ آپ کی نواب زادی کا

کام ہے۔''

''اس کا مطلب تم نے پھر کوئی شرارت کی۔ تم دونوں باز نہ آنا اپنی حرکتوں سے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں چھوڑوں گا نہیں اس کو، ایسے کرتے ہیں مہمانوں کو ویلکم۔'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے میرے سر پر چپت لگائی۔

''مامی نانا، نانی کہاں ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''وہ اندر آرام کر رہے ہیں تم پہلے نہالو پھر کسی اور سے ملنا ورنہ میری طرح وہ بھی تمہیں بھوت سمجھ کر ڈر جائیں گے۔'' مامی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم اِدھر دلشاد کے کمرے میں اپنا سامان رکھ کر کپڑے نکال لو، میں تمہارے لیے کھانا بناتی ہوں۔''

میں کمرے میں گیا، کپڑے نکالے، واش روم میں چلا گیا۔ نہا کر باہر نکلا تو مامی پوچھنے لگیں۔

''کھانا کہاں کھاؤ گے کمرے میں یا باہر بیٹھ کر۔''

''جی باہر۔'' میں نے جواب دیا اور صحن میں نیم کے درخت کے نیچے بچھی چارپائی پر بیٹھ گیا اور کہا۔

''یہاں پر ہی لے آئیں۔''

تھوڑی دیر بعد ہی میری فیورٹ کچے آم کی چٹنی میرے سامنے تھی اور پھر کھانے کا مزا آ گیا۔ مامی برتن اٹھانے آئیں تو میں نے انہیں کہہ دیا کہ میں باقی سب لوگوں سے شام کو ملوں گا۔ میں ابھی سونے کے لیے کمرے میں جا رہا ہوں۔

''جیسے تمہاری مرضی۔'' مامی کہہ کر چلی گئیں۔

میں اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس کے یعنی کہ راحیلہ کے کمرے کے سامنے رکا اور کہا۔

''بخشوں گا نہیں تمہیں۔'' اندر سے زبردست قہقہہ بلند ہوا تھا۔ اور میں منہ بسورتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گیا۔ تھوڑی دیر راحیلہ کو سبق سکھانے کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر نیند کی وادیوں میں اُتر گیا۔

☆......☆......☆

جب میری آنکھ کھلی تو گھڑی چھ بجا رہی تھی۔ سورج سونے کے لیے اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ

چکا تھا۔ پہلے تو میں دس منٹ آنکھیں بند کر کے لیٹا رہا پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ باہر اُٹھ کر جاؤں۔ بشارت اندر آ گیا۔ (بڑے ماموں کا بیٹا) میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا تو میرے ذہن میں دوپہر والا سارا واقعہ پھر تازہ ہو گیا اور میں ایک بار پھر خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اور دل میں کہا ''اس کی تو ایسی خبر لوں گا کہ ساری عمر یاد رکھے گی۔''

''اچھا اس کی خبر بعد میں لینا پہلے باہر چلو بڑی شدت سے جناب کا انتظار ہو رہا ہے۔'' میں نے حیران نظروں سے بشارت کی طرف دیکھا تھا کہ دل میں کہی بات اس نے کیسے سن لی وہ تو بعد میں غور کرنے پر معلوم ہوا کہ دل میں کہی بات زبان سے بھی ادا ہو گئی تھی۔ میں تھوڑا سا شرمندہ ہوا تھا لیکن صرف دل میں اس کا اندازہ بشارت کو نہیں ہوا تھا۔

''پہلے بھی دو چکر لگا گیا ہوں لیکن جناب کو ہوش ہی نہیں تھا۔ سارے گدھے گھوڑے بیچ کر تم سو رہے تھے۔'' بشارت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں بشارت کے ساتھ باہر نکلا تو سب گھر والے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے اور میری طرف دیکھ کر سب مسکرانے لگے تھے اور میں سمجھ گیا تھا اس ہنسی کا مطلب۔ میں بھی مسکراتے ہوئے نانی کی طرف بڑھ گیا۔ ویسے بھی میں نے شرمندہ ہونا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔ میرا تو بس نہیں چل رہا تھا ورنہ راحیلہ کا کچومر بنا دینا تھا میں نے اب تک۔ میں نے راحیلہ کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور جا کر نانی کے گلے لگ گیا۔ نانی نے میرا ماتھا چوم کر پیار دیا اور پھر میں نانا جی کو ملا، اس کے بعد باری باری سب سے مل کر ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔

وہاں سب ہی موجود تھے صرف دلشاد کو چھوڑ کر...... میں نے پاس بیٹھی طاہرہ (بڑے ماموں کی بڑی بیٹی) سے پوچھا۔

''دلشاد کہاں ہے وہ نظر نہیں آ رہا۔''

''وہ ڈیرے پر ہے بس آتا ہی ہوگا۔'' طاہرہ نے جواب دیا۔

نانی، امی کا حال احوال پوچھنے لگیں کہ وہ کیسی تھیں۔

''وہ سب ٹھیک تھے آپ سب کو سلام دعا دے رہے تھے۔'' میں نے جواب دیا۔

''سلام تو ٹھیک ہے، دعا کون سی دے رہے تھے۔'' راحیلہ نے ٹکڑا لگایا۔ میرے گھور کر دیکھنے پر راحیلہ مسکرائی تھی۔

ایک کنال کے اس گھر میں دونوں ماموں اکٹھے رہتے تھے۔ دونوں بھائیوں میں حد سے زیادہ محبت تھی۔ ایک جان دو قالب والی بات ان پر صادق آتی تھی۔ بڑے ماموں تھوڑے سے غصے والے تھے اور چھوٹے ماموں کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ ماموں کم اور دوست زیادہ تھے۔ چھوٹی مامی اور بڑی مامی آپس میں ایسے رہتی تھیں جیسے بہنیں ہوں۔ ان دونوں کی محبت کے پیچھے ایک راز چھپا تھا۔ ہوا ایسا کہ جب بڑے ماموں کی شادی ہوئی تو بڑے ماموں نے مامی اور نانی کو دوسرے ہی دن ایک دوسرے کو سامنے بیٹھا کر کہا کہ آج کے بعد میں نہ اپنی ماں کی کوئی بات سُن کر تمہیں کچھ کہوں گا اور نہ ہی تمہاری کوئی بات سن کر اپنی ماں کو کچھ کہوں گا۔ آپ دونوں لڑائی کریں۔ جھگڑا کریں میں آپ دونوں کے درمیان نہیں آؤں گا۔ جیسے آپ اپنی بیٹی سے اور آپ اپنی ماں سے لڑائی کر کے شام تک پھر ویسی کی ویسی ہو جاتی ہیں۔ ایسا ہی اب بھی ہونا چاہیے۔ آپ دونوں کو فری ہینڈ ہے۔ آپ دونوں جو مرضی کریں لیکن شام تک دونوں مجھے ہنستی ہوئی ملنی چاہئیں۔''

اور پھر جب چھوٹے ماموں کی شادی ہوئی تو کچھ ایسی ہی باتیں چھوٹے ماموں نے نانی بڑی مامی اور چھوٹی مامی کے سامنے دہرائی تھیں۔ اور دوسرا بچوں کی وجہ سے اگر اس گھر میں لڑائی ہوئی تو ہم سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہماری آدھی سے زیادہ زندگی لڑائی جھگڑوں میں گزر جائے۔''

کچھ ایسی ہی باتیں امی نے مجھ سے بھی کہی تھیں۔

بڑے ماموں کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی جبکہ چھوٹے ماموں کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔

دلشاد مغرب کے بعد گھر میں داخل ہوا تھا۔ اس کو دیکھ کر میں پہچان نہیں پایا تھا۔ جب غور کیا تو تب معلوم ہوا دلشاد ہی ہے۔ میں اُٹھ کر تیزی سے دلشاد کی طرف بڑھا تھا اور پھر جب دلشاد کی مجھ پر نظر پڑی تھی تو وہ بھی بھاگ کر میری طرف آیا تھا۔

ہم بڑی گرم جوشی سے ملے۔ اور میرا پہلا سوال یہی تھا کہ ''تمہیں کیا ہوا۔'' کیونکہ یہ دلشاد ویسا تو تھا ہی نہیں جیسا ایک سال پہلے تھا۔

''کچھ نہیں مجھے کیا ہونا ہے۔'' دلشاد نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ''ہم تو ویسے ہی ہیں جناب البتہ تم بدلے بدلے لگ رہے ہو۔'' دلشاد نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تھا۔

ہم آ کر دوبارہ چارپائی پر بیٹھ گئے تھے لیکن میری حیرانگی ابھی تک ختم نہیں ہو رہی تھی۔ دلشاد کو دیکھ کر...... کیونکہ دلشاد کافی کمزور ہو گیا تھا پہلے سے اور چہرے پر موجود دو تین زخموں کے گہرے نشان...... دلشاد کے ساتھ کوئی حادثہ تو نہیں ہوا جس کا یہ نتیجہ ہو لیکن میرے ذہن میں زور ڈالنے پر بھی مجھے ایسا کچھ یاد نہیں آیا تھا۔ جس میں دلشاد کے ساتھ حادثے کی خبر ہو۔ دلشاد کافی خاموش بیٹھا ہوا تھا ورنہ وہ تو ایسا تھا ہی نہیں۔ وہ تو گھر میں داخل ہوتے سب کی ناک میں دم کر دیتا تھا۔ میں نے جب سے دلشاد کو دیکھا تھا میں پریشان ہو گیا تھا۔ پہلے والا دلشاد مجھے کہیں نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

شام کا کھانا کھاتے ہی میں چھت پر چلا آیا۔ کیونکہ میں جب بھی گاؤں آتا تھا ہمیشہ سے چھت پر ہی سوتا تھا۔ کیونکہ تاروں بھری رات اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا شہر میں کہاں نصیب ہوتی تھی۔ میرے ساتھ طاہر اور بشارت بھی تھے دلشاد کو ماموں نے کسی کام کے لیے بھیج دیا تھا۔ میں بشارت سے دلشاد کے بارے میں پوچھے بنا نہیں رہ سکا تھا۔

''یار یہ اپنے دلشاد کو کیا ہوا ہے۔ ایک دم سے بدل گیا ہے اور کیا عجیب سی حالت بنا رکھی ہے۔ نہ ہنسی نہ مذاق ایک دم خاموشی۔''

''پتا نہیں یار! پچھلے سات آٹھ ماہ سے ایسا ہو گیا ہے۔ پے در پے تین چار چوٹیں لگنے کے بعد سے چپ ہو گیا ہے۔''

''چوٹیں...... کیسی چوٹیں۔''

''وہ ایک دو بار درخت سے گر گیا تھا۔ ایک بار ٹریکٹر لے کر جا رہا تھا۔ وہ ایک سائیڈ کی طرف الٹ گیا۔ ایسے ہی تین چار چوٹیں آ گئی ہیں۔ اس کے بعد سے سنجیدہ سا ہو گیا ہے۔ ایک دو بار میں نے پوچھا تھا کہ یار کوئی مسئلہ ہے تو بتا دو لیکن کہنے لگا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ بچوں والی حرکتیں کرتا اچھا نہیں لگتا۔''

''ہوں......'' میں نے ایک گہری سانس لی تھی۔

''کہیں کسی لڑکی ڑکی کا چکر تو نہیں۔'' میں پُرسوچ انداز میں بولا تھا۔

''پتا نہیں یار! میں پوچھ پوچھ کر تھک گیا ہوں۔ لیکن مجھے تو کچھ نہیں بتاتا۔ تو کوشش کر۔ تیرا تو جگری یار ہے۔ شاید تیرے ساتھ کھل کر بات کرے۔''

''ہوں...... کرتے ہیں کچھ نا کچھ۔''

طاہر تھوڑی دیر ہمارے پاس بیٹھا رہا پھر اُٹھ کر نیچے چلا گیا اور ہم دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ بظاہر تو ہم باتیں کر رہے تھے لیکن میرے ذہن میں بس دلشاد گھوم رہا تھا۔ وہ پرانا والا ہنستا ہوا شور مچاتا ہوا اور اب والا بھی۔ کتنا فرق تھا ان دونوں میں، میں سوچ کر رہ گیا تھا۔

بشارت کو نیچے سے مامی نے آواز دی تھی کہ آ کر دودھ لے جاؤ۔ بشارت نیچے چلا گیا تھا اور میں چھت پر واک کرنے لگا تھا اور ساتھ ہی دلشاد کے بارے میں سوچنے لگا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن میں نے ناشتا کیا اور باہر نکل آیا۔ باہر آ کر نانی کو بتایا کہ میں ڈیرے پر جا رہا ہوں۔ گھر سے ڈیرہ زیادہ دور نہیں تھا بس کچھ ایکڑ کا فاصلہ تھا۔ ویسے تو ڈیرے تک کچی سڑک بھی جاتی تھی لیکن وہ راستہ لمبا تھا اس لیے میں کھیتوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے ڈیرے پر پہنچا تھا۔ ماموں اور کزن اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔

بس مامی اور طاہرہ ڈیرے پر موجود تھے۔ طاہرہ آم کچے چرنے میں لگی ہوئی تھی جبکہ مامی قریبی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھیں۔

ساڑھے بارہ کے قریب سب اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر ڈیرے پر آ گئے تھے۔ اور میں اتنی دیر میں نہر میں نہانے کا پروگرام ترتیب دے چکا تھا۔ اور پھر میں نے سب کو آگاہ کر دیا تھا۔ سب راضی ہو گئے جبکہ دلشاد کہنے لگا کہ تم چلو میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔'' نہر زیادہ دور نہیں تھی بس ایک ایکڑ کے فاصلے پر تھی۔ نہر کافی بڑی اور گہری تھی۔

الٹ بازی لگاتے ہوئے ہم تینوں نہر میں کودے تھے۔ اور پھر باری باری باہر نکلے تھے اور نہر کے اوپر جھکے درخت کے اوپر چڑھ گئے تھے۔ اور پھر باری باری اس کے اوپر سے چھلانگ لگائی تھی۔

''یار کافی دیر ہو گئی ہے دلشاد نہیں آیا۔'' میں نے اپنے دوسرے کزنز سے کہا۔

''کسی کام میں لگ گیا ہوگا۔'' طاہر نے اس کے نہ آنے کے بارے میں اپنا خیال بیان کیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نہر سے باہر نکلا تھا اور میں نے دونوں کزنز کو بتایا تھا کہ میں آم لینے کے لیے جا رہا ہوں باغ سے اور ساتھ ہی دلشاد کو لے آؤں گا۔''

انہوں نے اپنے لیے بھی لانے کے لیے کہا تھا۔ میں اُن کو گرین سگنل دے کر باغ کی جانب چل پڑا تھا۔ باغ زیادہ دور نہیں تھا نہر سے، بس دو کھیت چھوڑ کر ہی تھا۔

میں اپنے ہی خیالوں میں باغ میں داخل ہوا تھا۔ جیسے ہی باغ میں داخل ہوا ایک خوشگوار خوشبو کا احساس میری روح میں اُترا تھا، میں ایک لمحے کے لیے کھو سا گیا تھا۔

اس خوشبو سے مجھے ایک بات کا اندازہ ہو گیا تھا وہ یہ کہ دلشاد باغ میں ہی کہیں آس پاس ہے کیونکہ وہ خوشبوؤں کا دیوانہ تھا۔ ایک پل بھی خوشبو کے بغیر اس کا گزارہ نہیں تھا۔ میں اکثر اس سے پوچھتا تھا کہ یار تم اتنی خوشبو برداشت کیسے کر لیتے ہو۔ میرے تو سر

میں درد ہونے لگتا ہے۔'' اور وہ تھا کہ پوری پوری بوتل اپنے اوپر انڈیل لیتا تھا۔

دلشاد نے بہت زیادہ پرفیوم جمع کر رکھے تھے اور وہ ایک ہی پرفیوم کو لگاتار استعمال نہیں کرتا تھا۔ وہ روز بدل بدل کر پرفیوم استعمال کرتا تھا۔ اور اس کی لاجک وہ یہ بتاتا تھا کہ ایک ہی پرفیوم روز لگانے سے اپنے آپ کو خوشبو محسوس نہیں ہوتی۔

میں ایک میٹھے آم کے درخت پر چڑھ گیا تھا۔ اور پھر ایک آم توڑ کر ایک قریبی مضبوط ٹہنی پر بیٹھ گیا تھا۔ اور آم کھانے لگا تھا۔ اور ساتھ ہی اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ دائیں طرف مجھے چارپائی پر دلشاد نظر آیا۔ میں جس آم کے درخت پر تھا وہ اس سے کافی فاصلے پر تھا لیکن صاف نظر آ رہا تھا۔

دلشاد کو دیکھ کر میری نظر اس پر ٹھہر گئی تھی اور میں آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ میں آپی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے مسل رہا تھا لیکن منظر نہیں بدلا تھا۔ میں نے اس عمل کو دو تین بار دہرایا تھا لیکن منظر ویسے کا ویسا ہی تھا۔ میں کافی حیران ہوا تھا دلشاد کو دیکھ کر کیونکہ حیران ہونے والی بات بھی تھی۔

دلشاد چارپائی پر کچھ اس طرح سے لیٹا ہوا تھا جیسے سر کے نیچے گاؤ تکیہ ہو۔ لیکن وہاں تکیہ تھا ہی نہیں۔ لیکن دلشاد کا سر بلند تھا چارپائی سے کافی اوپر اور دلشاد بڑے سکون کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔

میں تقریباً پانچ منٹ دیکھتا رہا لیکن دلشاد ویسے کا ویسا ہی لیٹا رہا۔ میں جلدی سے درخت سے نیچے اُترا تھا اور آہستہ آہستہ دلشاد کی طرف بڑھا تھا۔ تھوڑا سا قریب گیا تو میں نے دیکھا دلشاد بالکل نارمل حالت میں لیٹا ہوا تھا۔

وہ میرا وہم تھا یا اس میں کوئی حقیقت تھی، میں ان کے درمیان فرق نہیں کر پا رہا تھا۔ شاید گرمی کا اثر ہو۔ میں خود پر اور اپنی سوچ پر ہنسا تھا بھلا ایسا بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ میرا بھی دماغ چل گیا ہے۔ میں خود پر مسکراتے ہوئے دلشاد کی طرف بڑھا تھا۔ ایک چیز میرے دماغ نے محسوس کی تھی اور مجھے آگاہ کیا تھا وہ یہ کہ جو خوشبو تھوڑی دیر پہلے میں نے محسوس کی تھی اب وہ نہیں رہی تھی۔ میں نے اس کو بھی اپنا وہم سمجھا تھا کیونکہ خوشبو ہو یا بدبو ہو جلد ہی دماغ میں رچ بس جاتی ہے اور محسوس ہونا بند ہو جاتی ہے۔ میں نے بھی یہی خیال کیا تھا۔ اور دلشاد کی طرف بڑھ گیا تھا۔

☆......☆......☆

اچانک میرے ذہن میں دلشاد کی ڈائری گھومی تھی۔ مجھے یاد آیا تھا کہ دلشاد باقاعدگی سے ڈائری لکھتا تھا اور وہ بھی جنون کی حد تک۔ وہ کھانا کھانا بھول سکتا تھا لیکن ڈائری لکھنا نہیں۔ دلشاد ڈائری ہر روز رات کو لکھ کر ہی سوتا تھا۔ ضرور وہ اب بھی لکھتا ہوگا۔

جیسے ہی میرے ذہن میں آیا تھا میں جلدی سے اٹھا تھا۔

☆......☆......☆

میں نے کمرے کی ایک ایک چیز اِدھر اُدھر کر کے رکھ دی تھی۔ لیکن مطلوبہ چیز ابھی تک نہیں ملی تھی۔ کچھ پرانی ڈائریاں ہاتھ لگی تھیں لیکن وہ میرے کسی کام کی نہیں تھیں۔ جب کافی دیر دوڑ دھوپ کے بعد کچھ ہاتھ نہ لگا تو میں تھک ہار کر بیٹھ گیا اور پھر اچانک ایک خیال آنے پر میں جلدی سے اٹھا تھا اور جا کر بیڈ کا گدا الٹ دیا تھا۔ اور پھر میری آنکھیں چمک اٹھی تھیں کیونکہ ایک ڈائری وہاں نظر آ گئی تھی۔ میں نے جلدی سے ڈائری اٹھائی تھی اور آ کر کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور اب دعا کرنے لگا تھا کہ یہ وہ مطلوبہ ڈائری ہی ہو۔

میں نے جلدی سے ڈائری کھولی تھی لیکن اگلے ہی پل ساری خوشی خاک ہو گئی تھی کیونکہ ڈائری پر جو آخری تاریخ درج تھی وہ چھ ماہ پہلے کی تھی۔ اور آگے ساری ڈائری خالی پڑی تھی۔

آخری تاریخ کی جو ڈائری لکھی ہوئی تھی وہ کافی مختصر تھی۔ میں نے یونہی بے خیالی میں ڈائری کی آخری سے دو اوپر والی لائن پڑھی تھی۔ اور میں چونکا تھا۔

''میں شاید آج کے بعد ڈائری نہ لکھ سکوں گا کیونکہ ڈائری سے تو بندہ اپنے دل کی ہر بات شیئر کرتا ہے لیکن اب میں نہیں کر سکتا اور جھوٹ میں لکھ نہیں سکتا

اس لیے بہتر یہی ہے اس کو نہ لکھوں۔''
میں جلدی سے پیچھے کا ورق الٹنے لگا تھا۔ اور تاریخ کے بعد درج لفظوں کو پڑھ کر اندازہ لگا رہا تھا اور پھر ایک پیج پر جا کر رک گیا تھا۔ کیونکہ تاریخ کے بعد 'نئی زندگی' کی ہیڈنگ دی ہوئی تھی۔ میں رک کر اس کو پڑھنے لگا تھا۔
''مجھے لگتا ہے آج میری نئی زندگی کی ابتدا ہوئی ہے کیونکہ آج سے پہلے میں نے زندگی کا یہ روپ دیکھا ہی نہیں جو آج محسوس کر رہا ہوں۔
مجھے لگ رہا ہے کہ مجھے محبت ہوگئی ہے اور وہ بھی پہلی نظر میں..... نہیں لگ نہیں رہا بلکہ دل کو یقین ہو گیا ہے۔ آج جب سے اس کو دیکھا ہے بے وجہ ہی خوش ہوئے جا رہا ہوں۔ چھوٹی چھوٹی بات پر دل مسکرانے کو چاہ رہا ہے۔
آج جب میں مغرب کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکل کر اپنے گھر کی طرف آنے والی سڑک پر آیا تو وہ مجھے نظر آئی تھی۔
اس پر نظر پڑتے ہی مجھے پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔ میں بے اختیار سا ہو گیا تھا اور اسی کو دیکھے جا رہا تھا۔ وہ سفید کپڑوں میں ملبوس تھی۔ سر پر دوپٹا لیا ہوا تھا، صرف اس کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے پرستان کی کوئی شہزادی زمین پر اُتر آئی ہو۔ یا پھر جنت سے کوئی حور آئی ہو۔ میں اپنے ہوش میں نہیں رہا تھا۔
یہ کیا ہوا تھا آج مجھے، مجھے خود سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ایسا پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ میں تو کسی بھی لڑکی کو دیکھ کر آنکھیں نیچی کرنے کا عادی تھا۔ لیکن آج تو سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کیا ہو رہا ہے اور پھر وہ خوشبو جو اُس نے لگائی ہوئی تھی۔ وہ مجھے اور دیوانہ بنا رہی تھی۔
میں نے دیکھا کہ وہ بھی مجھے دیکھ رہی ہے اور اب اس کا رُخ بھی میری طرف ہی ہے۔ میں ایک پل کے لیے ڈر گیا تھا کہ کہیں اب وہ مجھ پر ناراض ہی نہ ہو میرے اس طرح گھورنے پر..... لیکن اس کے باوجود بھی میری آنکھیں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔
وہ میرے پاس آ کر رُکی تھی اور میں بھی رک گیا تھا۔ اور پھر وہ بولی تھی تو اس کی آواز میرے کانوں میں رس گھولنے لگی تھی۔
''مجھے مولوی صاحب کے گھر جانا ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں وہ کہاں ہیں.....؟'' اس نے دوسری دفعہ جب اپنی بات دہرائی تھی تب میں ہوش میں آیا تھا اور تھوڑا سا شرمندہ ہوا تھا۔ اور پھر میں اس کو پتا سمجھانے لگا تھا۔
''کیا آپ مجھے وہاں چھوڑ کر آ سکتے ہیں۔'' میرے خاموش ہونے پر وہ بولی تھی۔ اندھے کیا چاہے دو آنکھیں، میں فوری راضی ہو گیا تھا اور اس کو اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔
میں مولوی صاحب کے گھر کے دروازے پر جا کر رک گیا اور پھر اس کو گہری نظروں کے ساتھ دیکھا۔ اس حور نے میرا شکریہ ادا کیا تھا اور کھلے دروازے سے اندر چلی گئی تھی۔
ہم نے اس کو اتنا دیکھا جتنا دیکھا جا سکتا تھا
لیکن پھر بھی دو آنکھوں سے کتنا دیکھا جا سکتا تھا
اس کے اندر جاتے ہی میں ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا تھا۔ لیکن ہوش میں نہیں رہا تھا۔ میری طرح اس کو بھی لگتا ہے خوشبو بہت پسند تھی اسی لیے تو اس نے اتنی زیادہ لگائی ہوئی تھی۔ لیکن میں پہچان نہیں پایا کہ اس نے کون سی خوشبو لگائی ہوئی تھی۔
شام سے اب تک اس کو کتنی ہی بار تصور کے پردوں پر سجا کر دیکھ چکا ہوں۔ لیکن دل پھر بھی بھر نہیں رہا۔''
اگلے ورق پر دو دن بعد کی تاریخ درج تھی۔
''آج دو دن گزر گئے ہیں لیکن مجھے لگتا ہے جیسے دو صدیاں گزر گئی ہوں۔ میں خود پر حیران ہوں کہ آخر مجھے ہو کیا گیا ہے۔ میں نے ان دو دنوں میں پتا نہیں کتنے چکر لگائے ہیں مولوی صاحب کے گھر کی طرف۔ پہلے تو میں کبھی کبھی نماز پڑھنے کے لیے مسجد جاتا تھا لیکن اب تو باقاعدگی سے جانے لگا ہوں۔ میں اب مختلف بہانے سوچ رہا ہوں مولوی صاحب کے گھر جانے کے لیے اس کی صرف ایک جھلک دیکھنے

کے لیے لیکن میں ابھی تک کوئی بہانہ نہیں سوچ پایا۔
اگلے پیج پر تین دن بعد کی تاریخ درج تھی۔
آج میں اتنا خوش ہوں کہ لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ آج اگر کوئی مجھ سے جان بھی مانگ لے تو میں ایک پل کے لیے بھی نہ سوچوں اور کہوں گا نکال لو۔

ہاں ہاں آج میں اس سے ملا تھا۔
میں مغرب کی نماز پڑھ کر نکلا تھا۔ آج کچھ زیادہ ہی دیر مسجد میں گزار دی تھی اور وجہ تھی وہ دعا جو لمبی ہی ہوتی جارہی تھی۔ اور پھر جب میں مسجد سے نکلا تو مجھے یقین آ گیا کہ جو دعا دل سے مانگی جائے وہ ضائع نہیں قبول ہوتی ہے۔

میں نے مسجد سے نکل کر ایک نظر مولوی صاحب کے گھر کی طرف دیکھا تھا۔ حسرت بھری نگاہوں سے اور اپنے گھر کی جانب چل دیا تھا۔ آج مجھے لگا تھا کہ پھر دعا رنگ نہیں لائی۔

ابھی میں نے کچھ قدم ہی اٹھائے تھے کہ مجھے اپنے پیچھے کسی کے آنے کا احساس ہوا تو میں نے یونہی پلٹ کر دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ میری نظریں واپس پلٹنا بھول گئی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ پری میری طرف چلی آرہی ہے۔ میرے دل کی دھڑکن ایک عجیب سی لے پر دھڑکنے لگی تھی اور وہیں تھم گیا تھا۔ مجھ میں آگے بڑھنے کی طاقت ختم ہوگئی تھی۔ وہ چلتی ہوئی میرے قریب آئی تھی اور پھر رک گئی اور ساتھ میں میرا سانس بھی رک گیا تھا۔ میں اس کو تکنے لگا تھا آج بھی اس نے وہی خوشبو لگائی ہوئی تھی۔

''دلشاد کیسے ہو؟'' اس کے گلاب سے ہونٹ ہلے تھے اور جو لفظ ادا ہوئے تھے میری روح کو سرشار کرنے کے لیے کافی تھے۔ حیران ہونے والی بات یہ بھی تھی کہ وہ میرا نام جانتی تھی لیکن میں اس پر حیران نہیں ہوا تھا حیران تو اس پر ہوا تھا کہ اس نے مجھے مخاطب کیا تھا۔

''اب بہت اچھا ہوں۔'' میں نے کیا کہا تھا۔ مجھے خود اس کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ میرا جواب سن کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری تھی۔

''کیا ہم تھوڑی دیر بات کرسکتے ہیں۔'' اس پری نے پوچھا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا وہ میرا مطلب سمجھ گئی تھی۔

''چلو تمہارے کھیتوں کی طرف چلتے ہیں۔'' اور پھر میں کسی روبوٹ کی طرح چل پڑا تھا۔

آدھا راستہ طے ہو چکا تھا لیکن ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بولا تھا بس خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اور پھر وہ بولی تھی۔ جسے سن کر میں خوشی سے بے حال ہوگیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کو بھی مجھ سے محبت ہوگئی ہے۔ اسی پل سے جب اس نے مجھے پہلی بار دیکھا تھا۔ کسی مجبوری کی وجہ سے وہ اتنے دن نہ مل سکی تھی اس سے۔

اور پھر ہم چلتے ہوئے نہر پر آگئے تھے۔ میں بہت کم بولا تھا وہ بول رہی تھی اور میں اس کو سن رہا تھا اور اس کو دیکھے جارہا تھا۔ دل کررہا تھا کہ زندگی بس یہیں پر ٹھہر جائے آگے نہ بڑھے۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ تو تب معلوم ہوا جب گاؤں سے عشاء کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ پھر ہمیں معلوم ہوا کہ کافی دیر ہوگئی ہے اور پھر ہم وہاں سے اُٹھ آئے اور میں نے اس کو مولوی صاحب کے گھر چھوڑ دیا اور خود مسجد کے اندر چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے کل پھر ملنے کے لیے کہا تھا۔ اس کی بات سن کر میرا دل خوشی سے جھوم ہی گیا تھا۔

اگلے ورق پر دس دن بعد کی تاریخ درج تھی۔
میں اور گل اب روز ملنے لگے ہیں۔ ''گل'' میں نے اس کا نام رکھ دیا ہے کیونکہ وہ مجھے گل کی طرح ہی ملتی ہے مہکتی ہوئی اس سے بہتر مجھے نام ملا ہی نہیں۔
کچھ دن پہلے گل نے مجھ سے اچانک پوچھا ''کیا تم میرے ساتھ زندگی بھر رہو گے۔''

میں نے بنا سوچے کہہ دیا تھا کہ ہاں میں تمہارے ساتھ عمر بھر رہوں گا۔'' میرا جواب سن کر وہ مسکرائی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں اُداسی کی ایک جھلک اُتر آئی تھی۔ اور میں اس بات کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ لیکن مجھے آج لگتا ہے کہ اس کی زندگی کے ساتھ کوئی راز جڑا ہے جس کی وجہ سے وہ اس دن اُداس

ہوئی تھی کیونکہ میں نے آج اس سے اس کے بارے میں پوچھا تھا وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے اور کب تک یہاں رہے گی۔'' اتنے دن سے تو میں اس سے کچھ پوچھ ہی نہیں پایا تھا۔ میری بات سُن کر وہ بولی تھی۔

'' دلشاد جھوٹ میں تم سے بول نہیں سکتی اور سچ میں کہہ نہیں سکتی کیوں کہ مجھے ڈر ہے کہ تم سچ سن کر مجھے چھوڑ دو گے۔ مجھ سے دور بھاگنے لگو گے۔ اور میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی کیونکہ تم بن میں جی نہ پاؤں گی۔ لیکن میں تمہیں سچ بتاؤں گی کیونکہ محبت کا یہی تقاضہ ہے۔ پر آج مجھے خوشی سے جی لینے دو میں کل تمہیں سب کچھ بتادوں گی۔''

اور پھر عشاء کی اذان ہونے لگی تھی اور ہم اُٹھ کر گاؤں کی طرف چل پڑے تھے۔

میں اب تک سوچ چکا ہوں کہ جو کچھ بھی ہوجائے، وہ جیسی بھی ہو، جہاں سے بھی اس کا تعلق ہو، میں اس کو چھوڑوں گا نہیں۔ میں اس کا ساتھ آخری دم تک نبھاؤں گا راستے میں نہیں چھوڑوں گا کیونکہ محبت کا یہی تقاضہ ہے۔

اگلے پیج پر اگلے دن کی تاریخ تھی اور یہ وہی پیج تھا جس کی آخری لائن میں نے پڑھی تھیں۔

یہ آگاہی بھی کتنا بڑا عذاب ہوتی ہے، میں نے اب جانا تھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان جو جاننے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دیتا ہے۔ جب وہ جان جاتا ہے تو پھر وہ سوچتا ہے کہ کاش وہ یہ نہ جان پاتا تو اچھا تھا۔ وہ انجان ہی رہتا تو اچھا تھا۔ آج اس نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ ایک ایک بات کھول کر میرے سامنے رکھ دی تھی اور آخر میں اس نے کہا تھا۔

'' دلشاد تم جو فیصلہ کرو گے مجھے منظور ہوگا۔ میں ایک پل کے لیے بھی شکوہ نہیں کروں گی۔ کیونکہ تم کہاں میں کہاں لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ میں تمہارے بغیر شاید جی نہ سکوں گی۔ مرہی جاؤں گی۔'' میں نے فوری اس کے منہ پر رکھا تھا۔

'' مرنے کی بات اب دوبارہ نہ کرنا۔'' مجھے خود معلوم نہیں ہوا تھا کہ مجھ میں یہ جرأت کیسے پیدا ہوگئی تھی۔ شاید اس لیے کہ میں اس کو رنجیدہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آج سے پہلے میں نے اس کے ہاتھ کو بھی نہیں چھوا تھا۔ میں نے اس کا خوف دور کردیا تھا کہ میں اس کو کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ میرے الفاظ سُن کر اس کو جو خوشی ملی تھی، اس کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں کیسے بیان کروں۔ میری بات سُن کر وہ آگے بڑھی تھی اور مجھے گلے سے لگالیا تھا اور یوں لگایا تھا جیسے ہم برسوں بعد ملے ہوں اور ملن کی پیاس نہ بجھ رہی ہو۔

مجھے اپنے کندھے پر نمی محسوس ہوئی تھی اور پھر مجھے معلوم ہوا کہ وہ رو رہی تھی۔ میں نے اس کو خود سے علیحدہ کیا اور پھر دونوں ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کردیے تھے اور پھر کبھی نہ رونے کا وعدہ لیا تھا۔

مجھے معلوم ہے کہ کوئی بھی نارمل انسان سنے گا تو مجھے پاگل کہے گا۔ لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے تو بس اب محبت کا مان رکھنا ہے مجھے اب محبت کو نبھانا تھا چاہے کچھ بھی ہوجائے۔

میں شاید آج کے بعد ڈائری نہ لکھ سکوں گا کیونکہ ڈائری سے تو بندہ اپنے دل کی ہر بات شیئر کرتا ہے لیکن اب میں نہیں کرسکتا اور جھوٹ میں لکھ نہیں سکتا۔ اس لیے بہتر یہی ہے اس کو نہ لکھوں۔''

میں نے ڈائری بند کرکے گود میں رکھ لی تھی۔ ڈائری سے میں صرف اتنا جان پایا تھا کہ جو میں سوچ رہا تھا کہانی کچھ ویسی ہی نکلی۔ لیکن دلشاد کی اس حالت کیے بارے میں کچھ نہیں جان پایا تھا اس لیے اپنے خیال کے سچ ہونے پر خوش نہیں ہوا تھا۔

☆......☆......☆

میری آنکھ پیاس کی شدت سے کھلی تھی۔ لیکن فضا میں موجود خوشبو نے بے اختیار مجھے دلشاد کی چارپائی کی طرف دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ کیونکہ یہ ویسی خوشبو تھی۔ جیسی میں نے باغ میں محسوس کی تھی۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ دلشاد اپنی چارپائی پر موجود نہیں ہے۔ میں نے خیال کیا کہ شاید نیچے واش روم میں گیا ہو۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میرے خیال کی نفی ہوگئی تھی کیونکہ دلشاد تیسرے مکان کی چھت پر کھڑا ہوا تھا اور

اس کا رخ کھیتوں کی طرف تھا۔ تین مکانوں کی چھت ایک ہی تھی اور میں پہلی چھت پر تھا۔

میں جو اُٹھ کر پانی پینے کے لیے جانے کا ارادہ بنا رہا تھا ترک کر دیا تھا اور دلشاد کی طرف دیکھنے لگا تھا کہ وہ اب کیا کرتا ہے اور کیوں کھڑا ہے وہاں پر۔

کافی دیر گزر گئی تھی مجھے دیکھتے ہوئے لیکن کچھ بھی خاص نہیں ہوا تھا دلشاد کبھی ایک جگہ پر کھڑا ہو جاتا تو کبھی واک کرنے لگتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں چارپائی سے اُٹھ کر نیچے جاتا میں نے محسوس کیا کہ ہوا میں موجود خوشبو کم ہونے لگی تھی اور ہلکی ہلکی بدبو پھیلنے لگی تھی۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر میں خوشبو آنا بند ہو گئی تھی جبکہ بدبو بہت تیز آنے لگی تھی۔ سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ بدبو ایسی تھی جیسے گندگی کا کوئی بڑا سا ڈھیر چھت پر لا پھینکا ہو۔ یہ میرے لیے حیرت کی بات تھی کیونکہ چند لمحوں میں خوشبو بدبو میں بدل گئی تھی۔ اور پھر اگلے پل جو میں نے منظر دیکھا وہ میری جان نکال دینے کے لیے کافی تھا۔ کیونکہ دلشاد جو چھت کے کنارے پر کھڑا تھا لڑکھڑا کر چھت سے نیچے جا گرا تھا۔ میں ایک دم سے چارپائی سے اچھل کر اٹھا تھا اور اس طرف بھاگا تھا جس طرف دلشاد گرا تھا چھت سے۔ میں نے دیکھا دلشاد اندھے منہ گرا ہوا ہے۔ میں نے دلشاد کا نام لے کر آواز دی تھی۔

''دلشاد تم ٹھیک تو ہو۔''

میری دوسری آواز پر اس نے جواب دیا تھا کہ میں ٹھیک ہوں۔'' میں جلدی سے نیچے اترا اور بیرونی دروازہ کھول کر دلشاد کی طرف بھاگا تھا۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ دلشاد آگے سے واپس آ رہا ہے۔ میں فکر مندی سے اس سے پوچھنے لگا تھا کہ تمہیں کہیں چوٹ تو نہیں لگی۔'' دلشاد نے نفی میں جواب دیا تھا۔

''یار تم کیسے گرے۔ میں پانی پینے کے لیے اٹھا تھا کہ تمہیں گرتے ہوئے دیکھا۔ کیا ہوا تھا اور تم وہاں کیا کر رہے تھے۔''

''وہ یار مجھے نیند میں چلنے کی عادت ہے۔'' دلشاد نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا تھا۔ میں دلشاد کا جواب سن کر حیران ہوا تھا مجھے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ کیونکہ یہ میرا کوئی وہم نہیں تھا۔ میں نے پندرہ منٹ دیکھا تھا دلشاد کو واک کرتے ہوئے اور اب دلشاد کہہ رہا تھا کہ مجھے رات میں چلنے کی بیماری ہے۔ میں چپ کر گیا تھا اور بولا تھا۔

''یار تمہارے ساتھ ایسا کب سے ہو رہا ہے؟''

''کافی عرصہ ہو گیا ہے۔''

''تم یار پہلے بتاتے میں تمہیں اوپر سونے کے لیے نہ کہتا۔''

''بس یار ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے اس لیے میں نے تمہیں نہیں بتایا۔''

ہم واپس چھت پر آ گئے تھے اور چارپائیوں پر لیٹ گئے تھے۔ مجھے ایک چیز حیران کر رہی تھی وہ یہ کہ خوشبو کہاں گئی اور پھر اتنی گندی بدبو کہاں سے آنے لگی تھی ایک دم سے اور اب کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا۔

☆......☆......☆

چارپائی سے اٹھنے کی آواز سن کر میں پوری طرح ہوش میں آ گیا تھا۔ میں سو تو رہا تھا لیکن اس طرح کہ میرا ذہن جاگ رہا تھا۔ اور پھر جوتا پہننے کی ہلکی سی آواز آئی تھی وہ بھی رات کا سناٹا ہونے کی وجہ سے ابھری تھی، ورنہ اتنی ہلکی آواز کہاں آتی ہے۔ پہلے تو میں نے خیال کیا تھا کہ دلشاد باتھ روم کے لیے اٹھا ہوگا۔ لیکن دروازہ کھلنے کی آواز پر میں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

پچھلے ایک ہفتے سے میں کچھ اسی طرح سو رہا تھا۔ اب ہم چھت پر تو نہیں سوتے تھے۔ صحن میں سوتے تھے لیکن گھر والوں سے کافی فاصلے پر بیرونی گیٹ کے قریب۔

تھوڑی دیر بعد میں اپنی چارپائی سے اٹھا تھا اور باتھ کی طرف گیا تھا جو کہ میری امید کے مطابق خالی تھا اور پھر میں بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گیا جو کہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا تھا اور سڑک کے ایک سرے سے دوسرے سرے کی طرف دیکھا تو دلشاد نظر آ گیا جو کہ ڈیرے کی طرف جاتی سڑک پر جا رہا تھا۔ میں باہر نکل آیا تھا اور آہستہ سے گیٹ بند کر دیا تھا۔ اور اس سے کافی فاصلہ رکھ کر چلنے لگا۔

آخری تاریخوں کا چاند تھا اس لیے روشنی بہت کم تھی بس میں ہلکا سا دور سے نظر آ رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ جب کوئی اپنا مصیبت میں ہو تو انسان کا خوف جاتا رہتا ہے ایسا ہی کچھ میرے ساتھ ہوا تھا۔ کتوں کے بھونکنے اور سناٹے نے کافی ڈراؤنا ماحول بنایا ہوا تھا۔ لیکن میں بغیر کسی خوف کے جا رہا تھا۔ میں تھوڑا سا اور آگے گیا تھا کہ فضا میں، میں نے وہی خوشبو محسوس کی تھی جو اس سے پہلے بھی میں دو دفعہ محسوس کر چکا تھا۔ خوشبو اب کافی تیز محسوس ہو رہی تھی اور اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ وہ نیند میں نہیں ہے۔ اس خوشبو میں ضرور کوئی راز چھپا ہے۔ مجھے اس کا اندازہ لگانے میں اب دیر نہیں لگی تھی۔ میں تھوڑا سا تیز ہوا تھا اور اپنے درمیان فاصلہ کم کیا تھا۔ تو مجھے کافی حیرت ہوئی تھی کیونکہ دلشاد کا دایاں ہاتھ ایک طرف کو جھول رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا ہاتھ کسی نے پکڑا ہوا ہو۔ اس کے ساتھ ہی مجھے باغ والا منظر یاد آ گیا تھا اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ جو اس دن میں نے دیکھا تھا وہ میرا وہم نہیں تھا۔

دلشاد کا رُخ اب نہر کی طرف تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی تھا مناسب فاصلے پر میں کبھی کسی درخت کے پیچھے ہو جاتا تو کبھی کسی قریب کے کھیت میں بیٹھ جاتا۔ دلشاد نہر کے کنارے پر بیٹھ گیا تھا اور پاؤں نہر کے اندر لٹکا لیے تھے۔ میں ایک درخت کے پیچھے بیٹھ گیا تھا اور دلشاد کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

تقریباً مجھے وہاں بیٹھے ہوئے ایک گھنٹہ گزر گیا تھا اور اس ایک گھنٹے میں بس اتنا ہوا تھا کہ دلشاد ایک طرف کو لیٹ گیا تھا، نہر کے کنارے پر اور اب کافی دیر سے اسی پوزیشن پر لیٹا ہوا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ اور گزرے ہوں گے کہ ہوا میں بدبو محسوس ہونے لگی تھی اور یہ بدبو آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ دلشاد اُٹھ کر کنارے پر کھڑا ہو گیا تھا اور پھر گلے ملنے والے انداز میں تھوڑا سا جھکا تھا۔

اور پھر وہی ہوا تھا جو ایک بار پہلے بھی میں محسوس کر چکا تھا۔ خوشبو کی جگہ بدبو نے لے لی تھی۔

دلشاد جو نہر کے کنارے پر کھڑا تھا اگلے ہی لمحے

یاد رکھیں

: جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ کبھی بدلہ نہیں لیتا۔
: حسد کرنے والا موت سے پہلے مر جاتا ہے۔
: کسی پر اعتماد مت کرو جب تک اُسے غصے میں نہ دیکھ لو۔
: موت کو یاد رکھنا نفس کی تمام بیماریوں کی شفا ہے۔
: خوشی انسان کو اتنا نہیں سکھاتی جتنا غم۔
: سچائی ایک ایسی دوا ہے جس کی لذت کڑوی اور تاثیر میٹھی ہے۔
: اذان کے وقت خاموش رہا کرو تا کہ موت کے وقت کلمہ نصیب ہو۔
: اچھی باتیں دوسروں کو بتانا بھی نیکی ہے۔

مرسلہ: رازِ عدن۔ بحرین

نہر کے اندر تھا وہ ایسے گرا تھا۔ جیسے کسی نے دھکا دیا ہو۔ اور پھر پانی میں ہاتھ پاؤں مارنے کی آواز بلند ہوئی تھی۔ میں جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور نہر کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ دلشاد پانی کی سطح پر مجھے نظر نہیں آیا تھا ایک جگہ سے پانی کی آواز بلند ہو رہی تھی میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر نہر میں چھلانگ لگا دی اور فوری اس جگہ پر پہنچ گیا تھا۔ اور پھر میں نے دلشاد کو پکڑا تھا اور کنارے کی طرف کھینچنے لگا تھا۔

کنارے پر آ کر دلشاد لمبے لمبے سانس لے کر اپنا سانس بحال کرنے لگا تھا۔ دلشاد نے کافی غوطے کھائے تھے ابھی بھی وقفے وقفے سے کھانس رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد جب دلشاد بالکل ٹھیک ہو گیا تو میں نے دلشاد کو گھر چلنے کے لیے کہا اور وہ بغیر کچھ کہے میرے ساتھ چل پڑا تھا۔

☆......☆......☆

"میں سب کچھ صاف صاف سننا چاہتا ہوں اور ایک بات اور کان کھول کر سن لو، وہ یہ کہ میرے ساتھ کسی بھی قسم کا جھوٹ بولنے کی کوشش مت کرنا کیونکہ میں بہت کچھ جانتا ہوں اس لیے تمہارے جھوٹ سچ کا

مجھے اندازہ ہو جائے گا۔'' میں نے ڈیرے پر آتے ہی دلشاد کو گھیر لیا تھا۔ رات کو میں نے کچھ پوچھا نہیں تھا اور صبح میرے اٹھنے سے پہلے ہی وہ ڈیرے پر آ گیا تھا اور میں بھی ناشتا کرتے ہی ڈیرے پر آ گیا تھا اور آتے ہی اس کو گھیر لیا تھا۔

دلشاد نے میری طرف دیکھا تھا اور پھر ایک گہرا سانس کھینچ کر چھوڑا تھا اور پھر آہستہ آہستہ سب بتانے لگا تھا۔ جسے سن کر میرا برا حال ہو رہا تھا۔ مجھے بری طرح شاک لگا تھا اور میرا دل اپنا سر پیٹنے کو کر رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اس کو کیا کہوں۔ میں نے دلشاد کی ساری بات حوصلے کے ساتھ سنی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ایسی بیوقوفی کا کوئی تک نہیں بنتا تھا۔

''تم جانتے ہو یہ بیوقوفی اور پاگل پن ہے اور وہ بھی اعلیٰ درجے کا..... تم اس سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہو جس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔'' مجھے لفظ نہیں مل رہے تھے کہ میں کس طرح دلشاد سے بات کروں۔

''ہاں میں مانتا ہوں میں ایک سراب کا پیچھا کر رہا ہوں لیکن اب میں بے وفائی نہیں کر سکتا۔ میں نہیں چھوڑ سکتا اُس کو۔ مجھے نہیں آتا مجبوری کی آڑ لے کر بے وفائی کرنا اور نہ ہی مجھ سے ایسا ہوگا اور نہ ہی مجھ میں ہمت ہے۔ ہم محبت کرنے سے پہلے کیوں نہیں ایسی باتیں سوچتے۔ یہ ہمیں تب ہی کیوں یاد آتا ہے جب ہم نے کسی کو چھوڑنا ہوتا ہے۔ اب وہ جیسی بھی ہے، جو بھی ہے مجھے قبول ہے۔ اور ہاں ایک بات اور..... محبت کرنے والے کبھی مجبور نہیں ہوتے۔''

''محبت کرنے والے کبھی مجبور نہیں ہوتے۔'' دلشاد کا کہا جملہ اب تک میرے کانوں میں بار بار گونج رہا تھا۔ وہ تو کب کا میرے پاس سے اُٹھ کر چلا گیا تھا۔ اس نے میری تو کوئی بات سنی ہی نہیں تھی، بس اپنی ہی سنا کر چلا گیا تھا۔

میں نے ماموں کو بتانے کا سوچ لیا تھا کہ ان کو بتا دوں گا پھر وہ جانیں اور اُن کا کام۔ وہ خود ہی دلشاد کو ہینڈل کر لیں گے۔ لیکن دلشاد نے جاتے ہوئے کہا تھا کہ میں خود ہی سب کو بتا دوں گا کچھ دن بعد، بس تم تب تک خاموش رہو۔'' اور میں خاموش ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

سب ٹھیک چل رہا تھا بلکہ بہت خوب صورت چل رہا تھا۔ ہم روز مغرب کی نماز کے بعد ملتے تھے اور جا کر نہر کے کنارے پر بیٹھ جاتے تھے۔ وہ کہتی اور میں سنتا تھا۔ اور پھر جیسے ہی عشاء کی اذان ہونے لگتی ہم واپس لوٹ آتے۔ وہ مولوی صاحب کے گھر میں اور میں مسجد کے اندر چلا جاتا۔

اور پھر وہ دن آ گیا جب میں نے اس سے اس کے بارے میں پوچھا۔ میرا سوال سن کر وہ اُداس ہو گئی تھی۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد بولی تھی۔

''دلشاد سچ میں کہہ نہیں سکتی اور جھوٹ بول نہیں سکتی۔ تم کل تک کا انتظار کر لو میں تمہیں سب کچھ سچ سچ بتا دوں گی اور میں خاموش ہو گیا۔'' اس کے لہجے میں، میں نے جدائی کا درد محسوس کیا تھا۔ اس کو لگتا تھا میں اس کو چھوڑ دوں گا۔ لیکن میں نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے میں یہ غم اس کی جھولی میں نہیں ڈالوں گا۔

اور پھر اگلے دن ہم ملے تھے اور اس نے اپنی حقیقت بتا دی تھی کہ وہ انسان نہیں ہے وہ ایک پری زاد ہے۔ میں اس کی بات سُن کر خاموش ہو گیا تھا اور اسے لگا تھا کہ میں اس کو چھوڑ جاؤں گا۔ لیکن میں نے اس کو یقین دلا دیا تھا کہ اب میں تیرا ہوں اور تیرا ہی رہوں گا۔''

اس نے مجھے بتایا کہ اس کو میری خوشبو کھینچ لائی تھی اور پھر مجھے دیکھتے ہی پہلی نظر میں وہ دل ہار گئی تھی۔ اور پھر وہ واپس نہ جا سکی اپنی دنیا میں اور مولوی صاحب کے گھر رہنے لگی اور مجھے روز آتے جاتے دیکھتی تھی اور پھر ایک روز ہمت کر کے میرے سامنے آ گئی۔ اور پھر اس کو دیکھتے ہی میرا حال بھی وہی ہوا جو اس کا ہوا تھا۔''

''اس نے کہا تھا کہ اگر تم چاہو تو کنارا کر سکتے ہو۔ لیکن جس لہجے میں اس نے کہا تھا مجھے لگا اس کو خود

میں چھپالوں اور کہیں دور لے جاؤں۔ وہ بھی مسلمان ہے اور ہم سے اچھی مسلمان ہے۔ لیکن وہ کہتی ہے تمہیں دیکھ کر مجھے پتا نہیں کیا ہوا۔ میں خود پر سے سارے اختیار کھو بیٹھی ہوں۔

زندگی سکون سے گزر رہی تھی کہ ایک دن وہ خبیث جن ہماری زندگی میں آ گیا اور ہماری زندگی کو جنت سے جہنم بنا دیا۔ جیسے گل کو میری ویسے ہی اس خبیث جن کو گل کی خوشبو کھینچ لائی تھی۔ اس نے ہماری زندگی کو جہنم بنا کر رکھ دیا اور وہ گل کو تنگ کرنے لگا تھا۔ اب گل کے لیے اگر کوئی جائے پناہ تھی وہ تھا مولوی صاحب کا گھر...... کیونکہ مولوی صاحب نے اپنے گھر کے گرد حصار کھینچ رکھا تھا۔ کوئی بھی جن یا بدروح بری نیت سے گھر میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ ہم جب بھی ملتے تھے وہ تنگ کرنے کے لیے آ جاتا تھا۔ وہ ہمیں زیادہ نقصان نہیں پہنچا پاتا تھا کیونکہ ہم قرآنی آیات کو پڑھ کر خود پر دم کر لیتے تھے۔ اب ہم یہ کرنے لگے تھے جب وہ آتا تو میں گل کو گھر بھیج دیتا تھا۔ کیونکہ اس کے آنے کا پتا ہمیں اس کی بدبو سے پہلے ہی چل جاتا تھا۔

وہ مجھے زیادہ نقصان نہیں پہنچا پاتا تھا، دم ہونے کی وجہ سے۔

تین ماہ پہلے میں گل کے ساتھ اس کی دنیا میں گیا تھا۔ گھر والوں کو میں نے دوست کی شادی کا کہا تھا اور پھر ہم تین دن وہاں رہ کر آ گئے تھے۔ وہ بھی ہماری طرح رہتے ہیں، جس طرح ہم رہتے ہیں۔ اب ہم نے پھر جانا ہے کچھ دنوں کے لیے کیونکہ اب وہ خبیث جن کچھ زیادہ ہی تنگ کرنے لگا ہے۔ گل اگر اب تک یہاں ہے تو صرف میری وجہ سے۔ اس کے ماں باپ نے کتنی ہی بار اس کو واپس آنے کے لیے کہا ہے لیکن وہ نہیں گئی صرف اور صرف میری وجہ سے۔ وہ بھی بے وفائی نہیں کرنا چاہتی۔ تو پھر میں کیسے کرلوں بے وفائی۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ تم کیوں نہیں سمجھتے آخر...... میں سب کچھ برداشت کرسکتا ہوں لیکن اپنے دامن پر بے وفائی کا داغ نہیں برداشت کرسکتا۔''

''اچھا تو تم راحیلہ سے بے وفائی کر سکتے ہو۔ جو حقیقت بھی ہے۔ اس سے تمہارے دامن پر داغ نہیں لگے گا۔'' میں نے طنز کیا تھا اس پر۔

''جس کی کوئی حقیقت ہی نہیں اس سے داغ لگے گا۔''

''تم جانتے ہو میں اس سے محبت نہیں کرتا۔ میں نے اس کو ہمیشہ سے تمہارے حوالے سے دیکھا ہے۔ وہ تو پاگل ہے حالانکہ میں نے آج تک اس کو امید بھی نہیں دلائی۔ تو پھر اس میں میرا کیا قصور؟'' میں آج پھر اس کو سمجھانے کے لیے بیٹھا تھا۔ لیکن وہ مجھے سمجھانے لگا تھا اور شروع سے لے کر آخر تک ساری کہانی سنا دی تھی۔

میں دلشاد کی بات سن کر خاموش ہوگیا تھا اور اس کے پاس سے ناراض ہو کر اٹھ آیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ میری کسی بھی بات کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن دلشاد نے گھر والوں کو بتا دیا کہ وہ اپنے کسی دوست کی شادی میں شرکت کے لیے دوسرے شہر جا رہا ہے۔ گھر والوں نے سن کر کسی قسم کا کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ سب جانتے تھے کہ دلشاد شادی میں جا رہا ہے لیکن صرف ایک میں جانتا تھا کہ وہ شادی پر نہیں جا رہا۔ ایک بار پھر دل کیا کہ ماموں کو بتا دوں سب کچھ لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش ہوگیا کہ جب دلشاد نے کہا ہے کہ وہ خود بتا دے گا تو پھر مجھے صبر کرنا چاہیے۔

سب ٹھیک تھا لیکن دل نہ جانے کیوں گھبرا رہا تھا کہ کچھ برا ہونے والا ہے۔ میری طبیعت عجیب سی ہو رہی تھی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ خود کو مطمئن کر کے بھی نہیں کر پا رہا تھا۔

شام کو دلشاد نے جانا تھا اور اس نے صبح ہی اپنی ساری تیاری مکمل کر لی تھی۔ اور پھر وہ اپنے دوستوں سے ملنے کے لیے چلا گیا۔ میں نے پرسوں سے اس سے بول چال بند کر رکھی تھی۔ دو چار بار دلشاد نے منانے کی کوشش کی تھی لیکن میرا موڈ ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ دلشاد جانے کے لیے تیار تھا اور وہ گھر والوں سے ملنے لگا اور میں اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

میں گھر سے نکلا اور بلا مقصد ہی گاؤں کے ایک

طرف کو چل پڑا۔ میں کافی اپ سیٹ تھا دلشاد کی وجہ سے۔ میرے بس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا لیکن دلشاد پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ میں ابھی تھوڑی ہی دور آیا تھا کہ پیچھے سے دلشاد کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے رکنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ میں نے دلشاد کی آواز کو نظر انداز کیا تھا اور چلتا رہا۔ اور پھر مجھے عقب سے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں جانتا تھا کہ دلشاد ہی ہوگا لیکن میں پھر بھی رکا نہیں تھا۔ دلشاد نے مجھے پیچھے سے کندھے سے پکڑ کر روکا تھا لیکن میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

''تجھے قسم ہے میری پلیز رک جا۔'' میرے نہ رکنے پر اس نے اپنی قسم دی تھی اور میں رک گیا۔

''یار جاتے ہوؤں کو ہنس کر رخصت کرتے ہیں نہ کہ روتا منہ بنا کر۔ پلیز مان جا۔''

''یار چھوڑ دے یہ پاگل پن۔'' میں نے ایک بار اس کو سمجھانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ دلشاد ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگیا تھا۔ اور پھر بولا تھا۔

''یار تو چھوڑ سب باتوں کو۔ آ تجھے تیری بھابی سے ملواتا ہوں۔'' بھابی کا لفظ بہت عجیب لگا تھا مجھے اس کے منہ سے اس پری زاد کے لیے۔ ایسا کیسے ممکن ہوسکتا تھا، بھلا انسان اور دوسری مخلوق کا ملن کیسے ممکن ہوسکتا تھا۔ ایسا سوچنا صرف اور صرف بیوقوفی اور پاگل پن ہی تو تھا۔

میں دلشاد کی بات سن کر خاموش ہوگیا تھا۔

''اب مان جا پلیز چھوڑ دے یہ ناراضگی! تجھے پتا ہے جب تو ناراض ہوجاتا ہے تو میری سانس اُکھڑنے لگتی ہے۔'' دلشاد نے ایک بار پھر منانے کی کوشش کی تھی۔

اس کی بات سن کر میں خاموش ہوگیا تھا۔ دلشاد نے میرا ہاتھ پکڑا تھا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر چلنے لگا تھا اور میں خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا تھا۔ اب ہمارا رخ ڈیرے کی طرف تھا۔ ہم جیسے ہی ڈیرے پر پہنچے تھے اس سے تھوڑی دیر بعد ہی وہی خوشبو آہستہ آہستہ ہوا میں پھیلنے لگی تھی۔ دلشاد نے مجھے وہاں رکنے کے لیے کہا تھا اور خود وائیں طرف موجود درختوں کے جھنڈ کی طرف چلا گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب اس کی واپسی ہوئی تو اس کے پیچھے پیچھے ایک لڑکی چلی آرہی تھی۔ لڑکی نے سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے اور اس کے چہرے پر نقاب تھا۔ لڑکی کو دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھیں گہری جھیل سی خوبصورت تھیں۔ میں نے دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔

دلشاد کے کہنے پر اس نے نقاب ہٹا دیا تھا۔ اور پھر جو چہرہ میں نے دیکھا تھا وہ جنت سے آئی حور کا ہی معلوم ہورہا تھا۔ میں اس کو دیکھتے ہی کھو سا گیا تھا اور مسلسل دیکھے جارہا تھا۔ دلشاد نے مسکراتے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا تھا اور کہنے لگا۔

''اب نظر لگانے کا ارادہ ہے کیا؟'' میں اپنی بے اختیاری پر شرمندہ ہوا تھا۔

میں نے اتنا حسین اور خوبصورت چہرہ آج تک نہیں دیکھا تھا۔ میں بیچ میں سانس لینا بھول گیا تھا اور پھر ایک جرم ہوا نے کیا۔ ہوا کے تیز جھونکے سے ایک جھٹکے سے گل کے سر سے دوپٹہ سرک گیا اور اس کے بال ہوا میں لہرانے لگے۔

میری آنکھیں اور میں ایک بار پھر بے قابو ہوگئے تھے۔ دل نے تسلیم کیا تھا کہ دلشاد ایسے ہی نہیں لٹ گیا۔ اور پھر دلشاد کی آواز ابھری تھی اور وہ کہنے لگا۔

''گل یہ میرا سب سے بہترین دوست اور کزن ہے اور کاشی یہ میری زندگی گل ہے۔''

میں نے نظریں اٹھا کر گل کی طرف دیکھا تھا۔ میرے دیکھنے پر گل نے سلام کیا تھا۔ گل کی آواز بھی اس کے سراپے کی طرح خوبصورت اور میٹھی تھی۔

اس سے پہلے کہ ہم کوئی اور بات کرتے گل کی گھبرائی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے دلشاد سے کچھ کہا تھا۔ اس سے پہلے کہ دلشاد مجھے کچھ بتاتا میں نے خود محسوس کرلیا تھا۔ ہوا میں ہلکی ہلکی بدبو پھیل رہی تھی۔

دلشاد نے اپنے بیگ سے ایک ڈائری نکال کر میرے ہاتھ میں دے دی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں

کچھ پوچھتا ڈائری کے بارے میں، دلشاد نے مجھے بڑی گرم جوشی کے ساتھ گلے لگالیا تھا۔ اور پھر کتنے ہی پل گزر گئے دلشاد مجھے خود سے الگ کرنا بھول گیا تھا۔

میں نے دلشاد کو جب خود سے علیحدہ کیا تو اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ مجھے اس کے رونے کی سمجھ نہیں آئی تھی۔

''اچھا چل معاف کیا تجھے! اب چپ کر جا۔''

میں یہی سمجھا تھا کہ شاید میری ناراضگی کی وجہ سے ایسا کر رہا ہے۔ ہوا میں بدبو لحہ بہ لحہ بڑھ رہی تھی۔ دلشاد نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا تھا اور جلدی سے گل کی طرف بڑھ گیا۔

اور پھر دلشاد نے گل کا ہاتھ پکڑا اور اس جھنڈ کی طرف چل پڑا۔ جس طرف سے وہ آئے تھے۔ دلشاد نے مڑ کر ہاتھ ہلایا اور تیزی سے وہ دونوں اس جھنڈ میں غائب ہو گئے۔ بدبو میں پہلے سے بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا اور اب خوشبو لحہ بہ لحہ کم ہو رہی تھی۔ اور پھر ایک وقت آیا جب خوشبو بالکل ختم ہو گئی اور صرف بدبو رہ گئی۔

میں وہاں کھڑا بس اس جھنڈ کو دیکھے جا رہا تھا جس طرف دلشاد اور گل گئے تھے۔ اور پھر میں نے محسوس کیا تھا کہ بدبو بھی کم ہونے لگی ہے اور پھر ایسا ہی ہوا تھوڑی ہی دیر میں بدبو بالکل ختم ہو چکی تھی۔

پھر اگلے ہی پل فضا میں اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی تھی اور میں ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا تھا اور پھر میرا خیال اس ڈائری کی طرف گیا تھا جو کچھ دیر پہلے دلشاد نے میرے ہاتھ میں دی تھی اور میرے ہاتھ سے نکل کر زمین پر گر گئی تھی۔ میں نے جھک کر وہ ڈائری اٹھائی تھی اور اداس دل کے ساتھ گاؤں کی طرف قدم بڑھا دیے تھے۔

☆......☆......☆

''جب تم یہ ڈائری پڑھ رہے ہو گے۔ میں اس وقت تم سے لاکھوں میل دور جا چکا ہوں گا۔ کچھ باتیں تھیں جو تم سے کرنی تھیں۔ جو کہ میں تمہارے سامنے کر نہیں سکتا تھا کیونکہ میں تمہیں اچھے سے جانتا ہوں کہ تمہارا ری ایکشن کیا ہونا تھا اور دوسرا مجھ میں ہمت بھی نہیں تھی کہ میں تم سے بات کر پاتا۔ مجھے ڈر تھا کہ تم نے میرا گریبان پکڑ کر مجھ سے ایک ایک چیز کا حساب مانگنا تھا جو کہ میں دے نہیں سکتا تھا۔

میں تمہیں کیا بتاؤں میں خود سے بہت لڑا ہوں لیکن پھر بھی فیصلہ محبت کے حق میں ہی نکلا ہے۔ راحیلہ بہت اچھی ہے اور اس کو تنہا نہیں چھوڑنا۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ مجھے کبھی اس سے محبت نہیں رہی۔ اور ایسا کیونکر ہوا اس کی وجہ بھی تم جانتے ہو۔ اسے کبھی اکیلا نہیں چھوڑنا......''

میں جیسے جیسے ڈائری پڑھ رہا تھا مجھے کسی انہونی کا ڈر لگ رہا تھا۔ میں جلدی جلدی سے آگے پڑھنے لگا تھا۔ اور پھر آخر دلشاد نے بم پھوڑ ہی دیا تھا۔

''میں ہمیشہ کے لیے یہاں سے جا رہا ہوں شاید کبھی واپس لوٹ کے نہ آؤں۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا لیکن مجھے ایسا کرنا تھا۔ کیونکہ میں ادھوری زندگی نہیں جینا چاہتا تھا۔

''وہ جا چو کہتے ہیں نا کہ زندگی کو جی کر جاؤ نہ کہ گزار کر۔ میں بھی ان ہی کی بات پر عمل کرنے جا رہا ہوں۔ میں زندگی کو جینے جا رہا ہوں......''

آگے بھی بہت کچھ لکھا ہوا تھا لیکن مجھ میں پڑھنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ ڈائری میرے ہاتھ سے نکل کر بیڈ پر گر گئی تھی اور میری آنکھوں سے بے بسی کے آنسو بہنے لگے تھے۔

''کاشف گھر آ گیا ہے۔'' راحیلہ کی آواز پر میں ماضی سے نکل کر حال میں آیا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو گاڑی گھر کے پورچ میں کھڑی تھی۔

میں گاڑی سے اُتر کر سیدھا بیڈ روم میں آ گیا اور آتے ہی بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔ میرے سر میں شدید قسم کا درد ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد راحیلہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پانی کا گلاس اور دوسرے ہاتھ میں سکون آور گولیاں ہوں گی مجھے اس کا اچھے سے اندازہ تھا۔

☆☆......☆☆



کالا حبشی



ارم ناز

اُس بدنصیب ماں کا عبرت ناک قصہ، جس نے جادو کی کتابیں پڑھ پڑھ کر انجانے میں ایک جن قابو کرلیا تھا

میری ماں کی ذرا سی بے احتیاطی میری بڑی بہن کی موت کا سبب بن گئی۔ گھر میں ماتم تھا۔ میری جوان بہن مرگئی تھی۔ ہم بہنیں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ چھوٹا بھائی کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ہمارے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔

گھر میں تمام رشتہ دار اکٹھا تھے۔ امی ساکت و جامد خاموشی سے بیٹھی تھیں۔ جیسے وہ پتھر کی ہوگئی ہیں۔ یہ سراسر امی کی غلطی تھی جس کا خمیازہ ان کی اولاد کو بھگتنا پڑ رہا تھا۔ اولاد کی تکلیف والدین کے لیے سب سے بڑی آزمائش ہوتی ہے۔

میری والدہ کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے تھا۔ امی چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں۔ امی نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ میٹرک کرنے کے بعد وہ گھر میں فارغ بیٹھی تھیں کہ امی کو نجانے کہاں سے عملیات کا شوق اٹھا۔ اپنے چھوٹے بھائی کو پیسے دے کر پانچ چھ عملیات کی کتابیں منگوا کر پڑھنا شروع کردیں۔ نہ صرف پڑھیں بلکہ اُن کتابوں میں دیے گئے عمل بھی کرنے لگیں۔ کسی عامل سے اجازت لیے بغیر اس طرح کے عملیات کا کیا نتیجہ ہوگا، یہ انہوں نے سوچا بھی نہ تھا۔

امی کے کسی عمل نے ایک پُرسکون روح کو جھنجوڑ دیا تھا۔ خدا جانے وہ کوئی جن تھا، بھوت یا کوئی روح۔ وہ ایک لمبا تڑنگا کالا مرد تھا جس طرح حبشی ہوتے ہیں۔ بالکل حبشی والے ناک نقشے کا۔ امی چونکہ نماز روزے کی پابند تھیں۔ نانا نانی ماموں گھر کے تمام لوگ نماز روزے کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔

شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے امی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ امی بتاتی ہیں وہ امی کو کبھی دیوار پر چپکا نظر آتا تھا کبھی صحن میں بندھی رسی پر اُلٹا لٹکا نظر آتا۔ اس طرح کی مخلوق کے لیے جب کوئی عمل کیا جاتا ہے تو مہینہ پندرہ دن پہلے جمالی یا جلالی پرہیز کیا جاتا ہے۔ جمالی پرہیز کا مطلب لہسن، پیاز، انڈہ، مچھلی سے پرہیز ہوتا ہے۔ جلالی پرہیز بہت سخت ہوتا ہے۔

اس میں صرف دودھ پی سکتے ہیں یا چنے کھا سکتے ہیں مگر بہت خیال کے ساتھ اگر دودھ کے ساتھ کوئی مکھی یا مچھر پی گئے یا چنے کے ساتھ گھن کھا لیا تو یہ پرہیز ٹوٹ جاتا ہے اور نئے سرے سے پرہیز کرنا ہوتا ہے۔ نماز اول وقت ادا کرنی ہوتی ہے اور تمام مکروہات سے پرہیز لازمی ہوتا ہے یعنی عملیات کے ذریعے کسی مخلوق کو قبضہ میں کرنا بڑا جان جوکھم کا کام



ہوتا ہے۔

جب عامل عمل میں کامیاب ہوتا ہے تو اس طرح کی مخلوق کے حاضر ہونے پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی قسم دے کر وعدہ لیا جاتا ہے کہ وہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا اور بلانے کے وقت ہی حاضر ہوگا مگر امی تو یہ بھی نہیں جانتی تھیں کہ ان کے کون سے عمل سے یہ حاضر ہوا ہے۔ خوف اسی بات کا تھا کہ یہ حبشی کسی وعدے اور قسم کا پابند نہ تھا۔

نانا نانی نے امی کے معاملے میں کبھی کسی عامل کی مدد نہیں لی۔ نانا کا خیال تھا یہ امی کا وہم ہے جبکہ امی تمام قصہ نانا کو سُنا چکی تھیں۔ وہ امی کے علاوہ کبھی کسی کو نظر نہیں آیا تھا۔ نانا کو لگا ان تمام مسائل کا حل امی کی شادی ہے۔

نانا نے مناسب رشتہ دیکھ کر امی کی شادی کر دی۔ ابو بھی مکمل مذہبی تھے امی نے ابو کو اس سارے واقعے سے لاعلم رکھا۔ شادی کے بعد بھی وہ حبشی امی کو نظر آتا رہا۔ پتا نہیں وہ امی سے کیا چاہتا تھا اس نے کبھی امی سے بات نہیں کی تھی۔ امی بھی عادی ہوگئی تھیں۔ وہ اب اُسے دیکھ کر خوف زدہ نہیں ہوتی تھیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ امی چار بیٹیوں اور ایک بیٹے کی ماں بن چکی تھیں مگر وہ اب بھی حبشی کو اُلٹا لٹکا دیکھتی تھیں۔

☆......☆......☆

وقت پر لگا کر اُڑتا رہا چاروں بیٹیاں جوان ہوگئی تھیں۔ اچانک ایک دن وہ ہوگیا جس کا ڈر تھا۔

بڑی باجی خوشی کو وہ حبشی دیوار پر چپکا نظر آیا۔ باجی چیخ مار کر بے ہوش ہوگئیں۔ باجی کی چیخ سے سب گھر والے ان کے اردگرد جمع ہوگئے۔ امی باجی کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگیں۔

''خوشی بیٹا ہوش میں آؤ۔ کیا ہوگیا تمہیں۔''

خوشی باجی نے آنکھیں کھولیں تو ان کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔

وہ کچھ بولنے کی کوشش کرنے لگیں مگر الفاظ زبان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ وہ انگلی سے ایک طرف اشارہ کررہی تھیں۔

باجی کے منہ سے بس یہ الفاظ نکلے۔ ''وہ کالا

آدمی......''

امی ساری بات سمجھ گئیں۔ امی باجی پر آیت الکرسی پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگیں۔ ابو بھی آ گئے۔ باجی کو ڈاکٹر کو بھی دکھایا مگر کوئی فرق نہ پڑا۔ باجی دن بدن کمزور ہوتی گئیں۔

وہ ہر وقت خوفزدہ رہتی تھیں۔ امی خود دم درود کرتی رہیں۔ کبھی کسی عامل کو نہیں دکھایا کیونکہ اس طرح امی کا راز فاش ہو جاتا۔ یہ مصیبت امی کی بلائی ہوئی تھی، امی کی خام خیالی تھی کہ وہ کالا حبشی باجی کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ باجی تنہا تنہا رہنے لگیں۔ وہ بات بھی بہت کم کرتیں۔ میری زندگی سے بھرپور بہن مرجھا کر رہ گئی اور پھر ایک دن باجی نے زندگی کا ساتھ چھوڑ دیا۔

☆......☆......☆

باجی کی اچانک موت نے امی کو ادھ مرا کر دیا۔ امی کو یہ اندازہ نہ تھا کہ باجی مر جائیں گی۔

وہ کھیل جو باجی کے ساتھ کھیلا جاتا رہا وہ کھیل کالا حبشی میری دوسرے نمبر کی بہن عرشی سے کھیلنے لگا۔ جو حالت باجی کی تھی اب وہ حال عرشی کا ہو گیا تھا۔ عرشی مجھ سے بڑی تھی۔

عرشی نے بتایا وہ کالا حبشی رات کو میرے پاس آ جاتا ہے۔ وہ میرے ساتھ وہی حرکتیں کرتا ہے جو کہ ایک شوہر اپنی بیوی کے ساتھ کرتا ہے۔ جب وہ میرے پاس سے ہٹتا ہے تو میرا پیٹ پھول جاتا ہے اور صبح فجر تک میں اس حبشی کی شکل کے ڈھیروں بچے پیدا کرتی ہوں۔ ہر رات کے اس عمل سے عرشی کمزور ہوتی چلی گئی۔

جب دوسری بیٹی کی جان پر بن آئی تو امی نے سارا راز ابو سے کہہ سنایا۔ ابو سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

''اگر تم یہ سب مجھے پہلے بتا دیتیں تو میں اپنی بیٹی کو بچا لیتا۔''

اب ابو کی دوڑیں عاملوں کے پاس لگنے لگیں۔ طرح طرح کے عامل حضرات اپنا علم آزماتے رہے۔ پیسہ پانی کی طرح بہایا مگر پھر بھی عرشی موت کی پرسکون نیند سو گئی۔

گھر میں پھر جوان موت...... لوگ طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ رشتے داروں نے ملنا جلنا ختم کر دیا۔ دو جوان اموات نے امی ابو کو نڈھال کر دیا۔ مجھے دونوں بہنوں کی موت سے زیادہ یہ خوف تھا کہ اب میرا نمبر ہے۔

☆......☆......☆

عرشی کی موت کو دس دن گزر گئے۔ ایک دن میں رسی سے کپڑے اتار رہی تھی۔ رسی کے کونے پر ایک مردانہ قمیض ٹنگی تھی۔ میں قریب جا کر قمیض دیکھنے لگی۔ میرے گھر میں تو یہ کسی کی نہیں ہے......

یہ سوچتے ہوئے میں نے قمیض کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ خوف سے میری چیخ نکل گئی۔ قمیض میں ایک سر پھنسا تھا کسی کالے آدمی کا اور وہ سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔

میری چیخ کی آواز سن کر امی آ گئیں۔ میں امی سے لپٹ گئی۔

''امی مجھے بچالیں۔ امی وہ کالا آدمی...... قمیض میں...... وہ وہ...... اس کا سر......'' میرے منہ سے بے ربط الفاظ نکلنے لگے۔

''کہاں، کہاں بیٹا! یہاں تو کوئی قمیض نہیں ہے۔''

کمال کی بات یہ تھی کہ وہ امی کو نظر نہیں آ رہا تھا۔ امی مجھے لے کر کمرے میں آ گئیں۔ حبشی کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ باجی اور عرشی کس آزمائش سے گزری تھیں۔ مجھے اپنی موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ خوف سے میرا دل، میرے حلق میں دھڑک رہا تھا۔ میری حالت دیکھ کر امی متواتر روئے جا رہی تھیں۔

اتفاق سے اس وقت امی کی خالہ زاد بہن آ گئیں۔ ریحانہ خالہ امی کو روتا دیکھ کر بولیں۔

''کیا بات ہے، تم ماں بیٹی کیوں پریشان ہو۔''

خالہ کی ہمدردی پا کر امی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں اور روتے ہوئے سب کچھ بتا دیا۔ ریحانہ خالہ نے کہا۔

''خدا نے شاید اس وقت مجھے تمہاری مدد کو ہی بھیجا ہے۔ میں کل اپنے مرشد کے پاس پشاور جا رہی ہوں۔ وہاں ہر سال مرید قافلے کی صورت میں جاتے

ہیں۔ رہائش اور طعام کا بھی بہترین انتظام ہے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو عینی کو میرے ساتھ بھیج دو۔ انشاء اللہ تمہارا مسئلہ وہیں سے حل ہوگا۔"

امی نے کہا کہ ریحانہ باجی آپ عینی کو اپنے ساتھ لے جایئے گا۔ میں اِس کے ابو سے رات کو اجازت لے لوں گی۔ میں اب یہ موت کا کھیل ختم کروں گی۔ غلطی میری ہے تو سزا بھی مجھے ملے۔ میرے بچے بے قصور ہیں۔" امی یہ کہہ کر پھر رونے لگیں۔

ریحانہ خالہ نے امی کو تسلی دی اور مجھے صبح تیار رہنے کی تاکید کرتی ہوئی چلی گئیں۔

مجھے تو رات کی فکر تھی، رات تو مجھے گھر میں ہی گزارنی تھی۔

☆......☆......☆

رات بھی آ ہی گئی۔ خوف سے میرا دم خشک ہو رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی یا اللہ میری مدد فرما میں ریحانہ خالہ کے مرشد کا نام نہیں جانتی تھی مگر میں صبح صحیح سلامت اُن کے پاس پہنچنا چاہتی تھی۔ میں ساری رات جاگتی رہی۔ جب موت سامنے ہو تو نیند کسے آتی ہے میں پوری رات درود شریف کا ورد کرتی رہی۔ یہاں تک کہ فجر کی اذان ہوگئی۔ میں نے فجر کی نماز پڑھی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ساری رات وہ ملعون حبشی نظر نہیں آیا۔ میں نے بیگ میں اپنے کپڑے اور ضرورت کا سامان رکھا۔ اتنی دیر میں امی ابو بھی اُٹھ گئے۔

ٹھیک سات بجے ریحانہ خالہ آ گئیں اور میں سب کو خدا حافظ کہتی ہوئی ریحانہ خالہ کے ساتھ باہر آ گئی۔ گھر کے سامنے بس کھڑی تھی بہت سے مریدین حضرت صاحب سے ملنے جا رہے تھے میں بس میں کھڑکی کی طرف بیٹھ گئی۔ میرے ساتھ ہی ریحانہ خالہ بیٹھ گئیں۔ جب میں نے نظر اُٹھا کر گھر کی طرف دیکھا تو دروازے پر حبشی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میری اوپر کی سانس اوپر رہ گئی۔ بس آہستہ آہستہ چل پڑی۔

میرا خیال تھا کہ وہ بس میں آ جائے گا مگر وہ آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ بس چلتی رہی۔

مغرب سے کچھ پہلے بس ایک ہوٹل کے سامنے رُکی، لوگ اترنے لگے ریحانہ خالہ نے کہا کہ چلو عینی واش روم چلتے ہیں۔"

میں بس سے اُتر کر ریحانہ خالہ کے ساتھ ہوٹل کے اندر چلی گئی۔ واش روم سے فارغ ہو کر وضو کیا، کھانا کھایا۔ ریحانہ خالہ وہیں بیٹھ کر پان کھانے لگیں۔ میں اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ چھ سات قدم ہی چلی ہوں گی کہ سامنے درخت پر وہی حبشی اُلٹا لٹکا تھا۔ وہ میری طرف غصے سے دیکھ رہا تھا۔ پیچھے سے ریحانہ خالہ آواز دینے لگیں۔

"چلو عینی۔" میرے قدم من من بھر کے ہوگئے تھے۔ میں وہیں جم گئی تھی۔ خالہ نے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں جیسے ہوش میں آ گئی۔ تیز تیز قدم اٹھاتی بس میں سوار ہوگئی۔ حبشی ہنوز وہیں لٹکا ہوا تھا۔ بس چل پڑی پھر بس دو جگہ رُکی مگر میں بس سے نہ اتری۔

میں جانتی تھی کہ حبشی اپنی سی پوری کوشش کرے گا کہ میں حضرت صاحب تک نہ پہنچوں۔ حبشی نے جس طرح میری طرف غصے سے دیکھا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ میری پریشانی کا حل مرشد سرکار کے پاس ہی ہے۔

☆......☆......☆

اگلے دن عصر کے وقت ہم حضرت صاحب کے مسافر خانے کے آگے اترے۔ نماز عصر ادا کی، لنگر خانے میں کھانا کھایا۔ خالہ بولیں۔

"عینی بیٹا بے فکر ہو جا۔ وہ مردود حبشی سرکار کی حدود میں قدم نہیں رکھ سکتا۔"

بعد نماز مغرب تمام خواتین مرشد سرکار کی بیگم سے ملنے چلی گئیں۔ میں بھی اُن کے ساتھ تھی۔ خواتین اپنے مسائل حضرت صاحب کی بیگم کو بتاتی تھیں۔ وہ ایک کاغذ پر تمام مسائل لکھ لیتی تھیں پھر اُن کا حل سرکار کاغذ پر لکھ کر دیتے تھے۔ میں نے بھی تمام واقعہ بی بی مرشد سے کہہ دیا پھر ہم سب مسافر خانے میں آ گئے۔"

خالہ نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ مردود حبشی اب تک مجھے یہاں نظر نہیں آیا تھا۔ اگلی صبح ایک عورت مسافر خانے

میں آئی آواز لگا کر کہنے لگی۔
''عینی کون ہے! سرکار بلا رہے ہیں۔'' میں اُٹھ کھڑی ہوئی ریحانہ خالہ بولیں۔
''عینی بیٹا پردہ کر کے جانا۔ سرکار بے پردہ بیبیوں سے نہیں ملتے۔'' میں نے خود کو چادر سے اچھی طرح ڈھانپ لیا۔ جب میں حضرت صاحب کے پاس پہنچی تو وہاں بی بی مرشد بھی موجود تھیں۔ بی بی نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔ حضرت صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔
''بی بی نے مجھے آپ کا مسئلہ بتایا ہے۔ اب آپ کچھ کہیں۔''
میں اپنی دونوں بے قصور بہنوں کی موت کا بتاتے ہوئے رو پڑی۔
حضرت صاحب بولے۔ ''ابھی اس کو بلائے لیتے ہیں۔ میں خود اس سے معلوم کرتا ہوں کہ وہ کیوں تم لوگوں کے پیچھے پڑا ہے۔'' حضرت صاحب نے آنکھیں بند کیں پھر چند سیکنڈ بعد اچانک آنکھیں کھول دیں۔ وہ حیرت سے بولے۔
''وہ تو مسلمان ہے پھر اس طرح کی حرکت کیسے کر سکتا ہے۔'' پھر حضرت منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگے کچھ دیر بعد وہ کالا حبشی حضرت صاحب کے سامنے کھڑا تھا۔ حضرت صاحب نے گرجدار آواز میں کہا۔
''بیٹھ جا۔'' وہ فوراً بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں نیچی تھیں۔ سرکار بولے۔
''کیوں اس خاندان کے پیچھے پڑا ہے۔ مسلمان ہوتے ہوئے دوسرے مسلمان کو تنگ کرتا ہے۔''
حبشی بولا کہ اس لڑکی کی ماں نے مجھے اپنے عمل سے قبضے میں کیا۔ آپ تو جانتے ہیں میرے عمل میں جلالی پرہیز کیا جاتا ہے اور یہ عمل ایک ایسے چراغ کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے جس میں بڑے مینڈک کا خون ہو اور چوتارا کپڑا ڈال کر جلایا جائے۔ مجھے بلانے کے لیے چراغ جلایا جاتا ہے اور واپس بھیجنے کے لیے چراغ گل کر دیا جاتا ہے۔ میں یہاں اپنے قبیلے سے دور اپنی بیوی بچوں سے دور قید میں ہوں۔ وہ نہ مجھ سے کوئی کام لیتی ہے اور نہ آزاد کرتی ہے۔''

مرشد بولے۔ ''تو ان بچیوں کے پیچھے کیوں پڑا ہے۔ قصور ان کی ماں کا ہے۔ جس نے تجھے اپنے عمل سے حاضر کیا۔ تُو نے ان کی ماں کو کیوں نقصان نہ پہنچایا۔'' حبشی بولا۔
''اس کی ماں کا نام ہی دودھاری تلوار ہے بھلا میں زینت فاطمہ نامی اس کی ماں کو کیسے نقصان پہنچا سکتا ہوں۔'' مرشد بولے۔
''اب کیا چاہتا ہے۔'' حبشی ادب سے بولا۔
''اس کی ماں سے کہیں مجھے آزاد کر دے۔'' مرشد بولے۔
''اور جو اس کی دو جوان بہنیں جان سے گئیں اس کی سزا تو تجھے بھگتنا پڑے گی۔'' حبشی گڑگڑانے لگا۔
''سرکار مجھے معاف کر دیں۔ میں نے گناہ کیا اور اب میں توبہ کرتا ہوں۔'' مرشد گرجے۔
''تُو نے خدا کا بنایا قانون توڑا ہے۔ بلا اپنی اس فوج کو جو اس لڑکی کی بہنوں نے جنی ہے۔'' کچھ سیکنڈ بعد چھوٹے چھوٹے ڈھیروں بچوں سے کمرہ بھر گیا وہ بچے سب حبشی کی فوٹو کاپی تھے۔ مرشد بولے۔ تو اب اس فوج کے ساتھ مل کر انسانوں کو تنگ کرے گا۔ حضرت آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنے لگے تمام بچے ایک ایک کر کے صابن کے بلبلوں کی طرح پھٹنے لگے۔ سب ایک ایک کر کے ختم ہو گئے۔
اب حبشی کی باری تھی حضرت صاحب نے ہاتھ میں پانی لے کر بلند آواز میں کلمہ پڑھا اور اللہ اکبر کہہ کر پانی کے چھینٹے حبشی پر پھینک دیے۔ حبشی کے جسم میں آگ لگ گئی وہ راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

☆......☆......☆

آج میں ایک خوش و خرم زندگی گزار رہی ہوں۔ مرشد صاحب نے میرے لیے خدا سے خصوصی دعا کی تھی اور خدا نے بندے کے روپ میں مرشد صاحب کو میرے لیے فرشتہ بنا کر بھیج دیا۔ ''کالا حبشی'' آج بھی کبھی چشم زدن میں میرے سامنے آ جاتا ہے تو...... میں یہ سوچ کر ہی کانپ جاتی ہوں کہ اگر میرا انجام بھی میری بہنوں جیسا ہو جاتا تو......

☆☆......☆☆



اجازت



حنا بشریٰ

ایک ایسی استانی کی کہانی، جو آج بھی ایک جن زادے سے کیے وعدے کی پابند ہے



یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں تھرڈ ایئر میں تھی۔ عید میلادالنبی ﷺ کی آمد تھی۔ کالج میں میلاد کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ تمام ٹیچرز اور اسٹوڈنٹ میلاد کی تیاریوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ کالج گراؤنڈ میں اسٹیج تیار کیا گیا تھا۔ میلاد والے دن بے حد رونق تھی۔ ٹیچر دُرنایاب ہمیشہ کی طرح بے حد حسین اور باوقار لگ رہی تھیں۔ اُن کی عمر تقریباً 32 سال تھی۔ سرخ وسفید رنگت، لمبے سیاہ گھنے بال، سیاہ چمکدار آنکھیں۔ اُن کے حسن میں ایک عجیب طرح کی مقناطیسیت تھی۔ جو اُن سے ملتا اُن کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ میں تو تھی ہی اُن کی دیوانی۔ وہ سفید شلوار قمیض میں کسی دوسری ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھیں۔

ایک طالبہ تمام ٹیچرز میں موتیے کے گجرے تقسیم کر رہی تھی۔ جب اُس نے مس دُرنایاب کو پھول دیے تو انہوں نے ہمیشہ کی طرح انکار کر دیا تھا۔

میں یہ بات مسلسل دو سال سے نوٹ کر رہی تھی۔ موتیے کے پھول دیکھ کر اُن کے چہرے پر کرب سا چھا جاتا تھا۔ وہ آنکھیں سختی سے بند کر لیتی تھیں۔ میلاد ختم ہوا، چھٹی ہوگئی۔ مگر میں سارے راستے مس دُرنایاب کے بارے میں سوچتی رہی۔

اُن کا گھر میرے گھر کے قریب تھا۔ اکثر نوٹس وغیرہ کے سلسلے میں اُن کے گھر جانا ہوتا تھا۔ ایک شام میں اُن کے گھر جانے کا پروگرام بنا کر نکلی تو راستے میں گجرے والا کھڑا تھا۔ میں نے اُس سے گجرے لیے اور ٹیچر کے گھر کی طرف چل پڑی۔



مس دُرنایاب گھر پر تھیں۔ سادہ سے عام حلیے میں بھی وہ بے حد دلکش لگ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ شفقت سے مسکرائیں، میں نے اُن کے سامنے گجرے پیش کر دیے۔ گجرے دیکھ کر وہ ایک دم ایسی ہو گئیں کہ جیسے اُن کا سانس رُک گیا ہو۔ انہوں نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں اور بولیں۔

''میں گجرے نہیں پہنتی۔''

''مگر کیوں؟'' میرے اندر کلبلاتا سوال لبوں پر آ گیا۔

''بس مجھے پسند نہیں ہیں۔'' افسردہ لہجے میں بولیں۔

''مس آپ کی ابھی تک شادی بھی نہیں ہوئی۔'' میں نے اُن سے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ میری بات پر وہ پل بھر کے لیے خاموش ہوئیں اور پھر بولیں۔

"بس اجازت ہی نہیں ملتی۔" اُن کی آنکھوں میں اضطراب نمایاں تھا۔

"کس سے اجازت نہیں ملتی؟" میرے سوال میں حیرت کا عنصر غالب تھا۔

"اوہ تو آج تم میرا انٹرویو لینے آئی ہو۔ پڑھائی کا کوئی موڈ نہیں ہے۔" مس دُرنایاب کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

میں آج بھی اپنے سوالوں کے جواب حاصل نہیں کرسکی تھی۔

☆......☆......☆

چند دنوں کے بعد میں اُن کے گھر دوبارہ گئی تو وہ گھر



پر موجود نہیں تھیں۔ اُن کی چھوٹی بہن غزالہ آئی ہوئی تھی۔

"غزالہ آپی ایک بات پوچھوں۔ اگر آپ برا نہ مانیں۔" میں نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں پوچھو!" غزالہ آپی خوشدلی سے مسکراتے ہوئے بولیں۔

"آپ آپ مس دُرنایاب سے چھوٹی ہیں مگر آپ کی شادی ہوچکی ہے لیکن مس دُرنایاب ابھی تک غیر شادی شدہ ہیں۔ وہ موتیے کے گجرے دیکھ کر اتنا عجیب بی ہیو کیوں کرتی ہیں؟" میرے لہجے میں تجسس تھا۔ میرے سوالات سُن کر غزالہ آپی کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں ہوگئے تھے۔

"یہ بہت افسوس ناک واقعہ ہے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہم کالج میں تھے۔ دُرنایاب کی عادت تھی کہ وہ رات کو باغ میں ٹہل کر پڑھا کرتی تھی۔ باغ میں طرح طرح کے پھول تھے۔ وہاں ایک موتیے کا بڑا سا پودا تھا۔ جس پر شام کو ڈھیروں پھول لگتے تھے۔ آپی کو موتیے کے پھول بہت پسند تھے۔ دادی ہمیشہ منع کرتی تھیں کہ جوان بچیوں کو رات کے وقت پھول نہیں توڑنے چاہئیں۔ اِرد گرد نجانے کون سی مخلوق ہو۔ کنواری بچیاں ایسی اَن دیکھی مخلوق کی نظر میں آجاتی ہیں۔"

مگر آپی ایسی باتوں پر ہنسا کرتی تھیں۔ انہیں ایسی باتوں پر یقین نہیں تھا۔

☆......☆......☆

ایک رات آپی دیر تک پڑھتی رہی تھیں۔ پورا باغ موتیے کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ آپی نے مسحور ہوکر موتیے کے پھول توڑ لیے، کچھ بالوں میں لگالیے۔ اور باقی آنچل میں ڈال کر کمرے میں آگئیں اور اپنے تکیے

کے پاس رکھ لیے۔ آپی تو ویسے ہی بہت پیاری ہیں۔ پھولوں کے سنگھار سے مزید حسین لگ رہی تھیں۔

''ارے آپی آپ نے پھول کیوں توڑے۔ دادی ناراض ہوتی ہیں۔'' میں نے انہیں دیکھ کر کہا۔

''افوہ فضول باتیں مت کرو۔ میں ان دقیانوسی باتوں پر یقین نہیں کرتی۔'' آپی کے لہجے میں لاپروائی کے ساتھ بیزاریت بھی تھی۔

مجھے بہت نیند آرہی تھی میں نے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔

صبح ہم کالج جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ میں نے آپی کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ اُلجھی اُلجھی سی لگ رہی تھیں۔ میں نے پوچھا تو آپی نے کہا کہ رات میں نے بہت عجیب سا خواب دیکھا تھا۔''

پھر دن آ گئی اور بات آئی گئی ہوگئی۔ کالج میں آپی کی دوست زویا جو گیٹ پر ہی انتظار کر رہی تھی۔ فوراً بولی۔

''دُرنایاب ٹرپ پر جانے کی جازت ملی؟''

''نہیں زویا ابو نہیں مان رہے۔'' آپی افسردگی سے بولیں۔

''یہ کیا بات ہوئی؟ میں شام کو آؤں گی انکل سے اجازت لینے۔'' زویا ناراضگی سے بولی۔

☆......☆......☆

''آپی رات کو آپ نے کیا خواب دیکھا تھا؟'' میں نے صبح والی بات دہراتے ہوئے پوچھا۔

''غزالہ میں نے دیکھا سفید سی کھڑکی ہے۔ اُس میں ایک بڑا سا عقاب بیٹھا ہے۔ اُس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ آنکھوں میں عجیب سی پُراسراریت تھی کہ خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اُس کے پنجوں میں موتیا کے پھولوں کی لڑی تھی۔ جو وہ میرے اوپر پھینک دیتا ہے۔ جس سے میں بے ہوش ہو جاتی ہوں۔'' خواب سُنا کر آپی پریشان لگ رہی تھیں۔ میں نے انہیں تسلی دی۔

شام کو آپی کی دوست زویا نے آ کر ابو اور دادی کو ٹرپ کے لیے منایا اور آخر کار ہمیں ٹرپ پر جانے کی اجازت مل ہی گئی۔

اگلے دن ہم کالج سے مری کی طرف روانہ ہو گئے۔

بس میں تمام لڑکیوں نے خوب ہلا گلا کیا۔ وہ گانے گا رہی تھیں۔ تمام ٹیچرز بھی بہت انجوائے کر رہی تھیں۔

اچانک آپی نے مجھے آواز دی۔

''غزالہ دیکھو وہ کیا ہے؟'' میں نے دیکھا تو ایک بہت بڑا عقاب بس کے اِرد گرد اُڑ رہا تھا۔ آپی اُسے دیکھ کر ایکدم خاموش سی ہوگئی تھیں۔

رات تک ہم مری پہنچ گئے تھے۔ تھکاوٹ سے بُرا حال تھا۔ سردی بھی بہت بڑھ چکی تھی۔ رات کا کھانا کھا کر ہم سونے کی غرض سے اپنے کمروں میں آ گئے۔ آپی کے چہرے پر تفکر کی لکیریں نمایاں تھیں۔

''یہ تمہیں کیا ہوا ہے؟'' زویا آپی نے دُرنایاب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''زویا اِس کمرے کی کھڑکی بالکل ویسی ہے جیسی میں نے خواب میں دیکھی تھی۔'' آپی نے غم زدہ لہجے میں کہتے ہوئے ہم دونوں کو دیکھا۔

''کم آن دُرنایاب! اب تم ہمیں بور کر رہی ہو۔ بس کرو اور گولی مارو اُس عقاب کے بچے کو بلکہ مجھے پتا ہوتا تو میں بابا کی بندوق لے کر آتی۔'' زویا جوش سے بولی۔ زویا کی بات پر ہم سب ہنس پڑے تھے۔

''دُرنایاب پلیز یار کھڑکی تو بند کر دو۔ ایمان سے کہیں ہماری برف نہ بن جائے۔'' آپی نے ہنستے ہوئے کھڑکی بند کر دی۔ صبح جب آنکھ کھلی تو کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔

''دُرنایاب تم نے رات کھڑکی بند نہیں کی تھی۔'' زویا آپی نے حیرت سے کھڑکی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں میں نے خود کھڑکی بند کی تھی۔ میں نہیں جانتی کہ یہ کیسے کھلی۔'' آپی نے حیران ہوتے ہوئے کھڑکی کو دیکھا۔ کھڑکی کے پاس ایک پَر گرا تھا۔ میں نے آپی کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو وہ بھی پَر کو حیرت سے تک رہی تھی (پَر کسی بڑے عقاب کا لگ رہا تھا)۔

☆......☆......☆

اگلے دن ہم صبح صبح ہی سیر کے لیے نکل گئے۔ برف باری ہو رہی تھی۔ ہم سب بہت انجوائے کر رہے تھے۔ سب لڑکیاں تصویریں اُتار رہی تھیں۔ اتنے میں ہم نے دیکھا ایک خوبرو سا لڑکا کھڑا تھا جو شاید گجرے والا تھا۔

شکل وصورت سے وہ ہرگز گجرے والا نہ لگ رہا تھا۔ وہ مسلسل دُرِ نایاب کو گھور رہا تھا۔ جیسے دُرِ نایاب کے علاوہ وہاں کوئی دوسرا نہ ہو۔ زویا آپی اُس کی محویت سے دیکھنے پر آپی کو چھیڑنے لگی البتہ وہ بالکل گم صم سی تھیں۔

''ارے بھائی گجرے والے یہ گجرے کتنے کے ہیں؟'' زویا آپی نے قریب جا کر پوچھا۔

''یہ مفت ہیں اور یہ اُن کے لیے ہیں۔'' اُس نے آپی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''کیوں جی اِن کے لیے مفت کیوں ہیں۔ سنبھالو اپنے گجرے!'' یہ کہتے ہوئے زویا آپی نے گجرے اُس کے ہاتھ میں پکڑائے۔

یکا یک وہ درد سے چلانے لگیں۔ زویا آپی کا ہاتھ سرخ ہو رہا تھا۔ یوں جیسے ہاتھ جل گیا ہو۔ ہم سب زویا آپی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ میری اچانک نظر پڑی تو وہ لڑکا ہر چیز سے بے نیاز آپی کو تک رہا تھا۔ اُسے گردو پیش کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ مجھے خوف سے جھرجھری سی آ گئی۔

زویا آپی کا ہاتھ کیسے جلا تھا؟ آگ کہاں تھی؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ ہم سب واپس ہوٹل آ گئے۔

زویا آپی نے ہمارے پوچھنے پر بتایا کہ اُس لڑکے کا ہاتھ اس قدر گرم تھا جیسے میں نے اپنا ہاتھ بھٹی میں ڈال دیا ہو۔ بات بہت عجیب اور ناقابلِ یقین تھی۔

☆......☆......☆

صبح پھر سے سیر و تفریح کے لیے سب نکل گئے۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ بہت سی لڑکیاں اور ٹیچرز شاپنگ بھی کر رہی تھیں۔ اچانک میری نظر اُسی لڑکے پر پڑی وہ آج بھی آپی کو دیکھ رہا تھا۔ آپی جان کر بھی انجان بن گئی اور اشارے سے منع کر دیا کہ زویا کو پتا نہ چلے ورنہ لڑنے نہ پہنچ جائے۔

اگلے دن ہم واپس گھر آ گئے تھے۔ گھر آتے ہی آپی کی طبیعت شدید خراب ہو گئی تھی۔ کوئی دوا اثر نہیں کر رہی تھی۔ بخار تھا کہ اُترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

پھر ایک عجیب و غریب حرکت روز ہونے لگی کہ آپی ہر روز موتیے کے پودے کے پاس بے ہوش ملتیں۔ نجانے رات کو وہ کیسے باغ میں چلی جاتی تھیں۔ میں نے یہ سب دادی کو بتا دیا۔ دادی بہت عبادت گزار خاتون تھیں۔ فوراً معاملے کی نزاکت کو بھانپ گئیں۔

''غزالہ بیٹا آج میں تم لوگوں کے کمرے میں سوؤں گی۔'' دادی نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ امی ابو بھی دونوں بہت پریشان تھے کہ یہ بیٹھے بٹھائے کیا مصیبت آ گئی تھی۔ آپی اُن دونوں کی بے حد لاڈلی جو تھیں۔

''ناجانے میری بچی کو کس کم بخت کی نظر لگ گئی ہے۔'' امی نے سوئی ہوئی آپی پر افسردہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

میری نظروں میں وہ گجرے والا لڑکا گھوم گیا تھا۔ جس کی چمکدار نیلی آنکھیں آپی پر جمی رہتی تھیں۔ مگر میں امی کو بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''دلہن تم فکر نہ کرو، دُرِ نایاب ٹھیک ہو جائے گی۔'' دادی نے امی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

میں ایک انجانے خوف میں مبتلا تھی کہ اب جانے آگے کیا ہونے والا ہے؟

☆......☆......☆

رات کو دادی ہمارے کمرے میں عبادت کر رہی تھیں۔ اُن کی تمام توجہ آپی پر تھی۔ آپی گہری نیند سو رہی تھیں۔ رات 12 بجے موتیے کی تیز خوشبو آنے لگی۔ میری نیند خوف کے مارے پہلے ہی اُڑ چکی تھی۔ اس افتاد پر تو ہوش ہی اُڑ گئے۔ دادی سب محسوس کر رہی تھیں۔ مگر پڑھنے میں مصروف تھیں۔ ایک دم دروازہ تیز ہوا کے جھونکے سے کھل گیا۔ آپی گہری نیند سو رہی تھیں۔ مگر اچانک سے اٹھیں۔ وہ ابھی بھی نیند میں تھیں۔ اُٹھ کر باہر جانے لگیں۔ میری آنکھیں خوف اور حیرت کے مارے پھٹ رہی تھیں۔ دادی نے فوراً اُٹھ کر آپی کو پکڑ لیا۔ اور دروازے کی کنڈی لگا دی میرا خوف سے برا حال ہو گیا تھا۔ البتہ آپی گہری نیند میں تھیں۔ پھر ساری رات وقفے وقفے سے دروازے پر دستک ہوتی رہی مگر دادی نے دروازہ نہ کھولنے دیا۔

☆......☆......☆

اگلا دن بھی بہت مصیبت بھرا تھا۔ آپی کی حالت بہت جنونی سی ہو رہی تھی۔ آنکھیں سرخ اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ دادی کو بہت خونخوار نظروں سے گھور رہی

تھیں۔ ہم سب بہت پریشان تھے۔ امی کا رو رو کر برا حال تھا۔

دادی نے ابو سے کہا کہ ”کسی اوپری شے کا خلل لگتا ہے۔ کسی اللہ والے سے بات کرو۔“

شام کو آپی کو ایک مزار پر لے گئے۔ وہاں ایک عورت نے آپی کو دیکھا اور بتایا کہ اس بچی پر کسی جن کا سایا ہے۔ جو بہت طاقتور ہے۔ وہ اس لڑکی کو نہیں چھوڑے گا۔“ انہوں نے ایک سرخ دھاگہ دے کر کہا کہ یہ لڑکی کی کلائی پر باندھ دو۔ اگر اس کو اُتارا تو وہ جن پھر سے نقصان پہنچا سکتا ہے۔“ دھاگہ باندھنے کے بعد آپی بالکل پُرسکون ہوگئی تھیں۔

”اماں پتا نہیں کیا ہوگیا ہے میری بچی کو!“ ابو پریشانی سے ٹہلتے ہوئے بولے۔

”حوصلہ کرو بیٹا! اللہ بہتر کرے گا۔“ دادی نے ابو کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”نجانے کس کم بخت کی نظر میری بچی کو لگی ہے۔ کیسا پھول سا چہرہ کمہلا گیا ہے۔“ امی روتے ہوئے بولیں۔

میں خاموشی سے سب کی باتیں سن رہی تھی اور آنسو بہا رہی تھی۔

”غزالہ سچ بتانا آخر دُرِنایاب کو کیا ہوا تھا؟“ امی روتے ہوئے اچانک بولیں۔

”امی میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ میں نے گڑبڑاتے ہوئے وضاحت کی۔

”تم دونوں دن رات ساتھ ہوتی ہو، کچھ تو ایسا ہوا ہوگا جس کا ہمیں علم نہیں ہے۔“ اب کے دادی مجھے گھورتے ہوئے بولیں۔

پھر میں نے آپی کا موتیے کے پھول لگانے کا واقعہ سب کو بتا دیا، جس کے بعد یہ مصیبت آ گئی تھی۔

”آئے ہائے کتنا منع کرتی تھی کہ کنواری بچیوں کو احتیاط کرنی چاہیے، وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔“ دادی نے سر پیٹتے ہوئے کہا۔

دھاگہ باندھنے کے بعد آپی قدرے بہتر تھیں۔ رات کو میری آنکھ باتوں کی آواز سے کھل گئی۔ میرا سانس پل بھر کے لیے رُک سا گیا تھا۔ پورے کمرے میں موتیے کی دلفریب خوشبو پھیلی تھی۔ آپی کسی سے باتیں کر رہی تھیں۔

وہ نادیدہ مخلوق میری نگاہوں سے اوجھل تھی۔ کچھ دیر بعد باتوں کی آوازیں بند ہوگئیں اور کمرے سے موتیے کی خوشبو بھی ختم ہوگئی تھی۔ یعنی وہ نادیدہ مخلوق جا چکی تھی۔ میں نے آپی کو دیکھا وہ سوگئی تھیں۔ اُن کی دونوں کلائیوں میں گجرے تھے۔ وہ لال دھاگہ کہاں گیا؟ میں نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا تو دھاگہ زمین پر گرا تھا۔ میں خوف سے بھاگتی ہوئی امی ابو کے کمرے میں گئی اور انہیں سب بتا دیا امی سنتے ہی رونے لگیں۔

☆......☆......☆

اگلے دن ابو اپنے ایک دوست کو لے کر آئے جو روحانی علوم کا ماہر تھا۔ ابو نے انہیں آپی کے متعلق تمام تفصیل بتا دی۔

عامل صاحب جب آپی کے کمرے تک پہنچے تو دیکھا کہ آپی کھڑکی میں کھڑی ہیں۔ جو انہیں یعنی عامل صاحب کو گھور رہی تھیں۔ اُن کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ بکھرے ہوئے بال انہیں مزید وحشت زدہ بنا رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں چھری تھی۔ عامل صاحب کو دیکھتے ہی انہوں نے حملہ کر دیا اور بے چارے اپنے دفاع میں کچھ کرتے کہ آپی نے انہیں زخمی کر دیا۔ عامل صاحب کافی پریشان ہوگئے تھے۔ سب گھر والے بے حد غم سے گزر رہے تھے۔

اُن کے جانے کے بعد آپی بالکل ٹھیک ٹھاک ہوگئیں۔ بلکہ نہا دھو کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے بال سنوار رہی تھیں کہ میں نے اُن سے پوچھ لیا۔

”آپی آپ کہیں جا رہی ہیں۔“ میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ جواب میں آپی نے مجھے انتہائی ناگواری سے گھورا تھا۔

”اپنے کام سے کام رکھو۔“ آپی انتہائی سخت لہجے میں بولیں۔ یہ آواز اور یہ انداز ہرگز آپی کے نہ تھے۔ پھر آپی جا کر بستر پر لیٹ گئیں۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ آج کی رات بالکل نہیں سوؤں گی۔ بلکہ آپی کی ہر حرکت پر نظر رکھوں گی۔

12 بجے کے بعد کمرے میں موتیے کی تیز خوشبو پھیل گئی۔ خوشبو سے مجھے شدید قسم کی غنودگی ہونے لگی تھی

مگر میں نے زبردستی خود کو سونے سے باز رکھا۔ آپی کسی سے باتیں کر رہی تھیں۔

''دُرِنایاب! تم صرف میری ہو۔ تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ ایک دن میں تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''

میں نے تھوڑی سی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اُف میرے خدا! اگر اُس وقت میں اپنے آپ پر قابو نہ پاتی تو شاید میری چیخ نکل جاتی۔ وہی مری والا لڑکا جس کی نیلی آنکھیں تھیں۔ جو گجرے والا تھا۔ وہ آپی سے باتیں کر رہا تھا۔ اور اُن کے ہاتھوں میں گجرے پہنا رہا تھا۔ اُس کے انداز میں بے پناہ محبت نمایاں تھی۔ اُس کی آنکھوں اور لہجے میں بہت حق کی آمیزش تھی۔ اچانک وہ آپی کے ہاتھ پکڑ کر باہر جانے لگا۔ مجھ میں نہ جانے کہاں سے اتنی ہمت آ گئی تھی کہ میں اُٹھ کھڑی ہوئی اور مضبوط آواز میں بولی۔

''رُک جاؤ! تمہیں حضرت سلیمانؑ کا واسطہ ہے۔''

میری آواز سنتے ہی وہ سرخ رنگ کے بگولے کی صورت اختیار کر کے باہر نکل گیا اور آپی بے ہوش ہو گئیں۔ صبح میں نے تمام تفصیل گھر والوں کو بتائی۔

ابو اپنے دوست کے پاس دوبارہ گئے تھے۔ اور پریشانی بیان کر کے مدد مانگی تھی۔

''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ جن میری جان بھی لے سکتا ہے۔'' عامل صاحب نے اپنی مجبوری بیان کرتے ہوئے کہا۔

''پھر بھی کوئی تو حل ہوگا اس مسئلے کا!'' ابو ہنوز پریشان تھے۔

''ہاں ایک ہستی ہے جنہیں میں جانتا ہوں۔ وہ بہت نیک اور اللہ والے ہیں۔ شاہ محمد حسین! راولپنڈی میں ہوتے ہیں۔ وہ آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔'' کافی دیر بعد وہ بولے۔

امی اور ابو دونوں فوراً راولپنڈی روانہ ہو گئے۔ گھر میں صرف میں، آپی اور دادی تھے۔ وہ رات ہم پر بہت بھاری گزری تھی۔ دادی ہمارے کمرے میں مسلسل پڑھائی کر رہی تھیں۔ میرا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ رات کو ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ آپی اپنے بستر پر لیٹی خاموشی سے چھت کو گھور رہی تھیں۔ کتنی خوبصورت اور زندہ دل ہوتی تھیں وہ مگر اب کیسے مرجھا کر رہ گئی تھیں۔ میں آپی کو دیکھتے ہوئے دکھی ہو رہی تھی۔ دادی بار بار آپی پر دم کر رہی تھیں کہ بارہ بجے کمرے میں تیز موتیے کی خوشبو پھیل گئی۔ خوشبو سے مجھے غنودگی سی ہونے لگی تھی۔ مگر مجھے جاگنا تھا۔ آج سونے سے زیادہ جاگنے کی ضرورت تھی۔

آپی کے چہرے پر بے چینی سی پھیل گئی تھی۔ وہ اضطرابی کیفیت میں اِدھر سے اُدھر ٹہل رہی تھیں۔ دادی اُن کی ہر حرکت پر نظر رکھ رہی تھیں۔ ایک پل کے لیے غافل ہونے کا مطلب یہ تھا کہ وہ جن آپی کو اپنے ساتھ لے جاتا اور ہم انہیں ہمیشہ کے لیے کھو دیتے۔ دادی مجھے اشارہ کر رہی تھیں کہ خبردار دروازہ کسی صورت میں نہ کھولنا۔ اسی اثناء میں دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ دستک کی آواز پر آپی کی پریشانی عروج پر تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھولتیں میں نے انہیں مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ دادی اور میں نے انہیں قابو کرنے کے لیے رسی سے باندھ دیا۔ دستک تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اب دروازہ ٹوٹ جائے گا۔ آپی کی حالت جنونی سی ہو رہی تھی۔ وہ ہمیں غضبناک نظروں سے گھور رہی تھیں۔ دادی مسلسل قرآنی آیات کا ورد کر رہی تھیں۔ کافی دیر دستک کے بعد خاموشی چھا گئی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس خاموشی میں طوفان ہے!

باہر بالکل خاموشی تھی کہ کچھ دیر بعد ابو کی آواز آئی۔

''دُرِنایاب دروازہ کھولو۔'' اِس وحشت زدہ ماحول میں ابو کی آواز سن کر میری جان میں جان آئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں دروازہ کھولتی دادی نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا۔

''رُک جاؤ غزالہ!'' دادی نے سختی سے کہا۔

''دادی ابو آ گئے ہیں۔'' میں بے چینی سے بولی۔

''غزالہ یہ تمہارا باپ نہیں ہے۔ یہ دھوکہ ہے!'' دادی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''دادی وہ باہر کھڑے ہیں، کہیں کوئی اُن کو نقصان نہ پہنچا دے۔'' میں نے التجا کی۔

''غزالہ چپ ہو جاؤ!'' دادی اکتاہٹ سے

بولیں۔ میں ڈر کر خاموش ہوگئی تھی۔ آواز دوبارہ آئی۔

''دُرِ نایاب دروازہ کھولو۔'' آواز میں شدید غصہ تھا۔ آپی آواز سن کر مزید بے چین ہوگئی تھیں۔ آواز پھر آئی تھی۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ باہر ابو نہیں ہیں کیونکہ وہ ہوتے تو ایک بار تو آواز دیتیں۔ یا مجھے اور دادی کو پکارتے صرف آپی کو کیوں پکارا جارہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

کچھ دیر بعد پھر دستک ہوئی اور پھر باہر سے کسی کے رونے کی آواز آئی۔ شاید وہ لڑکا رو رہا تھا۔ اُس نے روتے ہوئے عاجزانہ انداز میں کہا۔

''دُرِ نایاب دروازہ کھولو۔'' کافی دیر تک سسکیوں کی آواز آتی رہی۔ آواز بہت دردناک تھی۔ لمحے بھر کے لیے مجھے اُس پر بہت ترس آیا تھا۔ پھر جیسے ہی فجر کی اذان ہوئی رونے کی آواز بند ہوگئی۔ اس کے بعد خاموشی چھاگئی۔ میں نے اور دادی نے نماز ادا کی اور اللہ سے مدد مانگی۔ دعا مانگتے ہوئے میری نظر آپی پر پڑی۔ وہ ابھی تک رسی سے بندھی تھیں اور نجانے کب سوچکی تھیں۔ مجھے اُن کی حالت دیکھ کر بہت رونا آیا تھا۔ مگر ایسا آپی کی زندگی کے لیے بہت ضروری تھا۔

☆......☆......☆

صبح ہی ابو شاہ صاحب کو لے آئے۔ وہ تقریباً 60 یا 70 سال کے تھے۔ چہرہ انتہائی نورانی تھا۔ ابو انہیں آپی کے کمرے میں لے گئے۔ آپی کی طرف دیکھ کر وہ مسکرانے لگے تھے۔

''کیوں میاں خود جاؤ گے یا ہم تمہیں تمہاری دنیا میں چھوڑ کر آئیں۔'' شاہ صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔

''میں اِس لڑکی کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔'' آپی کرخت مردانہ آواز میں بولیں۔

''جانا تو پڑے گا! وہ الگ بات ہے کہ پہلے سزا ملے گی۔'' شاہ صاحب سنجیدہ لہجے میں بولے۔ ایکدم ہی آپی نے توڑ پھوڑ شروع کردی۔ شاہ صاحب پر حملہ کرنے والی تھیں کہ شاہ صاحب نے ایک زوردار تھپڑ مار دیا۔ آپی بے ہوش ہوگئیں۔ شاہ صاحب نے کچھ پڑھنا شروع کردیا۔ تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھول دیں۔ اور کمرے سے باہر نکل کر سیدھا باغ میں چلے گئے۔ ساتھ ساتھ پڑھتے جارہے تھے۔ اور موتیے کے پودے کو اکھاڑ رہے تھے۔ ابو سے کہا کہ ''اِس پودے کو فوراً جلادو۔ اِس خبیث کا یہیں بسیرا ہے۔''

جاتے وقت شاہ صاحب نے دو ہدایات دیں کہ ایک تو آپی کی فوراً شادی کردی جائے اور دوسرا انہیں کبھی موتیے کے پھول نہ پہنائے جائیں۔ آپی کو تعویذ بھی دیا تاکہ حفاظت رہے۔ اُس دن آپی بے حد ہلکی پھلکی لگ رہی تھیں۔ مسکراتے ہوئے یوں اٹھی تھیں جیسے گہری نیند کے بعد انسان جاگتا ہے۔ اور تازہ دم ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

ابو کے ایک دوست کے بیٹے کے ساتھ آپی کا رشتہ طے پاگیا۔ آپی دلہن بن کر چاند کا ٹکڑا لگ رہی تھیں۔ مگر میرا دل وہم میں مبتلا تھا۔ نجانے کیا ہونے والا ہے؟

انہی سوچوں میں گم تھی کہ آپی کے کمرے سے چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں بھاگتی ہوئی اندر گئی تو دیکھا لڑکیاں خوفزدہ کھڑی ہیں۔ آپی بے ہوش تھیں اور اُن کے ہاتھوں میں موتیے کے گجرے تھے۔ میں نے سر پکڑ لیا کہ آپی کو موتیا کے پھول منع تھے۔ شاید کسی لڑکی نے تیار کرتے ہوئے انہیں پھول پہنا دیے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ای نے روتے ہوئے آپی کے جہیز کے سامان کے جلنے کا بتایا۔

اسٹور میں پڑے تمام سامان کو آگ لگ گئی تھی نجانے کیسے؟ ہم ابھی پریشان تھے کہ فون پر اطلاع ملی کہ دولہا کا ایکسیڈنٹ ہوگیا اور کافی زخمی ہوئے۔ یعنی وہ مخلوق دوبارہ آچکی تھی اور یہ سب اُس کی انتقامی کارروائی تھی۔

ابو نے شاہ صاحب کو فون کیا تو وہ کسی کام سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ یہ شاید ہماری خوش قسمتی تھی ورنہ انہیں لینے جانا پڑتا تو دیر ہوجاتی اور رات ہی رات میں جانے کیا سے کیا ہوجاتا۔

وہ جیسے ہی آئے آپی انہیں دیکھتے ہی جنونی سی ہوگئیں۔ انہوں نے آپی کی طرف کچھ پڑھ کر پھونکا اور خود پڑھائی میں مصروف ہوگئے۔ کافی دیر پڑھائی کے بعد وہ بولے۔

''میں نے آپ سب کو منع کیا تھا کہ اس بچی کو موتیے کے پھولوں سے دور رکھنا ہے مگر آپ لوگوں نے

میری بات پر غور نہیں کیا۔‘‘ شاہ صاحب سنجیدگی سے بولے۔

’’شاہ صاحب غلطی ہوگئی آئندہ شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔‘‘ ابو بے حد عاجزی سے بولے۔

’’آج اگر میرے آنے میں دیر ہو جاتی تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس بچی کو اپنے ساتھ لے جاتا۔‘‘ شاہ صاحب افسوس بھرے لہجے میں بولے۔

’’آج میں اس کا پکا بندوبست کر کے جاؤں گا۔‘‘ شاہ صاحب کے لہجے میں مضبوطی تھی۔

شاہ صاحب نے پڑھائی شروع کی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے کسی کے ساتھ جنگ کر رہے ہوں۔ کسی کو مار رہے ہوں۔ چند لمحوں بعد اُس کی آواز سنائی دی۔

’’کچھ بھی ہو جائے میں دُرنایاب کو نہیں چھوڑوں گا۔ وہ صرف میری ہے۔ اُسے مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔‘‘ اُس لڑکے کی دردناک آواز میں ضد سی تھی۔

’’جانا تو پڑے گا۔‘‘ شاہ صاحب اٹل لہجے میں بولے۔ کافی دیر تک وہ پھر پڑھائی میں مصروف ہو گئے۔ اسی دوران اُس لڑکے کے رونے کی آواز آئی تھی۔ وہ رو رہا تھا۔ تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ معافی مانگ رہا تھا۔

’’آخر ہمارے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے؟‘‘ اُس لڑکے کی آواز میں نمی گھلی تھی۔

’’ہم بھی دل رکھتے ہیں۔ محبت کرتے ہیں۔ آخر ہمیں ہی کیوں جدا کیا جاتا ہے۔‘‘ وہ لڑکا دل گرفتگی سے بولا۔

’’اِس لیے کہ یہ فطری لحاظ سے دُرست نہیں۔ تم آگ ہو وہ خاک ہے۔ تم نقصان پہنچاتے ہو وہ نقصان اٹھاتے ہیں۔ تم طاقتور ہو وہ کمزور ہیں۔ جنات اور انسان کے تعلق میں سارا نقصان انسان کا ہوتا ہے۔‘‘ شاہ صاحب کے لہجے میں اب نرمی تھی۔

میں نے کھڑکی سے ذرا سا جھانکا تھا۔ وہ لڑکا نڈھال بیٹھا تھا۔ اُس کے چہرے پر زخم تھے اور شکست کے تاثرات تھے۔ مجھے پل بھر کے لیے اُس کی حالت پر رحم سا آیا۔

’’پھر ہمیں انسان سے محبت کیوں ہوتی ہے۔‘‘ وہ لڑکا نڈھال لہجے میں بولا۔

’’اِس کی بھی بہت سی وجوہات ہیں۔ ہم جب اپنی حدود و قیود کو توڑتے ہیں تو مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی دنیا میں رہتے ہوئے دوسروں کی دنیا میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ انسان اپنے بڑوں کی نصیحت کو غور سے نہیں سنتا اور جنات اپنی دنیا کے اصول و قوانین توڑ ڈالتے ہیں۔ محبت پر مانا اختیار نہیں مگر نفس پر تو اختیار ہے نا۔ اور یہ لڑکی اور اس کے گھر والے تم سے نجات چاہتے ہیں۔ وہ انسان ہیں، انسانوں کے ساتھ ہی تعلقات رکھنا چاہتے ہیں۔ تم نے یہ ظاہری خوبصورتی تو اختیار کر لی لیکن کیا کبھی اپنی اصلی صورت انہیں دکھا سکو گے۔ کیا یہ تم سے خوف نہیں کھائیں گے۔‘‘ شاہ صاحب ناصحانہ انداز میں بولے۔ وہ لڑکا جواباً خاموش رہا تھا۔

’’تم ہماری بات مان لو۔ ہم تمہیں جانے دیں گے۔‘‘ شاہ صاحب نے اُسے خاموش دیکھ کر کہا۔

’’میں چلا جاؤں گا مگر میری دو باتیں ماننا ہوں گی۔ پھر میں اپنی محبت سے دستبردار ہو جاؤں گا۔‘‘ وہ لڑکا شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

’’کون سی باتیں!‘‘ شاہ صاحب نے سوالیہ انداز میں اُسے دیکھا۔

’’ایک یہ کہ یہ کبھی موتیا کے پھول نہیں پہنے گی اور نہ ہی کبھی شادی کرے گی۔‘‘ وہ لڑکا بولا۔

’’ٹھیک ہے تمہاری دونوں شرطیں منظور ہیں مگر تم اب کبھی اِسے تنگ نہیں کرو گے۔‘‘ شاہ صاحب نے اُسے بھی پابند کرتے ہوئے کہا۔

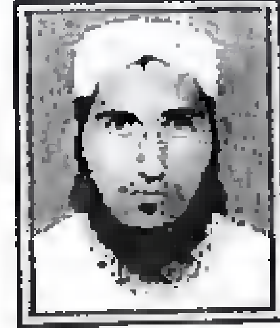
اس کے بعد وہ لڑکا غائب ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد آپی بالکل ٹھیک ہو گئیں۔ انہوں نے وہ دونوں شرطیں ہمیشہ کے لیے مان لیں۔‘‘

مس دُرنایاب کے بارے میں حقیقت جان کر غزالہ آپی اور میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں اپنے گھر آ گئی مگر میں اب بھی سوچتی ہوں کہ مس دُرنایاب کو آخر کس بات کی سزا ملی ہے؟ محبت تو اُس جن نے کی تھی۔ مگر سزا اس نے اٹھائی ہے۔ یہ کیسی محبت تھی؟ اب مجھے اُن کے گجرے نہ پہننے کی وجہ سمجھ آ گئی ہے۔ مگر نا جانے انہیں شادی کی اجازت کب ملے گی یا کبھی نہیں ملے گی۔

☆☆......☆☆



تحفہ



ابو ہریرہ بلوچ

انجانے میں کی گئی ایک نیکی، اُس نوجوان کی تمام زندگی کی خوشیوں کی نوید بن گئی تھی

عزیر اپنے ہوسٹل کے روم میں بند افسردہ تھا۔ افسردگی کی وجہ اس کا ایف اے کا نتیجہ تھا۔ جو آج آؤٹ ہونا تھا۔ اپنی کارکردگی پر وہ کسی طرح بھی مطمئن نہیں تھا۔ اس کے سارے کلاس فیلوز اور دوست نوٹس بورڈ کے گرد جمع تھے تاکہ اپنی محنت کا ثمر دیکھ لیں۔ جبکہ اسے اس چیز کی بالکل پروا نہیں تھی۔ پروا تھی تو صرف انہیں جنہوں نے کچھ لکھا، اب خالی پیپر دیکھ کر صفائی کے نمبر تھوڑے ہی دیے جاسکتے تھے۔ گھر سے یہاں آنے کا مقصد محض تحصیل علم تھا مگر بری مجلسوں، آوارہ دوستوں کی قربت نے اسے اس سے مقصد کو بہت دور کر دیا تھا۔ جس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے وہ خود کو تیار کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ فیل آیا ہے اس لیے اُس نے کسی سے پوچھنے کی زحمت کی اور نہ ہی تگ و دو۔ اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا تاکہ دوستوں کے سامنے شرمندگی سے بچ سکے۔ یہ ترکیب بھی عارضی تھی کیونکہ کبھی نہ کبھی تو ان سے سامنا لازمی تھا۔ مگر یہ آج کے لیے کارآمد تھا۔

دروازے پر ہوئی دستک نے اسے ان مستقبل کے خیالات کے بھنور سے کھینچ کر حال میں لا چھوڑا۔ وہ ایک دم جیسے ہوش میں آ گیا۔ اپنے یہ جاننے میں ذرا دیر نہ لگی یہ سب کالج یونین ہے جو ہتک جوئی کے درپے ہیں۔ اس نے خود کو دروازے کے پاس جانے سے روکا مگر ایک آواز نے اس کے رکے قدموں میں حرکت ڈال دی اور اُس نے آگے بڑھ کر جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔ یہ آواز اس کے پرنسپل طلحہ صاحب کی تھی جو کہ شفیق باپ کی حیثیت رکھتے تھے۔ سامنے سارے پروفیسر طالب علم اور پرنسپل ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لیے کھڑے تھے۔ جنہیں دیکھ کر وہ جھینپ سا گیا۔ سب نے مبارکاں مبارکاں کہتے ہوئے وہ ہار اس کے گلے میں ڈال کر دیے۔

''ارے برخوردار! تم نے تو کمال ہی کر دیا۔'' یہ آواز پروفیسر ریحان کی تھی جن کے ذمے ریاضی کا لیکچر تھا۔

''کیا ہوا سر! ایسی بھی کیا بات ہوگئی جو آپ حیرت زدہ ہیں؟'' عزیر بے خوفی سے بولا۔

''ارے جناب آپ تو چھپے رستم نکلے۔ سب کو مات دے دی۔''

وہ اپنی بے بسی پر رو پڑا۔ کیا کوئی کسی کا اتنا مذاق اڑاتا ہے۔ تمام اساتذہ اس کی کیفیت پر حیران رہ گئے۔

''ہم تمہیں خوشخبری سنانے آئے ہیں اور جناب رو رہے ہیں۔'' یہ پرنسپل صاحب تھے۔

''جناب یہ آنسو بھی خوشی کے ہیں۔'' اس کے کلاس فیلو آزر نے بات بڑھائی۔
''پلیز بس کریں! مجھے اور شرمندہ مت کریں۔''
اسے اپنے جذبات مجروح ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔
''ارے بیٹا تم نے کالج میں ٹاپ کیا ہے۔ یہ تو خوشی کی بات ہے۔''
''کیا؟'' عزیر کو جیسے اپنی سماعتوں پر شک ہوا۔
''یہ کیا مذاق ہے۔ جب میں نے کچھ لکھا ہی نہیں تو پاس ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور آپ ہیں کہ کالج میں ٹاپ کرنے کی بات کر رہے ہیں۔''
''ہم پر یقین نہیں تو یہ رزلٹ کارڈ دیکھ لو۔'' کہتے ہوئے پرنسپل طلحہ نے اس کا نتیجہ سامنے کر دیا۔ حقیقت واقعی اُس کے مطابق تھی۔ اس نے سچ میں امتیازی نمبر حاصل کیے تھے۔ مگر یہ سب کیسے ہو گیا؟ دماغ یہ سوچ کر مفلوج ہو گیا تھا مگر منزل تک نہ پہنچ سکا۔
''بیٹا تم نے ہمارے کالج کا نام روشن کر دیا ہے ہمیں تم پر ناز ہے۔''
''لیکن اس خوشی میں تمہیں ایک پارٹی دینا ہوگی۔'' سب نے بیک وقت مطالبہ کر کے تصدیق چاہی اور اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی سر اثبات میں ہلا دیا۔
شام سات بجے کا وقت مقرر ہوا۔
وہ سب چلے گئے تو وہ ایک بار پھر حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گیا۔ ایسا کیسے ممکن ہو گیا کہ اس نے کچھ لکھا ہی نہیں اور ٹاپ کر گیا۔ سب اس کی سوچ کے برعکس ہوا۔
لیکن جو ہوا بہتر ہوا اس نے تمام خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور شام کی دعوت کے بارے میں پلان



بنانے لگا کہ وہ پہلے کمرے کو سیٹ کرے یا ضرورت کی دوسری اشیاء بازار سے خرید لائے۔ کمرہ سجانے میں نہ جانے کتنا وقت لگتا اس لیے اس نے طے کیا کہ وہ پہلے بازار جاکر خریداری کرے گا اور باقی جو وقت میسر ہوا کمرہ ترتیب دینے میں لگا دے گا۔

اس نے کمرہ لاک کیا اور بازار کی طرف چل دیا۔ اس نے جلدی سے جلدی کرنے کی کوشش کی مگر پھر بھی گھنٹہ صرف ہو گیا۔ شام کے چھے بجنے والے تھے۔ وہ تیزی سے ہوسٹل اپنے کمرہ میں پہنچا۔ کمرہ کھولا اور جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا ایک دم چکرا گیا۔ پورا کمرہ دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ پھولوں سے اٹھنے والی بھینی خوشبوؤں نے اس کے دماغ کو معطر کر دیا۔ اگر اس طرح کی سجاوٹ وہ خود کرتا تو اسے کم از کم تین گھنٹے درکار تھے مگر ایک گھنٹے میں یہ سب کون کر گیا حالانکہ کمرہ باہر سے مقفل تھا۔ اس کا دماغ ابھی پہلی انہونی پر اٹکا ہوا تھا اور اب یہ...... جو ہو رہا تھا اس کے لیے بہتر ہی تھا۔ اس نے سامان کو میزوں پر ترتیب دیا اور مہمانوں کا انتظار کرنے لگا۔

وقت مقررہ پر دروازے پر بیل ہوئی، اس نے دروازہ کھولا سب ساتھی موجود تھے۔ وہ بھی اس کمرے کی سجاوٹ دیکھ عش عش کر اٹھے۔

ارے شادی کے بعد تو بھابی جی کی چھٹی ہو گئی کام سے۔ سارے کام تو بھیا جی سنبھال لیں گے۔'' ایک لڑکے نے شرارت کی اور سب کے قہقہے گونجنے لگے۔

پارٹی پُر تکلف تھی سب نے خوب داد دی۔ رات گئے تک یہ دور چلتا رہا اور پھر سارے آہستہ آہستہ کھسک گئے۔

گھڑی نے گیارہ بجنے کا الارم دیا وہ خود بھی تھکن سے چور ہو چکا تھا۔ اس نے برتنوں کو کل پر چھوڑا اور بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ نیند کے مارے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔

☆......☆......☆

لیٹے لیٹے اس کی سماعتوں میں ایک مترنم سی آواز ٹکرانے لگی۔ اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں آواز کسی دوشیزہ کی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے اپنا وہم سمجھ خیال کو جھٹکتا۔ دوبارہ بازگشت سنائی دی پکارنے والا اس کا نام لے کر بلا رہا تھا۔ آواز کا ٹھیک سے تعین نہ ہو پا رہا تھا۔ پھر اسے اپنی چھت پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی، جیسے کوئی چہل قدمی کر رہا ہو۔ مختلف وسوسوں اور بے مقصد خیالوں کو دل میں دبائے اٹھا اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا چھت پر آ گیا۔

ہوا میں معلق تخت پر براجمان ایک حسینہ دلربا کو دیکھ کر اچھل پڑا جیسے بجلی کا زبردست جھٹکا لگا ہو۔ سبز فراک، قیمتی زیوروں سے آراستہ وہ مہ جبین پری کا روپ تھی۔ وہ بت بنا اس کے سحر میں کھو گیا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں نہ جانے کیا کشش تھی کہ وہ اپنی نظریں نہ ہٹا پایا۔

''کون ہو آپ؟'' اس نے بمشکل تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

''تم مجھے نہیں جانتے ہو شاید لیکن میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ ہم پہلے بھی مل چکے ہیں لیکن حادثاتی طور پر اس لیے تمہیں شاید ہماری ملاقات یاد نہیں آ رہی۔'' مہ جبیں اپنی مترنم آواز میں گویا ہوئی تو یوں لگا جیسے کسی نے ساز چھیڑ دیے ہوں۔ اس کی آواز سماعت میں رس گھول رہی تھی۔ عزیر اپنی یادداشت پر زور ڈالنے لگا۔ جہاں تک اسے یاد تھا اس کا عمر بھر اس جیسی پری پیکر سے ٹکراؤ نہیں ہوا تھا۔ اگر وہ اس کے خوابوں میں بھی آئی ہوتی تو وہ اسے نہ بھولتا حقیقت میں کیسے بھول گیا۔

''آج سے دو سال پہلے تم نے جنگل میں ایک سانپ کو مار کر میری جان بخشی کروائی تھی۔''

اُسے تفکر میں پڑا دیکھ کر حسینہ نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

جنگل اور سانپ کا لفظ سن کر اسے سب کچھ یاد آ گیا اور وہ حال کے دروازے بند کرتا ماضی میں جا پہنچا۔

دو سال پہلے جب وہ میٹرک کا طالب علم تھا۔ جنگل بیابان، سنسان جگہیں دیکھنے کا دلدادہ تھا۔ اپنے اسی شوق کی تکمیل کے لیے دور دراز علاقوں کا بھی سفر کرنے سے دریغ نہ کرتا تھا۔ اس کے والد محترم ایک سرکاری کالج میں پروفیسر تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو روکنے کے کئی جتن کیے مگر اس کی ضد کے آگے ہار

مانتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے۔

ایک بار اس نے ایک جنگل کے بارے میں سنا جہاں زہریلے اور خوبصورت سانپوں کی بہتات کے علاوہ قدرت کی لازوال اور انمول نعمتوں کی بھی فراوانی ہے اس نے اپنے باپ کے سامنے اس خواہش کو رکھا تا کہ تعمیل و تکمیل کی اجازت لے سکے تو وہ بولے۔

''ابھی تمہارے امتحان قریب ہیں۔ پہلے اُن پر توجہ دو۔ وقت آنے پر اس موضوع پر بھی بات کریں گے۔'' اس نے دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے تمام اوقات پڑھائی کو دیے اسی لیے جب امتحان آئے تو اس نے بغیر کسی مشکل کے انہیں حل کیا پھر جب ختم ہوئے تو دل میں دبی خواہش پر عمل پیرا ہوتے ہوئے جنگل کی جانب محوسفر ہوا۔

اُس نے سپیروں سے سن رکھا تھا کہ سانپوں کو جب تک چھیڑا نہ جائے وہ انسانوں کو ایذا نہیں پہنچاتے مگر جب انہیں یہ محسوس ہونے لگے کہ وہ خطرے سے دوچار ہیں تو حملہ کرنے سے گریز نہیں کرتے اور کئی بار یہ حملہ انسانوں کو موت کی راہ دکھا دیتا ہے۔ اس لیے حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے چمڑے سے بنے لمبے والے جوتے اور دوسری چیزیں اپنے ہمراہ لے لیں۔

چار گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد وہ مطلوبہ جنگل کی حدود میں تھا۔ واقعی جنگل قدرت کی نعمتوں سے مالا مال تھا۔ رنگ برنگے کھلے پھول، آبشاریں، چہچہاتے اڑتے پرندے، پھلوں سے لدے درخت یہ سب محظوظی میں متواتر اضافے کا سبب تھے۔ انہی خوبصورتیوں میں کھویا وہ جنگل میں آگے سے آگے بڑھتا گیا۔ درخت اس قدر گھنے تھے کہ روشنی بمشکل زمین تک پہنچ رہی تھی۔ کئی سانپ اس کے پیروں کے گرد لپٹے جن کو وہ احتیاط کے ساتھ اتار دیتا۔ آخر وہ ایک جگہ حیران ہو کر رہ گیا۔ سامنے کا منظر ہی عجیب تھا، دو سانپ آپس میں جھگڑ رہے تھے جن میں ایک سنہرا اور دوسرا سیاہ کالا۔ سنہرا سانپ اسے بہت اچھا لگا

پھر اسے ان کی لڑائی کی وجہ مل گئی ایک خوبصورت چمکتا ہیرا جو ایک طرف مٹی میں دفن تھا۔ ان دونوں میں جو بھی اس ہیرے کی طرف بڑھتا دوسرا اس پر جھپٹ پڑتا۔ وہ سانپوں کے درمیان ہوتی لڑائی پہلی دفعہ دیکھ رہا تھا۔ کالا سانپ سنہرے پر حاوی ہونے لگا۔ اور سنہرا کئی جگہ سے زخمی ہو گیا جب وہ بالکل نڈھال ہونے لگا تو عزیر نے ہمدردی دکھاتے ہوئے پاس پڑا درخت کا ایک موٹا ڈنڈا اٹھایا اور کالے سانپ کا سر کچل دیا۔ سانپ کچھ دیر تڑپا پھر ٹھنڈا ہو گیا۔

سنہرے سانپ نے آگے بڑھ کر وہ ہیرا نگل لیا اور پل بھر میں غائب ہو گیا۔ اب نہ کوئی وہاں کالا سانپ تھا نہ سنہرا اور نہ ہی وہ چمکتا ہیرا......

عزیر کی چھٹی حس نے آگاہ کیا کہ وہ بہت بڑی غلطی کر چکا ہے اس نے فوراً وہاں سے سرپٹ دوڑ لگائی اور گاڑی پکڑ کر سیدھا گھر آ گیا۔

اس دن کے بعد وہ یہ واقعہ بالکل بھول گیا لیکن آج اس لڑکی کی یاد دہانی پر وہ پھر سے ابھر کر سامنے آ گیا۔ لیکن اس نے تو ایک سانپ کی مدد کی تھی۔ مطلب یہ ناگن ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اپسرا نے بھی شاید اس کے خیالات کو پڑھ لیا تھا اس لیے بولی۔

''میں ایک جن زادی ہوں۔ ہمارا تعلق مسلمان قبیلہ جنات سے ہے۔ تم انسانوں کی طرح ہم میں بھی قومیں، مذاہب اور فرقے ہوتے ہیں۔ میرا باپ جنات کا سردار ہے اور میں اس کی اکلوتی اولاد ہوں۔ وہ سانپ جسے تم نے مارا تھا وہ بھی جن ہی تھا۔ اس کو تمہاری دنیا کی ایک لڑکی سے عشق ہو گیا۔ لڑکی مسلمان تھی۔ جن نے اس کو بہت ڈرایا دھمکایا لیکن وہ اس کا ساتھ دینے کے لیے رضامند نہ ہوئی مجبوراً وہ اسے اُٹھا کر ہماری دنیا میں لے آیا۔ وہ کافر تھا اور شیطان کا پیروکار، لڑکی عزت دار گھرانے کی تھی، اس نے اس کے ہاتھوں ہوس کا نشانہ بننے کی بجائے موت کو گلے لگا لیا۔ یہ خبر جب ہمارے قبیلے والوں کو ہوئی تو انہیں بہت دکھ ہوا۔ اس کی کئی حرکتوں سے وہ پہلے ہی تنگ تھے اس لیے باہمی مشورے کے ساتھ اس کی تمام

طاقتیں چھین لیں اور اُسے سانپ کا روپ دے کر ملک بدر کر دیا۔ باوجود اس کے کہ وہ سنبھلتا اُس نے انتقام لینے کی ٹھانی اور ایک رات وہ ہمارا خاندانی ہیرا جو کہ بادشاہت کی بھی علامت تھا لے کر فرار ہو گیا۔

جب مجھے اس کا علم ہوا تو میں نے بغیر کسی سے اجازت لیے سانپ بن کر اس کا پیچھا کیا اور آخر اس جنگل میں اسے جالیا۔ پھر ہماری اس ہیرے کی بازیابی پر جنگ ہوگئی اور تم نے ہمیں بچالیا۔ عورت چونکہ فطرتاً مرد سے کمزور ہوتی ہے اس لیے وہ مجھ پر حاوی ہوگیا۔ تم نے بروقت اسے مار کر میری جان بچائی۔ میں انسانوں سے پہلے ہی متاثر تھی لیکن تم نے ہماری مدد کر کے میرا دل جیت لیا اور اس کے مالک بن بیٹھے۔ اسی دن کے بعد میں سائے کی طرح تمہارے ساتھ رہنے لگی اور مشکل حالات دیکھ کر تمہاری مدد کر دیتی۔ امتحانوں میں پاس کروانے اور تمہارا کمرہ سجانے میں میرا ہی ہاتھ تھا۔''

''لیکن آپ کا نام کیا ہے۔'' میں نے دوسرا سوال کیا تو وہ پری پیکر مسکراتے ہوئے بولی۔

''انگبین...... میرا نام انگبین ہے۔'' وہ واقعی امرت ہی تھی۔ جادوئی آنکھیں اور ان میں چھپا طلسم۔ انگبین نے اُسے اپنا حالِ دل کہہ سنایا تھا کہ وہ اسے اپنے دل میں چھپائے بیٹھی ہے۔

یہ بات اس کے لیے واقعی قابلِ مسرت تھی کہ ایک حسین و جمیل لڑکی اسے اپنی زندگی کا ہمسفر بنانا چاہتی ہے وہ جانتا تھا کہ یہ حسن اسے کہیں اور ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ وہ اس کی محبت کا بھرم رکھتے ہوئے اسے اپنا لائف پارٹنر بنانے کی حامی بھر لیتا مگر ایک خیال نے اس کی اس ابھرتی سوچ کو چکنا چور کر دیا۔ کیا وہ ایک جن زادی سے شادی کر لے گا؟ اس خیال کے دل میں آتے ہی اس کے چہرے پر موجود خوشی یکدم غائب ہوگئی اور وہ افسردگی سے بولا۔

''دیکھو انگبین تم ایک نہایت حسین لڑکی ہو۔ ہر خوبرو نوجوان کے دل کی دھڑکن ہو۔ اپنے لیے تمہارے اٹھنے والے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں۔ مانتا ہوں کہ پیار میں مذہب، ذات اور عمر کو نہیں دیکھا جاتا۔ مگر تم ایک غیر انسانی مخلوق ہو۔ جن کی پیدائش آگ سے ہے۔ تم اور میں اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارا ملاپ ممکن نہیں۔ اس لیے میں تمہیں نہیں اپنا سکتا۔''

انگبین کو شاید عزیر کی یہ بات سمجھ آ گئی تھی اسی لیے وہ خاموش ہوگئی۔ وہ جان چکی تھی کہ اس کا ایک انسان سے ملاپ کی طرح بھی ممکن نہیں۔ وہ خاموش تھی مگر عزیر اس کے شبنم کی طرح گرتے نایاب آنسو دیکھ رہا تھا۔ وہ شاید اس چوٹ کو سہہ نہ سکی تھی۔ مگر پھر نہ جانے اس کے دماغ میں کیا ابھرا اور وہ مسکرانے لگی اور اور پھر توقف کے بعد بولی۔

''عزیر پیار پالینے کا نام نہیں بلکہ اس کی یاد میں ہر پل تڑپتے رہنے کا نام ہے۔ مجھے اس بات سے خوشی ہوئی کہ تم نے میری محبت کا بھرم رکھا، میں اس مجبوری کو سمجھ سکتی ہوں لیکن مجھے خدائے ذوالجلال کی ذات پر بھروسا ہے۔ وہ ہمیں ضرور ملائے گا۔ میں تم سے ملتی رہوں گی۔ اب مجھے چلنا ہوگا۔ بس تم اپنا خیال رکھنا اور کسی بھی بات کو اپنے دل پر مت لینا۔'' پھر وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ رات کے اندھیرے میں غائب ہوگئی۔

عزیر بھی ٹوٹے دل کے ساتھ واپس اپنے روم میں آ گیا۔

ساری رات اس کی کروٹیں بدلتے گزری۔ اس پری پیکر کا چہرہ تھا کہ آنکھوں سے ہٹ نہیں رہا تھا آج تو جیسے اس کا دل بھی بغاوت پہ اُتر آیا۔ وہ جتنا اسے بھولنے کی کوشش کرتا وہ اسے اتنا ہی زیادہ یاد آتی۔ انہی خیالوں اور دل کی لڑائی میں اس پر نیند نے حملہ کر دیا اور وہ دنیا سے بیگانہ ہوتا چلا گیا۔ خوابوں میں بھی ساری رات وہی تھی۔

☆......☆......☆

اگلی صبح جب وہ اٹھا تو ایک خوشگوار صبح اس کی منتظر تھی۔ اس نے ہلکا پھلکا ناشتا کیا اور کالج کی جانب چل پڑا۔ ہر لڑکا اس کی طرف حیرت سے دیکھتا اور دیکھتا بھی کیوں نہ۔ اس نے ان سب کو پڑھائی میں پیچھے جو

چھوڑ دیا تھا۔ ہر کوئی ششدر تھا کہ ایک نکھٹو جس کا کام صرف آوارہ گردی تھا کیسے یہ سب کر گیا۔ لیکن اس پردے کے پیچھے کیا حقیقت تھی اس کا علم صرف اُسے تھا۔

اس نے کالج سے دو دن کی چھٹی لی۔ تاکہ وہ اپنے گھر ہو آئے۔

اس کے ماں باپ تین سال پہلے اس دار فانی کو چھوڑ کر داعی اجل کو لبیک کہہ گئے تھے۔ اس کے بعد اس کے چچا نے اس کی کفالت کی تھی۔ کچھ سال تک تو اس کی بھرپور نگرانی کی گئی لیکن آخر کب تک؟ آخر اس کے ساتھ بے رخی برتی جانے لگی۔ اس کی چچی اُس پر بہت سختی کرتی تھی۔ وہ اس وقت پندرہ سال کا تھا۔ اپنے والدین کا پیارا اور ناز و نعم یاد کر کے اس کی آنکھیں ساون کی طرح برسنے لگتیں۔ اس نے میٹرک اچھے نمبروں میں پاس کیا پھر اس نے اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ وہ شہر میں اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتا ہے لیکن اس کے چچا نے اسے صاف انکار کر دیا کہ وہ اس کی پڑھائی کا خرچہ برداشت نہیں کر سکتے پھر اس نے ایک سرکاری کالج میں جو کہ شہر میں تھا ایڈمیشن لے لیا۔

اس کے چچا اور چچی اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے تو کیا ہوا وہ تھے تو اس کے اپنے، اس لیے اس نے تمام نفرتوں کو بالائے طاق رکھ کر اُن سے ملنے کا فیصلہ کرتے ہوئے رخت سفر باندھ لیا۔

اس کا گھر کالج سے تین گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ اس کے پاس اپنی بائیک تھی جو کہ اس نے کالج سے ملنے والے وظیفے سے خریدی تھی۔ گھر میں اس کا اچھا خیر مقدم نہ کیا گیا۔ دو دن اُس نے جیسے تیسے گزارے پھر واپسی کی تیاری کر لی۔

وہ شام سات بجے کے قریب گھر سے نکلا۔ اندھیرا فضا میں اپنی جگہ پیدا کرنے کی سعی میں تھا۔ ستارے بادلوں کی اوٹ سے اپنا چہرہ نکال رہے تھے۔ ہوا میں کسی حد تک خنکی تھی۔ وہ اپنے خیالوں میں گم ڈرائیو کر رہا تھا کہ اچانک اسے بریک لگانا پڑی۔ ایک سات آٹھ سالہ بچی سڑک پر افسردہ کھڑی شاید مدد کی منتظر تھی۔

رحم دلی کے ناتے اسے اپنی بائیک روکنا پڑی وہ جیسے ہی اسٹینڈ لگا کر لڑکی کے پاس آیا۔ آٹھ مسلح افراد نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ جنھوں نے اپنے منہ پر کالے نقاب پہنے ہوئے تھے۔ اسے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ یہ سب ڈاکو ہیں اور اب اسے لوٹنے کے درپے ہیں اور بچی کا سڑک پر کھڑا ہونا، راہ گیر مسافروں کو روکنے کے لیے ایک ڈھونگ اور چال ہے۔ جس میں وہ مکمل طور پر پھنس چکا تھا۔ وہ آٹھوں اسلحے سے لیس تھے جبکہ خود اس کے پاس اپنے دفاع کے لیے ایک چھڑی تک نہ تھی۔ اتنے میں ایک بھاری بھرکم آدمی گھمبیر آواز میں گویا ہوا۔

”زندگی کی سلامتی چاہتے ہو تو جو کچھ ہے آرام سے دے دو۔ اگر ذرا بھی مزاحمت کرنے کی کوشش کی تو یہ سب کچھ تو ہم نے ویسے بھی لے لینا ہے، کہیں جان سے نہ جاؤ“

عزیر یہ آواز پہچان چکا تھا یہ اس کے گاؤں کے بندے سلطان کی آواز تھی جو کہ چوہدری علی شیر کا مزارعہ تھا۔

عزیر نے اس سے کہا کہ تم سلطان ہی ہو نا۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔

”تم ہماری اصلیت سے واقف ہو چکے ہو۔ اب تمہیں مرنا ہو گا۔ اپنے کسی اچھے کام کو یاد کر لو بیٹا۔ اور یہ کہتے ہوئے اُس نے بندوق کا رُخ عزیر کی طرف کر دیا۔ موت کے خوف سے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن ایک دردناک چیخ سن کر اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ سامنے کا منظر دیکھ کر وہ حیرت سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

پورا گروہ خون میں لت پت اوندھے منہ پڑا تھا۔ ان کے اس بھیانک انجام سے وہ خود بھی لرز گیا۔ سامنے وہ مہ جبیں ایک ادائے قیامت کے ساتھ مسکرائے جا رہی تھی۔ یقیناً یہ کارنامہ بھی اسی کا مرہونِ منت تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھ کر اس کا شکریہ کہتا اس نے فی الوقت گھبراتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولی۔

”تم ابھی ہوسٹل چلے جاؤ۔ میں وہیں تم سے ملوں

گی۔"

عزیر انجبین کے لہجے سے بہت حیران ہوا۔ کیونکہ اس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ ایک دم یوں بدل گئی جیسے کسی اَن دیکھے وجود سے ڈر گئی ہو۔ اس نے فی الفور اسے چلے جانے کا حکم صادر کیا۔ اور وہ خیالوں وسوسوں کو دل میں دبائے بائیک کے ذریعے ہوسٹل چلا آیا۔

اس کا ذہن ابھی تک پرانے واقعے پر اٹکا ہوا تھا۔ سارا منظر ایک فلم کی طرح اس کے دماغ کی اسکرین پر چلنے لگا۔ آج اگر بروقت انجبین اس کی مدد کو نہ پہنچتی تو وہ کب کا اس دنیا سے جا چکا ہوتا۔ اس نے جان بچا کر واقعی اسے خرید لیا تھا۔ دل میں سوئی انجبین کے لیے محبت کا لاوا ایک بار پھر بھڑک اٹھا۔ وہ اس کے سحر میں قید ہوتا جارہا تھا...... مگر اس کا اندازِ بیاں اس کے نازک دل کو زخمی کر گیا تھا۔

☆......☆......☆

اس نے کمرے میں پہنچ کر جیسے ہی کمرہ لاک کیا اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ گھبراہٹ کے مارے اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ظاہر ہوگئیں۔ اس نے چاروں اطراف گردن گھمائی مگر ندارد...... لیکن سانسوں کی گونج اسے واضح سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی بڑا سانپ پھنکار رہا ہو۔ اس نے کانپتے ہوئے اپنے لبوں کو گویائی کا اشارہ کیا۔

"کون ہو تم؟ سامنے آؤ۔ تمہیں کیا لگتا ہے تمہاری موجودگی مجھے ڈرا دے گی، تو اسے اپنی بھول سمجھو۔ کائروں کی طرح چھپنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر ہمت ہے تو روبرو آؤ۔" اچانک کمرے میں سنہری مائل دھواں پھیل گیا۔ جس نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اسے سانس لینے میں دشواری ہونے لگی تو اس نے رومال اپنی ناک اور منہ پر رکھا جس سے اسے کافی افاقہ ملا۔

دھواں چھٹا تو اس کی روح لرز گئی۔ ایک بہت بڑا سانپ جس نے کمرے کا احاطہ کر لیا تھا اس کے سامنے پھن پھیلائے ظاہر ہوگیا اور قہر آلود نظروں سے گھورنے لگا۔ اس کی جسامت عام سانپوں سے بہت بڑی تھی۔ اب عزیر پر کاٹو تو لہو نہیں والی مثال صادق آرہی تھی۔ اژدھے کی لمبی زبان مسلسل حرکت میں تھی۔ جیسے اپنے شکار کو دبوچنے والی ہو۔ سانپ نے پلٹی کھائی حیرت کا ایک اور پہاڑ اُس کا منتظر تھا۔ اب وہ ایک جن میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کے سر پر دو سینگ اور خوفناک چہرہ غصے سے تلملا رہا تھا۔

"تم ہی نے میرے بھائی کو موت کا ذائقہ چکھایا تھا ناں؟ تم یہ سمجھ بیٹھے کہ اس کا کوئی والی وارث نہیں۔ تم خود کو خوش قسمت سمجھو کہ میں اس وقت کوہ قاف میں ایک ضروری چلّے میں مشغول تھا جسے تکمیل سے پہلے چھوڑنا ناممکن تھا۔ ورنہ میں بھی بھسم ہو جاتا۔ پھر جب میں نے وہاں سے فراغت کی چادر لپیٹی تو معلوم ہوا کہ ایک آدم زاد نے میرے بھائی کو مار ڈالا ہے۔ میں اسی دن سے تمہاری تلاش میں سرگرداں رہا۔ لیکن رسائی ممکن نہ ہو سکی۔ پھر اپنے علم کو کام میں لاتے ہوئے یہ معلوم کر لیا کہ تم نے وہ سب ایک ناگن کے لیے کیا تھا جو اب تمہارے پیار میں غرق ہے۔ اسے میں نے تم تک پہنچنے کی سیڑھی بنایا اور تمہارا پیچھا کرتے کرتے آخر تمہیں پالیا۔ اس وقت جب تم ڈاکوؤں کی اُدھڑی ہوئی لاشوں کے پاس کھڑے تھے۔ میں نے تمہیں پکڑنا چاہا مگر اس ناگن نے میری موجودگی کو محسوس کر لیا اور اسی وقت تمہیں بھگا دیا اور یوں میرا وار خالی گیا۔

اب تم میری دسترس میں ہو۔ کوئی بھی تمہاری مدد کو نہیں پہنچ سکتا۔ میں تمہیں کوہ قاف لے جاؤں گا۔ پھر عمر بھر کی غلامی اور میرا قہر ہمیشہ کے لیے تمہارا مقدر بن جائے گا۔ وہاں ایسی سزائیں دوں گا کہ موت بھی تم سے بخشش مانگے گی۔"

اس کے دھمکی آمیز الفاظ عزیر کے اعصاب اور دماغ پر ہتھوڑا بن کر برسنے اور گونجنے لگے اسے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ اس کے پیر من من بھر کے ہوگئے وہ چاہ کر بھی بھاگ نہیں پارہا تھا۔ اپنی اس قدر بے بسی پر اس کے آنسو چھلک آئے۔ وہ جن خطرناک ارادے لیے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ موت کے جبڑوں میں آکر اس کی خوراک بنتا،

خلاف توقع سحر ظاہر ہوگئی اور اس کے سامنے دیوار بن گئی۔ خود عزیر ایک طرف ہٹ گیا۔ دونوں خونی نظروں سے ایک دوسرے کو گھورنے لگے۔

''کیوں بے موت مرنا چاہتی ہے۔ میرا بھائی بھی تیری وجہ سے مرا۔ تُو زندہ اس لیے ہے کیونکہ تُو ہمارے قبیلے کے سردار کی بیٹی ہے۔ تیری اسی خاندانی شرافت کی وجہ سے تیری غلطی سے درگزر کرتا ہوں لیکن اس حقیر آدم زاد کو تو میں کسی صورت نہیں چھوڑوں گا۔''

''ایسی سوچ اپنے گھٹیا دماغ میں مت لا روشل جب کہ میرے فانی جسم میں سانسوں کی ڈور قائم ہے۔ تو اس کا کچھ نہیں کرسکتا۔ اگر دوبارہ اس کی طرف غلط نظر بھی ڈالی تو اچھا نہیں ہوگا۔'' انگبین کا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔

''واہ...... واہ کیا محبت ہے۔ کیا دیوانگی ہے۔ واہ مزا آ گیا۔'' روشل طنزاً ہنسا۔

''تیری طاقت کی حقیقت میرے سامنے چیونٹی کی سی ہے ویسے بھی تُو ایک عورت ہے اور عورتیں کبھی مردوں پر حاوی نہیں ہوا کرتیں۔'' ان کے درمیان یہ تکرار طول پکڑتی گئی اور لڑائی کی صورت اختیار کر گئی۔ جس میں برتری واقعی روشل کی تھی۔ رفتہ رفتہ انگبین کی ہمت جواب دینے لگی اور وہ زخموں سے نڈھال ہوگئی۔ عزیر بت بنا کھڑا رہا۔ اس کی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ وہ آگے بڑھ کر انگبین کی کوئی مدد کرتا۔ آخر وہ گر گئی۔ روشل زہریلی مسکراہٹ لبوں پر سجائے اس کی طرف بڑھا اور بولا۔

''میں جانتا ہوں کہ اس نے میرے ساتھ لڑائی کی حماقت فقط تیری وجہ سے کی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ جن دھواں بن کر غائب ہوگیا۔ حواس بحال کر کے عزیر زمین پر گری انگبین کو اٹھانے لگا۔ اُس کے چھوتے ہی انگبین نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

''عزیر! آج میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ تم نے جو احسان مجھ پر کیا تھا۔ اُس احساس کو میری محبت نے انجام پر پہنچا دیا۔ آج میں تمہاری بانہوں میں، اپنے محبوب کی بانہوں میں زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہوں۔ میری محبت سچی تھی عزیر! دیکھو ہمارا ملن زمین پر ممکن نہ ہوا مگر یہ محبت کی معراج نہیں تو اور کیا ہے کہ میں تمہاری بانہوں میں......''

یہ کہہ کر انگبین نے جان دے دی۔ عزیر آنکھوں سے اس نادیدہ محبت پر آنسو رواں تھے۔ اچانک سے مجھے سب کچھ ویران ویران سا لگنے لگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سب کچھ ختم ہو چکا ہو اور بس جسم کے پنجرے سے انگبین کے ساتھ ہی روح پرواز کر گئی ہو۔

کچھ دیر بعد انگبین بھی دھوئیں میں تحلیل ہوگئی۔

وہ واپس بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ اب عزیر کی وہ خدا کی طرف سے دی گئی غیبی امداد جو ہر پل اس کے ساتھ رہتی تھی۔ اُس سے دور ہوگئی تھی۔ آنسوؤں سے جل تھل آنکھیں لیے جانے کب اُس کی آنکھ لگ گئی۔

☆......☆......☆

صبح صادق اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے وضو بنا کر نماز پڑھی اور جب سلام پھیرا تو اُسے محسوس ہوا جیسے کوئی چیز اُس کے بستر پر چمک رہی تھی۔ اُس نے دعا سے فارغ ہو کر بستر پر آ کر دیکھا۔ حیرت کے مارے اُس کی زبان گنگ اور آنکھیں پھیل کر رہ گئی تھیں۔ وہ ہیرا جو انگبین نے بتایا تھا کہ ان کی بادشاہت کی علامت بھی تھا۔ اُس کے بستر پر جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ اُسے ہاتھ اس لے کر میں نے آنکھوں سے لگا لیا۔ اُس کی انگبین اپنی اس نشانی کے ساتھ اس کے ساتھ تھی۔ اس کے بعد کی داستان طویل ہے۔ مگر مختصراً کہانی یہ ہے کہ عزیر ہاتھ میں جس دن سے انگبین کی یہ نشانی آئی۔ ناکامی لفظ زندگی سے نکل گیا۔

آج اُس کی عمر پچپن برس ہے۔ اُس کے پانچ بچے ہیں اور ایک خوبصورت بیوی جو انگبین سے ملتی جلتی ہے۔ اس کا نام بھی انگبین ہے۔ اُس کی خوش بختی کی علامت اُس کی انگبین کا دیا گیا وہ تحفہ، وہ نشانی ہے جو وہ بہت حفاظت سے رکھتا ہے۔ اور آج بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ انگبین اُس کے ساتھ ساتھ ہے۔

ساتھیو! آپ کو بھلے سے یہ یقین آئے یا نا آئے۔ مگر اس دنیا میں آج بھی آتش اور خاک کی محبت زندہ ہے۔

☆☆......☆☆

آسیب کی چادر اوڑھے، ان مسکنوں کی تین دہشت ناک کہانیاں
جو ہمیشہ سے دہشت کی علامت رہے ہیں

بیری کا آسیب

شائستہ انور

اُس بیوہ کی دل دھڑکاتی دہشت ناک کہانی، جس پر بیری کے آسیب نے اپنا تسلط جما لیا تھا

معمول کے مطابق نسیم جان نے صبح سویرے نماز سے فارغ ہو کر چھوٹی سی کیاری میں پودوں کو پانی دیا اور تھوڑا سا پانی ہمیشہ کی طرح آنگن کے بیچوں بیچ لگے قدیم بیری کے پیڑ میں بھی ڈال دیا۔ نسیم جان کو ہر دفعہ کی طرح آج بھی اِس پیڑ میں پانی ڈالتے ہوئے بازو میں کھنچاؤ محسوس ہوا تھا جیسے پانی دیتے ہوئے درخت کی جڑیں اُسے اپنی جانب کھینچ رہی ہوں۔ اس نے ہاتھ جھٹکا اور واپس اندر آ کر کچھ دیر بیٹھی اور پھر کچن میں چلی گئی۔ چائے کا پانی چولہے پر رکھا اور اندر آ کر سوئی ہوئی دُرِثمن، دُرِشہوار، دُرِ جہاں اور دُرِ سبین کو آوازیں دیں۔ ''اٹھ جاؤ لڑکیو......! سورج سر پر آ گیا ہے، چلو شاباش......!''

وہ انہیں اٹھاتے ہوئے چادریں کھینچ رہی تھی۔ لڑکیاں کسمسا رہی تھیں۔

''اماں......! ابھی اٹھ جائیں گے۔ تھوڑی دیر اور سونے دو پیاری اماں......!'' نسیم جان نے جب سب سے چھوٹی دُرِ سبین کی چادر کھینچی تو دوبارہ چادر اوڑھ کر بولی تھی۔

''ارے بچی......! اٹھ جا...... سردی کے دن ہیں۔ سارا دن بھی پڑی سوؤ گی تو بھی دل نہ چاہے گا اٹھنے کو۔ بس اَب سستی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔'' نسیم جان نے چادر کھینچ کر اُسے بھی باقی تینوں کی طرح اٹھا دیا۔

''ایک تو سونے نہیں دیتیں۔'' وہ منہ بسورتی باہر کی جانب چل دی۔

دن کی شروعات ہمیشہ کی طرح بسم اللہ بُوا کے آنے سے ہوئی۔ چاروں لڑکیاں گھر کے دھندے نمٹانے میں مصروف تھیں۔ نسیم جان برآمدے میں بیٹھی کپڑے کے بھالوؤں میں روئی بھر رہی تھی۔

''السلام علیکم! آؤ بُوا......!'' اس نے انہیں سلام کیا اور پاس رکھی پیڑھی بیٹھنے کو دی۔

''اے، جیتی رہو......! کیا حال ہے؟'' بوا نے بیٹھتے ہوئے چادر تہہ کر کے گود میں رکھ لی۔

''بس بُوا......! مالک کا کرم ہے، چل رہا ہے دال دلیہ۔'' نسیم جان نے اپنے کام میں مگن جواب دیا۔

''اے بیٹی......! میں نے تجھ سے پہلے بھی کہا تھا، جوان جہان بیٹیوں کا ساتھ ہے، اِس مُوئے پیڑ کو کٹوا کیوں نہیں دیتی؟ دیکھ تو، بیچ صحن میں کیسا کھڑا ہے۔ اے بیٹی......! تُو نہیں جانتی، بیری کا پیڑ جنوں کا مسکن ہوتا ہے۔ مجھے تو اللہ قسم رات کو بھی دھیان آتا ہے

سونے سے پہلے اِسی لیے سویرے سویرے تیری طرف آتی ہوں۔'' بُوا نے روز کی طرح اپنے واہمات اُس کے گوش گزار کیے۔

''بُوا......!بات تو آپ کی ٹھیک ہے' آپ ہمارے لیے اتنی فکرمند ہوتی ہیں' یہ بات دل سے آپ کی محبت کی گواہ ہے لیکن بُوا......!یہ بتاؤ' مجھے تیس سال ہوگئے اِس گھر میں' اگر کچھ الٹا سیدھا ہوا ہوتا تو میں یہ کام سب سے پہلے کرتی۔اِن بچیوں کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا' یہ ہونی تھی' اِسے ٹالا نہیں جاسکتا نہ ہی کسی پر الزام دیا جاسکتا ہے۔ یہ پیڑ بھی ہماری ہی طرح روکھی سوکھی کھاتا ہے۔ اِسے تو پیٹ بھر پانی بھی نصیب نہیں ہوتا۔ میں اِس کے سائے سے اپنے گھر کو خالی نہیں کرسکتی بُوا......!مجھے تو یہ اپنا بزرگ لگتا ہے سچی......!'' نسیم جان نے بُوا کو تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اے......!تمہاری مرضی' جو ہمارے دل میں تھا' کہہ ڈالا' تم جانو' تمہارا کام......'' بُوا کو اُس کی نظروں کی تپش آگ لگا گئی تھی۔

''آداب بُوا......!یہ لیجیے چائے' پئیں گرما گرم۔'' دُرِ شہوار نے چائے کی بھاپ اڑاتی پیالی اُن کی جانب بڑھائی۔

''اے جیتی رہ میری بچی......!سدا خوش رہ......نصیب اچھا ہو۔'' یک بند دُعائیں شروع ہوگئی تھیں۔

''شہوار......!اگر چائے ہے تو تھوڑی مجھے بھی دے دے۔'' نسیم جان نے اُسے کہا تو وہ اندر ماں کے لیے چائے لینے چلی گئی۔چائے پی کر بسم اللہ بُوا نے بھی بغل سے چادر نکالی اور چلتی بنیں۔

•......•......•

گھر کے کاموں سے فارغ ہوکر چاروں لڑکیاں فیاضی خالہ کے کارخانے چلی گئیں۔ گھر میں سناٹا ہوگیا۔ ہوا آہستہ آہستہ نسیم جان کو گدگدانے لگی تھی۔ اچانک بیری کے پتے ایک ساتھ ہلے جیسے التجا کررہے ہوں۔ نسیم جان نے آنکھیں اوپر کیں تو اُس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔اب پتے اور زور سے سرسرانے لگے۔نسیم جان کی آنکھوں میں لہو چھلکنے لگا' ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ اُس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہوگئیں۔کام ادھورا چھوڑ کر وہ اٹھ گئی اور خواب کے سے عالم میں چلتی ہوئی کمرے تک آگئیں۔ وہ بار بار یوں پلٹ کر دیکھتی تھی جیسے کوئی اس کے پیچھے ہے لیکن وہاں پورے گھر میں صرف بیری کے پتوں کی سرسراہٹ کا شور تھا۔

وہ کمرے میں چلی گئی اور اندر سے چٹخنی لگادی۔ پورا درخت اَب احتجاج بن چکا تھا۔ پتے لرزلرز کر رہے تھے۔ بالکل ایک غیر حقیقی سی صورت حال تھی۔



کچھ دیر بعد سب کچھ معمول پر آ گیا۔ دروازہ کھلا' وہ باہر نکلی' باہر لگے چھوٹے سے شیشے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ اس کے نچلے ہونٹ پر خون کی ایک لکیر سی بنی ہوئی تھی۔ اُس نے ہاتھ سے بری طرح ہونٹ کو رگڑ ڈالا۔ خون وقتی طور پر بند ہوگیا۔ اُس کی آنکھیں اصل رنگ میں واپس آ گئی تھیں۔ وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئیں۔

•......•......•......•

دُرِ ثمن کا رشتہ آیا تھا۔ بیری کے پیڑ کے بالکل سامنے ورانڈے میں ایک چارپائی اور ایک ٹیبل کے سامنے چار کرسیاں ڈال دی گئیں۔

''بہن! آپ کے حالات سن کر یقین جانیں' دل سے افسوس ہوا ہے مگر یہ تو قدرت کے کام ہیں۔ بندہ بشر کیا کر سکتا ہے؟ فی الحال تو منہ میٹھا کریں' ہمیں آپ کی بیٹی قبول ہے۔'' لڑکے کی ماں نے ساتھ لائے گئے مٹھائی کے ڈبے سے گلاب جامن نکال کر نسیم جان کے منہ میں ڈال دی۔ فرطِ مسرت سے نسیم جان کے آنسو بہنے لگے۔ بسم اللہ بُوا نے مبارک باد دینے کے لیے اُسے گلے سے لگالیا۔

''بہن......! اکیلی عورت ہوں' جہیز کی آس نہ رکھنا۔ غریب کے پاس عزت آبرو ہی سب سے بڑی پونجی ہوتی ہے' جی جان سے اِس کی حفاظت کی ہے۔'' گلوگیر آواز میں نسیم جان نے ہونے والی سمدھن سے کہا۔

''ہمیں ہماری بہو چاہیے۔ جہیز سے تول کر تو سودا کیا جاتا ہے' بیٹا بیچنے نہیں آئی۔ اس کی اور اپنے خاندان کی خوشیاں مانگنے آئی ہوں۔'' خاتون نے نرمی سے کہہ کر اُسے گلے لگالیا۔

''مولا! تیرا شکر!'' نسیم جان نے آسمان کی جانب سر اٹھا کر کہا۔ سر نیچے کیا تو بیری کے پیڑ سے آنکھیں ٹکرا گئیں۔ اُس کا دل بیٹھنے لگا۔ پتے اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے یوں تڑ مڑ رہے تھے جیسے کسی کو اچانک مرگی کا دورہ پڑ جائے اور اس کے ہاتھ پیر اینٹھ جائیں۔ اچانک نسیم جان کی آنکھیں گلابی ہونے لگیں۔ بڑی مشکل سے اس نے صورتِ حال کو قابو کیا۔ اُن کے جاتے ہی وہ اندر کمرے میں گھس گئی اور کمرا اندر سے بند کرلیا۔ لڑکیاں دروازہ پیٹتے ہی رہ گئیں۔ کوئی گھنٹا بھر بعد دروازہ کھلا اور وہ برآمد ہوئیں۔ عجیب اجڑی اجڑی سی لگ رہی تھیں۔ بال بکھرے' چہرے پر ایسی لکیریں ابھری تھیں جیسے کسی نے چانٹے مارے ہوں۔ لڑکیاں خوف سے تھرتھرانے لگیں۔ کچھ دیر بعد نسیم جان اپنے حلیے میں واپس آ گئی۔ بیری کے پیڑ کے پتے پہلے کی طرح ہو گئے تھے۔

•......•......•......•

''باجی......! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں اماں پر کوئی......'' شہوار نے دُرِ ثمن سے کہا تو اُس نے عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھا۔

''پاگل ہوگئی ہو؟ شرم آنی چاہیے تمہیں ایسی بات سوچتے ہوئے بھی۔ اماں پر کچھ نہیں ہے۔ تم جانتی ہو نا' وہ ہم سب سے کتنا پیار کرتی ہیں۔ جب اپنے پیاروں کو رخصت کرتے ہیں تو ایسی ہی حالت ہوتی ہے۔ بس اماں اُسی لمحے کی گرفت میں آ گئی تھیں۔'' ثمن نے اُسے سمجھایا۔

''باجی......! خدا کرے' اماں کو کچھ نہ ہو لیکن سچ بتاؤ' اس وقت تم نے یہ نہیں دیکھا تھا' بیری کے پتے کیسے بری طرح ہل رہے تھے۔ باجی......! بسم اللہ بُوا ٹھیک کہتی ہیں' ہمیں اِس پیڑ کو کٹوا دینا چاہیے۔'' شہوار پر ایک خوف سا تھا جس کا تعلق تھوڑی دیر پہلے ہونے والے واقعے سے تھا۔

''ارے پگلی......! تو میری طرف دیکھ' یہ بتا' تجھے عمیر نے کچھ کہا؟''

ثمن کے اِس سوال پر شہوار کا چہرہ گلابی ہوگیا اور اُس کی نظریں جھک گئیں۔

''بول ناں......! اَب بولتی کیوں بند ہوگئی تیری؟'' وہ اسے گدگدانے لگی۔

''باجی......! وہ بھی کل اپنی اماں اور بہن کو بھیجے گا۔'' یہ کہہ کر وہ دُرِ ثمن کے سینے سے لگ گئی۔ جانے عمیر سے جڑی کون سی بات یاد کر کے وہ مسکرانے لگی تھی۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا' ہفتے کے اندر ہی نسیم جان کے گھر رشتوں کی بارش ہوگئی۔ اُس کی لڑکیاں ہر کام میں طاق اور حسن میں یکتا تھیں۔ وہ خود بھی خدا کی بنائی ہوئی ایک حسین تصویر تھی جس پر گردشِ زمانہ کچھ کچھ ہی اثرانداز ہوا تھا لیکن ماں کی مسند پر بیٹھ کر خدا نے اُس کے وقار میں ایک خاص اضافہ کر دیا تھا۔ لڑکیاں اَب ڈبل شفٹ میں کام کر رہی تھیں۔ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ پیسے کمانا فی الحال اُن کا مقصد تھا مگر وہ اتنی محنت کے باوجود بھی محدود پیسے ہی جوڑ پائی تھیں۔ بسم اللہ بُوا کے کہنے پر تمام اہلِ محلّہ نے اپنے اپنے طور پر اُن لوگوں کی مدد کا وعدہ کر لیا تھا۔ ہر شخص کے ذہن میں یہی سوال تھے۔ چار لڑکیاں ہیں' ایک ایک چیز بھی دیں تو بھی چار بنتی ہیں۔ چھوٹی موٹی چیزوں کے ڈھیر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ رات کے کوئی آٹھ بجے ہوں گے۔ چاند کی چودھویں رات تھی' چاندنی کی چمک سارے آنگن میں چھن چھن کر درخت کے پتوں سے آ رہی تھی۔ اچانک درخت کے پتوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ نسیم جان اکیلی تھی۔ چاروں لڑکیاں اَب تک نہیں آئی تھیں۔ انہیں دس بجے تک آ جانا تھا۔ پتے یوں ہل رہے تھے گویا رقص کر رہے ہوں۔ وہ صحن ہی میں چت لیٹ گئیں۔

''ظالم......! چھوڑ دے میرا پیچھا۔ میں تنگ آ گئی ہوں تجھ سے۔'' نسیم جان لیٹے ہوئے اِس طرح ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھیں جیسے کسی کو پیچھے کو دھکیل رہی ہوں۔ اُن کی آنکھوں میں خون اُبل رہا تھا۔ اچانک پتوں کے رقص میں تیزی آ گئی۔

''میں تیرا عاشق ہوں' اور تُو......تُو مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے؟ میں تیرے لیے ہوں اور تو میری ہے۔ راستے میں جو بھی آئے گا' وہ ختم ہو جائے گا۔'' ایک غیر مرئی وجود کی بھاری آواز گونجی۔

''میں آج تیرا خون پی جاؤں گی۔ میں اپنی لڑکیوں کو عزت کے ساتھ بیاہنا چاہتی ہوں۔ تو میرے کردار پر کوئی داغ لگا جائے گا' دفع ہو جا...... کیوں میری عزت کے پیچھے پڑ گیا ہے؟ پہلے تو' تو سال میں آتا تھا' اَب جب سے میرے سر کا تاج گیا ہے' مہینے میں آتا تھا' تو اَب......اَب تو روز ہی آنے لگا ہے۔ میں آج تجھے چھوڑوں گی نہیں۔'' نسیم جان پوری طاقت سے اپنی نظر نہ آنے والے وجود کے ساتھ دھینگا مشتی شروع کر دی تھی مگر لاحاصل......وہ بھول گئی تھی کہ وہ ہوا سے لڑ رہی ہے جو پکڑ میں نہیں آتی مگر ماتا کی طاقت نے اُسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''جتنی زور آزمائی کرنا ہے' کر لے۔ آج تو نے عزت کی بات کی ہے ناں' تو بیٹیاں بیاہ لے' انہیں میں خود تیرے گھر لے آؤں گا۔'' عجیب پراسرار قہقہے گونجنے لگے تھے۔ فضا میں ناگواری بُو پھیل گئی تھی۔ نسیم جان اپنے حال میں نہیں تھی۔ وہ بیچ صحن میں بیٹھی سینہ پیٹ رہی تھی اپنی قسمت پر۔ اُس کے پاس آنسو بہانے کے سوا تھا ہی کیا۔ آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ درخت ساکت تھا۔ چاند کی روشنی نے سارے صحن کو جگمگایا ہوا تھا۔ وہ اٹھی' صحن میں موجود نل کے پاس گئی۔ پاس ہی پانی سے بھری بالٹی رکھی تھی۔ اُس نے بالٹی اٹھا کر اپنے اوپر سارا پانی انڈیل دیا/لیا۔ اس کی آنکھیں آنے والے وقت کو سوچ سوچ کر پھیل اور سمٹ رہی تھیں۔ اُسے کسی غیر مرئی وجود کی موجودگی کا جب پتا چلا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ غیر مرئی وجود آتا' اُسے جھنجھوڑتا اور چلا جاتا۔ ابتداء میں اُس پراسرار کیفیت سے وہ بھی لطف اندوز ہوتی تھی۔ خاص کر جب شوہر نے قبر کا کونا بسا لیا تو اُسے اِس نادیدہ ہستی کا انتظار رہتا تھا لیکن آج وہ اپنی بیٹیوں کے مستقبل کے لیے اس سے پیچھا چھڑانے پر مُصر تھی کیونکہ آج کل وہ وقت بے وقت' کسی بھی وقت آ جاتا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی لڑکیاں اس کے بارے میں کچھ غلط سوچیں مگر وہ کیا کرتی' وہ بہت کمزور تھی اور وہ منحوس بہت طاقت ور تھا مگر آج......آج وہ سب کچھ ہو گیا تھا جس کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ آگے کی فکر نے اس کی ذہن کو جکڑ لیا اور ماتھے پر گھنا جال سا بُن دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ تبھی وہ اچانک اٹھی اور زور سے بیری کے

پیڑ کو ٹھوکر ماری۔ ''جو جی چاہے' کر لے...... لیکن میں تیرا مقابلہ کروں گی۔'' وہ بے اختیار ہو کر بیری کے تنے کو اپنے ناخنوں سے کھروچنے لگی۔ ''میں بھی تجھے نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ بھاگ کر کچن میں گئی اور تیز دھار والی چھری لے آئی۔ پے در پے اُس نے تنے پر وار کرنا شروع کر دیئے۔ درخت سے غرّانے کی سی آوازیں آنے لگیں۔ وہ اِن سب آوازوں سے بے نیاز وار پہ وار کیے جا رہی تھی پھر وہ تھک کر چُور ہو گئی اور نڈھال ہو کر ایک طرف گر گئی۔ درخت کے پتے سرسراہٹ پیدا کر کے آخر کار پُرسکون ہو گئے۔

•......•......•......•

دروازے کی زوردار دستک سے وہ ہوش میں آئی تھی۔ اُس نے بہ مشکل حواس بحال کیے۔ دوڑ کر نَل کے پاس گئی۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور بال صحیح سے دوپٹے کے اندر کرتی دوپٹا سنبھالتی دروازے تک آئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے چاروں لڑکیاں پریشان کھڑی تھیں۔ ''اماں......! اتنی دیر لگا دی؟ طبیعت تو ٹھیک تھی نا آپ کی؟ یہ آپ کی آنکھیں کیسی ہو رہی ہیں اماں......؟'' دُرِّ شہوار نے بڑھ کر ماں کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔

''بس بیٹی......! ہلکا سا سر میں درد ہے' تم لوگوں کا انتظار کرتے کرتے نیند آ گئی تھی بس' اور کچھ نہیں۔'' نسیم جان یہ کہہ کر کچن میں چلی گئیں۔

لڑکیاں حیران حیران کمرے میں آ گئیں۔ دُرِّ ثمن کو کہیں آس پاس جانے کیوں ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کچھ اَنہونا سا ہے جس نے اُن کی ماں کی آنکھوں کو دھندلا دیا تھا لیکن اُس نے تمام خدشات اندر ہی دفن کر لیے۔

چاروں لڑکیوں کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی تھی۔ اگلے چاند کی بارہ تاریخ مقرر ہوئی تھی جس میں صرف دو ہفتے رہ گئے تھے۔ نسیم جان نے رات دن ایک کیا ہوا تھا۔ یہ بھی قدرت کا ایک کرشمہ تھا۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی وقت میں چاروں لڑکیاں گھر سے رخصت ہو رہی ہوں۔ اِس دوران ایک عجیب بات ضرور ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ بیری کے پتے جھڑنے لگے تھے پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہرا بھرا درخت گنجا ہو گیا تھا۔ اَب بیچ صحن میں اُسے کھڑا دیکھ کر خوف سا محسوس ہوتا تھا۔

•......•......•......•

پھر وہ دن بھی آ پہنچا جب نسیم جان کے چھوٹے سے گھر میں ایک ساتھ چار باراتیں اتریں۔ محلے والوں نے کھل کر محلے داری کا حق ادا کیا تھا۔ نسیم جان کو پتا ہی نہ چلا کہ کب کس نے پوری گلی میں برقی قمقمے لگوائے' کس نے شامیانے لگوائے؟ جب اُس نے باہر جھانک کر دیکھا تو گلی ایک سرے سے دوسرے سرے تک باراتیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ایک خواب کا سا سماں تھا۔ نیم تاریک کمرے میں ایک ساتھ چار دلہنیں حوریں بن کر بیٹھی تھیں۔ سادگی نے معصوم حُسن کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ نسیم جان کی نظریں بیٹیوں کی بلائیں لیتی نہ تھکتی تھیں۔ ''خدا! نظرِ بد سے بچائے۔'' نسیم جان کے ہلتے لب ایک ہی دُعا مانگ رہے تھے۔ ''مولا! ساتھ عزت کے اِس مرحلے سے گزار دینا۔'' نسیم جان آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر تھوڑی تھوڑی دیر بعد خدا سے مدد کی طلب گار ہوتیں۔ نکاح ہوا اور پھر کھانا کھول دیا گیا۔ آخر کار وہ گھڑی بھی آ گئی جسے ہر والدین کی زندگی میں آنا ہوتا ہے۔ رخصتی کا وقت آن پہنچا تھا۔ کسی نے ڈیک پر وِداعی گیت لگا دیا۔ مغنیہ کی پُرسوز آواز نے سماں باندھ دیا۔

کاہے کو بیاہی بدیس رے
سکھی بابل مورے
بھائیوں کو دینا محل دو محلے
ہم کو دیا پردیس رے
ہم تو رے بابل بیلے کی کلیاں
گھر گھر مانگی جائیں رے
سکھی بابل مورے
ہم تیرے انگنا کی بھولی رے چڑیاں
چگی چیں' اُڑ جائیں رے
کاہے کو بیاہی بدیس
ہم تیرے کھونٹے کی بھولی رے گیاں

بانکے جدھر، ہک جائیں رے
لکھی بابل موڑ ے۔
طاق بھری میں نے گڑیاں جو چھوڑیں
چھوٹا سہیلی کا ساتھ رے

سننے والی ہر آنکھ سے آنسو رواں تھے۔ رخصتی کی گھڑی جہاں بوجھ بانٹ رہی ہوتی ہے، وہیں اپنی جان کو کسی اور کے ساتھ ہمیشہ کے لیے اپنے ہاتھوں رخصت کر دینا، ایک کند چھری سے کلیجہ کاٹنے ہی کے مترادف ہوتا ہے۔ نسیم جان اپنی چار شہزادیوں کو رخصت کر رہی تھی، اُس کے دل کا حال وہی جانتی تھی۔ بسم اللہ بُوا، نسیم جان کے دُکھ کو جانتی تھیں، اُس کے ساتھ ہی چپک گئیں۔ اُسے تسلیاں دیتے دیتے انہوں نے رخصتی کے مرحلے کو آسان بنا دیا۔

سارا گھر خالی ہو گیا۔ باراتی چلے گئے۔ محلے والے بھی اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔ خالی گھر میں عجیب سی وحشت پھیل گئی، اوپر سے بیری کا گنجا درخت ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ صحن میں کھڑا قہقہے لگا رہا ہو۔ ''خدا خیر کرے!'' آگے کا سوچ کر نسیم جان دوبارہ فکر میں گھر گئی تھیں۔ ''یا اللہ! کرم کرنا! رحم مولا! تُو بڑا غفور الرحیم ہے۔ میری بچیوں کے نصیب اچھے کرنا!'' وہ دُعائیں کرتے کرتے کس لمحے سو گئیں۔

•......•......•

صبح اَذانوں کے وقت نسیم جان کی آنکھ کھلی۔ وہ سیدھی اندر کمرے میں گئیں۔ اندھیرے میں اکیلا ملگجی سی روشنی دیتا بلب جھول رہا تھا۔ سناٹے کا راج تھا۔ ''اوہ......! میں تو بھول ہی گئی، میری بچیاں تو اپنے گھر کی ہو گئیں۔ مالک! تُو رحم کرنا! نصیب اچھا کرنا میری بچیوں کا!'' وہ کہتے کہتے صحن میں آ گئیں۔ کیاری میں لگے پودوں کو پانی دیا اور جب بیری کے پیڑ میں پانی ڈالا تو بڑی زور سے ہاتھ کو جھٹکا سا لگا۔ ''کر لے ٹھٹھول...... بگاڑ...... کیا بگاڑے گا میرا...... جو دل چاہے، کر لے اَب......'' وہ درخت کو دیکھتے ہوئے دھاڑیں۔

''ہاہاہاہا......'' ایک شگاف قہقہہ گونجا تھا۔ نسیم جان نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ ''جلدی سے دن نکلے تو بسم اللہ بُوا کے ساتھ لڑکیوں کے گھروں کا چکر لگا آؤں۔'' وہ آپ ہی آپ بولتیں اندر آ گئیں۔

نو بجے کے وقت بسم اللہ بُوا خود ہی اُن کے گھر آ گئیں۔ ''اے بیٹی......! چلو ذرا، بڑی والی کے ہاں ہو آتے ہیں۔'' انہوں نے آتے ہی اُن کے منہ کی بات چھین لی۔

''چلو بُوا......! میں تیار ہوں۔'' نسیم جان نے چادر کو اچھی طرح لپیٹا اور جھٹ جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔

•......•......•

''دُرِ ثمن کا گھر یہیں ہے نا بُوا......؟ مگر یہاں یہ اتنا شور کیوں ہے؟ یہ بھیڑ کیوں ہے بُوا! باہر......؟'' دُرِ ثمن کے سُسرال کی گلی میں پیر رکھتے ہی اُن کے گھر کے باہر لگی بھیڑ نے انہیں ہولا دیا تھا۔ وہ بُوا کے ساتھ تیز تیز قدم بڑھانے لگیں۔ جانے کیوں اُن کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے؟ دروازہ پار کرتے ہی گھر کے لان میں بیٹھی عورتوں سے معلوم ہوا، رات کے جانے کون سے پہر یا اَذانوں کے وقت اچانک ایک چیخ بلند ہوئی جیسے کوئی دلہن کا گلا دبا رہا ہے۔ دولہا میاں نے گھبرا کر نئی نویلی دلہن کو دیکھا تو اس کی موت واقع ہو چکی تھی۔ نسیم جان کے جسم سے کسی نے پوری طاقت سے دل بھینچ لیا۔ وہ چیخ مار کر ہال کمرے میں موجود دُرِ ثمن کے لاشے کو چمٹ گئیں۔

''میری بچی......! ابھی تو میں نے تجھے جی بھر کر دیکھا بھی نہیں تھا، میری سہاگن بچی......! اپنی ماں کا تو انتظار کر لیتی۔ میں لُٹ گئی میری شہزادی......! میری پَری......! مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ تیرے ہاتھوں کی تو مہندی بھی ابھی تک مہک رہی ہے۔'' وہ ہذیانی انداز میں چلاّ چلاّ کر اپنے دل کی باتیں اپنی اُس بیٹی کو سنا رہی تھی جو بہت دور چلی گئی تھی مگر اِن سب باتوں پر کسی کو اختیار تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ ماں تھی، ممتا کو قرار دے رہی تھی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اُسے باقی تینوں لڑکیوں کی بالکل اسی طرح پُراسرار موت کی خبریں بھی مل گئیں۔ مارے صدمے کے نسیم جان کا دماغ الٹ گیا تھا۔ ایک ساتھ بیٹیاں رخصت کر کے دوسرے

دن چاروں بیٹیوں کو دنیا سے ہی رخصت کرنا پڑ گیا تھا۔ وہ سیدھی اسپتال پہنچادی گئی۔ نسیم جان کے دُکھ پر ہرایک دُکھی تھا۔ چاروں گڑیوں جیسی دلہنیں کسی کی آنکھوں سے نہ محو ہوئی تھیں کہ دوسرے ہی دن چاروں کو موت کے سفید لبادے میں لپٹا دیکھنا پڑ گیا تھا۔ یہ سرخ اور سفید کا بھی کیا جوڑ ہے۔ ایک رنگ خوشی کا ہے تو دوسرا غم کا......

•......•......•

پورے چوبیس گھنٹے بعد ڈاکٹروں نے نسیم جان کی حالت کو نارمل کر کے واپس گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ جو بیٹیوں کی خیریت معلوم کرنے گھر سے نکلی تھیں سب کچھ لٹا کر لوٹ رہی تھیں۔ قدم اٹھ ہی نہ رہے تھے۔ مرے مرے قدموں سے وہ گھر پہنچیں۔ دروازہ کھولتے ہی بھائیں بھائیں کرتا گھر کھانے کو دوڑنے لگا۔ چاند کی چودہ کا چاند پورے حُسن کے ساتھ چمکتا ہوا اُس کے آنگن کو چاندنی سے بھر رہا تھا۔ اچانک اُسے ہر طرف سے قہقہے گونجتے محسوس ہوئے۔ اُس نے نظر اٹھا کر اوپر دیکھا' اُس اجاڑ درخت پر نئی نئی کونپلیں پھوٹ چکی تھیں۔ وہ مڑی' کھلے دروازے سے نکلی۔ سامنے ہی بسم اللہ بُوا کا گھر تھا۔ وہ دَرآنا اندر گھسی اور سامنے پڑی کلہاڑی کو اٹھا کر واپس پلٹی۔ اس کی تیزی' جنونی کیفیت کو دیکھ کر بسم اللہ بُوا نے برابر والے گھر کے صمد کو نیند سے اٹھایا اور اُسے لے کر نسیم جان کے ہاں پہنچی۔

نسیم جان پاگلوں کی طرح بیری کے پیڑ پر کلہاڑی چلا رہی تھی۔ کبھی وار سیدھا پڑتا اور کبھی کلہاڑی اچٹ جاتی۔

''خالہ......! میں ہوں ناں' آپ الگ ہٹیں' میں پیڑ گرا دیتا ہوں۔'' صمد نے آگے بڑھ کر کہا۔

''نہیں......! میں تجھے خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔'' نسیم جان نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''اب کوئی وسیلہ بھیجے گا تو صرف میرا اللہ! تُو بہت کمزور ہے' الگ بیٹھ۔''

''خالہ......! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' صمد کو لگا کہ نسیم جان کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے۔

مگر نسیم جان جانتی تھی۔ اُس کی معصوم پریاں اسی بیری کے پیڑ کے عتاب کا شکار ہوئی ہیں۔

اچانک سے پیڑ بری طرح ہلنے لگا، ایسے لگ رہا تھا جیسے زلزلہ آ گیا ہے۔

بوا اور صمد بہت دور ہو کر دیوار سے جا لگے تھے۔ نسیم جان نے درخت کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا تھا۔ ''تو مجھے اب نہیں ڈرا سکتا۔ میری گڑیاں واپس کر دے مجھے۔ میری بچیاں واپس کر دے۔''

درخت بدستور ہلتا رہا، جیسے آج درخت کے اندر کوئی طوفان آزاد ہوا تھا۔ اور پھر نسیم جان کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ تیورا کر زمین پر جا گری۔ اِدھر اُس کے ماتھے سے خون کا فوارہ نکلا اور اُدھر درخت پُرسکون حالت میں واپس آیا۔ نسیم جان اوندھے منہ زمین پر ڈھیر ہوئی پڑی تھی۔

بوا اور صمد نسیم جان کی جانب بڑھنے ہی والے تھے کہ اچانک انہیں ''چوں چوں'' چڑیوں کی آواز سنائی دی۔

''ارے یہ کیا ہے؟'' بوا نے چڑیوں کی آواز کی جانب گردن کی۔ صمد بھی حیران تھا۔ نسیم جان پوری طاقت لگا کر اُٹھ بیٹھیں اور پھر آنکھوں میں گلابی ڈورے لیے پیڑ کی جانب دیکھنے لگیں۔ چار سنہری چڑیاں، چھوٹی چھوٹی سی، نسیم جان کے اس طرح بیٹھتے ہی درخت سے اُتر کر نسیم جان کے پاس آ کر چوں چوں کرنے لگیں۔ نسیم جان نے انہیں ہاتھ میں لے کر پیار کیا۔ یہ اُس کی اپنی گڑیاں تھیں، جو چڑیاں بن کر پھر سے بابل کے آنگن پر آ گئی تھیں۔

نسیم جان نے انہیں واپس درخت کی جانب اڑا دیا اور اب اُس کے قدم کمرے کی جانب تھے۔

درخت پُرسکون تھا اور یوں لگتا تھا جیسے نسیم جان کے کمرے میں جانے پر اُسے کوئی اَن دیکھی سی خوشی ملی ہو۔ اِدھر نسیم جان نے کمرے میں پیر رکھے اُدھر معمول کی طرح درخت جھومنے لگا۔

عین اُسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور باہر سے آواز آئی۔ ''نسیم جان......! فکر نہ کر' وقت پورا ہوتا ہے تو وسیلہ خود نکل آتا ہے۔ اگر اجازت دے تو

میں اندر آؤں؟''

''کون ہے؟ اندر آجاؤ۔''

دروازہ کھلا اور ایک ملنگ داخل ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں مرچھل/مورچھل تھا۔ گلے میں کشکول لٹک رہا تھا۔ بال جھڈولے تھے اور گلے میں عقیق کی مالا۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا' چٹاخ کی زوردار آواز گونجی۔ ملنگ نے گال پر ہاتھ رکھ کر پیڑ پر نظر ڈالی پھر گونج دار آواز میں بولا۔ ''اچھا ہوا' شروعات تو نے کردیں۔'' پھر اُس نے اپنی جھولی میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا پھر دوڑنے کے انداز میں پیڑ کے گرد چکر لگا کر اُس نے کالے دانے بکھیر دیئے جیسے وہ حصار کھینچ رہا ہو پھر اُس نے چہرہ اوپر اٹھا کر پیڑ کی اونچی شاخ پر نظر ڈالی اور بولا۔ ''ہمت ہے تو باہر نکل...... سن ابھی تک تجھے اس لیے کچھ نہیں کہا گیا کہ تو خلق خدا سے ٹکرا نہیں رہا تھا' کسی کو نقصان نہیں پہنچا رہا تھا مگر اَب...... اَب تو نے چار چار جانیں لے کر عتاب کو آواز دی ہے۔ زندگی کا مالک و مختار خدا ہے۔ تو نے ان چار بہنوں کی جان لے کر بہت ظلم کیا ہے۔ تجھے اس کی سزا ضرور ملے گی۔''

اُسی وقت پیڑ زور زور سے ہلنے لگا۔

''خوب اچھل کود مچالے' تو اَب نسیم جان کو بھی ڈرا نہیں سکتا۔ تجھے قید ہونا ہی پڑے گا۔ اگر شرافت سے نہیں آئے گا تو تجھے کھینچ کر اتاروں گا اور تجھے اذیت بھری زندگی ملے گی۔ تا عمر تو خاردار آتشی کوڑے سے پٹتا رہے گا۔''

ملنگ کی باتیں سن کر اور بیری کے ہلتے ہوئے پیڑ کو دیکھ کر بسم اللہ بُوا اور صمد حیرت سے گنگ تھے۔ ملنگ ہر طرف سے بے پروا بیری کی ٹہنی پر نظر جمائے خاموش لب سے کچھ پڑھ رہا تھا پھر اُس نے پھونک ماری۔ تین چار بار اسی عمل کو دہرانے کے بعد اُس نے جھولی سے لمبی لمبی چار کیلیں نکالیں اور انہیں بیری کے پیڑ کے نزدیک زمین پر گاڑتا چلا گیا۔

اس کام سے فرصت پا کر اُس نے نسیم جان سے کہا۔ ''اَب بھی وقت ہے' توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اللہ سے معافی مانگ اور انتظار کر' جب یہ پیڑ سُوکھ کر خود ہی گرے تبھی اِسے باہر پھینکنا اور خود بھی اپنے دیور کے پاس فیصل آباد چلی جا۔ اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں۔''

ملنگ جس پراسرار انداز میں آیا تھا' اُسی طرح واپس ہوگیا۔ نسیم جان' بسم اللہ بُوا یا صمد کسی کی زبان نہ کھلی۔

☆☆......☆☆



انار کلی

نزہت جبیں ضیاء

اُس دوشیزہ کی پُراسرار آپ بیتی، جسے انار کے درخت کا آسیب اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا

سات سالہ صمد کا یوں اچانک سے پُراسرار طور پر غائب ہو جانا ایک بار پھر اہلِ محلہ کے لیے سخت اذیت اور خوف کا باعث تھا۔ صمد بہت پیارا بچہ تھا۔ اپنے ماں باپ شہزاد اور کلثوم کا اکلوتا بیٹا، جو سارے محلے کی جان تھا۔ گڈو اسکول سے واپس آتے ہوئے اچانک غائب ہو گیا تھا۔ گلی کے کونے پر پرچون کی چھوٹی سی دکان پر بیٹھے غفور چاچا نے اُسے آتا دیکھا تھا۔ اس نے غفور چاچا کی دکان سے میٹھی چھالیہ خریدی تھی۔ پھر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ مگر اپنے گھر تک نہ پہنچا تھا اس کا گلی میں آٹھویں نمبر پر مکان تھا۔ اب یوں درمیان کے گھروں تک پہنچ کر غائب ہو جانا کسی معمے سے کم نہ تھا۔

ایسا دوسری بار ہوا تھا۔ ابھی کچھ ماہ پہلے اسی گلی میں رہنے والے ناصر پان والے کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ صبح صبح گھر سے معمول کے مطابق دکان کھولنے کے لیے نکلا، محلے کے کچھ لوگوں سے سلام دعا بھی ہوئی لیکن وہ گلی کے ختم ہونے پر اپنی دکان تک نہ پہنچ پایا اور غائب ہو گیا۔ ایک لڑکا جو اس کے ساتھ دکان پر کام کرتا تھا، وہ معمول کے مطابق صبح دکان پہنچا تو دیکھا کہ دکان بند ہے۔ لڑکا (سلمان) پتا کرنے جب اس کے گھر گیا تو ناصر کی بیوی زرینہ نے بتایا کہ وہ تو چابی لے کر نکل گیا تھا۔"

محلے میں شور مچ گیا۔ سب نے تلاش شروع کر دی۔ لیکن ناصر تو نہ جانے کہاں غائب ہو چکا تھا۔ زرینہ اور اس کی بیٹی کا رو رو کر برا حال تھا اس طرح سے گھر کا مرد اور وہ بھی کمانے والے کا غائب ہو جانا آسان بات نہ تھی۔ وہ تو محلے والے ہمدرد تھے کہ دکان کو ایک بزرگ نے سنبھال لیا تھا مگر یہ بات بھی تکلیف دہ تھی کہ ناصر بھلا بغیر بتائے کہاں چلا گیا تھا؟ نہ لڑائی نہ جھگڑا نہ کوئی اور پریشانی تھی۔ پولیس بھی متحرک تھی۔

آخر کار تین دن بعد ناصر کی لاش ایک پرانے کھنڈر جیسے اسکول سے ملی۔ لاش کی حالت بہت خراب تھی اور داہنا ہاتھ کہنی سے غائب تھا۔

"ہائے ہائے کیسا غضب ہے؟ وہ معصوم تو کسی کو دھکا بھی نہیں دیتا تھا۔" زرینہ بین کیے جا رہی تھی۔ نائلہ بھی باپ کو دیکھ کر بلک رہی تھی۔

ناصر کی تدفین کر دی گئی۔ نائلہ اور زرینہ پر گویا پہاڑ ٹوٹ گیا تھا۔ محلے والوں کی ہمدردیوں نے اس وقت انہیں بہت سنبھالا دیا۔ رفتہ رفتہ وہ لوگ سنبھلنے

گئے۔ نائلہ کبھی کبھی آنگن کے کونے میں لگے انار کے درخت نیچے بیٹھ کر ابا کو یاد کرتی۔

☆......☆......☆

ابھی یہ لوگ مکمل طور پر اپنے غم سے نہ نکل پائے تھے کہ یوں صمد کے غائب ہو جانے پر ایک بار پھر محلے میں خوف و دہشت طاری ہوگئی۔ پھر وہی بھاگ دوڑ شروع ہوگئی اور ہفتے بعد صمد کی لاش سوکھے ہوئے گٹر سے برآمد ہوئی اور یہ دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں کہ صمد کا بھی داہنا ہاتھ کہنی سے غائب تھا۔

سارے محلے میں کہرام مچ گیا تھا۔ صمد محلے کا لاڈلا بچہ تھا۔ صمد کی ماں تو اس صدمے سے پاگل ہوگئی۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ نائلہ اور زرینہ بھی رو رہی تھیں۔

یہ کون تھا؟ یہ سب کچھ بھلا کس لیے اور کیوں ہو رہا تھا۔ محلے میں اس حد تک دہشت پھیل گئی تھی کہ ماؤں نے اپنے بچوں کو اسکول بھیجنا بند کر دیا تھا۔ مغرب سے پہلے ہی گلیاں اور سڑکیں ویران ہو جاتیں۔ وہ محلہ جہاں پر محلے کے بچے میدان میں کرکٹ کھیلتے، خواتین گھروں سے باہر نکل کر بیٹھ جاتیں۔

جھولے والے روز شام کو خوب ساری کمائی کر کے جاتے وہ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ رات تو رات اب دن میں بھی وہاں ویرانی برسنے لگی تھی۔ مائیں بچوں کو معمولی چیز لینے بھی اکیلے نہیں بھیجتی تھیں۔ نہ آئس کریم والوں کی سائیکلیں آتیں، نہ پاپ کورن والوں کے ٹھیلے۔

عجیب وحشت برسنے لگی تھی۔ نائلہ کی حالت بھی عجیب سی ہو گئی تھی۔ وہ گھر کے کاموں میں بھی دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ ہر وقت چپ چپ رہتی اور زیادہ بے چینی ہوتی تو انار کے درخت کے نیچے پلنگ پر جا بیٹھتی۔ وہاں جا کر اُسے سکون محسوس ہوتا تھا۔

☆......☆......☆

رشیدہ خالہ جو محلے میں رہتی تھیں وہ نائلہ کو پسند کرتی تھیں اور اُسے اپنے بیٹے داؤد کی دلہن بنانا چاہتی تھیں۔ کافی دنوں سے یہ بات ان کے دل میں تھی۔ ناصر کی اچانک موت کی وجہ سے وہ چپ سی ہو گئی تھیں۔ صمد کی موت کو بھی کافی ٹائم ہو گیا تھا۔ محلے والے کچھ کچھ معمول کی زندگی کی طرف لوٹنے لگے تھے۔ تب ہی رشیدہ داؤد کا رشتہ لے کر زرینہ کے گھر چلی آئیں۔

زرینہ کو بھی داؤد پسند تھا۔ سیدھا سادھا اور شریف لڑکا، کسی مل میں کام کرتا تھا۔ وہ بھی زرینہ جیسے ہی غریب لوگ تھے۔ زرینہ نے حامی بھر لی۔

☆......☆......☆

”نہیں اماں! میں شادی نہیں کر سکتی۔“ نائلہ نے سنا تو صاف انکار کر دیا۔

”کیوں...... کیوں نہیں کر سکتی؟ تیری شادی ہو جائے گی تو مجھے سکون ملے گا۔“ زرینہ نے کہا۔

”اماں میں نے کہہ دیا کہ نہیں کرنی تو بس نہیں کرنی...... ضد مت کر مجھ سے۔“ اس بار نائلہ کا لہجہ غصے والا تھا۔

”نائلہ کیوں تنگ کرتی ہے مجھے؟ کیا تجھے داؤد اچھا نہیں لگتا یا پھر رشیدہ کی وجہ سے منع کر رہی ہے؟“ زرینہ نے پیار سے اس کے ہاتھ تھام کر پوچھا۔ زرینہ اپنی اکلوتی بیٹی کو دل و جان سے زیادہ چاہتی تھی۔ بہت منتوں مرادوں کے بعد شادی کے دس سال بعد تو نائلہ پیدا ہوئی تھی۔

”اس لیے کہ میں نے...... میں نے شادی کر لی ہے اماں۔“ نائلہ کی بات پر زرینہ کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

”یہ...... یہ...... کیا بکواس کر رہی ہے۔ تُو پاگل ہو گئی ہے کیا؟ الٹے سیدھے رسالے پڑھ پڑھ کر تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے، تب ہی الٹی سیدھی بکواس کر رہی ہے۔ گھر سے باہر نکلتی نہیں ہے اور شادی کر لی ہے۔ خواب دیکھا ہوگا تُو نے۔ چپ کر کے شادی کی تیاری کر لے۔“

زرینہ کی بات پر نائلہ نے سر اٹھا کر بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

”اور آئندہ ایسی بات نہیں کرنا کسی کے سامنے۔“ زرینہ کو لگا تھا نائلہ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس پر کہانیوں اور افسانوں کا اثر ہو گیا ہے۔

”اماں...... یہ تم ٹھیک نہیں کر رہی ہو...... پچھتاؤ گی...... دیکھ لینا۔“ نائلہ نے تیز لہجے میں کہا اور اپنی مخصوص جگہ پر جا بیٹھی۔

”ہونہہ بڑی آئی تیس مار خان۔“ زرینہ نے منہ بنایا۔

☆......☆......☆

دو دن بعد رشیدہ آئی محلے کے دو تین افراد کی موجودگی میں نائلہ کو مٹھائی کھلا کر اس کے ہاتھ میں داؤد کے نام کا چاندی کا چھلا پہنا دیا۔ نائلہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

”دو ماہ بعد نکاح کر کے ہم اپنی بیٹی کو لے جائیں گے۔“ رشیدہ نے جاتے جاتے نائلہ کو گلے سے لگا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت سے کہا تو زرینہ مسکرا کر سر ہلانے لگی۔ زرینہ بہت خوش تھی کہ نائلہ چپ تھی۔ اور اس نے کوئی الٹی سیدھی بات نہیں کی تھی۔ نائلہ کا نارمل رویہ زرینہ کے لیے اطمینان کا باعث تھا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن صبح زرینہ نیند سے جاگی تو سارے

محلے میں کہرام مچا ہوا تھا۔ رشیدہ اپنے گھر میں مردہ حالت میں پائی گئی تھی۔ کوئی چھری، گولی، چاقو، کسی قسم کا نشان نہیں تھا بس...... اس کا بھی داہنا بازو کہنی سے غائب تھا۔ داؤد جب رات کی ڈیوٹی سے صبح واپس آیا تو روز کی طرح اسے رشیدہ دروازے پر منتظر نہ ملی وہ گھبرا گیا۔ دروازہ بجایا تو کوئی جواب نہ آیا۔ زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔ محلے کے لوگ جمع ہوگئے ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔ رشیدہ خالہ تو فجر سے اُٹھ جاتی تھیں۔ نماز پڑھ کر اپنے گھر کے آگے جھاڑو لگاتیں۔ اور پھر دہلیز پر بیٹھ کر تسبیح پڑھتیں اور آنے جانے والوں سے اُن کی سلام دعا ہوتی رہتی تھی۔

آخر کار داؤد پیچھے کی طرف سے دیوار کود کر گھر کے اندر گیا تو اپنی اماں کو مردہ حالت میں کٹے ہوئے بازو کے ساتھ دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور سارے محلے والے اندر آگئے۔

ایک بار پھر محلے میں دہشت پھیل گئی۔ رشیدہ کی تدفین ہوگئی داؤد نفسیاتی مریض بن گیا۔ اور ایک گھر بری طرح اجڑ گیا۔

رشیدہ بے چاری تو بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کے خواب دیکھتے دیکھتے موت کی آغوش میں چلی گئی تھی، اسے کیا خبر تھی کہ پُراسرار موت اس کی منتظر ہے۔

زرینہ بری طرح ٹوٹ گئی تھی۔ رشیدہ سے بہت پرانی جان پہچان تھی اُس کی، جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی تب سے رشیدہ اُس کی محلے دار تھی۔

☆......☆......☆

زرینہ کی رات کو آنکھ کھلی تو نائلہ کے ہنسنے کی آواز پر وہ چونک گئی۔ رات کے تین بج چکے تھے۔ نائلہ اس وقت کس سے باتیں کررہی ہے۔ زرینہ نے جلدی سے پلٹ کر پلنگ کی سمت دیکھا نائلہ کا پلنگ خالی تھا۔ وہ اُٹھ کر صحن میں آئی۔ صحن میں انار کے درخت کے نیچے اُسے دو سائے نظر آئے۔ قبل اس کے کہ زرینہ قریب جاتی۔ ایک سایہ درخت کے تنے میں گم ہوگیا۔ دوسرا سایہ جو یقیناً نائلہ ہی تھی۔ جو اپنے بال کھولے ہوئے تھی۔ اس کے بال زمین کو چھو رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے نائلہ اس درخت کے گرد چکر لگانے لگی۔ دیوانہ وار بجلی کی سی تیزی سے وہ درخت کے گرد گھومنے لگی، گھومتے گھومتے وہ ایک لمحے کو رُکی اس کے بال زمین سے اُٹھ کر ایک دم اوپر کی جانب ہوگئے اور وہ بالوں کے سروں سے درخت کی شاخ پر لٹک گئی اور اس کے پیر زمین سے تقریباً ایک فٹ اوپر ہوگئے۔

''نائلہ...... نائلہ......'' زرینہ بے اختیار چیخ کر آگے بڑھی لیکن...... یہ کیا...... درخت کی ہر شاخ سے نائلہ لٹک رہی تھی اور زور زور سے قہقہے لگا رہی تھیں۔ اس طرح سے زمین سے ایک فٹ اوپر بالوں کے سروں سے...... خوف اور دہشت سے زرینہ کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔ وہ اُلٹے پیر کمرے کی جانب بھاگی کمرے میں آئی تو دیکھا کہ نائلہ اپنے بستر پر موجود تھی۔

زرینہ نے ڈرتے ڈرتے صحن میں انار کے درخت کی جانب دیکھا۔ وہاں مکمل خاموشی کا راج تھا۔ نہ لٹکتی ہوئی لڑکیاں تھیں اور نہ قہقہوں کی خوفناک آوازیں......

''کیا ہوا اماں......؟ بتی کیوں جلائی؟'' نائلہ نے منہ سے چادر ہٹا کر مندی مندی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

''نائلہ...... تُو...... تُو...... سو رہی تھی؟'' ہکلاتے ہوئے اُس نے سوال کیا۔

''اماں تمہیں کیا نظر آرہا ہے؟ ابھی جاگی ہوں ناں تمہارے بتی جلانے پر؟'' الٹا نائلہ نے ماں سے سوال کردیا۔

''ہاں...... ہاں......'' زرینہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔

''تُو تو ابھی اٹھی ہے۔ مگر مجھے لگا جیسے تُو باہر تھی صحن میں۔''

''اماں لگتا ہے رشیدہ خالہ کی پُراسرار موت نے تمہیں پاگل کردیا ہے تب ہی الٹے سیدھے خواب دیکھ رہی ہو۔ میں سو رہی ہوں تم بھی سو جاؤ۔ رات بہت ہوگئی ہے۔'' نائلہ نے قدرے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ تو زرینہ اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔ اس نے جو کچھ

دیکھا تو وہ اس کی نیند اڑانے کے لیے کافی تھا۔ وہ عجیب سے وسوسوں کا شکار ہوگئی تھی۔ کوئی گڑبڑ، کوئی بات تھی ضرور۔

''نائلہ!'' اس نے پلٹ کر نائلہ کی جانب دیکھا۔ وہی معصومیت اور سادگی جو اس کے چہرے کا خاصہ تھی۔

مگر کچھ نہ کچھ تو تھا جو یوں محلے میں اموات ہورہی تھیں۔ وہ رات زرینہ نے شدید کرب میں گزاری اور صبح سارا معاملہ کھل کر سامنے آہی گیا۔

صبح نائلہ ناشتے سے فارغ ہوکر نہانے چلی گئی۔ زرینہ نے سوچا کافی دن سے اسٹور کی صفائی نہیں ہوئی یہ سوچ کر اس نے اسٹور کا دروازہ کھولا تو عجیب سی ناخوشگوار بُو پھیل گئی۔

''اُف شاید کوئی چوہا یا بلی مرگئی ہو۔'' زرینہ نے سوچ کر بڑے صندوق کے آگے پیچھے جھانکا پیچھے سے بدبو آرہی تھی۔ اس قدر غلیظ اور ناخوشگوار بو تھی۔ صندوق کے پیچھے پلاسٹک کی تھیلیاں پڑی تھیں، زرینہ نے آگے بڑھ کر تھیلیاں باہر نکالیں تو شدید بدبو سے اُسے ابکائیاں آنے لگیں لیکن یہ کیا...... ! ان تھیلیوں میں انسانی ہاتھ تھے جو کافی حد تک سڑ گئے تھے۔ خوف سے زرینہ کا دم نکل گیا۔ اس کے ہاتھ سے تھیلیاں چھوٹ کر زمین پر گر پڑیں۔ ایک مردانہ، ایک عورت کا اور ایک ننھا سا ہاتھ یقیناً بچے کا تھا۔ دونوں بڑے ہاتھوں کی گلی ہوئی انگلیوں میں پڑے چھلے وہ کیسے بھول سکتی تھی۔ ایک تو ناصر کے ہاتھ کا وہ چاندی کا باریک چھلا تھا جس کے اوپر چھوٹا عقیق لگا تھا اور دوسرا چھلا جو زرینہ نے ساری زندگی رشیدہ کی انگلی میں دیکھا تھا اور...... اور...... وہ چھوٹا سا ہاتھ اُف...... زرینہ کا سر چکرانے لگا تھا۔

''ہاہاہاہا......'' نائلہ کے بے ہنگم سے قہقہے پر زرینہ نے گھبرا کر دیکھا۔ اس کے سامنے نائلہ کے کپڑوں میں بے حد خوفناک عورت کھڑی تھی۔ لال لال باہر کو نکلی ہوئی بڑی بڑی خوفناک آنکھیں، سخت تاروں جیسے کھڑے بال، لمبے لمبے دانت اور تیز ناخن......

''نائلہ...... ن...... نا...... نائلہ۔'' زرینہ بے ہوش ہوچکی تھی۔

☆......☆......☆

زرینہ کو ہوش آیا تو اپنے اوپر نائلہ کو جھکا ہوا پایا۔''

''اماں...... اماں...... تم ٹھیک ہوناں؟'' نائلہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بہت پریشان تھی۔

''نائلہ...... نائلہ...... تُو...... تُو......'' زرینہ کی آواز اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ خوف اور دہشت کا شکار تھی۔

''اماں تم مجھ سے مت ڈرو۔ میں بہت پیار کرتی ہوں تم سے۔ ابا سے بھی زیادہ اور اماں...... میں تم کو سب کچھ بتادوں گی۔ مگر تم کو ایک وعدہ کرنا ہوگا کہ اس بات کا ذکر کسی سے مت کرنا۔ اماں...... میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ بس تم کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔ ہم تم کو کچھ نہیں کریں گے۔ کچھ نہیں بولوں گی میں تمہیں۔ بس تم...... یہ بات کسی کو نہیں بتانا۔'' زرینہ کے ہاتھ تھام کر نائلہ نے معصوم سے لہجے میں عاجزی سے کہا۔ وہی معصومیت، جو بچپن سے نائلہ کے چہرے پر ہوتی تھی۔ زرینہ نے غور سے اپنی نازوں پلی بیٹی کو دیکھا۔ وہ بیٹی جو زرینہ کی جان تھی، زرینہ کی زندگی تھی۔ کچھ دیر بعد نائلہ نے بولنا شروع کیا۔

''اماں اس انار کے درخت پر جنات کی فیملی کا بسیرا ہے اور اُن میں سے ہی ایک جن سے مجھے اور اسے مجھ سے محبت ہوگئی کیونکہ جب میں پیدا ہونے والی تھی تو تم نے اس درخت سے بہت سے انار کھائے تھے۔ میں بچپن سے ہی ان لوگوں سے باتیں کرتی ہوں، ان کے ساتھ گھومتی پھرتی ہوں اور پھر تمہیں یاد ہوگا کہ ایک بار ابا نے انار کا یہ درخت کاٹنے کا ارادہ کیا تھا حالانکہ میں نے منع بھی کیا تھا لیکن ابا نہیں مانے اور جانتی ہو وہ کلہاڑی میرے شوہر کے بازو پر لگی تھی۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں نے ابا کا وہ ہاتھ کاٹ کر ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لیا۔ اور ابا کو ماردیا۔ اسی طرح صمد نے اسکول سے آتے آتے چھوٹے سے انار کو پتھر مارا تھا وہ میرا بچہ تھا۔ ہم نے ابا کی موت

کے بعد شادی کر لی تھی۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا اور صمد کو بھی مار کر اس کا ہاتھ کاٹ لیا اور جب میں نے منع کیا پھر بھی تم نے میری شادی طے کر دی تو رشیدہ خالہ کا وہ ہاتھ بھی کاٹ کر انہیں مار ڈالا جس ہاتھ سے انہوں نے مجھے انگوٹھی پہنائی تھی۔ اماں...... اماں...... میں یہ سب جان بوجھ کر نہیں کرتی۔...... مگر...... تم لوگ مجھے غصہ دلاتے ہو۔''

''نائلہ...... نائلہ...... یہ کیا بول رہی ہے تُو۔''

زرینہ جو دم سادھے سب کچھ سن رہی تھی وہ خوف سے چیخ پڑی۔

نائلہ...... نائلہ...... یہ سب کر رہی تھی۔ یہ بات اس کے لیے اذیت اور خوف کا باعث تھی۔

''اماں...... اماں...... مجھ سے مت ڈرو اماں...... میں تم کو بہت پیار کرتی ہوں، تمہیں کچھ نہیں کر سکتی اماں۔'' نائلہ روتے ہوئے زرینہ سے لپٹ کر التجا کر رہی تھی۔

''نائلہ...... نائلہ...... میری بچی...... تُو...... تُو...... کیسے راستے پر چل پڑی ہے۔ یہ سب کچھ چھوڑ دے میری بچی...... میں تیرا علاج کرواؤں گی۔'' زرینہ نے روتے ہوئے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔

''نہیں اماں یہ سب ناممکن ہے۔ اب میں اتنی آگے جا چکی ہوں کہ واپس لوٹ کر نہیں آ سکتی۔ جیسا چل رہا ہے چلتا رہے گا۔ اماں کسی کو کچھ نہیں پتا نہیں چلے گا۔ بس تُو...... تُو بھی کسی سے کچھ مت کہنا اماں...... میں وعدہ کرتی ہوں اب کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی لیکن تُو...... ایسی کوشش بھی نہیں کرنا جس سے مجھے یا میرے گھر والوں کو نقصان پہنچے۔ ہم اسی طرح جئیں گے اماں......'' نائلہ نے عاجزی سے کہا تو زرینہ وقتی طور پر خاموش ہو گئی لیکن...... زرینہ نے سوچ لیا تھا کہ اپنی معصوم بیٹی کو اس عذاب سے ضرور نکالے گی۔

☆......☆......☆

زرینہ نے دوسرے روز بھی بازار کا بہانہ کیا اور محلے کی مسجد کے پیش امام صاحب سے ملی اور ان سے

غزل

اب تو خود سے بھی ملاقات سے ڈر لگتا ہے
ان دنوں اپنے خیالات سے ڈر لگتا ہے

دل دُکھاتے ہوئے لوگوں کو خوشی ہوتی ہے
اس لیے مجھ کو ہر اک بات سے ڈر لگتا ہے

صبح ہوتی ہے تو آرام سے سو جاتی ہوں
رات بھر جاگتی ہوں رات سے ڈر لگتا ہے

اس لیے شک کی نظر سے میں اُسے دیکھتی ہوں
اُس کی بے وجہ عنایات سے ڈر لگتا ہے

پیار کی بازی کبھی کھیل نہیں پائی میں
سعدیہ اس میں مجھے مات سے ڈر لگتا ہے

یاد آتے ہیں کئی پھول سے چہرے مجھ کو
رُت ہو ساون کی تو برسات سے ڈر لگتا ہے

شاعرہ: سعدیہ سیٹھی۔ لندن

کسی عامل کو لانے کے لیے کہا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ یہ بات کسی کو بھی پتا نہ چلے۔ پیش امام صاحب نے وعدہ کر لیا کہ دو دن بعد انشاء اللہ وہ بہت پہنچے ہوئے عامل کو لے کر آئیں گے کیونکہ نائلہ رات کو جلدی سو جاتی تھی اس لیے یہ عمل رات کو کرنا تھا۔ تین چار گھنٹے نائلہ بے سدھ سوتی تھی۔ یہی وقت عمل کے لیے مناسب تھا۔

اس رات کو نائلہ نہ جانے کیوں وقت سے پہلے ہی بستر پر جا لیٹی۔ آج نائلہ بہت چپ چپ اور اُداس تھی۔ سونے سے پہلے اس نے زرینہ کے پیر بھی دبائے تھے۔ اور اس کے ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگائے تھے۔ اس لمحے نائلہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''اماں میں تمہیں بہت پیار کرتی ہوں۔''

''میں بھی تجھے بہت پیار کرتی ہوں بیٹی۔''

زرینہ نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''اماں میں نے ابا کے ساتھ غلط کیا ناں؟'' اچانک اس نے سوال کیا۔

''اماں...... اماں مجھے معاف کردے۔'' وہ زرینہ کے ہاتھ پکڑ کر رونے لگی۔

''ہاں...... ہاں...... میں نے معاف کردیا بیٹی۔'' زرینہ اس کی حالت پر آبدیدہ تھی۔ نائلہ خود ہی ان سب باتوں سے ناآشنا تھی۔ جو کچھ کیا وہ سب اُس طاقت نے کروایا تھا جو اس پر قابض تھی۔ نائلہ لیٹتے ہی گہری نیند سوگئی۔ زرینہ کو اطمینان ہوگیا کہ وہ سوگئی ہے۔

☆......☆......☆

مقررہ وقت پر عامل صاحب بھی آگئے۔ آتے ہی صحن میں لگے انار کے درخت کے پاس حصار کھینچ کر بیٹھ گئے۔ کچھ فاصلے پر زرینہ بھی بیٹھ گئی۔ عامل صاحب آنکھیں بند کرکے کچھ پڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد درخت میں ارتعاش پیدا ہونے لگا اور درخت سے کچھ عجیب وغریب آوازیں آنے لگیں۔ رفتہ رفتہ آوازوں کا شور بڑھنے لگا جیسے کوئی کراہ رہا ہو۔ درد کی وجہ سے تڑپ رہا ہو۔ ان آوازوں میں نائلہ کی آواز بھی نمایاں تھی۔ زرینہ نائلہ کی آواز سن کر تڑپ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ شور بڑھنے لگا سارا گھر جیسے زلزلوں کی زد میں آگیا تھا۔

زرینہ تھرتھر کانپ رہی تھی اور عامل صاحب کی بتائی ہوئی سورتیں پڑھ رہی تھی۔ درخت زور زور سے ہلنے لگا۔ یکایک درخت سے ایک بڑا سا انار دھپ سے زمین پر آگرا اس کے ساتھ اس سے چھوٹا انار گرا اور پھر آخر میں ایک ننھا سا انار بھی گر پڑا۔ تینوں انار زمین پر ایسے مچلنے لگے جیسے تڑپ رہے ہوں ساتھ ہی کراہنے کی آوازیں بھی بڑھ گئی تھیں۔ دفعتاً ہلتا ہوا درخت منجمد ہوگیا۔ چیخنے کی آوازیں بند ہوگئیں اور تڑپتے مچلتے ہوئے تینوں انار بھی ساکت ہوچکے تھے اور پھر تینوں انار آپس میں اس طرح سے مل گئے۔ جیسے آپس میں جڑے ہوتے ہوں۔ ماحول پر ایک دم سکوت چھا گیا۔

سارا شور، ہنگامہ، کراہیں...... سب کچھ تھم چکا تھا اور ماحول میں پُراسراری خاموشی چھا گئی تھی۔ مولوی صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ ان کے چہرے پر اطمینان تھا۔

''جاؤ بی بی! سب کچھ ختم ہوگیا ہے۔'' انہوں نے مطمئن انداز میں کہا تو زرینہ نے خدا کا شکر ادا کیا۔ عامل صاحب چلے گئے۔ زرینہ کمرے میں آئی تو نائلہ بدستور گہری نیند میں تھی۔ زرینہ بھی آکر لیٹ گئی اب اسے ذرا سا بھی خوف محسوس نہیں ہورہا تھا۔

''اماں...... اماں...... میں نے منع کیا تھا ناں کہ ایسا کچھ مت کرنا...... اماں...... اماں...... تم نے ایسا کیوں کیا؟ تمہیں میرے بچے پر بھی رحم نہ آیا۔'' نائلہ بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو لیے اس سے سوال کررہی تھی۔

زرینہ نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔ ''اُف کتنا عجیب سا خواب دیکھا تھا۔'' اس کی دو گھڑی کو آنکھ لگی تو خواب میں نائلہ کو دیکھا تھا۔ وہ پریشان تھی بہت رو رہی تھی۔ گھبرا کر پلٹ کر دیکھا تو دیکھ کر اطمینان ہوا کہ نائلہ تو بدستور سو رہی تھی۔

زرینہ کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ نائلہ مرچکی تھی۔ نہ جانے رات کے کس پہر اس کی موت واقع ہوگئی تھی۔ اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ چہرے پر آنسوؤں کے نشانات واضح تھے اور آنگن میں گرنے والا بڑا انار اس کے منہ کے پاس اور چھوٹا اس کے بازو پر رکھا تھا۔

''نائلہ...... نائلہ...... نائلہ...... زرینہ پاگلوں کی طرح اس کے بے جان وجود کو جھنجوڑ رہی تھی۔ زرینہ نے تو اپنی بیٹی کو اس عذاب سے چھٹکارا دینا چاہا تھا۔ اور نائلہ نے...... نائلہ نے بھی ماں کی محبت کی لاج رکھ لی تھی اور خود بھی محبت پر قربان ہوگئی تھی۔ زرینہ تو ہوش وحواس کھو چکی تھی۔

محلے والوں نے نائلہ کی تدفین کی اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ نائلہ کفن کے اندر جیسے انارکلی کی طرح خوبصورت ومعصوم سی لگ رہی تھی۔ اور اس کی قبر کے سرہانے دو انار رکھے، تھے ایک کافی بڑا اور دوسرا ننھا سا اور...... دونوں بالکل سوکھ گئے تھے۔

☆☆......☆☆



فوزیہ فرید احمد

کراچی کے ایک ایسے آسیبی گھر کی کہانی، جس میں اُس مگرمچھ جیسی چھپکلی کا بسیرا آج بھی ہے




میرا نام رئیسہ ہے اور آج سے آٹھ سال پہلے اورنگی ٹاؤن سات نمبر میں نہایت کم قیمت میں ہم نے ایک گھر خریدا تھا۔ اسّی گز کے اس گھر میں تین کمرے، ایک باتھ روم، ایک کچن اور ایک بڑا سا صحن تھا۔

پہلے میں اپنی فیملی کے بارے میں بتا دوں۔ ہم دو میاں بیوی دو بیٹے ایک بیٹی اور ساس ہم کل چھ افراد تھے۔

پہلے ہم جس گھر میں رہ رہے تھے وہ ہر سہولت سے آراستہ تھا۔ اس میں صرف دو ہی کمرے تھے جو ہم چھ افراد کے لیے ناکافی تھے۔ بچے بڑے ہو رہے تھے۔ اگر کوئی مہمان آ جاتا تو اس وقت اور پریشانی اٹھانی پڑتی تھی، اسی لیے ہم نے اس گھر کو کرائے پر اُٹھا کر خود تین چار کمروں کے گھر میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس سلسلے میں حفیظ نے اپنے ایک دوست ابرار سے بات کی تھی۔ وہ کہنے لگا۔

''تین چار کمروں کا گھر تو ذرا مشکل سے ملے گا لیکن تم فکر مت کرو میں کوشش کرتا ہوں۔ ویسے میرے بہنوئی نے اورنگی ٹاؤن میں انتہائی کم قیمت میں ایک گھر کے فروخت ہونے کے بارے میں بتایا تھا۔ اگر تم نے پہلے ذکر کیا ہوتا تو میں اپنے بہنوئی سے تمہاری بات کروا دیتا۔ اب تک تو وہ گھر بک چکا ہوگا وہ گھر تمہارے معیار کے مطابق ہے۔''

حفیظ نے کہا کہ یار تم اپنے بہنوئی سے ایک بار معلوم کر کے دیکھو، ہو سکتا ہے ابھی وہ گھر نہ بکا ہو۔ میں وہ گھر خریدنا چاہتا ہوں۔''

ابرار نے کہا۔ ''ٹھیک ہے میں اپنے بہنوئی سے بات کر کے تمہیں بتاتا ہوں۔''

حفیظ نے جب اس گھر کے بارے میں مجھے بتایا تو میں نے حفیظ سے کہا کہ آپ جلد اس گھر کے بارے میں اپنے دوست سے بات کریں۔ ایسا نہ ہوا اسے کوئی خرید لے اور ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں۔''

''میں یہ سوچ رہا ہوں اگر یہ گھر ہم نے خرید لیا تو کرائے کی ادائیگی سے جان چھوٹ جائے گی۔''

''یہ تو ہے۔'' میں نے حفیظ کی ہاں میں ہاں ملائی۔

☆......☆......☆

دوسرے دن ابرار کا فون حفیظ کے پاس آیا وہ کہنے لگا کہ آپ شام تک آ جائیں، ابھی وہ گھر فروخت نہیں ہوا ہے۔ ہم اسے دیکھنے چلیں گے۔''

شام کو حفیظ گھر دیکھنے چلے گئے تو میں دعا کرنے لگی کہ وہ گھر ہمیں مل جائے۔''

حفیظ جب واپس آئے تو کہنے لگے گھر تو کافی بڑا ہے، بس ٹھیک طرح بنا ہوا نہیں ہے۔ ہم اسے اپنی مرضی کے مطابق مرمت وغیرہ کروا کر ٹھیک کر لیں گے۔''

اس گھر کا بیعانہ ادا کرنے سے پہلے حفیظ مجھے اور اپنی امی کو یہ گھر دکھانے لائے تھے۔ مجھے یہ گھر بے حد پسند آیا تھا کیونکہ مجھے گھر کھلے ہی اچھے لگتے تھے۔ میں نے حفیظ سے کہا۔

''گھر تو مجھے بہت پسند آیا ہے۔ آپ بھی اچھی طرح دیکھ لیں پھر اس کی قیمت ادا کریں۔''

میری ساس کہنے لگیں کہ بیٹا اتنی جلد بازی سے کام مت لو۔ پہلے اچھی طرح چھان بین کر لو، آس پڑوس کے لوگوں سے پتا کرو پھر اس گھر کی قیمت ادا کرنا۔''

''اماں جو صاحب یہ گھر بیچ رہے ہیں انہیں دبئی اپنے بیٹے کے پاس جانا ہے اس لیے وہ جلد اسے فروخت کرنا چاہ رہے ہیں۔ اگر میں نے ٹائم ضائع کیا تو کہیں یہ گھر ہاتھ سے نہ نکل جائے۔''

اس ڈر سے کہ کہیں یہ گھر کوئی اور نہ خرید لے ہم نے بغیر سوچے سمجھے، یہ جانے بنا کہ اتنی کم قیمت میں گھر بیچنے کی کوئی وجہ ہوگی؟ ہم نے اس گھر کا بیعانہ ادا کر دیا باقی کی رقم گھر میں شفٹ ہونے کے بعد ادا کرنی تھی۔

نئے گھر کی خوشی نے ہماری راتوں کی نیندیں اڑا دی تھیں اگر اس وقت ہمیں ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ ہم کس خوشی سے اپنی زندگی کو جہنم میں دھکیل رہے ہیں۔ تو اس گھر کو کسی بھی قیمت پر نہ خریدتے۔

گھر کا قبضہ ملتے ہی ہم نے سامان کی منتقلی کرنا تھی اس لیے میں نے اپنے چھوٹے بھائی کامران کو بھی پاس بلوا لیا تھا۔

اس گھر میں کامران پہلی مرتبہ آیا تھا۔ اس نے صحن میں کھڑے ہو کر پورے گھر کا جائزہ لیا پھر

میرے پاس آ کر کہنے لگا۔
''باجی آپ نے اس گھر کے بارے میں معلومات کروائی تھی۔'' میں نے کہا۔
''نہیں۔'' تو وہ کہنے لگا۔
''آپ کو پہلے اس گھر کے بارے میں چھان بین کر لینی چاہیے تھی یا کم از کم مجھے ہی بلوا لیا ہوتا۔ آپ کو پتا ہے یہ گھر آپ کے لیے بھاری ثابت ہوگا۔''
میں آپ کو بتاتی چلوں کہ قدرت نے میرے اس بھائی کو ایسی صلاحیت سے نوازا ہے کہ اگر کسی گھر میں آسیب ہوں یا کسی جگہ کوئی تعویذ دبا ہو۔ یہ فوراً اس جگہ کی نشاندہی کر دیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی اس کے اس طرح کہنے پر میں پریشان ہوگئی تھی۔ مگر اس پر ظاہر نہیں کیا اور اس سے کہا کہ یہ سب تو زندگی کے ساتھ چلتا رہتا ہے تم فکر مت کرو اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' میری بات سن کر وہ خاموش ہوگیا۔
گھر کا تمام سامان حفیظ' کامران اور اس کے دوستوں کی مدد سے گھر میں آ چکا تھا۔ ان ہی لوگوں نے مل کر سب سامان کی سیٹنگ بھی کر دی تھی کچھ سامان میں نے ٹھکانے لگا دیا تھا۔
اس گھر میں پہلے دن میں ہی میں نے ختم شریف کروا کر یہ مٹھائی پورے محلے میں بھیج دی تھی۔
اس گھر میں آنے کے بعد ایک ہفتہ آرام سے گزر گیا۔ میں دل ہی دل میں اپنے چھوٹے بھائی کی، کی گئی پیشن گوئی پر ہنس رہی تھی کہ اس بار اس سے غلطی ہوگئی تھی۔ سب لوگ اس گھر میں آ کر بہت خوش تھے۔

☆......☆......☆

وہ اتوار کا دن تھا میرے میاں حفیظ گھر پر تھے۔ آج میری بڑی نند کو آنا تھا اس لیے میں صبح ہی سے کھانے پینے کے انتظامات میں لگی ہوئی تھی۔ ابھی مجھے کمرے میں پردے بھی ڈالنے تھے۔ مجھے کاموں میں مصروف دیکھ کر حفیظ کہنے لگے کہ لاؤ پردے مجھے دو میں ڈال دیتا ہوں۔''
میں نے تشکر سے ان کی طرف دیکھا اور پردے لا کر انہیں دے دیے، ساتھ ہی احتیاط سے ڈالنے کی ہدایت کر کے کچن میں آ گئی۔
میں دل ہی دل میں حفیظ کی شکر گزار تھی کہ ایک کام کی ٹینشن دور ہوئی۔ استری میں نے رات کو کر دی تھی، بس پردے ڈالنے کی فکر تھی جسے حفیظ نے دور کر دیا تھا۔
ابھی مجھے کچن میں آئے ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ مجھے کسی چیز کے گرنے پھر حفیظ کی چیخ سنائی دی۔
میں دوڑ کر اس کمرے میں گئی۔ دیکھا تو حفیظ زمین پر پڑے کراہ رہے تھے۔ اسٹول بھی ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ میں سارا معاملہ سمجھ گئی کہ حفیظ اسٹول پر سے توازن برقرار نہ رکھنے کے سبب گر پڑے ہیں۔ میں نے ان کو اٹھانے کی کوشش کی تو وہ کہنے لگے مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود وہ اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر ان سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔
میں نے حفیظ سے کہا کہ آپ یہاں رکیں میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں پڑوس کے گھر چلی گئی۔ یہ پڑوسن ہمارے شفٹ ہونے کے پہلے دن ہی ہم سے ملاقات کرنے آئی تھیں اور کسی بھی چیز کی ضرورت یا کسی بھی قسم کا کوئی کام پیش آنے کی صورت میں اپنی خدمات پیش کر رہی تھیں۔
اس وقت تو کوئی کام نہ پڑا تھا لیکن آج ضرورت پڑ گئی تھی۔
میں نے سلام کرنے کے بعد انہیں اپنے میاں کے گرنے کا بتایا، تو وہ کہنے لگیں ایسی صورت میں تو بھائی صاحب کو ہاسپٹل لے کر جانا چاہیے۔'' پھر انہوں نے کہا کہ تم گھر جاؤ میں کسی ٹیکسی کا بندوبست کرواتی ہوں۔''
میں گھر آ گئی حفیظ ابھی بھی اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے مگر شاید اندرونی چوٹ کی وجہ سے انہیں اٹھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔
کچھ دیر بعد پڑوسن نے آ کر بتایا کہ ٹیکسی آ گئی ہے پھر انہوں نے اپنے بیٹے اور شوہر کی مدد سے حفیظ کو ٹیکسی میں منتقل کیا۔ میں بھی ٹیکسی میں حفیظ کے ساتھ بیٹھ گئی جبکہ اُن کا بیٹا آگے بیٹھ گیا۔ وہ کہنے لگیں۔

''تم ہاسپٹل پہنچو میں کچھ دیر بعد آؤں گی۔''

بہرحال ہم ہاسپٹل پہنچے ڈاکٹر نے بتایا کہ ریڑھ کی ہڈی میں چوٹ آئی ہے۔ مگر شکر ہے کہ ہڈی ٹوٹنے سے بچ گئی ہے لیکن پھر بھی انہیں ٹھیک ہونے میں کافی ٹائم لگے گا۔''

میں نے اپنی بڑی نند کو حفیظ کے گرنے کے بارے میں بتادیا تھا کچھ ہی دیر بعد وہ بھی اسپتال حفیظ کو دیکھنے آ گئی۔

جس کسی کو بھی پتا چلتا گیا وہ حفیظ سے ملنے اسپتال آنے لگا۔

ایک ہفتہ کس طرح گزرا یہ الگ کہانی ہے۔ گھر آنے کے بعد میں حفیظ کو زیادہ ٹائم دیا کرتی تھی۔

☆......☆......☆

ایک دن میرا بھائی مجھ سے اور حفیظ سے ملنے گھر آیا تو کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہنے لگا۔ ''باجی آپ برا نہ منائیں تو ایک بات کہوں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں ہاں کہو۔'' تو وہ کہنے لگا۔

''باجی آپ کو یاد ہے اس گھر میں، میں پہلی بار آیا تھا اور میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ گھر آپ لوگوں کے لیے بھاری ثابت ہوگا تو آپ نے میری بات پر کوئی توجہ نہ دی تھی۔ باجی میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں حفیظ بھائی کا گرنا اتفاق نہیں ہے بلکہ اس گھر میں موجود شے کی کارستانی ہے۔''

یہ سب سن کر میں نے اس سے کہا کہ وہ جو کوئی بھی ہے ہمیں اس سے کیا لینا دینا دفع کرو اس قصے کو۔ یہ بتاؤ چائے کے ساتھ کیا لینا پسند کرو۔''

میرے ٹالنے والے انداز کو دیکھ کر اس نے بھی مزید کوئی بات نہ کی۔ میں چائے بنانے کے لیے کچن میں آ گئی تو وہ میرے چھوٹے بیٹے سے باتوں میں مگن ہوگیا۔

اِدھر میں یہ سوچ رہی تھی کامران ٹھیک کہہ رہا ہے۔ حفیظ نے مجھے یہی بتایا تھا جیسے اسے کسی نے دھکا دیا ہو۔ میرا بچوں کا ساتھ تھا، اگر آگے چل کر اس سے بڑا نقصان ہوگیا تو پھر کیا ہوگا؟ یہ سوچ مجھے پریشان کیے دے رہی تھی۔

میں سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ میرا چھوٹا بیٹا آ کر کہنے لگا۔ امی ماموں کا فون آ گیا ہے۔ انہیں ابھی جانا ہے وہ کہہ رہے ہیں آپ کو بتادوں۔''

میں نے اپنے بیٹے کو کامران کے پاس بھیجا کہ ماموں سے کہو بس میں ابھی آئی۔''

میں نے جلدی جلدی چائے کپ میں انڈیلی، کباب اور بسکٹ پلیٹوں میں نکالے اور کچن سے باہر آ گئی۔ وہ کہنے لگا۔

''ارے باجی یہ سب کیوں کیا۔ مجھے ابھی جانا ہے۔''

''چلے جانا تم کون سا روز روز آتے ہو۔ کام تو ہوتے رہتے ہیں۔ تھوڑا لیٹ ہو جاؤ گے تو کوئی آفت نہیں آ جائے گی۔'' میں نے اسے چائے پر زبردستی روک لیا۔ اس نے جلدی جلدی چائے ختم کی اور مجھ سے اجازت لے کر چلا گیا۔

☆......☆......☆

باقاعدگی سے ورزش اور علاج کی وجہ سے حفیظ سہارا لے کر چلنے پھرنے کے قابل ہوگئے تھے۔ یہ بات ہمارے لیے اطمینان بخش تھی۔ اس دوران میں کوئی بھی ایسا ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا جس سے یہ ثابت ہوتا کہ اس گھر میں کوئی نادیدہ ہستی موجود ہو ہے اس لیے ہم مطمئن ہوگئے تھے لیکن یہ اطمینان عارضی ثابت ہوا۔

ہوا یوں کہ ایک رات میری بیٹی صبا سو رہی تھی کہ وہ اچانک چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ خوف کی وجہ سے وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

میں دوڑ کر چیخنے کی وجہ جاننے کے لیے اس کے کمرے میں گئی۔ میری ساس مجھ سے پہلے اس کو اپنے ساتھ لگائے اس کے چیخنے کا سبب پوچھ رہی تھی۔

وہ کہنے لگی کہ جب میں سو رہی تھی تو مجھے سوتے میں یوں محسوس ہوا جیسے کوئی چیز میری ٹانگوں پر سے رینگ کر میری طرف بڑھ رہی ہے۔ اسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلنے کے بعد بھی مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی چیز میری ٹانگوں پر موجود ہو۔ وہ کیا

چیز تھی یہ جاننے کے لیے جب میں نے اپنی گردن اٹھا کر دیکھا تو خوف سے میری چیخ نکل گئی کیونکہ مگرمچھ کی جسامت کی ایک بڑی سی چھپکلی میری ٹانگوں پر سوار تھی۔

اس کی بھیانک آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے منہ سے دو حصوں میں بٹی ہوئی زبان اندر باہر نکل رہی تھی۔ میری چیخ کی آواز سن کر وہ اسی بیڈ کے نیچے بھاگ گئی ہے۔'' اس نے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے کمرے کی لائٹ جلائی اور ڈرتے ڈرتے بیڈ کے نیچے جھانکا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

جب میں نے صبا سے کہا کہ بیٹا یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' تو صبا کہنے لگی۔

''امی ابھی ابھی میں نے اسے اس بیڈ کے نیچے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ آپ میرا یقین کریں۔'' میں نے اپنے بچوں کو سچ بولنے کی عادت ڈالی تھی اور مجھے یقین تھا کہ صبا سچ کہہ رہی ہے مگر پھر وہ چھپکلی اس کمرے سے یا یوں کہہ لیں کہ اس بیڈ کے نیچے سے کہاں گئی؟''

وہ رات میں نے صبا کے ساتھ جاگتے ہوئے گزاری اس واقعے کے بعد سے ہم لوگ ڈر سے گئے تھے۔ مگر پھر کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا۔

اس گھر کے باقی دونوں کمرے تو ٹھیک تھے۔ مگر تیسرا کمرہ جیسے ہم بطور اسٹور استعمال کر رہے تھے۔ اس کمرے میں ایک عجیب سی گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔ اس کمرے میں جاتے ہوئے ڈر سا محسوس ہوتا تھا۔ اس کمرے کے سامنے ہی کچن تھا۔ ہم نے اس کمرے کی دیوار سے لگا کر ایک تخت ڈال رکھا تھا۔ شام کو ہم وہیں بیٹھ کر چائے پیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ سبزی کاٹنا یا کچن کا دوسرا کام بھی ہم اسی تخت پر بیٹھ کر کیا کرتے تھے۔

ایک دن میری ساس رات کے کھانے میں بنانے کے لیے سبزی کاٹ رہی تھیں۔ میں کمرے میں کپڑے پریس کر رہی تھی۔ کیونکہ حفیظ اب دوبارہ آفس جانے لگے تھے۔ لائٹ کا کوئی ٹھیک وقت نہ تھا کسی بھی وقت چلی جایا کرتی تھی۔ اس لیے میں بچوں کے یونیفارم اور حفیظ کے کپڑے لائٹ آتے ہی پریس کرلیا کرتی تھی۔ میں کپڑے پریس کر رہی تھی کہ مجھے اپنی ساس کی دلخراش چیخ سنائی دی۔ میں نے فوراً استری کا پلگ نکالا اور باہر کی طرف دوڑی دیکھا تو ان کے چہرے کا رنگ پیلا پڑا ہوا تھا اور وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھیں۔ میں نے قریب جا کر ان سے پوچھا۔

''امی کیا ہوا۔''

انہوں نے ہاتھ سے کچن کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اُن سے پوچھا۔

''کیا ہے وہاں۔'' وہ جو ہولے ہولے کانپ رہی تھیں۔ اسی کیفیت میں انہوں نے مختصراً بتایا کہ ابھی ابھی انہوں نے ایک بڑی سی چھپکلی اس کچن میں جاتے ہوئے دیکھی ہے۔ وہ اس کمرے (اسٹور) سے نکل کر ابھی ابھی کچن میں گئی ہے۔''

چھپکلی کا نام سُن کر مجھے صبا کے رات میں ڈرنے والا واقعہ یاد آ گیا۔ اس بڑی سی چھپکلی کی موجودگی کو میں جھٹلا نہیں سکتی تھی۔

ساس کے بتانے پر میں نے دور سے کچن میں دیکھنے کا فیصلہ کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ کچن کی طرف بڑھی اور جب میں نے کچن میں دیکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہاں پر چھپکلی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ میں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا اور پھر کچن کے قریب جا کر اندر سے دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا جبکہ میری ساس اپنی بات پر قائم تھیں کہ ابھی بالکل ابھی انہوں نے اس چھپکلی کو کچن میں بھاگ کر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔''

یہ چھپکلی تھی یا چھلاوا جو کچھ بھی تھا ہمیں اب اس سے ڈر لگنے لگا تھا۔ میں نے رات کو ہی حفیظ سے اس گھر کے بیچنے کے بارے میں بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ جب اس سلسلے میں میں نے حفیظ سے بات کی تو وہ بولے۔

''تم عورتیں بھی یا کہیں خوش نہیں رہتی ہو۔ پہلے بڑے گھر کی پڑی ہوئی تھی۔ اب بڑا گھر میسر آ گیا ہے

تو اس میں بھی کیڑے نکل آئے ہیں۔''

''اچھا آپ کو لگ رہا ہے میں خوامخواہ آپ سے اس گھر کو بیچنے کا کہہ رہی ہوں۔ اگر اس گھر میں اس قسم کے واقعات پیش نہ آئے ہوتے تو میں کبھی بھی آپ سے یہ بات نہ کہتی۔''

''یہ سب تو زندگی کے ساتھ چلتا رہتا ہے اب اگر ان باتوں سے ڈر کر ہم گھر بیچ دیں تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ اگلا گھر ان واقعات سے پاک ہوگا۔''

''بھئی میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے اس گھر میں نہیں رہنا۔'' آخر میں حفیظ کی بحث سے چڑ کر میں نے حتمی فیصلہ سنایا۔

''اچھا تم پریشان مت ہو میں اپنے دوست سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔''

دن پر دن گزرتے جا رہے تھے مگر اس گھر کے ٹھیک دام نہیں لگ رہے تھے کیونکہ اس دوران میں کوئی بھی واقعہ پیش نہ آیا تھا اس لیے میں مطمئن سی ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

ایک دوپہر میری ساس کو عزیزوں کے ہاں جانا پڑ گیا۔ وہ اپنے ساتھ صبا کو بھی لے گئیں۔ جانے سے پہلے وہ مجھے ڈھیر ساری ہدایات دے گئی تھیں۔ جن میں آیت الکرسی کے حصار قائم کرنے سے لے کر اس اسٹور سے دور رہنے کی تاکید شامل تھی۔

ان کے جانے کے بعد میں گھر میں اکیلی تھی۔ میں نے سوچا کچھ دیر کے لیے آرام کرلوں اس غرض سے میں سونے کے لیے لیٹ گئی کہ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ میں دروازے کے پاس گئی اور پوچھا کون ہے۔

''امی میں ہوں۔'' عبید کی آواز سن کر میں نے دروازہ کھول دیا۔ عبید ابھی کالج سے لوٹا تھا۔ وہ وہیں تخت پر بیٹھ کر موزے اتارنے لگا۔ گھر میں سناٹا دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''امی دادی کہاں ہیں۔ ان کی آواز نہیں آرہی۔''

''بیٹا وہ ختم شریف میں گئی ہیں۔''

''اور صبا کہاں ہے؟''

''وہ بھی ان کے ساتھ گئی ہے اور جنید سو رہا ہے۔''

کچھ دیر بعد عبید کھانا کھا کر کوچنگ سینٹر چلا گیا تو میں نے چائے بنائی اور تخت پر آ کر لیٹ گئی۔ رات کے کھانے کے لیے آلو گوشت میں نے دوپہر کو ہی تیار کرلیا تھا اب صرف روٹیاں ڈالنا تھیں جو کہ میں کھانے سے آدھا ایک گھنٹہ پہلے بنالیتی۔

صحن کھلا ہونے کی وجہ سے شام کو موسم کافی ٹھنڈا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے چائے ختم کر کے کپ کچن میں رکھا اور تخت پر آ کر لیٹ گئی۔

آسمان پر اڑتے پرندے اور دیواروں پر بیٹھی چڑیوں کی چہکار نے اس وقت کو بڑا حسین بنادیا تھا۔ میں قدرت کی ان حسین رعنائیوں میں اتنی محو تھی کہ مجھے احساس تک نہ ہوا کہ کوئی مجھے گھور رہا ہے۔ میری چھٹی حس مجھے بار بار کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ اسی اثناء میں مجھے کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی، میں تخت پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ غیر ارادی طور پر میں نے مڑ کر دیکھا تو میں دنگ رہ گئی۔ خوف کی شدت سے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ مجھ سے ایک ڈیڑھ گز کے فاصلے پر ایک مگرمچھ سائز کی چھپکلی کھڑی مجھے گھور رہی تھی۔ اس کی سرخ آنکھیں اور منہ سے اندر باہر ہوتی زبان مسلسل حرکت کر رہی تھی اس پر مزید خوف کی بات یہ تھی کہ وہ میری طرف بڑھ رہی تھی۔ جیسے کوئی شیر اپنے شکار کو دیکھ کر آہٹ پیدا کیے بغیر آگے بڑھتا ہے۔

خوف و دہشت سے میں اپنی جگہ جم سی گئی تھی۔ مزید یہ کہ اکیلے پن کے احساس سے میری رہی سہی ہمت بھی رخصت ہوگئی تھی۔ میں چیخنا چاہتی تھی۔ مگر میری آواز نے جیسے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

تخت سے چھپکلی کا فاصلہ مسلسل کم ہو رہا تھا۔ مجھے اپنی موت بالکل سامنے نظر آرہی تھی۔ میں خود کو بالکل بے بس محسوس کر رہی تھی۔

تبھی دروازہ کھلا اور میری ساس اندر داخل ہوئیں۔ انہیں دیکھ کر وہ چھپکلی ایک سرعت سے اس اسٹور میں گھس گئی۔

میری ساس ہانپتے کانپتے ہوئے تخت پر آ کر بیٹھ

گئیں۔ چادر تہہ کرنے کے دوران کہنے لگیں۔
"ساجد (اُن کا چھوٹا بیٹا) نے بھی اپنی بیٹی کی بات لگادی ہے۔ اس سلسلے میں اس نے مجھے بلوایا تھا۔ لڑکا تو مجھے ٹھیک لگا ہے۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ بھئی لڑکا بہتر ہے۔ مگر پہلے اچھی طرح انکوائری کروالو۔ بھئی آج کل کسی کے منہ پر تھوڑا ہی لکھا ہوتا ہے۔" وہ آتے ہی شروع ہوگئی تھیں۔ جب میری طرف سے کوئی ریسپانس نہ ملا تو میری طرف دیکھ کر کہنے لگیں۔
"اے بہو تمہیں کیا ہوا؟ تمہارا رنگ کیوں پیلا ہو رہا ہے۔" میرا جواب نہ پا کر مجھے انہوں نے ٹہوکا دیا اور کہنے لگیں۔
"اے دلہن تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔"
میں نے ایک نظر اُن پر ڈالی اُس سے نجانے کیوں میرے ذہن سے سارے الفاظ مٹ گئے تھے۔ بس ذہن کی اسکرین پر کچھ دیر پہلے کا منظر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چل رہا تھا۔ میں غائب دماغی سے ایک ٹک اپنی ساس کو دیکھے جا رہی تھی۔
میرے اس طرح دیکھنے سے میری ساس کو کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ انہوں نے کچھ قرآنی آیات پڑھ کر مجھ پر دم کیں پھر جب میرے حواس بحال ہوئے تو انہوں نے کچھ دیر پہلے کی کیفیت کی وجہ پوچھی، جس پر میں نے انہیں وہ تمام واقعہ کہہ سنایا جو اب سے ایک گھنٹے پہلے وقوع پذیر ہوا تھا۔ تمام واقعہ سننے کے بعد وہ کہنے لگیں۔
"بیٹا اگر تم شروع میں میری بات مان لیتیں تو یہ نہ ہوتا۔ تم خود سوچو اتنے کم پیسوں میں آج کل کون پاگل ہوگا جو اپنی جائیدادیں کوڑیوں کے مول بیچے گا۔"
"امی کچھ بھی ہو مجھے اب اس گھر میں نہیں رہنا۔"
"تو پھر اب اس کے علاوہ کہاں جائیں گے۔"
ان کے اس سوال پر میں خاموش رہی کیونکہ ان کے سوال کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں تھا۔

☆......☆......☆

رات کو حفیظ کے آنے کے بعد میں نے انہیں بھی تمام قصہ کہہ سنایا وہ کہنے لگے۔
"تمہاری ضد تھی بڑے گھر میں رہنے کی۔ اب تمہارا خیال ہے کہ اب ہم اس گھر کو فروخت کرکے

دوسرا گھر خریدیں..... مگر یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ نہ تو گھر اتنی جلدی فروخت ہوسکتا ہے اور نہ ہی خریدا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔''

''تب تک کے لیے ہم کرائے کے گھر میں رہ لیتے ہیں مگر میں اس گھر میں مزید نہیں رہنا چاہتی۔'' میرے اٹل فیصلے کو دیکھ کر حفیظ نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں اپنے دوست سے بات کرتا ہوں۔ اب دیکھو دوسرے گھر کا بندوبست کب تک ہوتا ہے۔''

☆......☆......☆

مجھے اس گھر سے اب بہت خوف محسوس ہورہا تھا۔ اگر صبا یہاں ہوتی تو مجھے خوفزدہ دیکھ کر اس کی ناجانے کیا حالت ہوتی۔ دادی (میری ساس) اسے نانی کے گھر چھوڑ کر آگئی تھیں، اسی لیے وہ اس تمام قصے سے لاعلم تھی۔ شکر تھا کہ اس دن کے واقعے کے بعد سے پھر کوئی اور واقعہ رونما نہیں ہوا تھا۔

میں نے اپنی پڑوسن سے بھی اس واقعہ کا تذکرہ کیا تھا۔ پہلے تو وہ خاموش ہوگئیں کچھ دیر بعد انہوں نے اس گھر کی اصلیت بتاتے ہوئے کہا کہ واقعی یہ گھر آسیب زدہ ہے۔ میں آپ لوگوں کو بتانا نہیں چاہ رہی تھی کہ آپ لوگ پریشان ہوں گے، لیکن پھر میں نے سوچا اس طرح خاموش رہنے کی وجہ سے کہیں آپ لوگ کسی اور مشکل میں نہ پھنس جائیں۔ آپ لوگوں کو یہ گھر خریدنے سے پہلے کسی سے معلوم کرلینا چاہیے تھا۔ مگر......''

''یہ سب ہماری جلد بازی کی وجہ سے ہوا ہے لیکن میں نے بھی حفیظ سے کہہ دیا ہے۔ وہ جلد ہی کسی دوسرے گھر کا انتظام کریں گے۔'' میں نے پڑوسن سے کہا۔

اسی رات حفیظ نے مجھے بتایا کہ انہوں نے اپنے دوست سے اس سلسلے میں بات کی تھی۔ اس نے کہا ہے کہ اتنی آسانی سے گھر نہیں ملا کرتے۔ آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ جیسے ہی کوئی گھر بہتر داموں میں ملا میں آپ کو مطلع کردوں گا۔ البتہ آپ کے لیے کسی کرائے کے گھر کا انتظام کرسکتا ہوں۔ لیکن پہلے بتادوں اُن کا کرایہ زیادہ ہوگا۔ اب تم بتاؤ اتنے مہنگے کرائے کے گھر میں ہم کس طرح گزارہ کریں گے یا تو اخراجات پورے کریں یا پھر کرایہ بھریں۔''

شاید خدا تک ہماری فریاد پہنچ گئی تھی جبھی ہمیں کسی نے بتایا کہ آپ لوگ کرائے کے لیے پریشان ہیں۔ آپ کے محلے کے آخر میں جو گھر ہے وہ بھی تو کرائے کے لیے خالی ہے۔ آپ وہاں کیوں بات نہیں کرتے۔''

حفیظ جب اس گھر کے مالک مکان سے ملے کچھ شرطوں کے بعد کرایہ طے پا گیا۔

میں تو یہ سن کر بہت خوش تھی کہ چلو ہمیں اس آسیبی گھر سے نجات مل جائے گی۔ ایک بار پھر ہم نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کردیا تھا ہمیں کیا معلوم تھا کہ ابھی کچھ اور امتحان باقی ہیں۔

☆......☆......☆

سامان کی منتقلی کے لیے میں نے اپنے چھوٹے بھائی کامران کو بلالیا تھا کیونکہ حفیظ بھاری سامان اٹھانے کے قابل نہ تھے۔

یہ نیا گھر جس میں اب ہم لوگ جارہے تھے اندر باہر دونوں طرف سے جدید طرز پر بنا ہوا تھا۔ امریکن کچن، ڈرائنگ روم، بیڈرومز غرض کہ ہر چیز دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ میں یہ گھر پاکر بے حد خوش تھی اور اس خوشی کا اظہار جب میں نے اپنے چھوٹے بھائی سے کیا تو وہ خاموش رہا۔ اُسے خاموش دیکھ کر میں نے اس سے پوچھا۔

''کیا بات ہے کامران تمہیں یہ گھر پسند نہیں آیا۔''

وہ کہنے لگا باجی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ گھر ناپسند آنے والی کوئی بات نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جس وجہ سے آپ اُس گھر کو چھوڑ کر اس گھر میں شفٹ ہوئی ہیں۔ یہ گھر بھی اس گھر جیسا ہی آسیبی ہے۔ یہ بھی آپ کے لیے بھاری ثابت ہوگا۔'' بھائی نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

میں اس کی یہ بات سُن کر سناٹے میں آگئی لیکن پھر سنبھل کر بولی۔

''ارے بھئی ابھی تو آئے ہیں اور تم نے ایسی باتیں شروع کردیں۔'' حالانکہ میں اچھی طرح جانتی

تھی کہ میرا بھائی جو کچھ بتاتا ہے وہ سو فیصد درست ہوتا ہے۔ بھائی نے جب میرا نارمل انداز دیکھا تو پھر اس نے اس بارے میں مزید کچھ نہ کہا اور سامان منتقل کر کے جانے لگا۔

میں نے کہا کھانا کھا کر جانا تو وہ کہنے لگا باجی کھانے کا ٹائم نہیں ہے۔ جاتے جاتے میں آپ سے ایک بار پھر کہہ رہا ہوں یہ گھر آپ کے لیے مناسب نہیں ہے۔''

''ابھی رہنے دو یہاں رہ کر پتا چلے گا تم فکر نہ کرو۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

میں نے اس کی بات کو ذہن سے جھٹکا اور گھر کی سیٹنگ میں مصروف ہوگئی۔ تین دن گھر کی سیٹنگ میں لگے۔ اس گھر میں آ کر میں بے حد خوش تھی۔

اس گھر میں پانچ چھ دن بہت سکون سے گزر گئے۔ میں سوچ رہی تھی کہ کامران نے تو مجھے بلاوجہ ڈرا دیا تھا۔ اگر کچھ ہونا ہوتا تو اب تک ہو چکا ہوتا۔''

لیکن آنے والے دنوں میں ہمیں اندازہ ہوگیا کہ کامران نے جو کہا تھا وہ غلط نہیں کہا تھا۔

☆......☆......☆

اس بار اس گھر میں ہمیں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ بس اس گھر کی فضاؤں سے، ماحول سے اندازہ ہوگیا تھا۔ وہ ایسے کہ اچانک گھر میں انتہائی گندی ناگوار بدبو پھیل جاتی جس سے دم سا گھٹتا محسوس ہوتا۔ کبھی چیزیں بے ترتیب ملا کرتیں تو کبھی ٹوٹی پھوٹی اور تو اور گھر کا راشن جو مہینے بھر کا ہوتا تھا، صرف ایک دو دن میں ختم ہوجاتا دو دو کلو کی دالیں صرف ایک دو دن میں ختم ہو جاتیں۔ خشک دودھ اور چینی جو مہینے بھر کے لیے ہوتی تھی اب صرف تین دن سے بھی پہلے ختم ملتی تھی۔ اس صورتِ حال سے میں چکرا کر رہ گئی تھی۔ میں اگر دوبارہ راشن ڈلواتی تو وہ بھی اسی طرح ختم ہوجاتا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ راشن کہاں چلا جاتا ہے۔ گھر میں کوئی آتا نہ تھا اور نہ گھر کے افراد کی خوراک میں اضافہ ہوا تھا۔ پھر یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ بچوں کے کیے ہوئے ہوم ورک کے صفحے غائب ملتے جس کی وجہ سے انہیں کلاس میں شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ ساس کا

دوپٹہ جگہ جگہ سے جلا ہوا ملا، جس پر انہوں نے مجھے سخت سست سنائی تھیں۔

ان کی باتیں سُن کر میرا موڈ بھی آف ہوگیا۔ گھر کی فضا میں ایک عجیب طرح کی بے زاری اور بے سکونی رچی بسی رہنے لگی تھی۔

ان واقعات سے تنگ آ کر میں نے حفیظ سے تیسرے گھر کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

اِس بار وہ بھی چڑ سے گئے تھے کہنے لگے۔

''یار تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ پہلے تمہیں اپنا گھر چھوٹا اور ناکافی لگتا تھا۔ تمہارے کہنے پر میں نے دوسرا گھر خریدا۔ وہاں تمہیں آسیب دکھائی دینے لگے اب کرائے کا گھر لیا ہے تو اس میں بھی کیڑے نکل آئے۔ تم آخر چاہتی کیا ہو اور اگر فرض کرو میں تمہارے کہنے پر تیسرا گھر دیکھ بھی لیتا ہوں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم وہاں سکون سے رہوگی۔''

''حفیظ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں اس بار میں آپ سے کوئی شکایت نہیں کروں گی بلکہ یوں کرتے ہیں ہم اپنے پہلے والے گھر میں ہی چلتے ہیں۔''

''اس گھر میں جہاں تمہارا دم گھٹتا تھا۔ جو تمہیں مرغی کا ڈبا لگتا تھا۔'' حفیظ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''مجھے اب اندازہ ہوا ہے کہ وہی گھر سب سے اچھا تھا۔ آپ پلیز ہمیں وہیں لے چلیں۔ مجھے اب اور نہیں کہیں نہیں جانا۔''

شکر تھا وہ گھر ہم نے بیچا نہیں تھا کرائے پر چڑھایا ہوا تھا۔ اس میں میری ماں کی عقلمندی کارفرما تھی اگر میں نے اس گھر کو بیچ دیا ہوتا تو آج ہمارا ٹھکانہ نہ جانے کہاں ہوتا۔

آج ہم اپنے پہلے والے گھر میں خوش و مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمارا یہ چھوٹا سا گھر کسی جنت سے کم نہیں لگتا۔ سب یہاں خوش ہیں۔ اورنگی ٹاؤن 7 نمبر پر لیا جانے والا گھر ہم نے انتہائی کم قیمت میں فروخت کر دیا ہے۔ لیکن اس میں گزارے ہوئے وہ دن آج بھی یاد ہیں جو کسی بھیانک تجربے سے کم نہیں بیچتے وقت ہم اس گھر کی اصلیت بتانا نہیں بھولے تھے۔

☆☆......☆☆

ہم شکل

ایم اے راحت

سچی کہانیاں میں پہلی بار، برصغیر کے نامور قلم کار، ایم اے راحت کے قلم کا جادو

قسط نمبر: 15

خلاصہ

شاہ زیب کا تعلق روایت پسند گھرانے سے تھا۔ مشترکہ خاندان پر مبنی اس خاندان میں شاہ زیب سب سے چھوٹا اور لاڈلا فرد ہے۔ خاندان کی بزرگ دادی اماں بڑی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ اُن کے قصوں اور ٹوٹکوں سے ہر فرد مستفید ہوتا ہے۔ ایک دن قصوں کے درمیان دادی اماں نے کہا کہ دنیا میں اللہ نے ہر انسان کے سات ''ہم شکل'' بنائے ہیں۔

ایک دن شاہ زیب کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی۔ ہسپتال لے جانے کے بعد ڈاکٹر شاہ زیب کو برین ٹیومر ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ شاہ زیب زندگی کے باقی ماندہ دنوں کو ہسپتال کی نذر کرنے کے بجائے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے اور یوں وہ گھر والوں کو اطلاع دیے بغیر شہر سے دور سفر پر نکل جاتا ہے۔

دلاور ایک عادی مجرم ہے اور اس کی شکل شاہ زیب سے مشابہ ہے۔ دلاور کے دھوکے میں پولیس شاہ زیب کو گرفتار کرلیتی ہے۔ دلاور ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہوکر شاہ زیب کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد دلاور شاہ زیب کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

طویل سفر کرنے کے بعد ریل اسٹیشن پر رُکتی ہے تو ایک مجمع اسے نظر آتا ہے۔ ایک لڑکی شاہ زیب کو ''عالی'' کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ مجمع میں موجود ایک بزرگ اُسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے جانے پر مجبور کرتا ہے۔ شاہ زیب کو اپنی دادی کی بات یاد آتی ہے سات ہم شکل والی یعنی کہ ایک اور ''ہم شکل'' اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ذہنی کوفت کا شکار ہوجاتا ہے۔

گھر پہنچنے کے بعد شاہ زیب کو معلوم پڑتا ہے کہ ''عالی'' جو اس گھر کا بیٹا ہے وہ شاہ زیب کا ہم شکل ہے اسٹیشن والی لڑکی جس کا نام نشاط ہے وہ عالی کی بیوی ہے عالی نشاط سے غلط فہمی کا شکار ہوتے ہوئے گھر سے چلا گیا تھا۔ اب شاہ زیب کو عالی سمجھ کر سب گھر والے اور نشاط سمجھانے کی اور غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہ زیب نے بڑی مشکل سے ان کو یہ بات باور کرائی کہ وہ عالی نہیں شاہ زیب ہے جس کی شکل عالی سے مشابہ ہے۔ بہرکیف عالی کے خاندان والوں کو جب شاہ زیب کی حقیقت معلوم ہوئی تو وہ اس



کے احسان مند ہو گئے اور شکریہ ادا کرتے اس سے اس کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔ شاہ زیب نے بتایا کہ اس کی دادی ماں نے ایک بار کہا کہ ہر انسان کے سات ہم شکل ہوتے ہیں۔ بس میرا دل چاہا کہ اپنی زندگی میں اپنے ہم شکلوں کو تلاش کروں اور یقین کریں کہ مجھے میرے دو ہم شکل مل گئے ایک دلاور اور آپ کا عالی اور تیسرا میں اور اب چوتھے ہم شکل کی تلاش ہے۔

عالی کے گھر والے اس کو خاصی رقم دے کر رخصت کرتے ہیں۔ شاہ زیب اپنے تیسرے ہم شکل عالی کے بعد وہاں سے نکل کر ایک فور اسٹار ہوٹل میں جاتا ہے۔ اب شاہ زیب کی زندگی میں سیزارو آ جاتا ہے۔ وہ برطانیہ کے ایک خفیہ گینگ سے منسلک ہے۔ جس نے سیزارو کو ہائی جیک کیا ہوا ہے۔ ابھی شاہ زیب سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اُسے کوروتی ٹکرا جاتی ہے۔ کچھ بندے اُسے زبردستی اُس جگہ پہنچا دیتے ہیں جہاں پر ڈینیل نے کوروتی کو رکھا ہوا ہے۔

اب آگے ملاحظہ کیجیے

ساری رات اسی طرح گزر گئی۔ پھر خدا خدا کر کے دن کی روشنی پھوٹی، آتش فشاں میں کمی آتی جا رہی تھی، زمین کی جنبش بھی رک گئی تھی، لیکن جنگل مسلسل روشن تھے اور درجہ حرارت بڑھ جانے سے آنکھوں میں شدید جلن پیدا ہو گئی تھی، شاہ زیب نے چٹان سے ٹکی ہوئی ایرا کو دیکھا، اس کا چہرہ خوف و دہشت سے سفید اور بے جان ہو رہا تھا، اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، لیکن ان میں زندگی کے آثار نہیں تھے، شاہ زیب نے اسے جھنجھوڑا تو وہ چونک کر چیخی اور پھر شاہ زیب سے لپٹ گئی۔

''بھاگو... یہاں سے بھاگو، خدا کے لیے یہاں سے بھاگو'' ایرا نے کہا اور رو پڑی۔

شاہ زیب نے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اس کے شانے پر تھپکی دے کر اسے تسلی دی اور کہا کہ یہ خوفناک صورت حال جلد ختم ہو جائے گی۔''

''خدا کے لیے یہاں سے چلو۔'' اس نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

چاروں طرف پھیلے ہوئے دھوئیں کے مرغولوں نے فضا میں گھٹن سی پیدا کر دی تھی اور ایسی حالت میں جیپ ڈرائیو کرنا آسان کام نہیں تھا، مگر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق شاہ زیب نے جیپ کا اسٹیئرنگ سنبھال لیا، کھانے پینے کی چیزیں اب بھی کافی مقدار میں موجود تھیں، جیپ چند گز آگے بڑھانے کے ساتھ ہی شاہ زیب کو ایک اور احساس ہوا اور وہ شدت خوف سے کانپ کر رہ گیا۔ رات کو جس طرح آتش فشانی ہوئی اور جس طرح پتھر برسے ان سے شاہ زیب نے جان تو بچا لی تھی لیکن اگر کوئی پتھر جیپ میں رکھے ہوئے ان پیٹرول کے بیرلوں میں سے کسی ایک بیرل میں آ گھستا تو کیا ہوتا، لیکن قدرت نے زندگی بخشی تھی، چنانچہ یہ لوگ زندہ تھے، جیپ آگے بڑھتی رہی۔ شاہ زیب کو اس وقت اپنی زندگی کی بہترین ڈرائیونگ کرنا پڑ رہی تھی کیونکہ زمین جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی، آتش فشاں اب بھی گرج رہا تھا اور دوسری طرف کے جنگل میں آگ لگی ہوئی تھی۔

سورج نے پہاڑیوں سے سر بلند کیا تو ماحول کی وحشت خیزی نمایاں ہو گئی، نقشہ ہی بدل گیا تھا اس علاقے کا۔ میدانوں میں پتھروں کے نیچے جانوروں کی لاشیں دبی نظر آ رہی تھیں اور چاروں طرف سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ شاہ زیب نے جیپ کا رخ اس سمت کر لیا جو نسبتاً صاف نظر آ رہی تھی۔ جب کافی فاصلہ طے ہو گیا تو آگے کے مناظر کچھ بہتر نظر آنے لگے۔ اب یہ لوگ ایک چٹیل میدان سے گزر رہے تھے، یہاں سوکھی ہوئی جھاڑیوں کے سوا کچھ اور نہیں تھا، ماحول کی وحشت خیزی یہاں بھی چیخ رہی تھی اور پھر دفعتاً ہی ان کی نگاہ بائیں سمت اٹھ گئی۔

یہاں ڈھلان کے اختتام پر ایک جنگل نظر آ رہا تھا، چنانچہ شاہ زیب نے جیپ کا رخ اس جنگل کی طرف کر دیا، جنگل وسیع اور گھنا نہیں تھا، درختوں کے سلسلے میں داخل ہوئے تو پانی کی آواز سنائی دی، غالباً کوئی تیز رفتار ندی بہہ رہی تھی اور تھوڑے ہی فاصلے پر اس ندی کو دیکھ لیا گیا جس کے کنارے سبزہ زار سے ڈھکے ہوئے تھے اور ان میں

کچھ پھلوں کے درخت بھی تھے۔ نامعلوم قسم کے افریقی پھل لیکن لذیذ اور پیٹ بھرنے والے، شاہ زیب نے کچھ پھل توڑ کر کھائے اور پھر ان کے بارے میں اندازہ لگا کر ایرا کو بھی یہ پھل پیش کیے لیکن ایرا نے پھل کھانے سے انکار کر دیا تھا، اس کی حالت ابھی تک بہتر نہیں ہوئی تھی، سفر کافی طویل ہو چکا تھا اور یہ لوگ بھوکے تھے، اس لیے کچھ نہ کچھ کھا لینا ضروری تھا، شاہ زیب چاہتا تھا کہ جیپ میں محفوظ اشیاء کو سنبھال کر ہی رکھا جائے نجانے آئندہ کیا حالات پیش آئیں، اب تو سب کچھ ہی اپنے طور پر کرنا تھا۔ شاہ زیب سوچ رہا تھا کہ کیا اس زلزلے اور آتش فشانی کا اثر اسٹون برادرز تک ہوا ہوگا۔ کیا وہ اس سے محفوظ ہوں گے۔ کیا انہیں علم ہوگا کہ شاہ زیب پر کیا گزری ہے۔

دفعتاً ہی شاہ زیب کو ایک اور احساس بھی ہوا کہ رات کی اس افراتفری میں جو ٹرانسمیٹر اس کے لباس میں پوشیدہ تھا نکل کر کہیں گر پڑا تھا، ایک لمحے کے لیے وہ ساکت رہ گیا۔ گویا اب اسٹون برادرز سے رابطے کا ذریعہ بھی ختم ہو گیا تھا اور یہ سب کچھ.... شاہ زیب کو اپنے بدن میں شدید اینٹھن کا احساس ہونے لگا، حالات بد سے بدتر ہی ہوتے جا رہے تھے اور وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ درحقیقت اب یہاں شدید بیزاری ہونے لگی تھی، آتش فشانی اور زلزلے کا اثر اب تک اعصاب پر موجود تھا اور بیزاری کی شدت میں ان ہی کی کارفرمائی تھی۔ ایرا بھی ضرورت سے زیادہ ہی خاموش نظر آتی تھی اور اب اس نے شاہ زیب سے اظہارِ الفت بھی بند کر دیا تھا جس سے بسا اوقات شاہ زیب ذہنی کوفت ہونے لگتی تھی۔ یہ لوگ سفر کر رہے تھے اور اب ان کے پاس پیٹرول کا ذخیرہ بھی ختم ہوتا جا رہا تھا، صرف ڈیڑھ بیرل باقی تھا اور کہیں کسی آبادی کا نام و نشان نہیں ملا تھا۔ پھر ایک دوپہر جب سورج چمک رہا تھا۔ واقعات کی یکسانیت میں پھر تبدیلی پیدا ہوئی، جس علاقے سے یہ لوگ گزر رہے تھے وہاں ایک آبشار گر رہا تھا اور اس سے بننے والی چوڑی ندی دھیمے انداز میں گنگناتی ہوئی ایک سمت چلی جا رہی تھی، غیر اختیاری طور پر ہم اسی ندی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے، جیپ اسی راستے پر دوڑ رہی تھی اور ایرا بالکل خاموش تھی۔

سورج کی تمازت جب ناقابلِ برداشت ہونے لگی تو شاہ زیب نے ایک گھنے درخت کے نیچے جیپ روک دی اور اس کے بعد یہ لوگ سبزہ زار پر لیٹ گئے، ایرا کے انداز میں ناراضگی پائی جاتی تھی اور اس کی وجہ شاید شاہ زیب کی بے اعتنائی تھی، لیکن شاہ زیب بھی اپنی مصیبت میں گرفتار تھا، ان ویران صحراؤں میں بھلا کب تک بھٹکا جا سکتا ہے، کمبخت لڑکی کے بارے میں مجھے جو اطلاعات ملی تھیں ان پر بھی کچھ نہیں ہوا تھا، نظر ہی نہیں آئی تھی اور اگر نظر بھی آ جاتی تو شاہ زیب کیا کرتا۔

مسٹر گرج نے جو مشورہ دیا تھا ان حالات میں شاہ زیب نے یہ قبول کر لیا تھا، لیکن بہتر تو یہی تھا کہ شاہ زیب کو ان ویرانوں سے نکلنے کا موقع مل جاتا، یہی سوچ ہر وقت ذہن پر مسلط رہتی تھی، ایرا کو اسی طرح لیٹا ہوا چھوڑ کر شاہ زیب اپنی جگہ سے اٹھا اور ندی کے کنارے جا بیٹھا۔ چھوٹی چھوٹی رنگین مچھلیوں کے غول کے غول پانی میں اٹھکیلیاں کر رہے تھے، گہرائیوں میں بڑے خوبصورت پتھر نظر آ رہے تھے، اگر یہ پتھر ہیرے بھی بن جاتے تو ان ویرانوں میں بیکار تھے۔ انسان کتنی بے وقعت چیز ہے، بہت کچھ سوچتا ہے اپنے لیے، لیکن ایک وقت ایسا آ جاتا ہے جب وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

شاہ زیب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ دفعتاً ایک دھماکہ سنائی دیا اور اس کے ساتھ ہی کوئی چیز شائیں کی آواز کے ساتھ اس کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ شاہ زیب کچھ اس طرح بے اختیار ہوا کہ پانی ہی میں جا پڑا۔ اسے یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ یہ گولی کس نے چلائی ہے، ایرا کی چیخ بھی اور اس کے بعد دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں بھی اس نے سنی تھیں، کوئی کنارے پر آ گیا تھا۔ شاہ زیب نے خود کو پانی میں سنبھالا اور بدحواسی سے اس طرف دیکھا جدھر کوئی نظر آ رہا تھا۔ دو اور فائر ہوئے اور اس کے ساتھ ہی شاہ زیب کے حلق سے آوازیں نکل گئیں۔ گولی پانی سے ٹکرائی تھی جو شخص شاہ زیب پر گولیاں برسا رہا تھا وہ اجنبی نہیں تھا، اس کا چہرہ اس قدر بگڑا ہوا تھا

کہ شاہ زیب کی نگاہیں ایک لمحے میں اس کے بارے میں صحیح اندازہ نہیں لگا سکیں، لیکن دوسرے لمحے شاہ زیب نے اسے پہچان لیا۔ یہ ہالک تھا، اسٹون برادرز کے گروپ کا وہ طاقتور اور توانا شخص جسے دیکھ کر شاہ زیب پر ہمیشہ وحشت طاری ہو جاتی تھی۔ ہالک نے دانت کچکچاتے ہوئے پھر شاہ زیب کا نشانہ لیا اور پستول کا ٹرائیگر دبا دیا۔ اس بار شاہ زیب نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اب ظاہر ہے اس کے سارے نشانے ہی تو خطا نہیں جا سکتے تھے، لیکن ٹرچ کی ہلکی سی آواز ہوئی اور فائر نہ ہوا، غالباً ہالک کے پستول میں گولیاں ختم ہو گئی تھیں۔ شاہ زیب نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا، اسے اب پستول کے خالی ہونے کا احساس ہو گیا تھا، چنانچہ وہ شاہ زیب کی طرف لپکا اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اس دیوزاد کو سنبھالنا شاہ زیب کے بس کی بات نہیں تھی، جہاں تک اس سے جنگ کا تصور تھا تو بھول کر بھی یہ نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ جسمانی طور پر شاہ زیب اس پر حاوی ہو سکتا ہے، چنانچہ شاہ زیب نے ایک سمت دوڑ لگا دی، وہ ہالک کی گرفت سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا، ہالک بھی پانی میں شاہ زیب کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا، اسے جھکائی دے کر شاہ زیب پانی سے باہر نکل آیا اور پھر شاہ زیب نے اس درخت کی جانب چھلانگ لگا دی جس کے نیچے جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ ہالک شاہ زیب کے پیچھے دوڑ رہا تھا، ایرا بیوقوفوں کی طرح کھڑی یہ بھاگ دوڑ دیکھ رہی تھی، شاہ زیب نے درخت کے تنے کا سہارا لیا اور ہالک غراتا ہوا حملہ آور ہو گیا، اس نے ایک زوردار گھونسہ شاہ زیب کے جبڑے پر رسید کرنا چاہا، لیکن شاہ زیب نے اپنی جگہ خالی کر دی اور گھونسہ درخت کے تنے پر لگا، ہالک کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی اور وہ اپنا ہاتھ دبا کر کھڑا ہو گیا، شاہ زیب نے ہانپتے ہوئے ایرا سے کہا۔

”اس جنگلی بھینسے کو سنبھالو، اگر مجھے بھی غصہ آ گیا تو...“

ایرا کو جیسے ہوش آ گیا تھا، اس نے وحشت زدہ نگاہوں سے پہلے شاہ زیب کو اور پھر ہالک کو دیکھا، ہالک میں اب غالباً اتنی ہمت نہیں رہ گئی تھی کہ اپنے ہاتھ سے دوبارہ شاہ زیب پر حملہ کر سکتا، شاہ زیب نے اس موقع کو بہتر سمجھ کر پھر سرد لہجے میں کہا۔

”تم نے اسے پہچانا، یہ ہالک ہے۔ کیا خیال ہے کیا اب میں اسے موت کے گھاٹ اتار دوں“

”اوہ نہیں نہیں خدا کے لیے ایسا مت کرنا۔“ ایرا نے ہذیانی انداز میں کہا۔

”تو پھر ٹھیک ہے اسے درست کر لو، میں صرف تمہاری وجہ سے اس کی جان بخشی کر رہا ہوں“

ہالک نے دانت کچکچائے لیکن آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کی تھی، شاہ زیب جانتا تھا کہ یہ گھونسہ اسے کتنا مہنگا پڑا ہے اور ہالک زندگی بھر یاد رکھے گا کہ گھونسہ کس جگہ لگا تھا، شاہ زیب نے بھی یہ الفاظ بڑے مطمئن انداز میں کہے تھے ورنہ جب تک ہالک درست تھا شاہ زیب کے اوسان خطا ہی ہوتے رہے تھے، کمبخت اگر پکڑ لیتا تو شاید اسی چوڑے چکلے درخت کے نیچے شاہ زیب کی قبر بن جاتی۔ بہرحال ایرا ہالک کے پاس پہنچ گئی اور شاہ زیب وہاں سے ہٹ گیا، یہ صورت حال بھی بالکل غیر متوقع تھی، لیکن شاہ زیب یہ بات جانتا تھا کہ ہالک کی یہاں پہنچنے اور شاہ زیب پر حملہ کرنے کی وجہ صرف رقابت ہی ہو سکتی ہے اور وجہ رقابت ہی ہالک کو اعتدال پر لا سکتی ہے۔ یعنی میڈم ایرا... چنانچہ شاہ زیب نے وجہ رقابت کو رقیب کے قریب بلکہ عاشق کے قریب رہنے کا موقع دیا اور خود وہاں سے کافی دور ہٹ گیا، لیکن بہت چوکنا تھا تا کہ ہالک ہاتھ کی تکلیف درست ہونے کے بعد کہیں دوبارہ شرارتیں نہ شروع کر دے۔

ہالک جس وحشیانہ انداز میں شاہ زیب پر حملہ آور ہوا تھا اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہر قیمت پر شاہ زیب کی زندگی کے درپے ہے، کمبخت کا نشانہ اتنا ناقص نہ ہوتا تو نجانے کیا کچھ ہو چکا ہوتا۔ ایرا ہالک سے کچھ گفتگو کر رہی تھی اور ہالک خاموش نظر آ رہا تھا، پھر شاہ زیب نے ایک اور منظر دیکھا اور اس کی ہنسی نکل گئی، ہالک بھوں بھوں کر کے رو رہا تھا، حالانکہ کافی فاصلہ تھا لیکن اس کے رونے کی آواز شاہ زیب تک پہنچ رہی تھی، شاہ زیب اب کسی قدر مطمئن ہو گیا۔ جب آنسو نکل آتے ہیں تو پھر غصہ اور انتقام کی وہ کیفیت نہیں رہتی، پھر شاہ زیب نے ایک اور

منظر بھی دیکھا۔

ایرا نے اپنا رومال نکال کر ہالک کی آنکھیں صاف کی تھیں، چلو چھٹی ہوئی، اب بھلا بیچارہ ہالک شاہ زیب کے مقابل کیسے آسکتا تھا اور جہاں تک شاہ زیب کا مسئلہ تھا اس کے دل میں رقابت کا کوئی تصور بھول کر بھی نہیں تھا کیونکہ ایرا اس کی محبوبہ نہیں تھی، کافی دیر اسی طرح گزر گئی۔ پھر شاہ زیب نے ان دونوں کو قریب آتے دیکھا اور چوکنا ہو گیا، اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ہالک پھر خطرناک ہو سکتا ہے۔ ایرا شاہ زیب کے قریب آ گئی اور اس نے آہستہ سے کہا۔

''مسٹر شاہ زیب ہالک آپ سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔''

شاہ زیب نے گھورتی ہوئی نگاہوں سے ہالک کو دیکھا تو وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''سوری ڈیئر مجھے واقعی اپنی غلطی کا شدید احساس ہے۔''

''اور اگر اس غلطی میں تمہارے پستول کی کوئی گولی واقعی میرے بدن کو چھو لیتی تو کیا ہوتا؟''

''حقیقت معلوم ہونے کے بعد میں سخت شرمندہ ہوتا۔''

''یہ کیا کہتا ہے ایرا، پہلے مجھے یہ بتاؤ یہ یہاں کیسے آ گیا؟''

''ڈیئر شاہ زیب، اگر تم مناسب سمجھو تو اپنے ذہن سے ہالک کے لیے برائی نکال دو، یہ بیچارہ غلط فہمی کا شکار تھا، مگر میں نے اس سے کوئی کچھ نہیں چھپایا ہے، میں نے اسے بتا دیا ہے کہ تم مجھے یہاں نہیں لائے بلکہ میں خود چھپ کر آئی تھی۔''

''آئی ایم سوری شاہ زیب، واقعی مجھے سخت شرمندگی ہے بس میں سخت غصے کا شکار ہو گیا تھا۔ بہتر ہے تم مجھے معاف کر دو۔''

''میں تم دونوں کے لیے کوفی بنا کر لاتی ہوں، میرا خیال ہے کوفی پیتے ہوئے ہم باقی گفتگو کریں گے۔'' ایرا نے ہالک کا شانہ تھپکا اور واپس جیپ کی جانب چلی گئی۔

شاہ زیب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایرا نے ان دونوں کو جنگ سے روکنے کے لیے یہ پالیسی اختیار کی تھی یا پھر ہالک کے لیے واقعی اس کے دل میں کوئی نرمی پیدا ہو گئی تھی۔ ہالک شاہ زیب کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا، اس کا سر جھکا ہوا تھا پھر وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں ایرا کو بہت چاہتا ہوں مسٹر شاہ زیب، میں اس کے لیے پاگل ہوں۔''

''اور اس پاگل پن میں تم میری جان لینے کی کوشش کر رہے تھے۔''

''میں سخت شرمندہ ہوں اب مجھے مزید شرمندہ مت کرو۔''

''خیر چھوڑو اب باتوں کو، یہ بتاؤ تم اس آتش فشانی اور زلزلے میں اسٹون برادرز کا کیا ہوا؟''

''میں نہیں جانتا، اس سے پہلے میں انہیں چھوڑ چکا تھا۔'' ہالک نے جواب دیا۔

''میں سمجھا نہیں۔''

''تمہارے فرار سے سنسنی پھیل گئی تھی، سب حیران رہ گئے تھے، جو لوگ تمہارے تعاقب میں نکلے تھے وہ تمہیں پکڑنے کی کوشش میں ناکام ہو کر واپس پہنچ گئے، اسٹون برادرز شدید غصے میں تھے، یہ دوسری صبح ہی معلوم ہوا کہ ایرا بھی موجود نہیں ہے، پہلے تو مجھے اندازہ نہیں ہو سکا لیکن بعد میں سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''بس میں غصے میں دیوانہ ہو گیا اور کسی کو کچھ بتائے بغیر خاموشی سے وہاں سے نکل آیا اور اس کے بعد سے میں تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔''

''اس وقت تم کہاں تھے جب آتش فشاں پھٹا تھا؟''

''میں اس علاقے سے دور تھا، لیکن اس ہولناک تباہی سے میرا گھوڑا بدک کر بھاگ گیا''
''تم گھوڑے پر سفر کر رہے تھے؟''
''ہاں۔''
''بہرحال تمہیں ایرا نے بتا دیا ہوگا کہ میں نے اسے بھاگنے پر آمادہ نہیں کیا تھا۔''
''ہاں اور مجھے اس غلطی پر افسوس ہے۔''
''اب کیا ارادہ ہے تمہارا؟''
''ابھی کچھ نہیں سوچا ہے میں نے۔ ویسے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں میں تم سے، کیا تم بھی ایرا سے عشق کرتے ہو؟''

''ذرہ برابر بھی نہیں، میرے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، وہاں بھی اگر تم غور کرتے تو تمہیں اس کا اندازہ ہو جاتا وہ خود ہی ساری حماقتیں کرتی رہی ہے اور میں ہمیشہ اس سے بچتا رہا ہوں۔''
''میں واقعی تم سے نادم ہوں۔'' ہالک نے گہری سانس لے کر کہا۔
''اسٹون برادرز کے گروہ سے تمہارا فرار کہیں تمہارے لیے باعث مصیبت نہیں بن جائے گا۔''
''میں اب دوبارہ ان کے پاس نہیں جاؤں گا۔''
''تو پھر کیا کرو گے؟''
''اگر ایرا کے دل میں اب بھی میرے لیے کوئی جگہ نہ بن سکی تو یہیں خودکشی کرلوں گا اور اگر اس نے میری محبت قبول کرلی تو اسے لے کر یہاں سے نکل جاؤں گا۔''
''اور خزانہ؟''
''لعنت ہے ایسے خزانوں پر جو موت کے بعد ملیں اور پھر یہ صرف اسٹون برادرز کی بھوک تھی، ہمیں تو اس کی پہلے بھی امید نہیں تھی، تم جانتے ہو کہ ہم اسٹون برادرز کے ملازم تھے بس انہوں نے ایک پروگرام بنایا اور اس میں ہمیں بھی شریک کرلیا اس لیے ہم ان کے پروگرام میں شامل ہوگئے۔''
''میرے دوست میری دعا ہے کہ تم اپنی محبت حاصل کرلو، لیکن کیا تمہیں واپسی کے راستوں کے بارے میں کوئی اندازہ ہے؟''
''نہیں۔''
''تو پھر واپس کیسے جاؤ گے؟''
''راستے تلاش کریں گے۔'' اس نے جواب دیا اور شاہ زیب نے دل ہی دل میں اس پر مزید ایک بار لعنت بھیجی، عشق کرنے چلے ہیں مجنوں کی نسل کے آخری فرد اور بھٹک رہے ہیں ان صحراؤں میں۔

تھوڑی دیر کے بعد ایرا کوفی لے آئی تھی، شاہ زیب نے ایرا کو بھی نہیں بتایا تھا کہ اسٹون برادرز نے اسے کس منصوبے کے تحت فرار کرایا تھا، نہ ہی ہالک کو بتانے کی ضرورت تھی، اب اس کے سوا چارہ کار نہیں تھا کہ ہالک کو بھی ہضم کرلیا جائے۔ وہ کر بھی کیا سکتا تھا، مجبوریاں تو ہمیشہ شاہ زیب کے ساتھ رہتی تھیں۔ کوفی پیتے ہوئے یہ لوگ اس ہولناک آتشزدگی اور زلزلے کے بارے میں باتیں کرتے رہے، اسٹون برادرز بھی زیر بحث آئے، ان کی تیاریوں کے بارے میں ہالک سے کچھ اور تفصیلات معلوم ہوئی تھیں۔ مسٹر گرج کے بارے میں کچھ اور تفصیلات معلوم ہوئی تھیں مسٹر گرج پر بھی گفتگو ہوئی تھی۔ ہالک واقعی اس سلسلے میں زیادہ نہیں جانتا تھا چنانچہ کوئی ایسی بات نہیں بتا سکا جو قابل ذکر ہوتی۔

رات ہوگئی، حالات کے تحت اس جگہ کو نہیں چھوڑا گیا تھا اور ان لوگوں نے یہیں قیام کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ جگہ بہت مناسب تھی۔ رات کو شاہ زیب نے ان لوگوں کو تجدیدِ محبت کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔ شاہ زیب نے اپنے

آرام کے لیے ذرا فاصلے کی جگہ منتخب کی اور اس کے بعد خاموشی سے آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا، ایرا اور ہالک وہیں جیپ کے پاس موجود تھے اور پھر نجانے کب نیند آ گئی۔

☆......☆......☆

دوسری صبح کو دیر سے آنکھ کھلی تھی، ایرا اور ہالک ایک جگہ بیٹھے ہوئے کوفی پی رہے تھے اور ان کے درمیان کوئی مفاہمت نظر آ رہی تھی، ہالک بھی خوش تھا، شاہ زیب نے ایک گہری سانس لی، ان حالات میں ایرا کو یہی کرنا چاہیے تھا، ایک بے مقصد اور بیکار آدمی سے سر پھوڑنے سے کیا حاصل، ہالک اس کے لیے زندگی بھر کا سہارا بن سکتا تھا، بہر طور انہوں نے خوشدلی سے شاہ زیب کو مخاطب کیا تھا۔ ایرا تو بھی ہی عورت اور ایک عورت کی موجودگی جن فوائد کی حامل ہو سکتی ہے وہ ان لوگوں کو حاصل تھے، یعنی ناشتے کی تیاری وغیرہ۔

ناشتے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ہالک شاہ زیب سے مشورہ کرنے لگا کہ یہاں سے نکل جانے کے لیے کون سے راستے منتخب کیے جائیں۔ تمام باتیں انکل پچھو ہی تھیں، ظاہر ہے اُسے کون سی ان کے بارے میں معلومات حاصل تھیں، اگر ہوتیں تو اب تک وہ ان سے فائدہ نہ حاصل کر چکا ہوتا، چنانچہ ایک سمت منتخب کر لی گئی اور پھر ڈرائیونگ ہالک نے سنبھال لی، کم از کم اس کی آمد سے یہ فائدہ تو ہوا تھا کہ شاہ زیب کو اب مسلسل ڈرائیونگ سے نجات مل گئی تھی، ایرا تو اس سلسلے میں بالکل ہی بیکار ثابت ہوئی تھی اور اب تک شاہ زیب کو ہی اس کی ذمے داری سنبھالنی پڑ رہی تھی، لیکن اب اسے ایرا کی کوئی فکر نہیں تھی۔

آج کا سارا دن ہالک ہی جیپ ڈرائیو کرتا رہا، راستے میں شاہ زیب نے البتہ ایک تجویز پیش کی وہ یہ کہ ہمیں ہر طرح کی خوراک کا بندوبست کرتے رہنا چاہیے، اول تو پیٹرول کی قلت شروع ہو چکی ہے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ پیٹرول کب تک ان لوگوں کا ساتھ دے سکے، گو ابھی ڈیڑھ بیرل پیٹرول موجود تھا، لیکن جہاں جہاں تک نگاہ جاتی ویرانی ہی ویرانی کا سامنا کرنا پڑتا اور یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس پیٹرول کے ختم ہونے سے پہلے کوئی منزل ملے گی یا نہیں۔ چنانچہ بہتر یہ تھا کہ خوراک کے ذخائر محفوظ رکھے جائیں اور راستے میں کسی بھی طرح شکار کیا جاتا رہے تاکہ خوراک کا مسئلہ حل ہوتا رہے اور اس کے لیے بھی شاہ زیب کے پاس انتظامات تھے، چنانچہ راستے میں ان لوگوں نے ایک ہرن شکار کیا اور اس کا گوشت محفوظ کر لیا، یہ شام کھانے پینے کے لحاظ سے بڑی اچھی گزری، ہرن کا گوشت بھونا گیا اور تازہ گوشت کھا کر بہت لطف آیا، پھر ایرا اور ہالک نے ایک پر لطف رات گزاری۔

شاہ زیب پر بیزاری سی طاری ہونے لگی تھی، اس لڑکی کا بھی کوئی نشان نہیں ملا تھا۔

ہالک کو ان کے ساتھ شامل ہوئے پانچواں دن تھا اور یہ لوگ ہنوز کسی منزل سے محروم تھے اور امید کا ایک بھی چراغ روشن نہیں ہو سکا تھا، اس رات ماحول کچھ گرم تھا اور جیسی خنکی یہاں ہو جایا کرتی تھی ویسی نہیں تھی، طبیعت پر ایک اضمحلال سا طاری تھا، شاہ زیب معمول کے مطابق ان سے کچھ فاصلے پر لیٹ گیا، ایرا اور ہالک ایک چٹان پر جا بیٹھے تھے، کافی دیر تک شاہ زیب سونے کی کوشش کرتا رہا، لیکن طبیعت کچھ بے چین سی تھی چنانچہ شاہ زیب خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور یونہی ٹہلتا ہوا ایک سمت چل پڑا۔ شاہ زیب نے دیکھا کہ ایرا اور ہالک اس جگہ موجود نہیں تھے جہاں اس نے انہیں چھوڑا تھا۔ ہو سکتا ہے کہیں جیپ میں چلے گئے ہوں۔ شاہ زیب ٹہلتا ہوا کافی دور نکل آیا، تب ہی شاہ زیب کو کچھ آوازیں سنائی دیں اور شاہ زیب چونک کر رک گیا، یہ آوازیں اس بڑی چٹان کے عقب سے آ رہی تھیں جو صرف چند فٹ کے فاصلے پر تھی۔ شاہ زیب چوکنا ہو کر رک گیا اور پھر اس نے ان آوازوں کو پہچان لیا، یہ ایرا اور ہالک ہی تھے جو غالباً ٹہلتے ہوئے اس طرف نکل آئے تھے، لیکن ان کے منہ سے اپنا نام سن کر شاہ زیب نے ان کی گفتگو پر اپنے کان لگا دیے۔ ہالک کہہ رہا تھا۔

''تم نے میرے دل کی بات چھین لی ایرا، اس دوران میں خود بھی یہی سوچتا رہا ہوں، آخر اس احمق آدمی کو ساتھ لگائے پھرنے سے فائدہ ہی کیا، بے شک جیپ میں سامان بہت کم رہ گیا ہے، چلو اگر ہم گوشت اور پانی

حاصل بھی کر لیتے ہیں تب بھی دوسری چیزوں کی مقدار ہمارا زیادہ ساتھ نہیں دے سکے گی اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمیں کوئی منزل تلاش کرنے میں کتنا وقت لگ جائے گا اور پھر میں تم سے ایک بات سچ کہوں، اس کی موجودگی مجھے ناگوار گزرنے لگی ہے اور ہم لوگ خواہ مخواہ جھجک کا شکار رہتے ہیں۔''

''تو پھر کیا ارادہ ہے؟''

''کچھ نہیں، بہر طور میں اس کا اس حد تک شکر گزار ہوں کہ اس نے تمہارا تحفظ کیا، اس لیے ہم اسے قتل نہیں کریں گے، میرا خیال ہے صبح کو سورج نکلنے سے پہلے ہم جیپ لے کر یہاں سے نکل جائیں، سامنے کے راستے بھی صاف ہیں، وہ ہمارا تعاقب نہیں کر پائے گا، بس اس کے بعد ان صحراؤں میں ہم اپنی منزل تلاش کریں گے اور عیش کریں گے۔''

''ٹھیک ہے ہالک، وہ کمبخت اسی قابل ہے۔''

ایرا نے آہستہ سے کہا اور شاہ زیب کے دیوتا کوچ کر گئے، وہ ایک لمحے کے لیے سن کھڑا رہ گیا تھا، لیکن دوسرے لمحے ہی اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور وہ بے پاؤں وہاں سے واپس پلٹ پڑا، اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، ایرا پر سخت غصہ آ رہا تھا، ہالک تو خیر تھا ہی سدا کا دشمن، لیکن یہ لڑکی... غلطی شاہ زیب ہی کی تھی ہر جگہ شرافت کا ڈھول بجانے کا فائدہ نہیں تھا۔ کافی دیر تک غم و غصہ اس پر طاری رہا اور پھر خوف کا یہ احساس جاگزیں ہو گیا کہ اگر ایرا اور ہالک اپنی سازش میں کامیاب ہو گئے تو اس کا کیا ہوگا، نہ کھانے کو ہوگا نہ پینے کو۔ جیپ جا چکی ہو گی چنانچہ اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ اس سے پہلے کہ دشمن شاہ زیب کے خلاف اپنی سازش میں کامیاب ہو جائیں اسے یہاں سے فرار ہونا پڑے گا۔

اب اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا کہ ایرا اور ہالک اس کے دوست نہیں تھے بلکہ اب وہ شاہ زیب کے خلاف سازشیں کر رہے تھے، چنانچہ اس کے جانے کے بعد ان کا کیا ہوگا۔ یہ سوچنا حماقت تھی، جبکہ انہوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اخلاق و آداب میں گدھا بن جانا بھی مناسب نہیں ہوتا، شاہ زیب ایک جگہ پڑا رہا، البتہ اس نے اتنا ضرور کیا تھا کہ جیپ کے اگنیشن میں سے چابی نکال کر اپنی جیب میں ڈال لی تھی تاکہ ایرا اور ہالک کوئی کارروائی نہ کر جائیں، عموماً یہ چابی اگنیشن میں لگی رہتی تھی اور اسے نکالنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی، شاہ زیب جاگتا رہا، ابتدائی راتوں کا چاند نکل آیا اور چاندنی چاروں طرف پھیل گئی۔

تب ایرا اور ہالک جیپ کے قریب واپس آئے اور پھر ایک جگہ منتخب کر کے لیٹ گئے، لیکن یہ رات شاہ زیب کے لیے سونے کی رات نہیں تھی، ہوسکتا ہے وہ لوگ رات ہی کے کسی حصے میں یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کریں، اگنیشن میں چابی تلاش کریں یا چابی شاہ زیب سے حاصل کر لیں، چنانچہ وہ ایرا اور ہالک کے سونے کا انتظار کر رہا تھا۔ وقت گزرتا رہا اور اس کے بعد چاندنی مدھم پڑ گئی، شاہ زیب نے ہالک کے گہرے خراٹوں کی آوازیں سنی تھیں، ایرا بھی بے سدھ سو رہی تھی، وہ دونوں جیپ سے تقریباً دس گز کے فاصلے پر تھے اور بہت مطمئن تھے، شاہ زیب اپنی جگہ سے اٹھا اور انہیں دیکھتا ہوا جیپ میں جا بیٹھا، یہ راستہ ہالک نے منتخب کیا تھا، لہٰذا شاہ زیب نے اسی پر سفر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کے بعد شاہ زیب نے جیپ اسٹارٹ کر دی، اسے گیئر میں ڈالا اور تیزی سے آگے بڑھا دیا، سیدھے راستے پر جیپ دوڑاتے ہوئے اس نے کئی بار پلٹ کر ان دونوں کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، محبت کی منزلوں کے راہی گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے اور جیپ کے انجن کی آواز بھی انہیں نہیں جگا سکتی تھی، بہر طور یہ شاہ زیب کے حق میں بہتر ہی تھا، تھوڑی دیر میں شاہ زیب کافی دور نکل آیا تھا۔ اسٹون براوراز نے جب شاہ زیب کو روانہ کیا تھا تو وہ تنہا ہی تھا، اور پھر اچانک ہی ایرا کا نزول ہوا تھا اور اس کے سارے پروگرام دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ ہوسکتا ہے یہ لڑکی کی نحوست ہو کہ وہ اپنی منزل نہیں پا سکا تھا اور ہوسکتا ہے اب شاہ زیب

اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتا۔ اجالے پھوٹتے جا رہے تھے اور شاہ زیب اتنی دور نکل آیا تھا کہ دوسرے روز وہ دن بھر بھی سفر کرتے رہتے تو اس تک نہ پہنچ پاتے، لیکن شاہ زیب اتنی دور نکل جانے کا خواہش مند تھا کہ ہر طرح کا خطرہ دور ہو جائے۔

☆......☆......☆

روشنی کے ساتھ ساتھ جیپ کا سفر جاری رہا اور اس کے بعد اس نے گاڑی روک دی اور کھانے پینے کی چیزیں تلاش کرنے لگا، ناشتا کرتے ہوئے شاہ زیب کو ان دونوں کا خیال آیا، اس کی نیت میں تو کوئی کھوٹ پیدا نہیں ہوئی تھی، لیکن وہ مختلف انداز میں سوچنے لگے تھے، میں کیا کرتا۔

چنانچہ خاموشی سے ناشتا کرنے کے بعد اس نے پھر جیپ اسٹارٹ کی اور وہاں سے چل پڑا۔ موسم کسی قدر بہتر تھا، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس کے بعد کیا کیفیت ہو، وہ سورج بلند ہونے سے پہلے کوئی ایسی پناہ گاہ تلاش کر لینا چاہتا تھا، جہاں رات کی نیند پوری کی جا سکے، ویسے بھی صحرائے اعظم کے خطرات تو اب تقریباً بے اثر ہی ہو گئے تھے، کیا کہا جا سکتا ہے کہ کب کیا ہو جائے، زندگی بس یہی ہو کر رہ گئی تھی۔

جیپ کافی دیر سفر کرتی رہی اور پھر ڈھلان نظر آئے جن میں گھنے درختوں کے جھنڈ پھیلے ہوئے تھے، شاہ زیب احتیاط سے جیپ اس ڈھلان پر اتار لے گیا جو اس راستے کی سیدھ میں تھا اور پھر گھنے درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس اس نے جیپ روک دی۔ شاہ زیب پہلے یہ جائزہ لیتا رہا کہ آس پاس کا ماحول کیسا ہے، درندوں کے قدموں کے نشانات بھی تلاش کیے لیکن اس میں کامیاب نہیں ہو سکا، درختوں پر نگاہیں دوڑائیں کیونکہ صحرائے اعظم میں درختوں پر سانپ جھولتے عام نظر آ جاتے تھے اور کسی بھی لمحے اوپر سے کوئی سانپ نیچے گر کر سارا حساب کتاب درست کر سکتا تھا، باریک بینی سے جائزہ لینے کے باوجود ان درختوں میں کہیں سانپ نظر نہیں آئے تھے، پھر باقی سب کچھ حالات کے سپرد کر کے شاہ زیب جیپ کی عقبی سیٹوں میں گھس کر سو گیا۔

شاہ زیب اپنے طور پر حفاظت کا معمولی سا بندوبست کر لیا تھا، اگر سوتے ہی میں کچھ ہو جائے تو بہتر ہے کہ ہوش کی اذیتوں سے نجات مل جائے جب خطرات حد سے بڑھ جاتے ہیں تو بے اثر ہو جاتے ہیں، یہی کیفیت شاہ زیب کی تھی پھر اس نے سونے کی کوشش کی اور فوراً ہی نیند آ گئی تھی، شام کو آنکھ کھلی تو بدن پر کسل مندی طاری تھی۔ اسٹوو نکالا اور کوفی تیار کرنے لگا، اسٹون برادرز کی مہربانیوں سے کم از کم یہ سارے انتظامات جیپ میں کر دیے گئے تھے، کوفی نے اس وقت مزہ ہی دے دیا، یوں لگا جیسے بدن سے ساری تھکن دور ہو گئی ہو اس کے ساتھ ہی شاہ زیب نے کھانے پینے کی چیزیں بھی لی تھیں، تاکہ عارضی طور پر بھوک ختم ہو جائے، اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ یہاں سے آگے بڑھا جائے یا رات یہیں گزاری جائے، طبیعت کی کسل مندی نے اس کی اجازت نہ دی کہ اس وقت یہاں سے کہیں آگے بڑھا جائے ویسے بھی یہ بہتر جگہ تھی اور پورا دن گزرنے کے باوجود کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا، اس وقت بھی آرام کر لیا جائے تاکہ کل صبح پورا دن سفر کرنے کے لیے طبیعت ہشاش بشاش ہو، جیپ سے اتر کر کافی دور تک پیدل چلتا ہوا اطراف کے مناظر دیکھتا رہا اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ رات کی تاریکیاں خطرناک تو نہیں ثابت ہوں گی، بظاہر اس کے امکانات نظر نہیں آ رہے تھے۔

شاہ زیب ٹھنڈی سانس لے کر درختوں کے نیچے پڑی ہوئی خشک لکڑیاں جمع کرنے لگا۔ شاید اس کا ارادہ آگ روشن کرنے کا تھا، آسمان پر بادل گھرے ہوتے جا رہے تھے، اگر بارش ہوئی تو اس کے لیے کیا کیا جائے، اس نے سوچا اور پھر گردن جھٹک کر رہ گیا، اور پھر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا، رات کے تقریباً آٹھ بجے ہوں گے کہ درختوں کے پتوں سے ہلکی ہلکی بوندیں چھننے لگیں۔ شاہ زیب نے اپنے لیے کوفی بنائی اور بسکٹ کا ڈبہ لے کر جیپ میں آ بیٹھا، کوفی واقعی اس موسم میں مزہ دے گئی تھی۔ پھر رات کے تقریباً بارہ بجے ہوں گے جب شاہ زیب سونے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن چونکہ دن میں خوب سویا تھا اس لیے آنکھوں میں نیند نہیں تھی، وہ بارش کی ننھی پھوار سے لطف اندوز

ہو رہا تھا، لیکن تنہائی ویرانی بے سروسامانی بے بسی کا ایک احساس پیش کر رہی تھی، دفعتاً ہی شاہ زیب کو گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی اور وہ اچھل کر بیٹھ گیا، یہ آواز سماعت کا واہمہ تو نہیں تھی۔

شاہ زیب نے فوراً ہی جیپ سے اترنے کے بعد ایک بلند جگہ کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا، اسی وقت دوبارہ آواز سنائی دی اور تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر کچھ ہلچل سی بھی محسوس ہوئی شاہ زیب سراسیمہ نگاہوں سے اس طرف دیکھتا رہا، کیا کچھ لوگ ادھر آ نکلے ہیں، کیا وہ خطرے میں گھر گیا ہے۔ کافی دیر تک وہ اسی طرح سہما کھڑا اس جگہ نگاہیں جمائے رہا جہاں اب بھی درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس کچھ چیزیں ہلتی جلتی نظر آ رہی تھیں، ہوسکتا ہے وہاں کسی اور گروہ نے قیام کیا ہو، صحرائے اعظم میں تو اس قسم کے لوگ آتے جاتے ہی رہتے ہیں، ہوسکتا ہے یہ کوئی ایسی پارٹی نہ ہو جو شاہ زیب کو پہچانتی ہو۔

ایک بار پھر گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی اور اب شاہ زیب کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ اس آواز سے دور رہے، چنانچہ اس نے ہمت کی اور اس آواز کی جانب چل پڑا۔ لیکن اس پر ایک دہشت سوار تھی اور ہلکی ہلکی کپکپاہٹ کا بھی احساس ہو رہا تھا، آگے بڑھ کر اندازہ ہوا کہ بارش اتنی بھی کم نہیں ہے۔ ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے اس جگہ پہنچ گیا جہاں سیاہ رنگ کا ایک قدآور گھوڑا ایک درخت سے بندھا ہوا تھا۔ آس پاس کچھ بھی نہیں تھا، شاہ زیب نے حیرت زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا یہ کوئی گروہ نہیں بلکہ ایک فرد تھا یا شاید صرف ایک گھوڑا جسے باندھنے کے بعد کہیں چلا گیا تھا۔ آس پاس نگاہیں دوڑائیں، لیکن کوئی نظر نہیں آیا، پھر گھوڑے کے عقبی حصے میں ایک گھنے اور چوڑے درخت کے پیچھے سے کچھ سرسراہٹیں سنائی دیں اور وہ اچھل پڑا۔ اس نے ہمت کی اور درخت کے عقب میں پہنچ گیا، درخت کے تنے کے ساتھ کوئی دراز تھا اور گٹھری بنا ہوا تھا، لیکن شاہ زیب نے رات کی تاریکی کی عادی آنکھوں سے اس وجود کو دیکھا اور اس وجود کے لمبے لمبے سیاہ بال شاہ زیب کو نظر آ گئے۔

دوسرے ہی لمحے شاہ زیب شدت حیرت سے اچھل پڑا تھا، شاہ زیب اس لڑکی کو اچھی طرح پہچانتا تھا یہ وہی وحشی لڑکی تھی جس کے ساتھ اس نے طویل سفر کیا تھا، اس سے کچھ فاصلے پر کینوس کا تھیلا اور تھیلے کے نزدیک ایک اعلیٰ درجے کی سب مشین گن پڑی ہوئی تھی۔ شاہ زیب حیران رہ گیا، اس کے دل میں ایک لمحے کے لیے خوشی کی ایک لہر بھی اٹھی لیکن پھر معدوم ہوگئی، نجانے یہ خوشی اس کے مل جانے کی تھی یا تنہائی دور ہونے کی، پتا نہیں کیا تھا، بہرطور شاہ زیب تیزی سے اس کے قریب پہنچ گیا، اس جیسی عجیب و غریب عورت کا اس طرح پڑے رہنا تعجب خیز بات تھی، شاہ زیب اس کے نزدیک بیٹھ گیا اور پھر اس نے آہستگی سے لڑکی کے بازو پر ہاتھ رکھا، وہ بجلی کی طرح تڑپ گئی تھی، اس نے بے اختیارانہ انداز میں اٹھ کر فوراً سب مشین گن پر ہاتھ مارا لیکن شاہ زیب نے آگے بڑھ کر گن اٹھالی اور پیچھے ہٹ گیا۔

''میں شاہ زیب ہوں لڑکی، تمہارا دوست، اگر پہچان سکتی ہو تو مجھے پہچانو، میں وہی ہوں جس کا تم سے ساتھ رہ چکا ہے، شاہ زیب ہے میرا نام، اس وقت میں گرفتار ہو گیا تھا جب تم دلدل عبور کر کے اسٹون برادرز کے چنگل سے نکل گئی تھیں۔''

لڑکی کی جدوجہد ایک دم ماند پڑ گئی، وہ ابھی تک کھڑی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے درخت کے تنے کا سہارا لے کر کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن ایک جانب لڑھک گئی اور شاہ زیب نے کچھ جانے بوجھے بغیر برق رفتاری سے آگے بڑھ کر اسے گرنے سے بچایا، شاہ زیب نے ایک لمحے کے لیے بازو کو ہاتھ لگایا تھا تبھی یہ احساس ہوا تھا کہ اس کا بازو کچھ گرم ہے، لیکن اب جبکہ شاہ زیب نے اس کے بدن کو سنبھالا تو اسے احساس ہوا کہ لڑکی کا بدن تو بھٹی کی طرح تپ رہا ہے۔ شاہ زیب نے ہمدردی سے اس کے بدن کو سہارا دے کر درخت کے نیچے بٹھا دیا اور تشویش سے بولا۔

''تمہیں تو بخار ہے ایک منٹ میں تمہارے لیے بندوبست کرتا ہوں، مگر براہ کرم میرا انتظار کرنا۔ اس کے بعد

شاہ زیب برق رفتاری سے دوڑتا ہوا جیپ کے قریب پہنچ گیا اور پھر جیپ اسٹارٹ کر کے یہاں لے آیا، لڑکی اسی طرح بیٹھی ہوئی تھی، گھوڑا پانی سے بھیگ رہا تھا جس کی وجہ سے تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفے کے بعد ہنہنانے لگتا تھا، لیکن ابھی اس کی جانب کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ شاہ زیب نے جیپ حتیٰ الامکان ایسی جگہ کھڑی کی تاکہ وہ بارش سے کافی حد تک محفوظ رہے اور اس کے بعد لڑکی کے پاس آ گیا، پھر اس نے لڑکی کو اٹھایا اور جیپ تک آ گیا، پھر اس نے لڑکی کو جیپ کی اگلی سیٹ پر لٹا دیا اور جو کچھ اوڑھنے کے لیے اس کے پاس موجود تھا اس سے اس کے بدن کو ڈھک دیا، پھر اس نے پھرتی سے اسٹوو نکالا، بچی ہوئی کوفی پی چکا تھا اس لیے نئی کوفی بنائی اور اسے پیالی میں ڈال کر ایک بار پھر لڑکی کے نزدیک پہنچ گیا، کوفی کی سوندھی سوندھی خوشبو بارش کی ننھی ننھی بوندوں کے ساتھ ایک عجیب ہی لطف دے رہی تھی۔ شاہ زیب نے اپنے لیے کوفی نہیں نکالی تھی، بس سہارا دے کر اسے بٹھایا اور اپنے ہاتھ سے اسے گھونٹ گھونٹ کوفی پلانے لگا۔

کوفی پینے کے بعد اس نے لیٹ جانے کی خواہش ظاہر کی اور شاہ زیب نے اسے لٹا دیا، شاہ زیب کا ذہن عجیب و غریب احساسات کا شکار تھا، اس کا یہ تعاون کچھ ایسی دلکشی کا حامل تھا جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا، بس یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے شاہ زیب پر مکمل بھروسہ کر لیا ہو، حالانکہ شاہ زیب نے اس آتشی لڑکی کو ایک غیر انسانی مخلوق کی سی کیفیت میں پایا تھا، خاص طور سے وہ لمحات جب وہ ہولناک دلدل دوڑ کر عبور کر گئی تھی۔ یہ کوئی انسانی کارنامہ نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن اس وقت وہ لڑکی شاہ زیب کی پناہ میں تھی۔

شاہ زیب نے محسوس کیا کہ یا تو اس پر غشی کی کیفیت طاری ہے یا پھر وہ سو گئی ہے، شاہ زیب بے آواز جیپ سے نیچے اترا اور اس کے گھوڑ کی رسی کھول کر اسے بھی ایک ایسی جگہ باندھ دیا جہاں وہ پانی سے محفوظ رہے اور اس کے بعد جیپ سے کی اگلی سیٹ پر آ بیٹھا، شاہ زیب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کے لیے کیا کرے، وہ سوچتا رہا، پھر نجانے کب آنکھوں میں نیند گھر کر گئی تھی۔

☆......☆......☆

صبح کو جب سورج کی کرنوں نے گدگدایا تو شاہ زیب کی آنکھ کھل گئی، چند لمحات تک تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا اس کے بعد جب گزری ہوئی رات کے واقعات یاد آئے تو وہ اچھل کر بیٹھ گیا، لڑکی پچھلی سیٹ پر کمبل لپیٹے نیم دراز کی کیفیت میں تھی۔ اس کی بڑی بڑی حسین آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ہونٹ خشک تھے۔ شاہ زیب نے جاگ کر اسے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں ممنونیت کے آثار ابھر آئے، وہ دھیرے سے مسکرائی بھی تھی، شاہ زیب ہڑبڑا کر سیدھا ہو گیا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر شیرون کا ہاتھ چھو کر دیکھا، بخار اب بھی خوب تیز تھا، لیکن اس کی کیفیت پہلے سے بہت بہتر نظر آ رہی تھی۔ شاہ زیب نے ایک تولیہ بھگو کر اس کی آنکھیں اور چہرہ صاف کیا لڑکی نے کوئی مداخلت نہیں تھی۔ بس وہ میٹھی میٹھی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھتی رہی تھی، پھر شاہ زیب نے اسے کلی کے لیے پانی پیش کیا۔ اس دوران شاہ زیب نے کوفی کا پانی چڑھا دیا تھا۔ بسکٹوں کے دو ڈبے کھول کر شیرون کے سامنے رکھے اور پھر اسے کوفی بنا کر دی، کوفی کی دوسری پیالی وہ خود لے کر بیٹھ گیا تھا۔

''پتا نہیں، اسے اپنی بدقسمتی کہوں یا ستم ظریفی کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوسکتی، میں اس بات سے بہت بددل ہوں۔''

اس نے بسکٹ اٹھایا اور اسے اپنے تیز سفید چمکیلے دانتوں سے کاٹنے لگی، پھر کوفی کا ایک گھونٹ لے کر اس نے بڑے آسودہ انداز میں شاہ زیب کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں بول رہی تھیں۔ بسکٹ بھی اس نے اچھی خاصی مقدار میں کھا لیے تھے، پھر اس نے کوفی کی پیالی شاہ زیب کی جانب بڑھا دی، اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے اور کوفی دی جائے۔ شاہ زیب نے اس کی یہ خواہش جلدی سے پوری کر دی، پھر یہ ہلکا پھلکا ناشتا ختم ہو گیا تھا، وہ آہستہ سے اپنی جگہ سے کھسکی اس نے کمبل اتارا اور اپنا داہنا پاؤں شاہ زیب کے سامنے کر دیا، ایک لمحے کے لیے اس کی سمجھ میں

کچھ نہیں آیا تھا، لیکن پھر دوسرے لمحے شاہ زیب نے اس کے پھٹے ہوئے لباس سے جھانکتے ہوئے اس کے زخم کو دیکھ لیا جو تقریباً دس انچ لمبا اور کافی گہرا تھا۔

شاہ زیب اس زخم کو دیکھ کر اچھل پڑا اور اس کے بدن میں جھرجھری سی آگئی۔ تبھی لڑکی نے ایک ہاتھ اوپر اٹھایا اور اپنی پشت شاہ زیب کے سامنے کر دی۔ اس کی پشت پر ایک ایسا ہی بڑا زخم تھا، شاہ زیب واقعی اس وقت عجیب و غریب کیفیت کا شکار ہو گیا تھا، ان بڑے زخموں کے باوجود اس کے اندر کتنا سکون پایا جاتا تھا، جبکہ دوسرا کوئی ہوتا تو شاید ساری رات ہی درد و تکلیف سے تڑپتا رہتا، شاہ زیب بھی بہت متاثر ہو گیا تھا، شاہ زیب نے بے اختیار کہا۔

''اوہ... بیوقوف لڑکی، تم نے مجھے پہلے یہ زخم کیوں نہیں دکھائے؟''

اس کے بعد شاہ زیب مصروف عمل ہو گیا، اس نے پانی تیز گرم کیا اور اس کے بعد فرسٹ ایڈ بکس میں سے جو کچھ بھی سامان تھا نکالا اور پھر لڑکی کو سہارا دے کر جیپ میں بٹھا دیا اور پانی لے کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے زخم کو صاف کرتے ہوئے کئی بار شاہ زیب کے بدن میں پھریریاں سی اٹھی تھیں۔ وہ بھی بڑی اپنائیت سے اپنے زخم صاف کروا رہی تھی، شاہ زیب نے ان زخموں کو صاف کر کے ان پر مرہم لگایا اور پھر بینڈیج کر دی، اس سے زیادہ کٹھن مسئلہ اس کی پشت کے زخم کا تھا۔ شاہ زیب نے اس کی نگاہوں سے مسکراہٹ دیکھی تھی، غالباً وہ یہاں شاہ زیب کا امتحان لینا چاہتی تھی۔ شاہ زیب نے اس کی نگاہوں کو پڑھ لیا اور خود بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، پھر شاہ زیب نہایت بے باکی سے اس کی پشت کو فطری لباس میں لے آیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

ان تمام کاموں سے فارغ ہو کر شاہ زیب جیپ کی اگلی سیٹ پر آ بیٹھا۔ شیرون کی آنکھوں میں ممنونیت تھی۔ شاہ زیب نے دل میں سوچا کہ جب تک شیرون کی حالت بہتر نہیں ہو جاتی اس کا آگے کا سفر بے مقصد ہے۔ جہاں تک ہالک اور ایرا کا تعلق تھا تو شاہ زیب ان پر تو فاتحہ پڑھ چکا تھا۔

☆......☆......☆

شیرون کی حالت کافی بہتر نظر آ رہی تھی، اس نے بھی یہاں سے آگے بڑھنے پر اصرار نہیں کیا۔ شاہ زیب نے شام کو اسے جیپ سے اتارا اور سہارا دے کر تھوڑی دور تک لے گیا۔ لیکن پاؤں کے زخم کی وجہ سے وہ باآسانی چل نہیں پا رہی تھی، تھوڑی دیر کے بعد شاہ زیب نے پھر اسے اس کی جگہ بٹھا دیا، سب مشین گن جیپ میں ہی رکھ لی تھی، اس سے پہلے شیرون کے پاس یہ مشین گن نہیں تھی، نجانے اس نے اسے کہاں سے حاصل کیا تھا، بہترین ساخت کی گن تھی، شاہ زیب کو تو اس کا استعمال بھی نہیں آتا تھا۔ پھر اس نے ایک جگہ سے ایک تھیلا نکالا۔ اس کے تھیلے میں بھی کافی غذائی اشیاء موجود تھیں جنہیں اس نے خود نکال کر شاہ زیب کے سامنے رکھ دیا تھا۔ سب مشین گن کا ایمونیشن بھی تھا، کوئی پستول وغیرہ نہیں تھا۔ شاہ زیب نے اندازہ لگا لیا کہ شیرون کی حالت بہتر ہونے میں کئی دن لگ جائیں گے، چنانچہ شکار کی بھی اشد ضرورت تھی اور یہ ان کی خوش بختی ہی تھی کہ اس شام شکار بھی مل گیا۔

دوسرے دن، اس نے پھر شیرون کی پٹی تبدیل کی اور اس کے زخموں کو حیرت انگیز طور پر بھرتے ہوئے محسوس کیا، پھر تیسرا دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ چوتھے دن شیرون جیپ سے نیچے اتر آئی اور کافی دور تک پیدل چلتی رہی، اس دوران ان دونوں کے درمیان کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی تھی، شیرون کے انداز میں اب پہلے جیسی وحشت نظر نہیں آتی تھی، البتہ وہ اپنے اطراف سے پوری طرح چوکنا تھی، شاہ زیب نے پہلے کے ساتھ میں اس عجیب و غریب لڑکی کے اندر ایک وحشت سی پائی تھی، بے شک وہ اپنے مشن کی تکمیل کر رہی تھی، لیکن اس کی شخصیت سے واقف ہونے کے بعد اس کا زیادہ گہری نگاہوں سے جائزہ لینے لگا تھا، شیرون نے اشاروں کی زبان میں شاہ زیب کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا تھا، جواب میں شاہ زیب نے کہا۔

''تمہارا زخم اور بہتر ہو جائے تو ہم زیادہ آسانی سے آگے کا سفر طے کر سکتے ہیں۔'' اس نے گردن ہلاتے ہوئے دونوں ہاتھ شاہ زیب کے سامنے کر دیے، مطلب یہ تھا کہ اب وہ اس سفر کے لیے بالکل تیار ہے، شاہ زیب

نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

''بہتر ہے کہ ایک آدھ دن اور یہاں گزار لیا جائے ویسے تم سے کچھ باتیں بھی کرنا چاہتا ہوں۔'' شیرون نے غالباً بات تسلیم کر لی تھی، پھر وہ سوالیہ نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھنے لگی۔

''ایک بات بتاؤ، کیا تم لکھ کر گفتگو نہیں کر سکتیں؟''

جواب میں شیرون نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''خیر یہ بات میں تسلیم نہیں کر رہا کیونکہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ میری ملاقات مسٹر گرج سے ہو چکی ہے۔'' شیرون نے سپاٹ نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا، لیکن شاہ زیب کی باریک نگاہوں نے اس کے چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا، شاہ زیب نے آہستہ سے کہا۔

''میں تمہاری مرضی کے خلاف کچھ کہنے یا کرنے کے لیے مجبور نہیں کروں گا، بس اپنے بارے میں بتانا چاہتا ہوں، اس دن جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تو میرے ذہن میں تمہارے لیے ایک عجیب سا تصور پیدا ہو گیا تھا، میری تم سے دوسری ملاقات ہوئی اور پھر ہم لوگ ایک مختصر وقت ایک دوسرے کے ساتھ رہے، پھر اسٹون برادرز نے تم پر قابو پانے کی کوشش کی، لیکن تم وہاں سے نکل گئیں اور میں ان کے قبضے میں آ گیا، میرے لیے بڑا مشکل مرحلہ پیدا ہو گیا تھا، لیکن ظاہر ہے میں ان تمام معاملات سے کوئی واقفیت نہیں رکھتا تھا، مجھے بڑی مشکل سے اپنی پوزیشن صاف کرنی پڑی اور آخر اسٹون برادرز نے مجھے قبول کر لیا، میں تمہارے سامنے چند حیرت انگیز انکشاف کر رہا ہوں، شیرون لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا میں تم سے جھوٹ نہیں بول رہا اور نہ ہی مجھے ان تمام معاملات سے کوئی دلچسپی ہے۔ اسٹون برادرز کے درمیان میری حیثیت بے مقصدی ہو کر رہ گئی تھی، انہوں نے مجھے پیشکش بھی کی کہ اگر میں چاہوں تو وہ مجھے صحرائے اعظم سے باہر بھجوانے کا بندوبست بھی کر سکتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت میں نے ان کا یہ فیصلہ قبول نہ کر کے سخت غلطی کی تھی۔ مجھے کسی خزانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے شیرون، میری ساری زندگی میں لاتعداد خزانے بکھرے پڑے ہیں اور میں اگر دنیا کا سب سے بڑا خزانہ بھی حاصل کر لوں تو یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس سے مجھے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا، خزانہ کسی اور کی تحویل میں چلا جائے گا اور میں اسی طرح بھٹکتا پھروں گا، ہاں یہ میری تقدیر ہے، بات اسٹون برادرز کی ہو رہی تھی، انہی کے کیمپ میں مجھے مسٹر گرج ملے جن کے ساتھ ان کی بیٹی سونارا بھی تھی، مسٹر گرن نے مجھ سے خفیہ ملاقات کر کے تمہاری کہانی سنائی، قبیلے کے بارے میں بتایا اور تمام تفصیلات ذہن نشین کرا کے مجھے پیشکش کی کہ اگر میں خزانے کے حصول میں دلچسپی رکھتا ہوں تو مسٹر گرج کی مدد کروں تو وہ مجھے اس خزانے کا بہت بڑا حصہ پیش کرنے کے لیے تیار ہیں۔ میں کسی سے تعاون نہیں کرنا چاہتا تھا شیرون، میری خواہش تو صرف یہی تھی کہ کسی طرح اس مصیبت سے چھٹکارہ مل جائے اور میں صحرائے اعظم سے واپس چلا جاؤں، اسٹون برادرز نے مجھے جو پیشکش کی تھی وہ یہ تھی کہ میں ان کے درمیان سے فرار ہو جاؤں دراصل کچھ لوگ ان کے قبضے میں آئے تھے جو صحرائے اعظم میں بھٹک رہے تھے اور شدت بھوک سے پریشان ہو کر اسٹون برادرز پر حملہ آور ہوئے تھے ان میں بے شمار مارے گئے اور چند گرفتار ہونے والوں نے بتایا کہ انہوں نے شیرون کو اسٹون برادرز کے گروپ کے آس پاس بھٹکتے دیکھا ہے، بس اسٹون برادرز نے یہ فیصلہ کیا کہ تمہیں میرے ذریعے گرفتار کر لیا جائے یا ہلاک کر دیا جائے۔''

شیرون نے چونک کر شاہ زیب کی طرف دیکھا اور شاہ زیب نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں اور میں نے ان سے یہ وعدہ کر کے وہاں سے نکلا تھا کہ میں شیرون کو ان کی گرفت میں دے دوں گا، تو شیرون، میرے لیے فرار کا ایک ڈرامہ رچایا گیا اور یہ جیپ تیار کر کے مجھے دے دی گئی، بس میں ان صحراؤں میں نکل آیا، لیکن میرا مقصد یہی تھا کہ میں صحرائے اعظم سے نکل جاؤں، مجھے کسی خزانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، یہ میں اب بھی کہہ رہا ہوں، تمہاری مدد بھی اسی قدر کرنا چاہتا ہوں کہ ٹھیک ہو کر تم اپنی منزل سے جا لگو تو مجھے خوشی ہو گی،

آتش فشانی اور زلزلے نے مجھے بدحواس کر دیا، بالآخر بچتا بچاتا یہاں تک نکل آیا اور تم اتفاق سے پھر میرے نزدیک آ گئیں۔ شیرون میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں، تمہیں اس آدھے نقشے کی تلاش ہے نا جو اسٹون برادرز کے پاس ہے اور یہ نقشہ بہرطور اسٹون برادرز کے پاس ہی محفوظ ہے، لیکن اگر تم قبیلے کے راستے کے بارے میں جاننا چاہتی ہو تو میں اس راستے کے سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں کیونکہ مسٹر گرج نے مجھے وہ تمام تفصیلات بتا دی ہیں۔ وہاں تک کا راستہ ان کے ذہن میں محفوظ تھا۔ اگر تم چاہو تو ان راستوں کی تفصیلات مجھ سے معلوم کر سکتی ہو اور اس کے جواب میں تمہیں میری صرف اس قدر مدد کرنا ہو گی کہ مجھے افریقہ سے باہر نکلنے کا راستہ بتا دو۔ بولو کیا یہ سودا کرنے پر تیار ہو؟''

شیرون کے چہرے پر اضطراب کی لہریں نمایاں ہو رہی تھیں، وہ عجیب سی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھتی رہی، پھر اپنی جگہ سے کھسکی، آگے بڑھی اور شاہ زیب کا بازو پکڑ لیا، پھر اپنا سر شاہ زیب کے کندھے سے ٹکا دیا، یہ عجیب سا اظہار تھا جس کا مفہوم شاہ زیب کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ شیرون کئی منٹ تک شاہ زیب کے کندھے سے ٹکی رہی، پھر اس نے زور زور سے شاہ زیب کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے گردن ہلائی اور وہ اس کی کیفیت سمجھنے کی کوشش کرنے لگا، پھر شاہ زیب نے اس کی کیفیت کچھ کچھ سمجھتے ہوئے کہا۔

''کیا تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے ساتھ رہوں؟'' شیرون نے زور زور سے گردن ہلا دی تھی، اس وقت وہ ایک معصوم سی لڑکی لگ رہی تھی، یقین نہیں آتا تھا کہ صحرائے اعظم میں تنہا بھٹکنے والی روح کی مانند یہ لڑکی اتنی معصوم ہو سکتی ہے، اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔

''دیکھو شیرون، مجھے کسی خزانے کی ضرورت نہیں، میں تمہیں یقین دلا رہا ہوں کہ مجھے ان تمام چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، میں تو دنیا کا کوئی پرسکون گوشہ اپنے لیے چاہتا ہوں، جہاں میں اپنی زندگی سکون سے بسر کر سکوں، خزانے مجھے راس نہیں آتے شیرون مجھے خزانے نہیں چاہیے ہیں۔ اگر تم اس طرح میرا ساتھ چاہتی ہو تو چلو صحرائے اعظم سے باہر چلتے ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم نے پسند کیا تو میں بقیا زندگی تمہارے ساتھ بسر کر لوں گا''

اس نے شاہ زیب کے کندھے سے چہرہ ہٹا کر اسے دیکھا پھر دوبارہ اس کے کندھے سے ٹک گئی۔ اس کی آنکھیں اور انداز کہہ رہے تھے کہ وہ اس بات پر بضد ہے کہ اس مرحلے پر شاہ زیب اس کا ساتھ دے۔ شاہ زیب کے لیے کشمکش کے لحات پیدا ہو گئے تھے، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، ویسے بھی صحرائے اعظم سے نکلنا ایک موہوم سا تصور تھا۔ یقین سے کہا جا سکتا تھا کہ یہ مرحلہ کیسے طے ہو گا، اس کی ملتجی آنکھیں نم ہو گئی تھیں، شاہ زیب نے بے بسی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''تم وہ کام کرنے کے لیے کہہ رہی ہو مجھ سے جو میرا ذہن کسی طور قبول نہیں کر رہا، تاہم اس مجبوری کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتا کہ مجھے صحرائے اعظم سے باہر جانے کے آسان راستے معلوم نہیں، تم اگر یہی چاہتی ہو تو ٹھیک ہے۔''

شیرون ایک دم خوش ہو گئی اور اس خوشی کا اظہار بھی اس نے غم کے اظہار کی مانند ہی کیا بہرطور شاہ زیب نے ایک بار پھر خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ وہ اور کر بھی کیا کر سکتا تھا۔

شیرون کو اس کے فیصلے کا اندازہ ہو گیا تھا اور وہ بہت خوش تھی۔ ان لوگوں نے مزید ایک دن وہیں گزارا اس کے انداز میں اپنائیت پیدا ہو گئی تھی اور جب بھی وہ شاہ زیب سے کچھ فاصلے پر ہوتی، عجیب سی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھتی رہتی، اس دن صبح شیرون نے خود ہی یہاں سے آگے بڑھنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ بکھرا ہوا سامان سمیٹا گیا، گھوڑے کی لگام اس نے جیپ کے عقبی حصے میں باندھ دیں، شاہ زیب اس کی یہ تیاریاں دیکھ رہا تھا، پھر اس کے بعد اس نے شاہ زیب کا بازو پکڑ کر اسے اسٹیرنگ پر بٹھا دیا اور انگلی سے ایک سمت اشارہ کر دیا، مطلب یہی تھا کہ اس سمت سفر کیا جائے۔ شاہ زیب نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی تھی۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد فیول بتانے والی سوئی نے اشارہ کیا کہ پیٹرول ختم ہونے والا ہے، شاہ زیب نے آخری بیرل کھول کر پیٹرول کا ٹینک فل کر دیا اور خالی بیرل ایک جگہ پھینک دیا، پیٹرول کے ذخیرے کا یہ آخری بیرل تھا اور اس کے بعد جیپ سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ شیرون نے اپنا گھوڑا ساتھ رکھا تھا اور غالباً وہ بھی اس سلسلے میں غور کر رہی تھی۔ یہ سفر چار بجے تک جاری رہا اور اچھا خاصا فاصلہ طے ہو گیا، شام کو جس جگہ قیام کیا گیا وہ بھی بہت دلکش تھی، چاروں طرف سبزہ زار پھیلے ہوئے تھے۔ درختوں کے سلسلے بھی طویل ترین تھے، کھانے پینے کا بندوبست کیا گیا، درختوں میں ایک خاص قسم کے پھل لٹکے ہوئے تھے جن کا جائزہ لیا گیا اور پھر ان پھلوں کا ذخیرہ کر لیا گیا۔ اس وقت تو کھانے پینے کی ہر چیز کی ضرورت تھی۔ شیرون کافی خوش نظر آ رہی تھی، اس کے زخم بالکل ٹھیک تو نہیں ہوئے تھے لیکن بھر چکے تھے اور ان پر تیزی سے کھال آتی جا رہی تھی، یہ غالباً اس کی قوت مدافعت کا کرشمہ تھا کہ اتنے گہرے زخموں سے اس نے اتنی جلدی نجات حاصل کر لی تھی۔ شام کو وہ ایک جگہ زمین پر بیٹھ کر پتھر سے زمین پر نشانات بنانے لگی، اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا نقشہ بھی زمین پر پھیلا لیا تھا، اب اسے شاہ زیب سے کسی قسم کا اجتناب نہیں تھا، وہ نقشے کے مطابق شاہ زیب کو راستے سمجھاتی رہی اور شاہ زیب نے اطراف میں دیکھتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا کہ شیرون صحیح راستوں پر سفر کر رہی ہے، مسٹر گرج نے جو نقشہ شاہ زیب کو ذہن نشین کرایا تھا اس کے نشانات بھی مل رہے تھے۔

جنگلوں کا یہ سلسلہ عبور کر کے انہیں دوسری جانب جانا تھا۔ شیرون اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر کچھ سوچنے لگی۔ پھر اس نے اشاروں میں کچھ کہنا چاہا جو کوشش کے باوجود بھی شاہ زیب کی سمجھ میں نہیں آیا تھا، اس نے شاہ زیب کو اشاروں میں بتایا کہ جیپ ان پہاڑوں پر سفر نہیں کر سکے گی اور وہ اتنی چڑھائی نہیں چڑھ سکے گی، شاہ زیب نے اب اس کی بات سمجھ لی تھی۔ اس نے دونوں شانے ہلاتے ہوئے کہا کہ وہ اس کے لیے کیا کر سکتا ہے۔ وہ چاروں طرف دیکھنے لگی اور اس کے بعد اس نے کچھ سوچ کر گھوڑے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ شاہ زیب سمجھ نہیں پایا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ لیکن دوسرے لمحے وہ گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر ہوا ہو گئی تھی، ایک لمحے کے لیے شاہ زیب کا دل دھک سے رہ گیا، یہ کیا ہوا، کیا شیرون نے اسے یہاں تنہا چھوڑ دیا۔ لیکن یہ امید نہیں تھی اس سے، جس طرح وہ متاثر ہو گئی تھی اور جس طرح اب تک اس نے شاہ زیب کے ساتھ تعاون کیا تھا اس کے بعد اس بات کے امکانات نہیں تھے کہ وہ اس طرح شاہ زیب کو چھوڑ کر فرار ہو جائے گی لیکن شاہ زیب کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی، پھر وہ اس وقت واپس آئی جب خوب اندھیرا پھیل گیا مگر اس دوران شاہ زیب کا آدھے سے زیادہ خون خشک ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے، وہ گھوڑے سے اتر کر جیپ میں آ لیٹی، کافی دیر تک اس نے شاہ زیب سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ رات کو تقریباً ساڑھے آٹھ یا نو بجے ان لوگوں نے ہلکا پھلکا سا کھانا کھایا، شیرون نے ایک جگہ بنائی اور دراز ہو گئی۔ شاہ زیب اس سے کچھ فاصلے پر ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، پھر نیند آنے لگی اور شاہ زیب ایک مناسب جگہ دیکھ کر دراز ہو گیا۔ ماحول پر خنکی سی چھا گئی تھی، یہ خنکی خوشگوار نہیں تھی، پھر نجانے کس وقت شاہ زیب کو نیند آ گئی تھی۔

آنکھ کھلی تو غالباً کسی احساس کے تحت اور یہ احساس انسانی شکل اختیار کر گیا۔ وہ شیرون ہی تھی جو بہت پہلے کی ایک رات کی مانند جب صحرائے اعظم میں شاہ زیب سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی، شاہ زیب کے نزدیک موجود تھی، اس کی آنکھیں رات کی تاریکی میں بھی چمک رہی تھیں، ان آنکھوں میں ایک کہانی بسی ہوئی تھی، اس کہانی میں زندگی کا حسن ہی حسن بکھرا ہوا تھا تاحد نگاہ گنگناتی وادیاں پھیلی ہوئی تھیں اور شاہ زیب نے شیرون کے ساتھ ان وادیوں کی جانب قدم بڑھا دیے تھے، جب آخری منزل سے گزر گیا تو احساس ہوا کہ وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے اور اس احساس کے بعد شیرون کی محبت زندگی بن گئی۔ اسے شاہ زیب کے وجود میں ایک عجیب مقام حاصل ہو گیا تھا۔ شاہ زیب نے شکست خوردہ نگاہوں سے شیرون کو دیکھا اس کی آنکھوں میں فتح مندی کے آثار تھے، تب شاہ

زیب نے آہستہ سے کہا۔

''شریلڑکی تو نجانے کیا ہے؟''

شاہ زیب کے الفاظ سمجھ کر اس نے مسکرا کر شاہ زیب کے بازوؤں میں گردن چھپائی اور پھر صحرائے اعظم کی ہر شئے شاہ زیب کو بھلی لگنے لگی تھی۔

یہ لوگ سفر کر رہے تھے، لیکن دنیا کی باقی ضروریات سے بے نیاز ہو کر شیرون بھی شاید اپنا مقصد بھول گئی تھی۔ بس وہ شاہ زیب کی ذات میں گم تھی، اور شاہ زیب اس میں پوشیدہ تھا۔

نقشوں کے مطابق ان کی سمتیں وہی تھیں، لیکن اب ان لوگوں کو اپنی منزل تک پہنچنے کی جلدی نہیں تھی، شاہ زیب بھی یہ فیصلہ ترک کر چکا تھا کہ اب فوری طور پر مہذب دنیا تلاش کی جائے۔ شیرون کی خواہش ہی اب شاہ زیب کی خواہش تھی، جنگلوں کا سلسلہ عبور کر لیا گیا اور اس کے بعد یہ لوگ اس وسیع وعریض میدان میں سفر کرنے لگے جس کے انتہائی سروں پر دھندلی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں، راستے میں چونکہ کوئی رکاوٹ نہیں تھی اس لیے میدان کے پہلے سرے سے دوسرے سرے تک دیکھا جا سکتا تھا، لیکن دوسرا سرا آسمان میں پیوست معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس کا فاصلہ اتنا ہی تھا، تاہم ہموار میدان میں جیپ دوڑائی جاتی رہی اور یہ لوگ باآہستگی آگے بڑھنے لگے، بس زندگی کی تمام دلکشی اور دلچسپیاں ان دونوں کو حاصل تھیں، لیکن ایسے لمحات میں طویل سے طویل فاصلے مختصر ہو جاتے ہیں اور انہیں اندازہ بھی نہ ہو سکا کہ یہ لوگ پہاڑیوں کے دامن میں پہنچ گئے ہیں۔

شیرون نے نقشہ نکال کر شاہ زیب کے سامنے کر دیا اور اس پہاڑی سلسلے پر انگلی رکھ دی جو ان کے سامنے موجود تھا، نقشے میں یہ پہاڑیاں پیچ در پیچ دکھائی گئی تھیں، ان کی بہت سی چوٹیاں عقب میں بکھری ہوئی تھیں، غالباً یہ پہاڑی سے اوپر جانے کے بعد ہی معلوم ہو سکتا تھا کہ ان دور سے نظر آنے والی چوٹیوں کا مقصد کیا ہے، لیکن ایک بات کا اندازہ شاہ زیب نے بھی بخوبی لگا لیا تھا وہ یہ کہ جیپ کے ذریعے ان پہاڑیوں کو عبور کرنا ناممکن تھا، ہاں اگر دو گھوڑے ہوتے تو ان دنوں کو بڑی آسانی ہو جاتی، لیکن گھوڑا صرف ایک تھا اور اس کا حل بھی شیرون نے تلاش کر لیا جیپ سے تو یہاں آنے کے بعد چھٹکارہ حاصل ہو چکا تھا ویسے بھی اب پیٹرول زیادہ وقت تک ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔

شاہ زیب نے کسی خیال کے تحت پہاڑیوں میں ایسا کٹاؤ دریافت کر لیا جس میں ایک چٹان چھجے کی طرح جھکی ہوئی تھی اور جیپ کو اس کٹاؤ میں داخل کر دیا تاکہ اگر واپسی میں اس کی ضرورت پیش آ جائے تو یہاں سے اسے حاصل کیا جا سکے۔ اگنیشن کی چابی بھی شاہ زیب نے ایک پتھر کی آڑ میں چھپا دی تھی، شیرون نے جیپ کا وہ تمام سامان جو اہم ضرورت کا حامل تھا، کچھ اپنے تھیلے میں پیک کیا، باقی ایک اور تھیلے میں بھر لیا۔ زیادہ تر یہ کھانے پینے کا سامان تھا، فی الحال اس نے یہ دونوں تھیلے گھوڑے پر بار کیے اور ایسا سامان بھی لے لیا تھا جو اضافی حیثیت رکھتا تھا، جس کی ضرورت کہیں بھی پیش آ سکتی تھی۔

پھر ان لوگوں نے گھوڑے کی لگام پکڑ کر پہاڑیوں کی جانب سفر شروع کر دیا اور رات ڈھلے کافی بلندی پر پہنچ گئے، لیکن ابھی تمام بلندیاں طے نہیں کی گئی تھیں۔ رات کو یہ سفر ملتوی کرنا پڑا اور کھلے آسمان کے نیچے ایک ایسی جگہ منتخب کر لی گئی جہاں قیام کیا جا سکتا تھا۔ گھوڑے کو بھی ایک جگہ محفوظ کر لیا گیا اور پھر باقی رات چاندنی میں انہی روایات کے ساتھ گزری جو شیرون سے بے تکلف ہونے کے بعد ان کی عادت بن چکی تھیں۔

☆......☆......☆

دوسری صبح ضروریات زندگی سے فراغت حاصل کرنے کے بعد سفر دوبارہ شروع کیا گیا۔ راستے میں کچھ علاقے ایسے بھی ملے جہاں گھوڑے تک کے لیے چلنا مشکل تھا، لیکن بہرطور کسی نہ کسی طرح انہیں عبور کر لیا گیا اور اس سلسلے میں شاہ زیب سے زیادہ شیرون کی مہارت قابل ذکر تھی۔ اگر شاہ زیب تنہا ہوتا تو شاید بعض مقامات پر

ہمت ہار بیٹھتا لیکن شیرون اب پوری طرح پرفیکٹ ہوگئی تھی اور اس کے انداز میں کہیں بھی جھجک نظر نہیں آتی تھی۔ مشکل سے مشکل مرحلے کو وہ مسکراتے ہوئے طے کرلیتی تھی اور اس کی معیت میں درحقیقت شاہ زیب کو بھی کچھ نئے تجربات سے روشناس ہونا پڑا تھا، یہاں تک کہ اس شام جب سورج غروب ہونے لگا تو یہ پہاڑی سلسلہ عبور کیا جاچکا تھا اور اوپر پہنچنے کے بعد انہیں اندازہ ہوا کہ نقشے میں دکھائی دینے والی چوٹیاں کیا حیثیت رکھتی ہیں، یہ پہاڑی سلسلہ بہت چوڑائی پر مشتمل تھا، کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے خلاء نظر آجاتے تھے، ورنہ یہ سلسلہ بھی ایک طویل میدان کی طرح پہاڑوں کے اوپر چلا گیا تھا، البتہ یہاں جگہ جگہ چوٹیاں اور چٹانیں ابھری ہوئی تھیں، یہ عجیب و غریب منظر بے حد دلکشی کا حامل تھا، یہ لوگ چاندنی میں سفر کرتے رہے اور جب چاند ڈوبنے لگا تو تھک کر چور ہوگئے اور اس کے بعد یہ لوگ تھک کر ایک جگہ رک گئے تھے، یہی مناسب خیال کیا گیا کہ آرام کیا جائے اور یہ لوگ سوگئے۔

دوسرے دن صبح دس بجے تک یہ لوگ سوتے رہے تھے اور اس کے بعد پہاڑیوں کے اختتام کی جانب سفر کا آغاز کردیا، کیا وسیع وعریض جگہ تھی، ویسے اس علاقے میں سفر کرتے ہوئے ان لوگوں کو کوئی دقت نہیں پیش آئی تھی بلکہ پہاڑیوں کی بلندی پر زمین سے کافی اوپر یہ سفر ان لوگوں کے لیے انتہائی دلچسپ بھی تھا۔ بہرطور اس شام پہاڑیوں کی چوٹیوں کے انتہائی حصے کا سفر مکمل کرلیا گیا اور اب دوسری جانب پھر ڈھلان تھی جس سے اترنے کے بعد نقشے کے مطابق آگے کا سفر کرنا تھا۔ قبیلے کے بارے میں جو کچھ مسٹر گرج نے بتایا تھا اس کی تلاش بھی جاری تھی۔

پھر رات ہوگئی اور انہوں نے حسب معمول ایک جگہ قیام کیا، پھر یہ لوگ اس وقت چونکے جب انہیں اپنے اطراف میں کچھ سرسراہٹیں سنائی دیں۔ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے آس پاس کوئی موجود ہو۔ ابتداء میں تو یہ لوگ سمجھے کہ شاید یہ ہواؤں کا کرشمہ ہے، لیکن جب ہواؤں کے دوش پر انسانی آوازیں ان کے کانوں تک پہنچیں تو انہیں سنبھلنا پڑا۔ شیرون نے تڑپ کر سب مشین گن اٹھالی اور مستعد ہوگئی۔ اس کی آنکھیں چاروں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں اور کان ہوا کی سرسراہٹوں پر لگے ہوئے تھے، چند لمحات کے لیے مکمل خاموشی چھاگئی پھر ایک قہقہہ سا ابھرا اور اس کے ساتھ ہی شیرون کی سب مشین گن قہقہے برسانے لگی۔

گولیاں چٹانوں سے ٹکرا کر ادھر ادھر منتشر ہونے لگیں اور پہاڑیوں کا سناٹا زخمی ہوگیا۔ شیرون نے چند لمحات گولیاں برسائیں اور اس کے بعد پھر جائزہ لینے لگی۔ اس بار آواز دائیں سمت سے آئی تھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے پتھر پر کوئی چیز گھسیٹی گئی ہو۔ شیرون نے پھر گولیوں کی بارش شروع کردی، لیکن یہ سب کچھ مناسب نہیں تھا۔ دفعتاً ہی شیرون نے اپنی جگہ تبدیل کی اور قلابازی سی کھا کر ایک چٹان پر سیدھی لیٹ گئی۔ اس نے ایک لمحے تک آہٹوں کا جائزہ لیا اور اس کے بعد ایک بار پھر اس کی مشین گن گولیاں اگلنے لگی۔

شاہ زیب متوحش نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا، آوازیں بخوبی سن لی گئی تھیں اور یہ آوازیں بے معنی نہیں ہوسکتی تھیں۔ لیکن شیرون کی کوششوں کا نتیجہ ظاہر نہیں ہورہا تھا، وہ ہر آہٹ پر گولیاں برسانے لگتی تھی اور شاہ زیب کے خیال میں یہ مناسب نہیں تھا، پھر ایک لمحے کے لیے خاموشی چھاگئی اور سناٹا ذہن کو مجروح کرنے لگا۔ شیرون اب بھی چاروں طرف دیکھ رہی تھی، لیکن اس کے بعد جیسے قیامت آگئی ہو۔ دفعتاً ہی پہاڑیوں میں گولیوں کا زبردست شور ابھرا اور ان گولیوں نے شاہ زیب اور شیرون کو حصار میں لے لیا۔ ان کے چاروں طرف ایک دائرے کی شکل میں گولیاں برسائی جارہی تھیں اور یہ لوگ ایسی جگہ تھے کہ ان گولیوں کا نشانہ بن سکتے تھے۔ لیکن یوں لگتا تھا جیسے انہیں صرف دھمکی دی جارہی ہو۔ وہ لوگ شاہ زیب اور شیرون کے گرد گولیوں کا حصار قائم کررہے تھے، پتھروں کی کرچیاں اڑ اڑ کر ان کے جسموں پر لگ رہی تھیں۔

(زندگی کے پیچیدہ راستوں میں اپنے ہم شکلوں کی کھوج میں نکلے شاہ زیب کی اگلی منزل کیا ہوگی......؟ جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار کیجیے)



میں کیا کرتا؟



شعبان کھوسہ

اُس شخص کی کہانی جسے ایک شیطانی آتما نے اپنا ہم زاد بنالیا تھا

یہ سچ ہے کہ میں اپنے دوست کا قاتل ہوں۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میرے ہی ریوالور سے نکلی ہوئی چھ گولیوں سے اس کی کھوپڑی میں کئی سوراخ ہوئے ہیں۔ جن سے اس کی موت واقع ہوئی ہے لیکن آپ یقین کریں۔ میں اپنے دوست کا قاتل نہیں ہوں۔ میری اس بات پر ممکن ہے آپ مجھے پاگل سمجھیں۔ لیکن میری روداد سننے اور صحیح حالات کا علم ہونے پر آپ کو میرے بارے میں رائے تبدیل کرنا ہوگی۔ جن ناگزیر حالات میں مجھے اپنے دوست کو گولی مار کر ہلاک کرکے اس کی لاش کو جلانا پڑا ہے۔ اگر ان حالات سے آپ دوچار ہوتے تو یقیناً میری ہی طرح انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہوجاتے۔ اس لیے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ میں نے طاہر کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی انتقامی کارروائی کے تحت اسے گولی ماری ہے۔ طاہر تو میرا عزیز ترین دوست تھا۔ میرے بچپن کا ساتھی اور جوانی کی گلپاش بہاروں کا رازدار تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے چار سال چھوٹا ہونے کے باوجود میرا کلاس فیلو تھا۔ وہ ہر جماعت میں اول آتا اور میں دوم...... کبھی یہی ذہنی ہم آہنگی حقیقت میں ہماری دوستی کی قدر مشترک تھی۔

اُس نے دس برس کی عمر میں پہلا افسانہ لکھ کر ملک بھر میں ادبی حلقوں سے اپنی خداداد صلاحیت کا لوہا منوایا۔ وہ کم گو ہونے کے باوجود نہ صرف اپنے ساتھیوں بلکہ اساتذہ میں بھی فلسفی مشہور ہوگیا۔ مطالعے کا اِس قدر شوق کہ ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتا ہی دکھائی دیتا۔ اسی لیے وہ دوسرے طالب علموں سے الگ تھلگ رہتا۔ کھیل کود سے اسے قطعی دلچسپی نہ تھی اور ویسے بھی جسمانی اعتبار سے وہ بے حد کمزور تھا۔ نیز تنہا اولاد ہونے کے سبب والدین کا بہت لاڈلا تھا۔ ماں باپ کو ہر وقت اسی کا خیال رہتا۔ حتیٰ کہ اگر کبھی اسے کام کے سلسلے میں گھر سے باہر جانا ہوتا تو بوڑھا ملازم اس کے ساتھ بھیجا جاتا۔ اس طرح والدین کی بے پناہ محبت طاہر کی سب سے بڑی کمزوری بن گئی۔ اس کی خود اعتمادی کو شدید جھٹکا لگا۔ وہ آزادی کی کھلی فضا سے خوفزدہ رہنے لگا۔ حیرت کی بات ہے کہ ان حالات میں بھی ہماری دوستی برقرار رہی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ میرے سوا طاہر کا کوئی اور دوست نہ تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ بچپن بیتا، کچھ ساتھی غم روزگار میں بچھڑ گئے۔ کچھ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے۔ طاہر اور میں نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ انہی

دنوں طاہر کے کلام کا پہلا مجموعہ شائع ہوا جسے سراہتے ہوئے طاہر کو اس سال کا ادبی انعام دیا گیا۔ چند ماہ بعد اس کی دوسری کتاب 'بھٹکی روحیں' کے نام سے شائع ہوئی جس سے سارے ملک میں ہنگامہ بپا ہوگیا۔ اس کتاب میں کالے جادو پر سیر حاصل بحث کی گئی تھی۔ ہر شخص حیران تھا کہ طاہر نے اس موضوع پر اتنی چھوٹی عمر میں اس قدر وسیع معلومات کہاں سے اور کیسے حاصل کی ہیں۔ اس وقت طاہر کی عمر سولہ سترہ برس کے لگ بھگ تھی۔

طاہر کی ان تمام خصوصیات اور خداداد قابلیت کے علاوہ اس میں کچھ کمزوریاں بھی تھیں۔ اس کی زندگی میں اِک ٹھہراؤ تھا اور جوان ہونے کے باوجود وہ دوسروں کے سہاروں کی ضرورت شدت سے محسوس کرتا۔ اس کمزوری کی وجہ یقیناً ماں باپ کی حد سے بڑھی ہوئی محبت تھی۔ قوت فیصلہ مفقود تھی اور وہ خود کو زندگی کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کا اہل نہیں سمجھتا تھا۔ ان بنیادی کمزوریوں کے باوجود اس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ اس کا باپ علاقے کا سب سے بڑا زمیندار تھا۔ دولت کی فراوانی تھی۔ جوان ہونے پر جسمانی کمزوری بھی دور ہوگئی۔ وہ بڑا ہی خوبرو نکلا گورا چٹا رنگ، آنکھوں کی رنگت نیلگوں، دراز قد چوڑے شانے اور مضبوط کسرتی بدن، گویا جوان ہونے پر وہ اپنے بچپن سے قطعی مختلف تھا۔ لڑکیوں کے لیے آپ اسے آئیڈیل کہہ سکتے ہیں۔ لیکن آپ کو حیرت ہوگی کہ جوان ہونے پر بھی اس کے جذبات کے سمندر میں کوئی موج نہ اٹھی۔ اس کی ذات میں ایک گھمبیر سکوت تھا جیسے طوفان آنے سے پیشتر ہوا کرتا تھا۔ وہ اتنا شرمیلا تھا کہ جب کوئی لڑکی اس سے بات کرتی تو اس کے پسینے چھوٹ جاتے۔ اس شرمیلے پن اور خود اعتمادی کے سبب وہ کتابوں کا کیڑا بن گیا۔ اور دن رات مطالعے میں منہمک رہنے لگا۔

☆......☆......☆

وقت اپنی رفتار کے مطابق رینگتا رہا۔ عمر بڑھتی گئی اور زندگی گھٹتی گئی۔ میں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ایک فرم میں اکاؤنٹنٹ کی ملازمت اختیار کرلی۔ طاہر بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ اسے ملازمت کی ضرورت نہیں تھی۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ اس کی زندگی کا مقصد حصولِ علم تھا۔ جس کے لیے وہ دن رات کوشاں رہتا۔ اس کے علم اور تجربہ سے



استفادے کی خاطر مہینے میں ایک دو مرتبہ یونیورسٹی کے طلباء کو لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا جاتا۔ طلبا اور اساتذہ سب ہی اس کا احترام کرتے تھے۔ اپنی اس بہترین مصروفیت کے باوجود وہ ہر روز باقاعدگی سے مجھ سے ملنے آیا کرتا تھا۔

دروازے پر دستک دینے کا اس کا مخصوص انداز تھا۔ پہلے تین مرتبہ دروازے پر ہاتھ مارتا، اور پھر تھوڑے وقفے کے بعد دوبارہ دو مرتبہ دستک دیتا۔ ہم دونوں عموماً رات کا کھانا ایک ساتھ ہی کھایا کرتے اور بہت دیر تک بیٹھے گپیں مارا کرتے۔ طاہر کی زندگی میں بس یہ اڑھائی تین گھنٹے کی تفریح کے سوا کوئی قابلِ ذکر بات نہ تھی۔

اٹھائیس برس کی عمر میں وہ بحیثیت شاعر اور ادیب ملک بھر میں مشہور ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی ساری دنیا میں اپنے دور کا عظیم فلسفی بھی گردانا جانے لگا۔ ان دنوں اس کی زندگی میں ایک بڑا ہی اندوہناک واقعہ ہوا۔ یعنی اس کی ماں فوت ہو گئی۔ طاہر کے لیے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی زندگی غیر محفوظ ہو گئی ہو۔ حفاظتی حصار ٹوٹ گیا ہو۔ ماں کی محبت سے محرومی نے اس کی تنہائیوں میں زہر گھول دیا اور اُس کی صحت گرنے لگی۔

باپ نے بیٹے کی یہ ابتر حالت دیکھی تو طاہر کو علاج کے بہانے اپنے ہمراہ ملک سے باہر لے گیا۔ لیکن یورپ کی رنگینیاں بھی اس کی تنہائیوں کو آباد نہ کر سکیں۔ البتہ چھ مہینے بعد چوٹ کی دُکھن میں کمی آ گئی۔ واپسی پر طاہر کے باپ نے اس کی شادی کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اس نے بڑی سختی سے انکار کر دیا۔ میں نے اسے منانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہ مانا۔

پھر ایک دن اس نے خود ہی اپنی ضد کو ختم کر ڈالا۔ کالج کی ایک انتہائی خوبصورت طالبہ شازلی کے نقرئی قہقہے اس کی تنہائیوں میں گونجنے لگے۔ شازلی کی عمر اس وقت انیس برس سے کسی طرح زیادہ نہ تھی۔ وہ خوشبو بن کر طاہر کی زندگی میں داخل ہوئی اور طاہر کے دل و دماغ کو مسحور کر ڈالا۔

شازلی بچپن میں ہی ماں کی ممتا سے محروم ہو گئی تھی۔ اور باپ نے اس کی پرورش کی تھی۔ شازلی کا باپ جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈے کر کے روزی کماتا تھا۔ اس کے بارے میں لوگوں کی رائے کچھ اچھی نہ تھی۔

یہی حال شازلی کا تھا۔ اس کے کلاس فیلو اس سے میل ملاپ رکھنا پسند نہ کرتے۔ کیونکہ کالج میں اس کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ بھی اپنے باپ کی طرح جادوگرنی ہے اور جب کسی طالب علم کو غصے میں ایک نظر دیکھتی ہے تو وہ طالب علم اسی وقت بیمار پڑ جاتا ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ وہ بڑی عجیب و غریب پیش گوئیاں کرتی ہے۔ جن میں آج تک ایک بھی غلط ثابت نہیں ہوئی۔

ایک طالب علم نے اس کے بارے میں سب سے عجیب بات بتائی کہ بعض اوقات وہ کسی طالب علم کو اپنا دوست بنا لیتی ہے تو وہ اپنی شخصیت میں تبدیلی محسوس کرنے لگتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ شازلی نے کبھی کسی لڑکی کو اپنا دوست نہیں بنایا مگر وہ لڑکوں پر ہی مشق ستم کرتی ہے۔ ایک مرتبہ اس نے سب کے سامنے کہا تھا کہ وہ جسمانی اعتبار سے لڑکی ضرور ہے۔ لیکن اس کا دماغ اور محسوسات بالکل مردوں کے سے ہیں اس لیے وہ کسی مرد کے جسم کو اپنا لینا چاہتی ہے۔ شازلی کی اس بات پر سب طالب علم ہنس دیے مگر ایک طالب علم اکبر خوفزدہ ہو گیا۔ اکبر کے کہنے کے مطابق کچھ دن قبل شازلی اسے اپنا دوست بنا چکی تھی۔

☆......☆......☆

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں طاہر میرا دوست ہی نہیں بلکہ ہم ایک دوسرے کے راز دار بھی تھے اپنے نجی معاملات میں بھی ہم آپس میں مشورہ کیا کرتے تھے۔ طاہر نے شازلی سے ملاقات کے چند دن بعد ہی اس بات کا ذکر مجھ سے کیا کہ وہ شازلی پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا ہے۔ ایسے حالات میں میری مخالفت قطعاً بے مقصد بلکہ کشیدگی کا باعث ہو سکتی تھی۔ ویسے بھی میں شازلی کے بارے میں افواہوں پر یقین نہیں رکھتا

تھا۔ ایسی باتیں ضعیف الاعتقادی کے سوا میرے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھیں۔ مجھے شازلی سے متعلق اعتراض ضرور تھا کہ وہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود غیر مہذب، اکھڑ اور گنوار معلوم ہوتی۔ غالباً اس میں شازلی کا قصور بھی نہیں تھا۔ بچپن میں ہی ماں کی ممتا سے محروم ہو جانے کے بعد خود ایک ایسا خلا تھا جو کسی صورت میں پُر نہیں ہو سکتا تھا اور پھر اس کی پرورش بھی ایسے غیر مہذب ماحول میں ہوئی جس میں اس کے طبقے کی اپنی مخصوص روایات اور تہذیبی قدریں تھیں۔

وہ اسی طبقے کی ایک فرد تھی۔ اس اعتبار سے طاہر اور شازلی میں نمایاں فرق تھا۔ اس کے علاوہ عمر میں تضاد بھی کھٹکتا تھا۔ لیکن میں طاہر کے اس معاشقے پر بہت خوش تھا کہ شازلی کے بعد وہ اس معاشرے کا ایک ذمہ دار فرد گردانا جاسکے گا۔ اس کی بے ربط زندگی میں باقاعدگی آجائے گی اور اس کی اُداس تنہائیاں آباد ہو جائیں گی۔ شازلی بہت ذہین تھی۔ وہ یقیناً بہت جلد اپنے آپ کو اس نئے طبقے کے آداب و اخلاق سے ہم آہنگ کرلے گی۔

☆......☆......☆

دوسرے دن طاہر اپنے ہمراہ شازلی کو بھی میرے ہاں لایا۔ اور میں ان دونوں کو دیکھ کر یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ شازلی بھی طاہر کے بغیر خود کو نامکمل تصور کرتی ہے اور دونوں کی محبت میں اگر کسی نے حائل ہونے کی کوشش کی تو وہ دونوں اس رکاوٹ کو زورِ بازو سے اپنی راہ سے ہٹادیں گے۔

میرا اندازہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ طاہر نے اپنے والد کی شدید مخالفت کے باوجود چار ماہ بعد شازلی سے شادی کرلی۔ طاہر جس قدر کمزور قوت ارادی کا مالک تھا۔ شازلی اسی قدر مضبوط قوت ارادی رکھتی تھی۔ اس لیے وہ طاہر کے دل و دماغ پر چھا گئی۔ ماں کی محبت سے محرومی کے بعد طاہر کو شازلی کی قربت نے پُر کردیا اور طاہر ایک بار پھر خود کو اداسیوں اور محرومیوں سے محفوظ سمجھنے لگا۔ اس نے شازلی کے کہنے پر شادی سے چند دن پیشتر اپنے لیے الگ مکان خریدا جسے شازلی نے بڑی محنت اور سلیقہ شعاری سے آراستہ کیا۔ طاہر کے والد نے علیحدہ رہنے کی سختی سے مخالفت کی لیکن ہونے والی بہو کی ضد کے سامنے انہیں بھی ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔

میں نے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے طاہر کے والد کو سمجھایا اور اس طرح دونوں کی شادی بخیر و خوبی انجام پاگئی۔ شادی کے بعد میری اور طاہر کی ہر روز کی ملاقات کے ہم زاد میں دو ماہ کے لیے تبدیلی آگئی۔ اس دوران نہ وہ مجھ سے ملنے آیا اور نہ ہی میں کبھی اس کے ہاں گیا۔

شادی ہر انسان کی زندگی میں اہم تبدیلیاں لانے کا سبب ہوا کرتی ہے اور طاہر کی زندگی میں تو انقلابی تبدیلیاں رونما ہونا میرے لیے غیر متوقع نہ تھا۔ سب سے اہم تبدیلی جو اسے دیکھتے ہی میں نے محسوس کی وہ اس کی مہین مونچھوں کی بجائے کلین شیو تھی۔ یہ یقیناً شازلی کی مہربانی تھی۔

میں نے طاہر سے چھیڑ خانی کی مگر وہ خاموش رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی خاموشی میں سنجیدگی کے بجائے شدید کرب جھلک رہا تھا۔ میں اُلجھن میں پڑ گیا۔ ممکن ہے میرا خیال غلط ہو اور جسے میں کرب سمجھ رہا ہوں۔ وہ سنجیدگی اور خود اعتمادی کے امتزاج کی کیفیت ہو۔ اس کے باوجود میری اُلجھن دُور نہ ہوئی۔ طاہر کا مجھ سے تنہا ملنے آنا بھی تو مشکوک تھا۔ اسے چاہیے تھا کہ اپنے ساتھ شازلی کو بھی لاتا۔ میں اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ طاہر نے دبے لفظوں میں شازلی کی خفیہ قوتوں سے خائف ہونے کا اظہار کیا اور ساتھ ہی شازلی کے رکھے ہوئے تینوں ملازموں سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ میں نے حقیقت معلوم کرنے کے لیے بہت کریدا مگر بات نہ بنی۔

اِس سرسری ملاقات کے بعد تقریباً اڑھائی تین ماہ تک ہماری ملاقات نہ ہوئی حتیٰ کہ ایک شام طاہر نے اپنے مخصوص انداز میں دروازے پر دستک دی۔ اس مرتبہ شازلی اس کے ہمراہ آئی تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر خوشی کے بجائے مجھے بے حد دکھ ہوا۔ طاہر کے چہرے سے تھکن اور اضمحلال کا اظہار ہو رہا تھا اور شازلی کی جوانی بھی بڑھاپے میں ڈھلی ہوئی تھی۔

چہرے پر مہین چھائیوں کا جال اور موٹی موٹی خوبصورت مسکراتی ہوئی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ میرے دریافت کرنے پر طاہر بات ٹال گیا اور میں نے اُس کی نجی زندگی میں مداخلت کو مناسب نہ جانا۔ البتہ یہ ضرور محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے لیکن شازلی کی موجودگی میں نہیں کر سکتا۔ وہ بے حد خوفزدہ بھی لگ رہا تھا۔

میں اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھا کہ طاہر کی شازلی سے شادی کے ایک سال بعد ہی لوگوں میں ان کے بارے میں بے سروپا افواہیں گشت کرنے لگی تھیں۔ ان افواہوں میں یقیناً کچھ نہ کچھ صداقت تھی۔ مثلاً طاہر کا کار چلانا...... کار تو در کنار اسے تو سائیکل چلانا بھی نہیں آتا تھا۔ لیکن شادی کے بعد اس نے ماہر ڈرائیور ہونے کا ثبوت دیا۔ شہر کے پرہجوم بازاروں میں سے وہ کار چلاتے ہوئے ایسے گزرتا گویا وہ کاروں کی ریس میں حصہ لے رہا ہو۔ البتہ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ وہ کار میں سوار شہر سے باہر کہاں جاتا ہے۔ کسی کو بھی اس کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ البتہ دو چار دن بعد واپسی پر وہ کسی ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر تھکن سے نڈھال پڑا ہوا دکھائی دیتا۔ داڑھی بڑھی ہوئی ہوتی۔ لباس کی یہ حالت ہوتی جیسے کئی مہینوں سے ایک ہی سوٹ پہن رکھا ہو اور رات کو بھی تبدیل نہ کیا ہو۔ چہرا اُترا ہوا اور سر کے بال اُلجھے ہوئے۔

شازلی کے بارے میں سننے میں آیا کہ بعض اوقات وہ ڈھلتی جوانی کا عکس دکھائی دیتی ہے۔ لیکن دو چار دن کے بعد اس کے بالکل برعکس، جھریوں سے پاک ملائم اور شفاف جلد نیز گداز بدن کے تمام گوشے بھرپور جوانی کا مظہر ہوتے۔ اسی دوران طاہر نے یونیورسٹی میں لیکچر دینے کا سلسلہ بھی منقطع کر دیا اور وہ زندگی کے ہر ربط سے بے نیاز دکھائی دینے لگا۔

☆......☆......☆

کچھ دنوں بعد وہ مجھ سے ملنے آیا۔ اس مرتبہ بھی وہ تنہا تھا۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ اُس نے دبے دبے لفظوں میں ایک بار پھر خوفزدہ اور موجودہ زندگی سے غیر مطمئن ہونے کا اظہار کیا ہے۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اپنی شخصیت پر اعتماد نہیں رہا۔ پہلے تو میں نے اس کی باتوں کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ لیکن اسے دیکھ کر لوگوں کی بے سروپا باتیں یاد آنے لگیں۔ میں نے اُسے کریدا، میری دلچسپی سے اس کی ہمت بندھی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ طاہر کا باپ مر چکا ہے۔ ورنہ بیٹے کی تباہ کن اور پریشان حالت دیکھ کر اسے شدید صدمہ ہوتا۔

اس ملاقات کے بعد وہ ہفتے عشرے میں ایک مرتبہ ضرور مجھ سے ملاقات کرتا۔ اس کی حالت دن بدن بگڑتی چلی جا رہی تھی اور اب وہ باتوں باتوں میں اپنی پُر ہول زندگی کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتانے لگا تھا۔ میں نے اس دوران یہ رویہ اختیار کیا کہ طاہر سے خود کوئی بات نہ پوچھی جائے اور خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہوں۔

کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ باتیں کرتے کرتے ایک دم خاموش ہو جاتا اور اس کے چہرے سے شدید کرب کا اظہار ہوتا۔ ہاتھ پاؤں اینٹھ جاتے۔ آنکھیں پھیل جاتیں اور وہ حواس باختگی کے عالم میں میرا منہ تکنے لگتا۔ یہ کیفیت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہتی۔ اور سنبھلنے کے بعد وہ گھر روانہ ہو جاتا۔

ایک دن اس نے بتایا کہ شازلی کو اس کا مجھ سے ملنے آنا پسند نہیں اور اب وہ چوری چھپے یہاں آتا ہے گھر کے تینوں ملازم اس کی جاسوسی کرتے ہیں اور شازلی کو اس کی ہر بات سے آگاہ کر دیتے ہیں۔“

طاہر نے ایک بار پھر مجھ سے ملنا ترک کر دیا جس کا مجھے بے حد دکھ ہوا۔ لیکن میں نے کسی بھی صورت میں یہ بات پسند نہ کی کہ میری وجہ سے میاں بیوی کی خوشگوار زندگی میں تلخی پیدا ہو۔

☆......☆......☆

دو یا تین ماہ بعد ایک دن مجھے حیدر آباد کے اسپتال سے طاہر کا پیغام ملا کہ ”مجھ سے ملاقات کرو۔“ وہ کیونکر اسپتال پہنچا ہے؟ کیا اسے کوئی حادثہ تو پیش نہیں آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ شازلی اپنے خاوند کے پاس ہوگی اور کوئی ہولناک حادثہ پیش آنے کی صورت میں طاہر نے مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار

کیا ہوگا۔ پیغام ملتے ہی میں کار میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ دو گھنٹے بعد میں اس کے پاس تھا۔

شازلی وہاں نہیں تھی۔ طاہر کو شہر سے باہر جنگل کے کنارے نیم مردہ حالت میں پڑا پایا گیا تھا۔ وہ جنگل میں کیسے پہنچا اور اگر خود آیا تھا تو کیوں؟ اسے کیا واقعات پیش آئے ہیں۔ اس نے کسی کو بھی بتانے سے انکار کردیا تھا۔ وہ صرف مجھے اپنے اس راز سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ میرے پہنچنے سے قبل اس کی حالت سنبھل چکی تھی اور اب ڈاکٹروں کے مشورے سے پوری طرح قوت کی بحالی کی خاطر اسپتال میں پڑا ہوا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ اس نے مجھ سے بات کرنے کے لیے نرس کو کمرے سے باہر جانے کو کہا۔ اور پھر وہ بتانے لگا کہ دو دن پہلے رات کے وقت وہ گھر بیٹھا ایک کتاب کے مطالعے میں مشغول تھا کہ شازلی نے اس کی شخصیت کو تبدیل کردیا۔ شازلی اپنا جسم گھر میں ہی چھوڑ کر میرے جسم کے ساتھ یہاں آئی اور تھوڑی دیر بعد جب میرے جسم پر وہ قبضہ برقرار نہ رکھ سکی تو مجھے یہاں...... جنگل میں ہی چھوڑ گئی۔ نہ جانے میں کتنی دیر جنگل میں بھٹکتا پھرا ہوں۔ یہ سب اس ہی کی کارستانی ہے۔ میں اب یہ اذیت ناک زندگی برداشت نہیں کرسکتا۔ میں شازلی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ وہ میری بیوی نہیں ہے۔ اس نے شادی کا ڈھونگ رچا کر مجھے اپنا ہم زاد بنالیا ہے۔ وہ عورت نہیں ہے۔ دوست تمہیں نہیں معلوم اس نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا...... وہی کمینی......'' طاہر جذبات کی رو میں کہتا چلا گیا اس کی آواز بلند ہوگئی اور غصے سے سارا دن کانپنے لگا۔ میں نے اسے تسلی دی اور بہت دیر تک بیٹھا سمجھاتا رہا تب جاکر کہیں وہ سنبھلا۔

طاہر کی خواہش کے مطابق میں نے ڈاکٹروں سے اسے گھر لے جانے کی اجازت لی۔ میں نے بازار سے اس کے لیے نئے ریڈی میڈ کپڑے خریدے۔ شیو بنوائی اور ہم کراچی روانہ ہوگئے۔ میرا خیال تھا کہ طاہر کو اس کے گھر پہنچا دینا چاہیے تاکہ شازلی کو مجھ سے شکایت نہ ہو۔ مگر طاہر نے بڑی سختی سے انکار کردیا۔ اس کی الٹی سیدھی باتیں سن کر میں اُلجھن میں پڑ گیا اور مجھے طاہر کے دماغی توازن پر شک ہونے لگا۔ اس کی غیر ہم زادی ذہانت کہیں جنون کی صورت تو نہیں اختیار کرگئی۔

ماہر نفسیات کے نزدیک غیر ہم زادی ذہانت حقیقت میں جنون ہی کی کیفیت تصور کی جاتی ہے۔ طاہر ذہنی مریض تو نہیں......؟ میں سوچتا رہا اور وہ میرے ساتھ والی اگلی سیٹ پر خاموشی سے بیٹھا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔

جب ہم شہر کی حدود میں داخل ہوئے تو رات ہوچکی تھی۔ روشنیوں کا شہر دور ہی سے بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ طاہر نے سیٹ پر سیدھے ہوکر بیٹھتے ہوئے خاموشی کو توڑا۔

''دوست! تم شازلی کے باپ سے تو واقف ہی ہو۔ وہ بڑا ہی بدنام شخص تھا۔ لوگ اسے جادوگر کہتے تھے لیکن یہ غلط ہے۔ وہ تو بدروح تھی۔ تمہیں شاید علم نہیں۔ بدروح مرا نہیں کرتی۔ اسے موت نہیں آتی۔ وہ جسم تبدیل کرتی رہتی ہے اور ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔''

''مگر کیسے؟''

''میں تمہاری بات نہیں سمجھا؟'' میں نے کہا۔

''شازلی اپنے باپ کی ہم زاد رہی ہے۔'' طاہر نے بتایا۔

''وہ بوڑھا شازلی کا باپ نہیں تھا۔ اس نے موت سے بچنے کے لیے شازلی کو منتخب کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا بوڑھا جسم ریت کی دیوار کی طرح گرنے والا ہے۔ اس کی موت بھی تو راز ہی ہے۔ اس نے شازلی کا جسم اپنالیا۔ مگر شازلی عورت ہے۔ تم تو جانتے ہو عورت اور مرد کی جسمانی ساخت کے علاوہ اور بہت سی باتوں میں فرق ہوتا ہے۔ اس لیے شازلی کا جسم اس بدروح کے لیے موزوں نہیں تھا۔ یہ بات وہ بہت پہلے سے جانتا تھا۔ اس نے شازلی کی زاہد شکن جوانی اور حسن کے ذریعے مجھے پھانسا۔ میرا صحت مند ذہن مگر کمزور قوتِ ارادی اس کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ اسے ایک ایسے ہی مرد کے جسم کی ضرورت تھی۔ جس پر وہ آسانی سے قبضہ کرسکے۔''

اتنا کہنے کے بعد طاہر ایک دم خاموش ہو گیا۔ آواز اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کسی نے ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ آف کر دیا ہو۔ پھر اچانک ہی اس کے چہرے کی رنگت تبدیل ہونے لگی۔ ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگے گویا اس کا بدن نئی ترتیب پا رہا ہو۔ شکل بگڑ کر انتہائی خوفناک ہو گئی۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سنبھل گیا۔ اس نے مجھے کار روکنے کو کہا۔ میں نے کار سڑک کے کنارے کھڑی کر دی۔ اور وہ اٹھ کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ اب میرے بجائے وہ کار چلا رہا تھا اور میں اس کے ساتھ بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اب بالکل صحیح حالت میں تھا۔ البتہ تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ تقریباً ایک میل کی مسافت طے کرنے کے بعد طاہر نے میری موجودگی کا احساس کرتے ہوئے گفتگو شروع کی۔

''دوست! مجھے معاف کر دینا۔ میں نے تمہیں بہت تکلیف دی ہے۔ تم جانتے ہو، میں اعصابی مریض ہوں۔ ان دنوں اکثر مجھے دورے پڑتے رہتے ہیں اور میں بہکنے لگتا ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے ہماری بے لوث دوستی ایسی ہم زادی باتوں سے بہت بلند ہے میں شازلی کے بارے میں بہت سی الٹی سیدھی باتیں کہہ گیا ہوں۔ شازلی میری بیوی ہے۔ وہ بہت اچھی ہے۔ میں نہ جانے اس کے خلاف کیا کچھ بک گیا ہوں۔ یہ سب میرے دن رات کتابیں پڑھنے کا نتیجہ ہے۔ اس سے میرے اعصاب پر بہت برا اثر پڑا ہے۔ زندگی کے متعلق میرا سارا فلسفہ بکواس ہے۔ عام لوگ میری بکواس کو پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ میں بات کو رقیق پیرائے میں بیان کرتا ہوں۔ جو بات لوگوں کو مشکل سے سمجھ آئے اسے فلسفہ کہا جاتا ہے۔'' چند لمحے رک کر اس نے کہا۔

''میرا جب دماغ تھک جاتا ہے تو میں الٹی سیدھی باتیں سوچنے لگتا ہوں۔ میرا خیال ہے اب کچھ دن میں مکمل آرام کروں۔ اگر میں بہت دن تمہیں نہ ملوں تو برا نہ منانا اور نہ ہی شازلی کو ذمہ دار ٹھہرانا۔ یہ سب میری اپنی ہی حماقتوں کا نتیجہ ہے۔

طاہر نے مجھے گھر کے دروازے پر اتارا اور کار لے کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ جسے دوسرے دن میرا ڈرائیور لایا۔

☆......☆......☆

اس اندوہناک حادثے کے تقریباً پانچ ماہ بعد تک طاہر مجھ سے صرف ایک مرتبہ ہی ملا۔ اس نے اس مرتبہ دروازے پر اپنے مخصوص انداز میں دستک دینے کے بجائے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ میرے لیے طاہر کے انداز میں یہ تبدیلی تعجب خیز تھی لیکن میں نے زیادہ اہمیت نہ دی۔ شادی کے بعد وہ یہ دوسری عجیب وغریب اور مضحکہ خیز حرکت کر رہا تھا۔ اس دن وہ مجھے بڑے خلوص سے ملا۔ میں یقیناً اس کی باتوں پر توجہ نہ دیتا۔ اگر اس کی آواز میں نمایاں تبدیلی نہ محسوس ہوتی۔ میں اس کی تمام حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ لیکن میرے لیے کوئی فیصلہ کرنا ممکن نہ تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ چلا گیا اور میں سوچتا ہی رہ گیا۔ اب وہ میرے اعصاب پر بھوت کی طرح سوار ہونے لگا تھا۔ میں نے بارہا اس سے قطع تعلق کے بارے میں سوچا۔ مگر جب وہ مجھ سے ملنے آتا تو بچپن کی دوستی اور خلوص کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا۔ اس دوران لوگوں سے شازلی اور طاہر کے متعلق بعض بڑی ہی سنسنی خیز باتیں سننے میں آئیں۔

لوگوں کے کہنے کے مطابق طاہر اپنی نئی کار میں تقریباً ہر روز گھر سے باہر جاتا ہے اور آدھی رات کے قریب گھر لوٹتا ہے۔ کار اور لباس مٹی سے اٹے ہوتے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لمبا سفر کر کے آیا ہے۔

وہ کہاں جاتا ہے؟ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ طاہر کے برعکس شازلی کی یہ حالت ہے کہ اس نے گھر سے باہر نکلنا قطعی طور پر بند کر دیا۔ اس دوران کسی بھی ہمسائے نے اسے نہیں دیکھا۔ شروع میں تو ہمسایوں کو یہ خیال گزرا کہ وہ گھر میں بیمار پڑی ہوگی اور خاوند ہر روز سیر سپاٹے کرتا پھرتا ہے۔ اور کسی ڈاکٹر کو نہ بلایا جا سکا۔ انہی دنوں دو چار مرتبہ گھر سے کسی مرد کے رونے کی آوازیں بھی ہمسایوں نے سنیں۔ پہلے تو چہ میگوئیاں ہوتی رہیں اور پھر محلے کے کچھ منچلے نوجوان حقیقت معلوم کرنے کے لیے جاسوسی کرنے لگے۔ انہیں یہ دیکھ کر بے حد تعجب ہوا کہ رونے والا کوئی مرد نہیں بلکہ شازلی تھی۔

بعض لوگوں کا خیال تھا کہ پولیس کو اطلاع کر دی

جائے۔ مگر اکثر نے مخالفت کی کیونکہ اس طرح انہیں بھی پریشان ہونا پڑتا۔

حتیٰ کہ دو ماہ بعد شازلی ایک روز ہنستی مسکراتی گھر سے باہر آئی۔ ہمسایوں سے ملی۔ ہر ایک کی خیریت معلوم کی اور بتایا کہ کبھی کبھار اُسے ہسٹیریا کا دورہ پڑا کرتا ہے، جس سے بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شازلی کو دیکھ کر لوگوں کی زبانیں بند ہوگئیں۔

☆......☆......☆

غالباً اکتوبر کا مہینہ تھا کہ دروازے پر مانوس آواز میں دستک ہوئی۔ میں اس وقت پھولوں کی کیاریوں میں پانی دے رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور طاہر کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ وہ میرے بچپن کا دوست جو تھا۔ آج میں نے اس میں کوئی تبدیلی محسوس نہ کی۔ البتہ وہ بہت خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہم دونوں کمرے میں بیٹھ گئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ دونوں نے چائے پی میری خواہش تھی کہ اپنے معاملات کے بارے میں وہ خود ہی گفتگو کی ابتدا کرے اور میں اس کی باتیں خاموشی سے بیٹھا سنتا رہوں۔ ایسا ہی ہوا...... طاہر بولا اور کہنے لگا۔

''شازلی چلی گئی ہے۔ گزشتہ رات نوکروں کو چھٹی دینے کے بعد ہم دونوں میں گفتگو ہوئی۔ شازلی نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ آئندہ مجھے پریشان نہیں کرے گی۔ اپنا ہمزاد نہیں بنائے گی۔ وہ رات ہی کو اپنا سامان لے کر چلی گئی ہے۔ اب میں آزاد ہوں۔ پہلے میں بہت پریشان رہا ہوں۔ اس کے جانے کے بعد میری پریشانیاں ختم ہوگئی ہیں۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہمیشہ مجھ سے دور کسی دوسرے شہر میں رہے گی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ میں طلاق دینے میں پس و پیش نہیں کروں گا۔ اس کے یہاں رہتے ہوئے میں بہت تکلیف میں تھا۔ شادی کے بعد ایک پل بھی سکون میسر نہیں ہوا۔ میری شخصیت میرا وجود سب کچھ شازلی کے قبضہ میں تھا۔ البتہ اسے صرف ایک مشکل درپیش تھی۔ میرا ذہن ادبی اور فلسفیانہ تھا اور اس کے بس کی بات نہ تھی۔ میرے باغی ذہن کو وہ غلام نہ بنا سکی۔ انسان کو جسمانی اعتبار سے غلام بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن خیالات کی زندہ قوت پر تسلط برقرار نہیں رکھا جاسکتا۔''

طاہر حسبِ عادت ایک دم خاموش ہوگیا۔ میرے نزدیک اس کی حالت تشویشناک ہوگئی۔ میں نے غور سے اُسے دیکھا۔ لیکن وہ پُرسکون تھا۔ کوئی خلافِ ہمزاد بات نہ ہوئی۔ طاہر بھی میری مشکوک نگاہوں کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے تینوں نوکروں کو بھی علیحدہ کردیا ہے۔ وہ بڑے ہی مکروہ اور منحوس تھے۔ شازلی نے انہیں میری جاسوسی کرنے کے لیے ملازم رکھا ہوا تھا۔ اب ان سے میری جان چھوٹ گئی ہے۔ اب میں اپنے والد مرحوم کے نوکروں کو اپنے پاس رکھوں گا۔ وہ سب بہت ہی اچھے ہیں۔ دوست میری باتیں سُن کر شاید تم مجھے پاگل سمجھو لیکن میں نے کوئی غلط بات نہیں کی۔ میری ہر بات صداقت پر مبنی ہے۔ تمہیں یاد ہے جب ہم اسپتال سے آرہے تھے تو راستے میں، میں تمہیں شازلی کے بارے میں بتا رہا تھا کہ اس نے مجھے آدبوچا تھا۔ اور پھر میں شازلی کی حمایت میں ہی باتیں کرنے لگا تھا۔ جسم میرا تھا، لیکن تم سے باتیں شازلی کررہی تھی۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ جب میں نے سگریٹ لینے کے لیے پنواڑی کی دکان کے سامنے کار کھڑی کی تو قریب ہی دو تین آوارہ کتے کھڑے تھے میرے کار سے اترتے ہی وہ بھونکنے لگے اور پھر ڈر کر کانپتے ہوئے بھاگ گئے تھے۔ اگر اس وقت میں کتوں کو گھور کر دیکھتا تو اُن کی موت یقینی تھی۔ لیکن شازلی نے ایسا نہیں کیا کہ مبادا تم مشکوک ہوجاؤ۔'' طاہر کی باتیں سُن کر میں کانپ اٹھا۔ اگر مجھے اسپتال سے آتے وقت صحیح صورتِ حال کا پتا چل جاتا تو خوف کے مارے میری جان ہی نکل جاتی۔ یا شاید میں چلتی کار سے کود پڑتا۔

''دوست! مجھے اپنی جان بچانی ہے۔'' طاہر کہتا چلا گیا۔

''شازلی نے مجھ پر بہت ظلم توڑے ہیں میری شخصیت کو توڑ ڈالا ہے۔ میری کمزور خود اعتمادی اور قوتِ ارادی کے فقدان سے اس نے فائدہ اٹھانے کے لیے مجھ سے شادی کی تھی۔ میں نے تمہیں شاید ایک مرتبہ بتایا تھا کہ شازلی بھی میری طرح اپنے باپ کی ہمزاد تھی۔ اس بوڑھے نے خدا جانے شازلی کو کہاں سے اور کیسے حاصل کیا تھا۔ اپنے بوڑھے جسم کی موت سے پہلے ہی

اس نے نئے جسم کا انتظام کرلیا تھا۔ لیکن جب اسے احساس ہوا کہ اس کے لیے عورت کا نہیں مرد کا جسم موزوں رہے گا۔ تو شازلی کے توسط سے مجھے منتخب کیا گیا۔ شازلی بھی بعض اوقات اپنی اصلی حالت میں آجایا کرتی تھی۔ لیکن یہ وقفہ ایک آدھ گھنٹے سے کبھی زیادہ نہیں ہوا۔ اپنے باپ کی موت کے بعد پھر وہ خود بدروح کا روپ دھار چکی تھی۔

طاہر ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ اس نے سگریٹ سلگا کر لمبا کش لگاتے ہوئے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''میں بہت تھک چکا ہوں۔ شازلی نے مجھ سے بڑا ہی خوفناک برتاؤ کیا ہے۔ خدا کا شکر ہے اب میں آزاد ہوگیا ہوں۔ میں ایک بار نارمل زندگی گزار سکوں گا۔ چند دنوں کے آرام سے میری صحت اچھی ہو جائے گی۔ میں اب اس منحوس مکان میں بھی نہیں رہوں گا۔ وہ بڑی ہی بھیانک جگہ ہے۔ مجھے اب وہاں سے خوف آتا ہے۔ دوست! اگر پھر کبھی حالات بگڑے تو میری مدد کرنا۔ دنیا میں تمہارے سوا میرا کوئی بھی تو نہیں رہا۔ اب میں تنہا ہوں۔'' یہ کہہ کر طاہر کی آواز وفورِ جذبات سے بھرا گئی۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ میں نے اسے تسلی دی اور ہر ممکن مدد کرنے کا وعدہ کیا۔

اس رات میں نے طاہر کو اپنے گھر میں ہی روک لیا تاکہ وہ ذہنی کرب محسوس نہ کرے۔ کہیں گھر جا کر شازلی کی عدم موجودگی کا احساس اس کی تنہائی کو ڈسنے نہ لگے۔ میرا خیال تھا کہ دوسرے دن وہ مکان تبدیل کر کے اپنے آبائی مکان میں منتقل ہو جائے گا۔ لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ وہ وہیں پڑا رہا۔ اس کے بعد وہ مجھ سے ملنے بھی نہیں آیا۔ جس کی وجہ سے مجھے خود ہی اس کے پاس جانا پڑا۔

اس نے شازلی کو دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا اور اب شازلی کی جدائی کا غم اسے کھائے جا رہا تھا۔ میں باقاعدگی سے روزانہ اس سے ملنے جاتا تاکہ وہ ماضی کی دہشت ناک یادوں سے پریشان نہ ہو۔ شازلی کے جانے کے بعد وہ خود کو تنہا محسوس کرنے لگا تھا۔ زندگی اس کے لیے عذاب بن گئی تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ تو اس کے دل کے زخم مندمل ہونے لگے۔ دن مہینوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔ سردیاں شروع ہوگئی تھیں۔ طاہر کی بے ربط زندگی میں باقاعدگی پیدا ہوگئی۔ وہ ابھی تک اسی مکان میں مقیم تھا۔ میں نے ایک دو مرتبہ اسے اپنے آبائی مکان میں منتقل ہونے کو کہا۔ مگر وہ میری بات ٹال گیا۔ میں نے بھی اصرار نہیں کیا کیونکہ اس کے ساتھ اپنے مرحوم والد کے دونوں ملازم بھی مقیم تھے۔ جن کی موجودگی میں کوئی بھی شخص اسے گزند نہیں پہنچا سکتا تھا۔ سردی بھی رخصت ہوگئی اور بہار کا موسم آگیا۔ میں طاہر کے بارے میں بالکل مطمئن تھا۔ ہم میں ہر روز ملاقات ہوتی اور رات گئے تک ہم بیٹھے گپیں ہانکا کرتے یا تاش کی بازی ہوتی۔ بین الاقوامی سیاست سے لے کر ادب کے جدید رجحانات تک زیرِ بحث آتے۔

ایک رات ہم چاند کی تسخیر کے موضوع پر بحث کر رہے تھے کہ طاہر چیخا۔

''اُف خدایا! میرا دماغ پھٹا جا رہا ہے۔ خدا کے لیے میری مدد کرو۔ وہ شیطان......'' اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا اور کرسی پر لوٹ پوٹ ہوگیا۔ میں نے سہارا دے کر اسے پلنگ پر لٹایا۔ تو وہ دھیمی آواز میں بڑبڑانے لگا۔

''دوست! وہ پھر کوشش کر رہی ہے۔ میں کئی راتوں سے پریشان ہوں۔ اب مجھ میں قوت مدافعت نہیں رہی۔ اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس نے وعدہ خلافی کی ہے۔ اُف......'' پھر وہ خاموش ہوگیا۔ اس کا سارا بدن پسینے میں شرابور تھا۔ مگر اب وہ پُرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ سو گیا اور پھر میں بھی کمرے میں جا کر سو گیا۔

اگلی صبح میری آنکھ کھلی تو طاہر جا چکا تھا۔ میں بھاگتا ہوا اس کے گھر گیا۔ اس کے بوڑھے ملازم نے بتایا کہ وہ آدھی رات کے بعد بڑی پریشانی کے عالم میں گھر پہنچا تھا۔ اور اس وقت سے وہ اپنے کمرے میں بند ہے۔ اس دوران کئی مرتبہ اندر سے رونے اور سسکیاں بھرنے کی آوازیں بھی سنائی دی ہیں۔ طاہر کی مخدوش حالت کو دیکھتے ہوئے میں دماغی امراض کے ماہر ڈاکٹر کے پاس گیا اور مشورہ کرنے کے بعد طاہر کو سینی ٹوریم میں داخل

کرادیا۔ علاج ہوتا رہا۔ مگر طاہر کی حالت سنبھلنے کے بجائے بگڑتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

چار ماہ گزر گئے۔

ایک دن دفتر میں فون پر اطلاع ملی کہ طاہر اچانک بالکل تندرست ہوگیا ہے۔ اب وہ بہتر ہے اور اس کی یادداشت بھی لوٹ آئی۔ طاہر کے یاد کرنے پر میں اس کے پاس گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ لیکن اسے دیکھ کر میں اُلجھن میں پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ہی خوفناک تھی۔ اب اس کی گفتگو میں دھیمے پن اور شائستگی کے بجائے اکھڑپن اور کرختگی تھی۔ اور چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ بھی مصنوعی معلوم ہوتی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے ایک ایک کر کے بیتے ہوئے واقعات یاد آنے لگے اور میں خوف سے کانپنے لگا۔ خدا جانے اس کے بعد کیا ہوا۔ نوع انسانی پر کیا قیامت ٹوٹی؟

☆......☆......☆

ایک مرتبہ طاہر نے باتوں باتوں میں قربان گاہ پر انسانی قربانی کا ذکر بھی کیا تھا۔ جہاں شازلی اسے لے کر گئی تھی۔ میں جتنا بھی سوچتا پریشانی اور اُلجھن اسی قدر بڑھتی جاتی تھی۔ میری بات پر کوئی کیونکر یقین کرتا بلکہ الٹا مجھے ہی پاگل سمجھا جاتا۔

دوسرے دن طاہر کا بوڑھا نوکر گھبرایا ہوا میرے پاس آیا۔ اس نے یہ کہہ کر میری پریشانی میں اور بھی اضافہ کردیا کہ شازلی اور اس کے باپ کی لاشیں گھر کے گودام میں پڑی ہوئی دیکھی گئی ہیں۔''

ان حالات میں نوکر کو رازدار بنانے کے سوا کوئی صورت نہ رہی۔ میں نے تمام حالات اور واقعات اسے بتائے اور خاموش رہنے کا مشورہ دیا۔

اس رات ہم دونوں دیر تک بیٹھے آپس میں مشورہ کرتے رہے اور آخر کسی نتیجے پر نہ پہنچ کر فیصلہ کیا کہ خاموشی سے حالات کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ اس کے بعد جیسا مناسب ہو۔ اقدام کیا جائے۔

آدھی رات کو دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ طاہر میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی اور ایک کاغذ میرے ہاتھ میں تھما کر رات کی تاریکی میں کھو گیا۔ اتنے میں طاہر کا بوڑھا ملازم جو میرے پاس ہی تھا۔ وہ بھی بستر سے نکل کر باہر آ گیا ہم نے کمرے میں آ کر کاغذ دیکھا اس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔

''پیارے دوست نوید! آج مجھے حقیقی معنوں میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ وقت آ چکا ہے۔ شازلی نے میرے جسم پر قبضہ کرلیا ہے۔ مگر میرا ذہن ابھی اس کے بس سے باہر ہے۔ آج رات میں نے سینی ٹوریم میں ایک مریض کو ہلاک کر کے دیوتا کی قربان گاہ پر قربانی دے کر ابدی زندگی حاصل کر لی ہے۔ میں نے مجبوراً ایسا کیا ہے۔ میرے بس میں اب کوئی بات نہیں رہی۔ اب دیوتاؤں کی خوشنودی ہی میری زندگی کا حاصل ہے۔ تم کو شازلی اور اس کے بوڑھے باپ کی لاشیں گودام میں پڑی ہوئی ملیں گی۔ میں نے تمہیں پہلے ہی حقائق سے آگاہ کردیا تھا۔ لیکن تم نے بھی میری بات نہیں مانی۔ کچھ دنوں تک میرا باغی ذہن بھی ہتھیار ڈال دے گا۔ میری قوتِ مدافعت دن بدن کم ہوتی جارہی ہے۔ میرا جسم تو پہلے ہی شکست خوردہ ہے۔

صرف ذہنی مدافعت مجھے بچائے ہوئے تھی۔ یہ بھی اب چند ہی دنوں کی بات ہے۔ اگر تم میری بھلائی چاہتے ہو تو مجھے ہلاک کر کے میری لاش جلا دو۔ شازلی اور اس کے باپ کی لاشیں بھی جلا دو۔ اگر ایسا نہ کیا تو میں مر نہیں سکوں گا۔ کوئی دوسرا جسم اپنا لوں گا۔ اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ اس لیے جلدی کرو۔ دیر نہ کرو۔''

☆......☆......☆

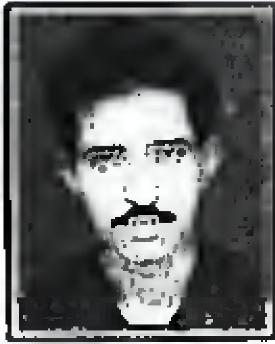
میں طاہر کے خط کو پڑھ کر پریشان ہوگیا۔ لیکن میرے پاس اب اس کی ہدایت پر عمل کرنے کے سوا کوئی صورت نہیں تھی۔

مجھے اب طاہر کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا جا چکا ہے۔ اور کچھ دنوں کے بعد مجھے سزائے موت ہو جائے گی۔ لیکن کوئی بھی یہ نہ جان سکے گا کہ میں نے یہ سب کچھ کیوں کیا ہے اور اگر میں کسی کو بتا بھی دوں کہ میں نے قتل نہیں کیا بلکہ اُسے مکتی دے دی ہے۔ تو کیا کوئی اعتبار کرے گا۔

☆☆......☆☆



چمگادڑ کی مورتی



ملک محمد اکرم آھیر

ایڈونچر کا شوق اُن نوجوانوں کو ماڑی انڈس کے پہاڑوں پر موجود مندروں میں لے گیا تھا اور پھر......




نعمان میرا بہت اچھا دوست تھا۔ وہ سیر و سیاحت کا بے حد شوقین تھا۔ پرانی عمارتوں کو دیکھنے کا اس کو بے حد شوق تھا۔ اور وہ مختلف سیر و سیاحت کی کتابوں کا بھی بے حد دلدادہ تھا۔ اکثر نئی کتابوں کے علاوہ پرانی کتابیں بھی شوق سے پڑھتا تھا۔ ایک مرتبہ اسے کباڑ کی دکان سے ایک بہت پرانی کتاب مندروں کے حوالے سے ملی۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ جب اسے یہ کتاب ملی تھی تو وہ بہت خوش تھا۔ جیسے اُس کے ہاتھ کوئی خزانہ لگ گیا ہو۔ اور وہ کتاب ہاتھ میں لیے میرے گھر آیا اور کہا کہ مجھے ایک بے حد قیمتی کتاب ملی ہے۔''

''میں نے اُس سے کہا کہ یار نعمان تم تو ایسے خوش نظر آ رہے ہو جیسے تمہیں قارون کے خزانے کے نقشے کی کتاب مل گئی ہے۔''

اُس نے مسکراتے ہوئے کہا کہ ہاں مجھے بہت پرانے خزانوں کی کتاب ملی ہے۔''

میں نے جوش سے کہا کہ یار تجھے کون سے خزانے کی کتاب مل گئی۔''

''پرانے مندروں کی معلومات کے خزانے کی کتاب ملی ہے۔ ہمارے شہر میانوالی سے صرف 45 کلومیٹر دور کالا باغ کے نزدیک شہر ماڑی انڈس کے پہاڑوں پر موجود مندروں کی معلومات ہے۔ کبھی بدھ مت لوگوں کے لیے یہ جگہ بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ آج بھی یہاں پر کافی مندر موجود ہیں جو کہ صدیوں پرانے ہیں۔ مجھے تو پہلے ان مندروں کے بارے میں معلومات نہیں تھی مگر آج ان مندروں کے حوالے سے مجھے یہ کتاب ملی تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ میں ان مندروں کی سیر کے لیے بڑا بے تاب ہو گیا ہوں۔ بلکہ سوچ رہا ہوں میں تمہیں ساتھ لے کر کل ہی اس طرف نکل جاؤں۔''

مجھے بھی بڑا تجسس ہوا میں نے بھی ساتھ جانے کی حامی بھر لی۔ میں دل سے بے حد خوش تھا کہ ہمارے علاقے میں اتنے پرانے مندر موجود ہیں۔

ابھی ابھی سوچ میں گم تھا کہ نعمان نے مجھے ان مندروں کی تاریخ کے حوالے سے بریف کرنا شروع کر دیا۔

نعمان نے کہا کہ اگر اس کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو یہاں پر عقل کو دنگ کرنے والے واقعات کے علاوہ یہاں کی سرزمین بہت بڑے ثقافتی ورثہ کی حیثیت رکھے گی کیونکہ یہاں پر ہر مذہب کے لوگ

آ کر آباد ہوئے۔ ماڑی کا شہر اور ضلع میانوالی جو کہ بہت اہم علاقہ تھا۔ جو بھی فاتحین افغانستان سے برصغیر پاک و ہند میں داخل ہوئے وہ ان شہروں سے دریائے سندھ کے کنارے کنارے انہی پہاڑوں سے ہوکر گزرے ہیں۔ اور پھر دیگر علاقوں میں داخل ہوئے۔ یہ ماڑی انڈس کا شہر جو کہ بہت قدیمی علاقہ ہے جو آثارِ قدیمہ کا خزانہ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔''

اس نے مزید کہا کہ ان مندروں میں سب سے بڑا مندر 'ہنومان کا استھان' کہا جاتا ہے جو کہ کسی دور میں چندر گپت موریہ کے پوتے راجہ کنشک کا پایہ تخت بھی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے سکندر اعظم نے اس علاقہ کو ڈھونڈا تھا اور بابل کے جادوگروں نے انہیں ایک مخفی علوم کی کتاب بھی دی تھی۔ بلکہ وہ کتاب نہیں بابل کے بڑے بڑے جادوگروں کی لکھی ہوئی ڈائری تھی۔ انہیں تحفے میں دی تھی مگر جب وہ اس پہاڑی علاقہ میں پہنچا تھا تو اس نے گھوڑے سے اتر کر اس علاقہ کا جائزہ لیا مگر اس وقت شام کا وقت تھا اور وہ اپنے پڑاؤ کے لیے جگہ کا انتخاب کر رہا تھا۔ اس کے گھوڑے کا منہ انہی مندروں کی طرف تھا جو کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر موجود تھے۔ مگر ان مندروں سے کیا چیز گھوڑے کو دکھائی دی کہ وہ ایک طرف دوڑ پڑا تو سکندر اعظم گھوڑے کی طرف بھاگا مگر گھوڑا بے حد تیز تھا تو آخر کار تھک کر وہ لیٹ گیا مگر کچھ گھنٹوں بعد گھوڑا واپس آتا ہوا دکھائی دیا مگر گھوڑے کی پیٹھ پر پڑا ہوا سامان غائب تھا اور وہ کتاب بھی انہی پہاڑی علاقوں میں کہیں گر گئی تھی۔'' نعمان بس اپنی ہی پڑھتا چلا جا رہا تھا اور میرے چہرے کا رنگ اُڑتا جا رہا تھا۔

''جب محمود غزنوی اس علاقہ میں آیا تھا تو یہاں پر بہت بڑا تجارتی مرکز قائم ہو چکا تھا۔ انہی پہاڑوں



کے راستوں سے ایک خفیہ راستہ افغانستان جانکلتا ہے۔ یہ پہاڑی سلسلہ کوہِ سلیمان سے ہوتا ہوا چکوال اور دیگر علاقوں تک چلا جاتا ہے۔"

میں نے نعمان سے کہا کہ یار اب اس قصے کو مزید پڑھنا بند کرو۔ ویسے ہی کافی رات ہوگئی اور صبح ہمیں ان مندروں کی سیر کے لیے بھی جانا ہے۔"

نعمان اور میں ایک ہی گھر میں رہتے تھے کیونکہ اس کا تعلق قائد آباد سے تھا اس کے والد ایک انسپکٹر تھے۔ جن کا تبادلہ میانوالی شہر میں ہوا تھا اور نعمان میرا دوست تو تھا ہی مگر میرے ماموں کا بیٹا بھی تھا۔ اور وہ اکثر میرے گھر پڑھنے آجاتا تھا تو ہم نے آج اُن کی دعوت کی تھی اور ہم سب نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ میں نے نعمان کو دیکھا تو وہ اب بھی کتاب پڑھنے میں مگن تھا پھر پتا نہیں کب مجھے نیند نے آ گھیرا۔

☆......☆......☆

جب میں اٹھا تو سورج کافی بلند ہو چکا تھا پھر ہم اٹھ کر نہانے لگے اور ناشتا کرنے کے بعد نعمان اور میں نے اپنے والدین سے اجازت مانگی تو ماموں نے کہا کہ تم سب سے پہلے داؤدخیل چلے جانا اس تھانے میں ایک میرا دوست ایس ایچ او لگا ہوا ہے۔ اس سے مل لینا وہ تمہارے ساتھ ایک دو پولیس والے بھی بھیج دے گا۔"

یہ بات سن کر ہمیں بے حد خوشی ہوئی تو نعمان کے والد نے اپنی کار کی چابی نعمان کے حوالے کی ہم نے ضرورت کی چیزیں گاڑی میں رکھیں اور اللہ کا نام لے کر اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔

میانوالی شہر کی حدود سے نکل کر ہماری گاڑی بنوں روڈ کی طرف رواں دواں ہوگئی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم داؤدخیل پہنچ گئے اور متعلقہ تھانے گئے تو ماموں کے دوست نے ہمارا استقبال کیا اور کہا کہ میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ کے والد نے مجھے فون کر کے بتا دیا تھا۔ بیٹا کچھ کھا پی لیتے ہیں پھر میں تمہارے ساتھ اپنے دو کانسٹیبل روانہ کر دوں گا۔"

انکل نے چائے کے ساتھ پکوڑے سموسے بھی منگوا لیے تھے۔ چائے وغیرہ سے جب فارغ ہوئے تو انہوں نے کہا کہ جب پہاڑوں سے واپس آنا تو کھانا یہیں پر کھانا۔"

ہم نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور انسپکٹر عالم خان نے ہمارے ساتھ دو باوردی سپاہی روانہ کر دیے کیونکہ یہ پہاڑی علاقہ تھا اور ان علاقوں میں کافی خطرات ہوتے ہیں۔ ہم چاروں پرانی ماڑی انڈس شہر کی طرف روانہ ہوگئے۔ جب ان پہاڑوں کے نزدیک پہنچے تو ہمیں حیرت کا ایک ایسا جھٹکا لگا کہ ہم حیران رہ گئے کیونکہ وہ مندر دور سے دیکھنے میں ایسے لگ رہے تھے جیسے کوئی قد آور دیو پہاڑوں کی چوٹیوں پر کھڑا ہو۔ اُن کی تراش ہی ایسی تھی کہ جیسے کوئی انسان کھڑا ہو۔ وہ ہمیں دور سے ایسے ہی محسوس ہو رہے تھے جیسے کوئی بھٹکی ہوئی آتما ہمیں اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔

یہ سوچ کر تو پہلے تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہوگئے کیونکہ ہمیں سکندر اعظم کا وہ گھوڑا یاد آ گیا تھا جس نے اس جگہ پر کوئی نادیدہ چیز دیکھ کر دوڑ لگا دی تھی مگر ہم نے دل میں ورد شروع کر دیا۔ ہم سوچ رہے تھے کہ خدا جانے اس جگہ کا منظر کیسا ہوگا۔ مگر نعمان اپنی ہی دھن میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

ہم نے پہاڑوں کے نزدیک پہنچ کر گاڑی سے ضرورت کا سامان نکالا اور انہیں ایک بیگ میں ڈال کر ہم نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر سفر شروع کر دیا۔ پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے کافی وسیع راستہ پہاڑوں کے سینے کو چیرتا ہوا ہمیں اوپر لے کر جا رہا تھا۔

ہم جیسے جیسے اوپر چڑھتے جا رہے تھے ہمارے دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر کار ہم اس مندر میں پہنچ گئے۔ اس طرح کہ اور بھی مندر کافی فاصلوں پر موجود تھے۔ ہم سب سے پہلے بڑے مندر میں داخل ہوئے تو میرا پاؤں ایک پتھر سے ٹکرایا تھا۔ لڑکھڑا کر پہاڑوں سے نیچے گرنے لگا۔ ہم مندر کے منہ پر پہنچے ہی تھے کہ ایک دم پیچھے ہٹ کر اور پھر چاروں ایک دوسرے پر گر پڑے کیونکہ مندر کے اندر سے گیدڑوں کا ایک غول پوری طاقت کے ساتھ نکلا تھا۔ جن کی تعداد پانچ تھی۔ سپاہی نے فوراً ہی ایک ہوائی

فائر کر دیا تو وہ دوڑ کر پہاڑی کے دوسرے راستے نیچے اُتر گئے۔ مگر جیسے ہم تو اپنے حواس ہی کھو بیٹھے تھے۔ شاید کسی چیز نے ہم پر حملہ کر دیا ہے۔ پھر ہم نے مندر کے اندر جانے کا پروگرام بنایا۔ ہم نے بیگ سے ٹارچ نکال لیں کیونکہ مندر کے اندر کافی اندھیرا تھا۔ باہر سے تو وہ بہت چھوٹے نظر آ رہے تھے۔ مگر اندر سے کافی وسیع تھے۔ ٹارچ کی روشنی میں مندر کافی خوفناک نظر آ رہے تھے اور ان کی لمبائی بھی کافی تھی جیسے ہم کسی غار میں اتر رہے ہوں ہم جیسے جیسے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ہمارے دل کی دھڑکن بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ دیکھنے میں یہ مندر اندر سے کافی پُر اسرار نظر آ رہا تھا۔ کہیں کہیں پر تو کافی گہرے گڑھے بھی تھے، مگر وہ اپنی تاریخ آپ رکھتے تھے۔ انہیں جس نے بھی بنوایا تھا بڑی خوبی سے بنوایا تھا۔

ہماری آنکھیں اُس کی پُر اسراریت دیکھ کر اور بھی پھیلتی جا رہی تھیں کہ اسی بے احتیاطی میں میرا پاؤں نیچے پڑے ہوئے پتھر سے ٹکرا گیا، پتھر کا ٹکرانا تھا کہ میں کود کر نعمان اور دو سپاہیوں پر جا گرا پتھر کافی بڑا تھا۔ یوں گر جانے سے مجھے کافی خراشیں بھی آ ئیں مگر اس دوران ایک حیرت انگیز منظر ہمارے سامنے تھا۔ جس پتھر سے میرا پاؤں ٹکرایا تھا وہاں پر ایک بہت بڑا شگاف پڑ گیا تھا جو کہ کہیں نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ ہم چاروں نے یہ شگاف دیکھا تو ہمارے پسینے چھوٹ گئے کہ نا جانے اس کے اندر کیا چیز ہے۔

نعمان یہ شگاف دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور جذبات میں آ کر اُس نے ایک پتھر کو پاؤں سے ٹھوکر لگائی تو وہ پتھر اس شگاف میں جا گرا۔ پتھر کا شگاف میں گرنا تھا کہ ایک زوردار شور بلند ہوا جیسے بہت سے پرندے ایک ساتھ اُڑ کر آ رہے ہوں۔

ایک بہت بڑا چمگادڑوں کا غول ہمارے سروں سے ہوتا ہوا گزر گیا جو کہ دیکھنے میں کافی خونخوار نظر آ رہے تھے۔ ان کے منہ سے دو دانت ڈریکولا کی طرح نکلے ہوئے تھے اور خوف ناک آوازیں نکال کر وہ مندر سے باہر نکل گئے مگر ہم کافی چوکس ہو گئے تھے کہ ہمیں ہر قدم احتیاط سے اٹھانا پڑے گا کیونکہ مندر جگہ جگہ پُر اسراریت اور موذی چیزوں سے بھرا پڑا تھا۔

''ایک سپاہی نے کہا کہ یار تمہیں اس جگہ سے باہر نکل جانا چاہیے۔ کہیں ہمارے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے۔''

مگر نعمان نے کہا کہ 'میں یہاں اس مندر کو دیکھے بنا باہر نہیں جاؤں گا۔ اگر آپ لوگوں کو جانا ہے تو بے شک واپس چلے جاؤ، میں اکیلا اس مندر کی سیر کر لوں گا۔''

اُس کی ضد کے آگے میں نے اور سپاہیوں نے ہتھیار ڈال دیے پھر نعمان نے کہا کہ مجھے ان سیڑھیوں سے نیچے جانا ہے۔

میں نے کہا۔ ''نہیں نعمان میں تمہیں یہ خطرہ مول نہیں لینے دوں گا۔ نا جانے اس کے اندر کیا ہے۔ اور پتا نہیں ہم وہاں سے باہر نکل کر زندہ بھی آ سکیں گے کہ نہیں۔''

سپاہیوں نے بھی کہا کہ 'تمہارا دوست اسلم تمہیں ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہاں سے باہر نکل چلو بیٹا۔''

نعمان اُس غار کے دھانے پر کھڑا تھا۔ وہ ہمیں بھی اندر آنے کا کہہ رہا تھا۔ اور اس دوران وہ تھوڑا پیچھے ہٹا تو اس کا پاؤں ایک پتھر سے ٹکرایا اور وہ ان سیڑھیوں سے گرتا ہوا نیچے جا گرا۔ جب ہم نے یہ سب دیکھا تو ہم تینوں اس کی طرف دوڑے تا کہ اسے بچایا جا سکے۔ مگر وہ ہماری گرفت سے نکل چکا تھا۔

میں نے کہا کہ 'ہمیں اس کو ڈھونڈنے کے لیے ان سیڑھیوں سے نیچے کی جانب جانا پڑے گا۔''

ہم نے ہاتھوں میں ٹارچ لیے سیڑھیاں اُترنا شروع کر دیں۔ یہ سیڑھیاں اینٹوں سے بنی ہوئی تھیں۔ ہم جیسے جیسے نیچے جا رہے تھے۔ ہماری سانسیں بے کل ہو رہی تھیں۔ ان سیڑھیوں کی تعداد دس کے قریب تھی۔ جیسے ہی سیڑھیاں ختم ہوئیں تو ہم نے نعمان کو نیچے زمین پر بے ہوش پایا۔ ہم نے جا کر اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔

نعمان ہوش میں آ گیا۔ تو اُس نے بتایا کہ اس نے خود کو ایک راہداری میں گرتے ہوا پایا تھا۔ اس

کے ماتھے سے خون نکل رہا تھا۔ اسلم نے بیگ سے روئی اور سپرٹ نکالا کیونکہ انہوں نے ایک ایمرجنسی بکس (فرسٹ ایڈ) میں ضرورت کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ تاکہ ضرورت پڑنے پر انہیں استعمال کیا جاسکے۔

نعمان نے پانی پیا اور اس جگہ کا جائزہ بھی لیا اور پرانی راہداروی دیکھ کر خوش ہوگیا۔ یہ کوئی تہہ خانہ تھا نعمان نے اُٹھ کر اس تہہ خانے کا جائزہ لیا تو ان کے کونوں میں جابجا انسانی ہڈیوں کی باقیات پڑی ہوئی تھیں۔ تو ہم چاروں یہ منظر دیکھ کر کانپ سے گئے۔ میں نے کہا کہ مجھے اس جگہ سے کافی خوف محسوس ہورہا ہے یہاں سے نکلیں۔ مگر نعمان بولا تھوڑا سا اس کا جائزہ لے لوں۔ تہہ خانہ اتنا بڑا نہیں تھا مگر پتھروں سے بنی ہوئی دیواروں کے اندر مکڑی کے جالے ضرور تھے جسے ضرورت کے وقت ان میں چراغ رکھ کر روشن کیے جاتے ہوں۔ جالے ہٹائے کہ شاید ان کے اندر ان کو کوئی خزانہ مل جائے۔ جگہ جگہ پر انسانی ہڈیوں کے علاوہ چمگادڑوں کی باقیات اور ان کا گند بھی موجود تھا۔ نعمان تمام جالوں کو صاف کر کے باری باری اُن کا جائزہ لے رہا تھا۔ مگر اسلم اور دو سپاہی سیڑھیوں کے پاس کھڑے مسلسل اس کو واپس چلنے کو کہہ رہے تھے۔ جب نعمان نے آخری جالے کو صاف کیا تو یک دم پیچھے کو ہٹ گیا۔ کیونکہ اس جالے میں ایک سنہری مورتی چمک رہی تھی۔ جس کے منہ سے دو بڑے بڑے دانت اور ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے نوکیلے دانت بھی چمک رہے تھے۔ اس کی آنکھیں ایسی تھیں جیسے سرخ رنگ کے یاقوت جڑے ہوں۔ یہ مورتی ایک چمگادڑ کی تھی جو کہ اپنے نوکیلے دانت نکالے، اپنے پروں کو کھولے ہوئے کھڑی تھی۔

نعمان نے چمگادڑ کی یہ مورتی خاموشی سے اپنے بیگ میں رکھ لی اور پھر ایک نظر تہہ خانے پر گھما کر باہر نکلنے کا اشارہ کردیا۔ سب باہر نکل آئے۔

شام ڈھلنے والی تھی وہ کار میں بیٹھے اور واپس داؤدخیل آگئے۔ عالم انکل نے باز پرس کی اتنی دیر کیوں لگادی۔"

تو سپاہیوں نے وہ تمام کہانی بنا ڈالی جوان کے ساتھ رونما ہوئی تھی۔ انکل عالم کو بہت خوشی ہوئی کہ ہم مہم جو تو تھے ہی مگر بہادر بھی نکلے۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے انکل کے ساتھ کھانا کھایا اور واپس گھر کی راہ لی۔

نعمان نے اُس رات ماموں کے گھر رہنے کا فیصلہ کیا تاکہ تھکاوٹ دور ہوجائے۔

☆......☆......☆

جب سب اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لیے چلے گئے تو نعمان نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کردیا اور کمرے کے روشن دان کو کھول دیا۔ اس نے اپنے بیگ سے وہی سنہری چمگادڑ کی مورتی نکالی اور اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھوں کو ہاتھ لگایا تو وہ فوم کی طرح نہایت نرم تھیں مگر باقی مورتی بہت سخت قسم کی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر اس میں ایسی کون سی بات ہے یا پھر یہ کوئی ڈریکوریشن پیس ہے۔

اُس نے اُس مورتی کو اپنے بیڈ والے میز پر رکھ دیا اور لائٹ آف کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

جلد ہی وہ نیند کی وادیوں میں اُتر گیا۔ نجانے رات کا وہ کون سا پہر تھا کہ پرندوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اور دل ہلا دینے والی آوازوں نے اُسے جگانے پر مجبور کردیا۔ اس نے گھبراہٹ میں لائٹ آن کی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دس بارہ چمگادڑ اس مورتی کے اوپر اُڑ رہے تھے۔ وہ یہ صورتِ حال دیکھ کر گھبرا کر رہ گیا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے؟ لائٹ آن ہوئی تھی کہ چمگادڑ اور بھی خوفناک آوازیں نکال کر نعمان پر جھپٹنے لگیں تو اُس نے فوراً لائٹ آف کر کے خود کو پلنگ پر پڑے کمبل سے مکمل طور پر چھپالیا۔

پھر چند منٹ بعد بالکل خاموشی چھاگئی تو اس نے ڈرتے ڈرتے لائٹ آن کی۔ دوسری بار اس کے ذہن نے ایک زبردست جھٹکا لیا کیونکہ میز پر اب مورتی موجود نہیں تھی۔

وہ بڑا حیران ہوا کہ آخر یہ مورتی کہاں چلی گئی۔ اُس نے تمام کمرے کا جائزہ بھی لیا۔ دروازے بھی

بند تھے۔ پھر کھڑکی کی طرف آیا مگر وہ زمین سے کافی اوپر کی جانب تھی۔ اس نے تمام کمرے کی چیزوں کو اُلٹ پلٹ کر کے رکھ دیا مگر اسے وہ مورتی نظر نہ آئی وہ بے حد پریشان ہوا کہ یہ مورتی آخر گئی کہاں؟

☆......☆......☆

جب وہ صبح اٹھا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مورتی دوبارہ اسی میز پر موجود تھی مگر اس کا منہ پہلے سے بھی زیادہ سرخ نظر آرہا تھا۔ جیسے ابھی ابھی کسی نے اس کے منہ پر خون لگایا ہو۔ اس کے دونو کیلے دانت بھی لہو میں رنگے ہوئے تھے تو نعمان نے مورتی کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کے منہ پر ہاتھ لگایا تو اچانک اس کے ہاتھ سے وہ مورتی گر گئی اور اس مورتی کے گرنے سے فرش پر ایک بھاری آواز پیدا ہوئی۔ نعمان نے مورتی کے منہ کو جس ہاتھ سے چھوا تھا اس ہاتھ کی انگلیاں پر خون لگ گیا تھا۔

وہ خوف کے عالم میں اپنے دوست کے کمرے کی طرف بھاگا اور ہانپتا ہوا، دوست کے کمرے کے دروازے پر جا کر گر گیا۔

اسلم نے دروازہ کھولا تو اپنے کمرے کے باہر نعمان کو بے ہوش پایا۔ اس کا جائزہ لیا تو ہاتھ پر خون اب بھی موجود تھا۔ اُس پر پانی چھڑکا تو اسے جیسے ہوش آیا۔

نعمان، اسلم کے گلے لگ گیا جیسے سہم گیا ہو۔ اسلم نے کہا۔

''یار کیا بات ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے اور تم اتنے خوف زدہ کیوں نظر آرہے ہو اور تمہارے ہاتھ پر یہ خون کیسا ہے۔''

نعمان نے گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے اسلم کو رات کا تمام قصہ کہہ سنایا۔ جسے سن کر اسلم بھی گھبرا سا گیا تھا۔ وہ اسے ساتھ لے کر نعمان کے کمرے میں گیا۔ مورتی اس طرح الٹی زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اسلم نے وہ مورتی اٹھائی تو مورتی بہت خوفناک نظر آرہی ہے۔

''یار اسلم کیوں ناں اسے جا کر کہیں دور پھینک آئیں۔ نا جانے اس مورتی کے اندر کون سی پُراسرار قوت موجود ہے۔''

اس مورتی کے بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے۔ فی الحال اسے رکھ دو اور نیچے جا کر ناشتا وغیرہ کرتے ہیں۔''

وہ دونوں نیچے اُتر آئے تو اسلم کے والدین ناشتے کی میز پر ان دونوں کا انتظار کر رہے تھے۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو اسلم نے دروازہ کھولا تو اس کے سامنے نعمان کے والد انسپکٹر عالم خان کھڑے تھے۔

''انکل اندر آجائیں خیر تو ہے، آپ سویرے سویرے اِدھر آگئے ہم نعمان کو ناشتا کروا کر اسے گھر بھیج دیتے۔''

ماموں اندر آگئے تو میرے والد نے کہا کہ یار عالم تم کچھ پریشان سے نظر آرہے ہو۔'' تو ماموں بولے۔

''بھائی جان مجھے فون کر کے آپ کے علاقے میں بلایا گیا ہے۔''

''کیوں کیا بات ہے؟''

''یار تمہاری دوسری گلی میں عباس کمہار کا گھر ہے۔ کل رات وہ اپنے کمرے میں مردہ حالت میں پایا گیا۔ جب میں نے جا کر اس مردے کا جائزہ لیا تو اس کی گردن اور دیگر جسم پر چھوٹے چھوٹے کافی سوراخ نظر آئے جیسے کسی نے اس کا خون چوس لیا ہو۔''

یہ بات سن کر اسلم اور نعمان کے علاوہ سب کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔

نعمان نے کہا کہ ایسی کون سی بات ہو سکتی ہے کہ کسی نے اس کے جسم سے سارا خون نکال لیا ہو۔ حیرت کی بات ہے۔

نعمان کو عباس کمہار کے خون کا شک مورتی پر تھا۔ مگر ناشتے کے بعد اسلم نعمان کو لے کر کمرے میں آگیا۔

''دیکھو یار اسلم مجھے لگتا ہے یہ مورتی نہیں بلکہ کوئی آتما اس کے اندر قید ہے۔ آج رات ہم دونوں اس کمرے میں سوئیں گے اور اس مورتی کی نگرانی

کریں گے۔"

"یار مجھے تو بے حد ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں چھٹی نماز ہمارے گلے نہ پڑ جائے۔" نعمان اب بھی خوفزدہ تھا۔

"نہیں یار اگر وہ ہمارے لیے خطرناک ہوتی تو رات کو تم پر حملہ ضرور کرتی مگر پھر بھی ہمیں احتیاط کرنی چاہیے۔ ہم ایسا کریں گے کہ چھپ کر اس مورتی کو دیکھیں گے اور اس کا جائزہ لیں گے۔ اپنے شک کو حقیقت کا رنگ دیں گے۔"

☆......☆......☆

شام ڈھلنے لگی۔ دونوں دوست کھانا کھا کر کمرے میں آئے۔ مورتی کو ایک روشن جگہ پر رکھا اور پھر سوچ بچار شروع کر دی۔ رات کے بارہ بج گئے تھے مگر مورتی اپنی اسی جگہ پر پڑی تھی۔

رات کے تقریباً دو بجے کھڑکی کے ذریعے بہت سے چمگادڑ کمرے میں داخل ہونے لگے ان کے منہ سے خوفناک قسم کی آوازیں نکل رہی تھیں جو کہ تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ وہ کمرے میں آئے اور مورتی کے اردگرد چکر کھانے لگے۔ اُن کا چکر لگانا تھا کہ مورتی اپنے جگہ سے حرکت کرنے لگی پھر وہی مورتی زمین پر آگے بڑھنے لگی تو چمگادڑ اور بھی خوفناک آوازیں منہ سے نکالنے لگے۔ اس کے بعد ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اب مورتی کی جگہ ایک بہت بڑا چمگادڑ پر پھیلائے چنگھاڑتا ہوا اٹھا اور کھڑکی کی طرف منہ کر کے پرواز کی۔ وہ آگے آگے تھا۔ باقی چمگادڑ اس کے پیچھے پیچھے اڑنے لگے۔ وہ کھڑکی سے نکل کر کہیں اندھیرے میں گم ہو گئے۔ ہم دونوں بھاگ کر کھڑکی کے پاس پہنچے مگر وہ کافی دور نکل گئے تھے کیونکہ ان کی آوازیں بھی سنائی نہ دے رہی تھی۔ نعمان اور اسلم نے یہ دیکھا تو ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے اور ان کی آنکھیں خوف کے مارے پھیل چکی تھیں۔

اسلم نے کہا کہ یار ان کا پیچھا کیسے کیا جائے۔ بڑی عجیب اور پُراسرار قسم کی مورتی ہے۔ نا جانے یہ ہے کیا چیز۔"

خوف کے مارے نیند اُن سے کافی دور جا چکی تھی اور وہ ایک دوسرے سے اس مورتی کی بابت بات کر رہے تھے کہ رات کے تین بجے کے قریب انہیں کھڑکی بند کرنے کا خیال آیا کہ کیوں نا کھڑکی بند کر دی جائے اور وہ اندر نہ آسکے گی۔ اسی سوچ میں کھڑکی کے قریب گئے تو انہیں دور سے چمگادڑوں کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ وہ خوف کے مارے بھاگ کر لائٹ آف کر کے بیڈ کے نیچے لیٹ گئے۔

ایک بار پھر چمگادڑوں کا غول اندر داخل ہوا اور انہوں نے سات بار کمرے کے چکر مکمل کیے تو ایک زوردار آواز پیدا ہوئی کہ نعمان اور اسلم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی نے کوئی وزنی چیز میز پر پھینک دی ہو۔ آواز جیسے ختم ہوئی تو چمگادڑ کھڑکی کے راستے باہر نکل گئے۔ تو انہوں نے بھی اللہ کا نام لیا اور لائٹ آن کر دی مگر لائٹ آن ہوتے ہی ایک خوفناک آواز نے کمرے کی خاموشی کو توڑ کر رکھ دیا۔ ہم دونوں دل تھام کر رہ گئے۔ کیونکہ اس مورتی نے ہم پر حملہ کر دیا تھا۔ ہم نیچے بیٹھ گئے تو وہ لائٹ کی وجہ سے دیوار سے ٹکرا گئی اور وہیں پر گر کر پھر سے اڑنے لگی۔

انہیں ایسا لگا کہ جیسے یہ دیوار سے ٹکرا کر مرگئی ہو مگر وہ جیسے ہی اس کے نزدیک گئے تو اب بھی اس کے پر کھلے ہوئے تھے۔ چمگادڑ کی مورتی اپنا منہ اوپر کر کے ایک بار پھر ان حملہ آور ہوئی۔ وہ دونوں اس سے بچتے ہوئے بیڈ پر جا گرے تو پھر وہ دوبارہ دیوار سے ٹکرا گئی۔ اسلم نے کہا کہ یار تمہیں لائٹ بند کرنا ہوگی ورنہ یہ ہم دونوں میں سے کسی کو ضرور نقصان پہنچائے گی۔" نعمان نے لائٹ آف کی تو ایک خوفناک چیخ سے کمرے کی فضا گونج اٹھی اور کوئی چیز نیچے فرش پر گری پھر خاموشی چھا گئی۔

اسلم نے کہا لگتا ہے کہ وہ پھر اپنی شکل میں آ گئی ہے یعنی مورتی والی شکل میں۔" تو نعمان نے کانپتے ہاتھوں سے لائٹ کو آن کیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مورتی اوندھے منہ فرش پر گری ہوئی تھی تو نعمان نے اللہ کا نام لے کر ایک چھڑی کی مدد سے اسے سیدھا کیا تو اس مورتی نے ایک جھٹکا لیا اور پھر ساکت ہو گئی۔ مگر اس بار اس کے منہ سے لے کر اس کے دیگر جسم پر بھی کافی خون لگا ہوا تھا۔ جو کہ بالکل

تازہ تھا۔ اسلم نے کہا کہ لگتا ہے آج پھر اس نے کوئی شکار کیا ہے۔

صبح جب بابا آئیں گے تو ان کو ہم دکھائیں گے۔'' وہ دونوں کمرے سے نکل آئے اور دوسرے کمرے میں جا کر سو گئے۔

☆......☆......☆

صبح اٹھ کر ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر اور وہ دونوں باہر نکل گئے۔ وہ اپنے مکان سے دسویں مکان کے پاس سے گزر رہے تھے وہاں سے رونے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ دونوں بھی وہاں پہنچ گئے۔ لوگوں سے پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ کل رات ہمارا نوجوان بیٹا اچانک مر گیا۔ مگر اس کی گردن اور جسم کے مختلف حصوں پر باریک باریک سوراخ تھے۔ اس کا رنگ بالکل پیلا ہو گیا تھا۔ جیسے کسی چیز نے اس کے جسم سے سارا خون نکال لیا ہو۔''

وہ دونوں یہ سن کر اپنے گھر کی طرف دوڑے تو سامنے نعمان کے والد اور تین سپاہی گاڑی میں وقوعہ کی طرف آ رہے تھے۔ انسپکٹر نے جب اپنے بیٹے کو دیکھا تو گاڑی روکی۔

''کہاں بھاگے جا رہے ہو۔ وہ بھی اتنی خوف زدہ صورت بنا کر۔'' تو نعمان نے وہی کہانی دہرائی کہ اس آدمی کی موت بھی اس طرح واقع ہوئی ہے جیسے گزشتہ رات عباس کمہار کی ہوئی تھی۔

انسپکٹر نے کہا کہ مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ آخر یہ چیز ہے کیا جو انسان کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیتی ہے۔''

تو اسلم نے نعمان کے کان میں کہا کہ گزشتہ رات کا ذکر بابا سے کر دوں۔'' نعمان نے اپنے والد سے اکیلے ملنے کو کہا تو انسپکٹر نے کہا۔

''کیوں بیٹا خیریت تو ہے۔ ایسی کون سی بات ہے جو تم ان کے سامنے نہیں بتا سکتے۔'' نعمان نے اصرار کیا تو اس کے والد اس کے ساتھ گاڑی سے ذرا دور چلے گئے۔ نعمان نے انہیں مختصراً تمام حالات سے آگاہ کیا تو حیرت کے مارے ان کا چہرہ عجیب سا ہو گیا۔

''نعمان بیٹا فی الحال اس بات کا ذکر کسی سے مت کرنا۔ میں رات کو خود اس پُراسرار مورتی کا جائزہ لوں گا۔''

انسپکٹر نے سپاہیوں سے کہا کہ تم حادثے والی جگہ پر چلو میں ابھی آتا ہوں۔'' وہ اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر رستم کے مکان کی طرف آ گئے اور پھر واپس اسلم کے گھر آ کر بیٹے کے کمرے کا جائزہ لینے اندر چلے گئے۔

وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئے تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ اب وہی مورتی بالکل صاف سامنے میز پر کھڑی تھی۔ انسپکٹر عالم نے کہا۔

''بیٹا تم کہہ رہے تھے کہ یہ نیچے فرش پر پڑی ہوئی تھی تو پھر یہ یہاں کیسے آ گئی۔ کہیں تم نے جھوٹ تو نہیں بولا۔'' اسلم نے کہا۔

''انکل میں اور نعمان خود اس کو رات کو زمین پر اوندھے منہ گرا ہوا چھوڑ کر گئے تھے۔''

انسپکٹر نے مورتی کو اٹھا کر اس کا جائزہ لیا مگر وہ اب ایک ڈیکوریشن پیس کے علاوہ کچھ نظر نہ آئی تھی۔ وہ حیران ہو کر بولے۔

''یہ بے جان سی مورتی اتنے پُراسرار خون کیسے کر سکتی ہے۔ آج رات اس کمرے کی میں خود رکھوالی کروں گا۔'' انسپکٹر رات کا انتظار کرنے لگا اور اپنے سپاہیوں کو بھی حکم دیا کہ نیچے کھڑے ہو کر اس کھڑکی پر نظر رکھنا۔

☆......☆......☆

رات کو انسپکٹر عالم واپس کمرے میں آئے اور لائٹ آف کر دی مگر ایک چھوٹی سی ٹارچ اپنے پاس رکھ لی۔ اپنے مخصوص وقت پر کھڑکی سے چمگادڑوں کا غول اندر داخل ہوا اور مورتی کے سر کے اوپر آ کر گھومنے لگا اور ان کی آوازوں نے خوفناک سا ماحول بنا دیا تھا۔ معمول کے مطابق مورتی میں جان آئی اور اس نے ایک زوردار چیخ منہ سے نکالی اور پھر کھڑکی کی جانب اڑنے لگی۔ اور دیگر چمگادڑ اس کی رہنمائی میں اس کے تعاقب میں اڑنے لگے۔ باہر پولیس والے بھی ہائی الرٹ ہو چکے تھے۔ چمگادڑوں کا پیچھا شروع کیا تو انسپکٹر بھی ان کے ساتھ تھا۔ ابھی تھوڑی دور گاڑی چلی ہو گی کہ چمگادڑوں کے غول نے ان پر حملہ کر دیا۔ پولیس والوں نے فائرنگ شروع کر دی تو چمگادڑوں کی چیخوں نے فضا کو لرزا دیا۔ پولیس والے

تو ایک پانی کے بھرے تالاب میں کود گئے اور پانی میں ڈبکی لگا کر نیچے ہو گئے مگر چمگادڑ تالاب کے اوپر گھومتے ہوئے ایک جانب نکل گئے۔

اچانک تالاب کے کچھ فاصلے پر بنے ایک مکان سے چیخنے کی آواز آئی پولیس والے اس مکان کی طرف دوڑے۔ وہ جیسے ہی دیوار پھلانگ کر مکان میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بہت سارے چمگادڑ ایک جسم کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ یہ خوفناک منظر دیکھ کر سب کے دماغ بھک سے اڑ گئے۔ انہوں نے پھر سے فائر کھول دیے مگر چمگادڑوں نے بھی ان پر حملہ کر دیا تھا۔ ان سب میں ایک سنہری رنگ کا چمگادڑ جو کہ عام سائز کے چمگادڑوں سے کافی بڑا تھا۔ ایک پولیس والے کے چہرے پر چمٹ گیا اور بے بسی سے چیخنے چلانے لگا۔ اور پھر کچھ دیر بعد وہ بھی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ پھر تمام چمگادڑ اُڑ کر آسمان کی طرف پرواز کر گئے۔

انسپکٹر نے دونوں لاشوں کو گاڑی میں رکھوایا اور واپس چلے تو سحر پھوٹنے والی تھی۔

وہ پہلے اسپتال گئے۔ ان کا پوسٹ مارٹم کرایا پھر انہیں لے کر واپس آ گئے۔ اس کے بعد انسپکٹر اپنے گھر پہنچے تو صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔

انسپکٹر نے سب سے پہلے کسی عامل کی تلاش شروع کی تاکہ پتا چلے کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ آخرکار انسپکٹر نے کسی پہنچے ہوئے عامل کا نمبر حاصل کیا اور عامل بابا کا نمبر ڈائل کیا اس سے بات کی اور اسے ملنے آنے کو کہا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد عامل بابا وہاں پہنچ گئے۔ اب وہ انہیں اوپر کمرے کی طرف لے کر آ گئے۔

عامل بابا اندر داخل ہوئے اور اس مورتی کا جائزہ لینے لگے پھر انہوں نے مورتی کو کمرے کے درمیان میں رکھ کر اس کے اردگرد ایک دائرہ کھینچا اور منہ میں کچھ پڑھنے لگے تو دائرے میں موجود مورتی نے آہستہ آہستہ حرکت کرنی شروع کر دی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس مورتی نے ایک خوفناک چمگادڑ کی شکل اختیار کر لی۔ وہ دائرے سے باہر نکلنا چاہتا تھا تاکہ اس عامل بابا کا خون پی سکے، مگر وہ دائرے کے باہر نہ نکل سکی تو عامل بابا کے ہونٹ ہلے مگر چمگادڑ کے منہ سے بہت ہی خوفناک قسم کی آوازیں نکلنی شروع ہو چکی تھیں۔ عامل بابا کے بھی ہونٹ ہلنے لگے اور ایک گرج دار آواز ابھری۔

”بتا تُو کون ہے ورنہ تجھے جلا کر بھسم کر دوں گا۔“

چمگادڑ چیخ رہا تھا کہ عامل بابا نے مزید کچھ پڑھا تو وہ نیچے گر کر تڑپنے لگا۔

بول نہیں تو اسی طرح تڑپا تڑپا کر ماروں گا تجھے۔ سچ سچ بتا تُو کون ہے اور اس مورتی کا راز کیا ہے۔“

چمگادڑ کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلی اور پھر اس میں سے آواز آئی۔

”میں ایک خونی آتما ہوں اور مجھے اس مورتی میں قید کر دیا گیا ہے۔ میں صدیوں سے ان پہاڑوں کے مندر میں دفن تھی مگر اب میں آزاد ہو گئی ہوں۔ اب کوئی مجھے قید نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ میں نے دو آدمیوں کا خون پی کر اپنی طاقت بڑھا لی ہے اور مزید چار آدمیوں کا خون پی کر اپنی طاقت بڑھا لی ہے اور مزید چار آدمیوں کا خون پی کر ساتواں خون اُس آدمی کا ہوگا جو مجھے آزاد کرا کے یہاں لایا ہے۔ اس کے بعد میں ایک شکتی مان آتما بن جاؤں گی۔ پھر میں اس دنیا کو تہس نہس کر کے رکھ دوں گی۔“

پھر ایک زوردار چیخ ابھری کہ کمرے کی فضا کے علاوہ وہاں پر موجود لوگ کانپ گئے۔

”دوسری بات یہ ہے کہ میں اتنی جلدی مرنے والی نہیں ہوں کیونکہ مجھے سو سال کی طاقت مل چکی ہے۔ مزید طاقت جلد بڑھا لوں گی میرے ساتھی میرے لیے شکار ڈھونڈتے ہیں اور پھر مجھے اس شکار کے پاس لے جاتے ہیں اور ہم سب مل کر اُس آدمی کا خون چوستی ہیں تم عامل لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

اتنا کہنے کے بعد وہ یکدم زمین پر گری اور پھر سے چمگادڑ کی مورتی بن گئی۔ انسپکٹر نے کہا۔

”باباجی! یہ سب کیا ہے؟“

عامل بابا نے کہا کہ یہ ایک آتما ہے جو کہ زمین کی گہرائی سے نکل کر آئی ہے۔ اگر اس نے سات آدمیوں کا خون پی لیا تو پھر بہت مشکل ہو جائے گا اس

کو مارنا۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''بابا جی اب یہ مرے گی کیسے؟''

عامل بابا نے کہا کہ جب تک اسے کسی گہرے پانی میں نہیں پھینک دیا جاتا یہ مرے گی۔نہیں جتنا جلد ہو سکے اس کو سمندر یا دریا برد کر دو۔ ورنہ تم سب کی خیر نہیں۔اب میں چلتا ہوں۔اسے آج ہی کہیں ٹھکانے لگا دو وہ بھی شام کے سائے ڈھلنے سے پہلے، ورنہ یہ زندہ ہو جائے گی۔''

انسپکٹر نے بابا جی سے سب باتیں سنیں تو اس نے کہا کہ ٹھیک ہے، ہم آج ہی اسے دریا میں پھینک دیں گے۔

انسپکٹر نے اسی وقت دو پولیس والے ایک خود اور بیٹے کو ساتھ لے کر گاڑی پر اسے ڈال کر لے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔انسپکٹر نے مورتی کو جیسے ہی چھوا تو اس کا ہاتھ جل گیا اور مورتی زمین پر جا گری۔

اس نے عامل بابا سے کہا کہ یہ کیا ہوا۔یہ اتنی گرم کیسے ہو گئی تو عامل بابا نے کہا پہلے اس پر پانی ڈالو پھر اٹھاؤ تو اسلم پانی لینے چلا گیا واپسی پر اس پر پانی ڈالا اور پھر مورتی کو اٹھا لیا۔سہ پہر کے 4 بج چکے تھے۔

انہیں چھ بجے سے پہلے پہلے اسے دریا میں پھینکنا تھا۔انہوں نے جلدی جلدی گاڑی اسٹارٹ کی تو پھر وہ جہاز چوک کی طرف نکل گئے۔اور پھر وہاں سے بنوں روڈ پکڑ کر کالاباغ کی طرف رُخ کر لیا۔

انسپکٹر نے گاڑی کی کافی سپیڈ بڑھا دی تا کہ جلد از جلد پہنچا جا سکے۔

ابھی وہ بائی فیل ہی کے پاس پہنچے تھے کہ ان کی گاڑی کا ٹائر اچانک پھٹ گیا۔تو انہوں نے بڑی مشکل سے گاڑی کے ہینڈل کو قابو کیا اور انسپکٹر نے شکر ادا کیا کہ ہم بچ گئے۔پھر سپاہیوں نے گاڑی کا ٹائر بدلا اب پونے پانچ بج چکے تھے۔انہوں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ان کی گاڑی پھر روڈ پر فراٹے بھرنے لگی۔پھر وہ ماڑی پہنچے ،وہاں سے کالاباغ کی طرف رخ کیا تو پانچ بج چکے تھے۔سورج ابھی پہاڑوں کی اوٹ سے کچھ اوپر تھا۔انہوں نے گاڑی کی رفتار مزید تیز کی۔تو وہ کالا باغ دریائے سندھ کے پل کے درمیان پہنچنے ہی والے تھے کہ سامنے سے ایک دم ایک گاڑی آ گئی۔تو ایک دوسرے کو بچانے کے لیے جلدی ہی موڑنے والے تھے کہ اچانک پل کے تختے ٹوٹ گئے کیونکہ کالاباغ کا پل برطانیہ حکومت نے 1918ء میں بنایا تھا اور اس پل پر لکڑی کا کام کیا گیا تھا۔تختے ٹوٹتے ہی اُن کی کار پل کے نیچے سے دریا میں جا گری۔وہ چاروں بھی گاڑی میں تھے جس گاڑی کو بچایا تھا۔ان لوگوں نے یہ صورت دیکھی تو گاڑی روک کر اِدھر آئے مگر افسوس گاڑی دریا کے پیٹ میں چلی گئی تو لوگوں نے شور مچا دیا اور ایک مسافر نے تو مختلف جگہوں پر فون کیا تو امدادی ٹیمیں فوری طور پر پہنچ گئیں اور سورج پہاڑوں کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔

کافی جدوجہد کے بعد غوطہ خوروں نے وہ گاڑی ڈھونڈ لی پھر اس سے لاشیں نکالیں اور رسیوں کی مدد سے باہر لے آئے۔اللہ کا شکر تھا کہ ان کی گاڑی بہت بڑے جال میں اٹکی ہوئی تھی جو کہ لوہے کا بنا ہوا تھا۔اس لیے زیادہ گہرائی میں نہیں گئی تھی۔غوطہ خوروں نے لاشیں نکال لی تھیں۔مگر وہ جال کافی زنگ آلود ہو چکا تھا اِدھر لاشیں نکلی تھیں کہ گاڑی مزید نیچے دریا کی تہہ میں چلی گئی۔ہمیں بھی اطلاع مل چکی تھی۔اسلم اور اس کے گھر والے اور سرکاری ادارے کے لوگ بھی وہاں پہنچ چکے تھے ایمبولینس پر لاشیں پڑی تھیں اور پھر انہیں میانوالی کی طرف لے جانے لگے جب اسلم واپس آ رہا تھا تو اندھیرا کافی چھا چکا تھا۔مگر ابھی اندھیرا مزید گہرا نہیں ہوا تھا۔اُس نے شکر ادا کیا کہ چھ بجنے سے پہلے ہی حادثے کے وقوع پذیر ہونے تک وہ مورتی کو دریا برد کر چکا تھا۔جب وہ ماڑی شہر کے نزدیک سے گزر رہے تو اس کی نظر سائیڈ پر پہاڑوں پر چلی گئیں۔جب وہ دوست کے ساتھ اس پہاڑیوں پر گیا تھا۔ان پہاڑی کی چوٹی پر بنی دیو قامت شبیہہ پُراسرار نظر آ رہی تھی اور نا جانے یہ پہاڑ پر بنے مندر اپنے اندر کتنی پُراسراریت اپنے اندر چھپائے اس دھرتی پر موجود ہیں۔

آج بھی اِن پہاڑوں کو دیکھ کر وہ خونی چمگادڑ کی مورتی اپنے چمکتے سنہری رنگ کے ساتھ ہماری یادیں روشن کر کے خوف کی کپکپی طاری کر دیتی ہے۔

☆☆......☆☆



جھولی میں شیطان

حنا فرید

اُس بے اولاد جوڑے کی داستان، جس نے اولاد کے روپ میں ایک شیطان پال لیا تھا





ڈھول کی آواز پورے محلے میں گونج رہی تھی۔ لڑکیاں گلے پھاڑ پھاڑ کر شادی کے گیت گا رہی تھیں۔ کسی کے چہرے پر اُداسی تھی تو کسی کے چہرے پر خوشیاں۔ آج گاؤں کی ایک لڑکی مہرو، جو سب کی چہیتی تھی۔ کل اُس کی اِس گاؤں سے رخصتی ہونے والی تھی۔ دوسرے گاؤں والا دُلہا، ہادی بھی کسی سے کم نہ تھا۔ گبرو جوان اور خوبصورت تھا۔ جب دوسرے دن ہادی کی بارات مہرو کی دہلیز پر آئی تو کنواری لڑکیوں نے منہ میں دوپٹے لے لیے۔

''اِنا سوہنا منڈا اپنی مہرو کو ملا۔'' کتنی ہی لڑکیوں کے دلوں پر چھریاں چل گئیں اور جو مہرو کی سچی سہیلیاں تھیں۔ اُن کا دل خوشی سے جھوم گیا اور جو دل میں کھوٹ رکھتی تھیں۔ اپنی بد نیتی اور بد عملی سے اپنا ہی دل جلانے لگیں۔ اُدھر مہرو کا باپ عبدالغنی اور مہرو کی ماں فاخرہ دونوں کے دل اُداس تھے۔ اُن کی لختِ جگر آج اُن سے دور ہو رہی تھی۔ دونوں کا رو رو کر برا حال تھا۔ مہرو کی اماں کو چچی فاطمہ نے سنبھالا ہوا تھا۔ چچی کا رنگ بھی زرد ہو رہا تھا۔ فاخرہ کا دل کر رہا تھا کہ مہرو کو دوڑ کر کلیجے میں چھپا لے۔ لیکن اچانک ہی فاخرہ کے دل میں وہی شدید درد اٹھا جس کی تکلیف وہ پہلے بھی سہہ چکی تھی۔ لیکن غربت نے انہیں علاج کروانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اور نہ ہی وہ اس سے پہلے جان پائی تھی کہ مہرو اُن کو اتنی عزیز ہے۔ فاخرہ کو دل کا دورہ پڑ گیا۔ گاؤں والے انہیں گاؤں کے کسی حکیم کے پاس لے کر بھاگے۔ اُن کی جڑی بوٹیوں سے اسے کچھ آرام آیا تو گھر لایا گیا۔ گھر آتے ہی فاخرہ نے اپنی بیٹی مہرو کی رخصتی کی تیاری کی اور اسے رخصت کر دیا۔

یہ تھی مہرو کی پہلی بد نصیبی، اِدھر مہرو کے دل میں وسوسے اٹھ رہے تھے کہ یا اللہ میری رخصتی کے دن میری ماں کو کیا ہو گیا۔ پہلے ہی میرے ابا اتنے پریشان رہے۔

مہرو کے جہیز میں ہادی کے گھر والوں نے اُس کے ابا سے آدھی زمین، دو بھینسیں دس بکریاں مانگی تھیں۔ یہ اُس کے ابا کی روزی کا ذریعہ تھا۔ انہوں نے اپنا نہ سوچا اور بیٹی پورے مطالبے کے ساتھ رخصت کر دیا۔ جب اُس نے عبدالہادی کے گھر میں قدم رکھا تو اُسے بے گانیت محسوس ہوئی اور ایسا محسوس ہوا کہ اُسے کافور اور لوبان کی بو آ رہی ہو۔ اور یہ سب دیکھ کر اُس کا دل کانپ اٹھا کہ یہ بو کہاں سے آ رہی ہے۔ اُس نے درگزر کر دیا۔

جب وہ حجلۂ عروسی میں سیج پر بیٹھی تو اُسے بیٹھے ہوئے ابھی پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ دھڑ کر کے دروازہ کھلا اور عبدالہادی کی ماں اندر آ گئیں۔ اور آتے ہی اُسے کہنے لگیں۔

''دیکھ لڑکی تُو میرے آنگن میں آئی تو ہے لیکن اگر

تُو نے ہم ماں بیٹے میں دوریاں پیدا کرنے کی کوشش کی تو اچھا نہ ہوگا۔"

وہ جو اپنی ماں کی وجہ سے پریشان بیٹھی تھی اور پریشان ہوگئی۔ نئی دلہن کا کیا اس طرح استقبال ہوتا ہے۔ اُس کے دل میں جتنے بھی ارمان تھے سب آنسوؤں میں بہہ گئے۔ ابھی ساس کو گئے ہوئے دو منٹ ہی ہوئے تھے کہ عبدالہادی آ گیا۔

"اُس کے آنے سے اُسے تھوڑا دلاسا ملا۔ اُس نے اُسے کہا کہ اماں دل کی بری نہیں ہے۔ بس تھوڑی زبان کی تیز ہے۔"

عبدالہادی سے بات کر کے اس کے دل کو سکون محسوس ہوا۔ اپنا چلو کوئی بات نہیں یہ تو اپنا ہے، شوہر ہے۔"

☆......☆......☆

جب وہ اٹھی تو دروازہ دھڑ دھڑ بج رہا تھا۔ اُس نے جلدی سے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو عبدالہادی کی بہن کمر پر ہاتھ ٹکائے کھڑی تھی۔ مہرو کو دیکھ کر بولی۔

"نواب زادی کب تک سوتی رہو گی۔ کچھ کام دھام کرنا ہے کہ نہیں۔ لاڈلی ہو گی تم اپنے گھر کی۔ یہاں میرا راج چلتا ہے۔ چلو اٹھو اور سب کے لیے ناشتا بناؤ۔"

مہرو نے دل کڑا کر کے سب برداشت کیا کہ چلو کوئی بات نہیں ہادی تو اچھا ہے۔ پھر وہ اٹھ کر گئی اور تندور میں لکڑیاں جھونکیں، دوسرے چولہے پر چائے بنائی اور سب کا ناشتا لگایا۔ عبدالہادی اُسے بے چارگی سے دیکھ رہا تھا۔ مہرو کی تقدیر کسی رات کی تاریکی میں بنی تھی جو اُسے کبھی سکون کا سانس نصیب نہ ہوا۔ شادی سے پہلے ساری لڑکیوں کی طرح اُس نے بھی اپنی آنکھوں میں کچھ سپنے سجائے تھے۔ وہ سوچا کرتی تھی کہ شادی کے بعد بہت اچھا سسرال ملے گا مگر......

پھر بھی وہ بڑے پیار محبت سے سب کے ساتھ پیش آتی تھی۔ جس دن کھانا پکانے میں دیر ہو جاتی تو اماں کی بڑبڑاہٹیں بڑھ جاتیں۔ اسی طرح دن گزرتے گئے اور کب ایک سال گزر گیا۔ پتا بھی نہ چلا۔

اب مہرو کی ساس نندیں اُسے کھلم کھلا طعنے مارنے لگیں۔ بڑی نند تو جب بھی آتی ماں کے کان خوب بھرتی



کہ اماں دیکھو شکیلہ آپا کی بیٹی نوری کی بھی تو بھائی کے ساتھ شادی ہوئی تھی۔ اُس کے تو دو جڑواں لڑکے ہوئے ہیں۔ اس کوکھ جلی کو تو دیکھو ایک مچھر کا بچہ بھی نہ جن پائی۔"

بڑی نند کی باتیں اُس کے دل کو چھلنی کر دیتیں۔

ہادی کا گھر جس جگہ تھا اُس گھر کے برابر میں ایک بہت بڑا قبرستان تھا۔ جہاں ہر وقت ویرانی رہتی تھی۔ بس جب کوئی فوتگی ہوتی تو سب وہاں جاتے ورنہ ہر کوئی وہاں جانے سے گھبراتا تھا۔ اجنبی سی سنسان جگہ تھی وہ۔ شروع شروع میں تو مہرو کو بہت ڈر لگتا تھا۔ اس قبرستان کے پیچھے ہی پانی کا کنواں تھا۔ جہاں سے سب پانی بھرتے تھے۔ مہرو کی ساس اُسے بھی پانی بھرنے بھیجا کرتی تھی۔

ہادی کا مٹکے بنانے کا کاروبار تھا۔ جو ٹھیک نہیں چلتا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے گھر کا خرچا پورا کرتا تھا۔ یہ سب مہرو کو بعد میں پتا چلا تھا۔

شادی کے وقت تو اُس کی ساس نے ہادی کا کام بہت اچھا بتایا تھا۔ اسی لیے تو اُس کے بابا نے اُس کی شادی ہادی سے کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب تو جو ہونا تھا وہ ہو گیا تھا۔

اب سب کچھ اُس کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ وہ ہادی سے کہتی تو ہادی اُسے کہتا کہ اماں ہی ہیں۔ وہ تو سب کچھ کہہ سکتی ہیں۔"

اللہ کو اُس پر ترس آ گیا اور ہادی کو دوسرے گاؤں میں بہت اچھا کام مل گیا اور اُس نے ماں کو کہا کہ وہ دوسرے گاؤں میں کام کرے گا۔"

اماں نہیں مانی لیکن جب کھانے کے لالے پڑے تو اماں نے جانے کی اجازت دے دی۔ مہرو کو ماں نے ہادی کے ساتھ جانے سے روک دیا تھا کہ گھر کا کام کون کرے گا۔"

تو ہادی نے کہا کہ اماں تُو بھی چل میرے ساتھ۔" تو اُس کی ماں نے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گی۔ تمہارے ابا کی یادیں یہیں اسی گاؤں میں بسی ہیں۔" ہادی کے سمجھانے بجھانے پر انہوں نے مہرو ساتھ لے جانے کی اجازت بھی دے دی۔ اور یوں وہ دونوں دوسرے گاؤں کے لیے روانہ ہو گئے۔

☆......☆......☆

قارئین میری اصل کہانی اب شروع ہو گی جو میں آپ کو اپنی زبانی بتاؤں گی۔

دوسرے گاؤں جا کر بھی میں نے اپنے گھر کو خوب سجایا اور ہادی نے بھی میری مدد کی۔ اب بس ایک غم تھا اور وہ غم تھا اولاد کا۔ ہم دونوں خوشی سے زندگی گزار رہے تھے۔ مگر کسی بچے کا وجود ایک ایسا خلا تھا جو ہمیں اندر ہی اندر کھا رہا تھا۔

کسی نے کہا کہ تم کوئی بچہ گود لے لو۔" میں نے ہادی سے بات کی تو ہادی نے کہا کہ کون دے گا اپنا بچہ ہم کو۔"

ہمارے برابر میں ایک عورت رہتی تھی جس کو سب خالہ سلطانہ کہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اگر کوئی بچہ میری نظر میں آئے گا تو میں بتاؤوں گی۔"

پھر کیا تھا ہم بہت دل سے بچے کے لیے دعا کرنے لگے۔ اور ایک بار پھر اللہ تعالیٰ کو مجھ پر رحم آ گیا۔

ایک دن ہادی نماز پڑھنے جا رہا تھا کہ اُسے ایک بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھا شاید کسی گھر میں سے آواز آ رہی ہے۔ وہ درگزر کر کے مسجد روانہ ہوا۔ مسجد کے راستے ہی میں ایک کچرا دان تھا۔ وہ آواز وہیں سے آ رہی تھی۔

ہادی نے ذرا نظر گھما کر دیکھا تو ایک جگہ ایک گندی سی پوٹلی پڑی تھی۔ جس میں سے بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے آس پاس دیکھا اور اُس پوٹلی کو کھول کر دیکھا تو اُس میں واقعی ایک بچہ تھا۔

ہادی کو بہت ڈر لگا کہ یہ کیا ہے۔ اس نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کر لیے اور وہاں سے بھاگا بھاگا گھر پہنچ گیا۔

میں نے ہادی سے پوچھا تو اُس نے مجھے بچے کے بارے میں بتایا۔ میں نے اِسے کہا کہ اللہ نے ہمیں شاید اسی طرح اولاد کا سکھ دیا ہے۔ ہم اُسے گھر لے کر آ جاتے ہیں۔"

پہلے تو ہادی نہ مانے پھر میرے زور دینے پر وہ میرے ساتھ چلے۔ اور ہم ایک چادر میں لے کر اُسے گھر لے آئے۔ ہمیں حیرت ہوئی کہ کسی کو بھی ہمارے ہاتھ میں کچھ نظر نہ آیا......

خیر ہمیں بچے کی خوشی اتنی تھی کہ اِن باتوں کے سوچنے میں اپنا دھیان نہ لگایا۔
گھر آ کر دیکھا تو وہ لڑکی تھی۔ بہت ہی خوبصورت، بڑی بڑی آنکھوں والی، گوری رنگت گلاب کی کلی جیسے ہونٹ، لمبی ناک خوبصورتی کا شاہکار تھی وہ۔
وہ پری میری زندگی میں کیا آئی میری زندگی میں بہار آ گئی تھی۔ لیکن مجھے نہیں پتا تھا کہ میری زندگی میں آگے کیا ہونے والا ہے۔
ہم اُسے گھر لے آئے اور لاتے ہی میں نے اُسے نہلایا اور ایک چادر میں لپیٹ دیا اور اُسے دودھ پلا کر سلا دیا۔ دودھ وہ ایسے پی رہی تھی کہ جیسے، جانے وہ کب کی بھوکی ہے۔ پھر ہم بھی سو گئے لیکن وہ رات ہم پر بہت بھاری گزری۔ جب آنکھ بند کرتے تو ایک خونخوار بلی کی شکل دکھائی دیتی۔
خیر جیسے تیسے ہم نے وہ رات گزاری صبح اُٹھ کر میں نے اُسے تیار کیا۔ دودھ دیا اور اس کے کپڑے سی کر اُسے پہنائے اور اپنے کام میں لگ گئی۔ عجیب بات یہ تھی کہ اُسے تھوڑی تھوڑی دیر بعد بھوک لگنے لگتی تھی۔ ہماری گائے کا سارا دودھ وہ پی جاتی۔ ہم نے اُسے بڑے پیار سے پالا۔ اب وہ ایک سال کی ہو گئی تھی اور اب میں اُسے کھانا بھی کھلانے لگی تھی۔ وہ گوشت بہت شوق سے کھاتی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ ایک سال کی بچی اتنا گوشت کیسے کھا سکتی ہے۔ اور جب بھی میں گوشت بناتی تو وہ کچا گوشت کھا جاتی یہاں تک کہ اُس کا خون بھی چاٹ جاتی یہ میں نے چپکے چپکے کئی بار دیکھا تھا۔ وہ جوں جوں بڑی ہوتی جا رہی تھی بہت خوبصورت ہوتی جا رہی تھی۔ ایک بات اور بھی تھی جب سے وہ ہمارے گھر میں آئی تھی تب سے جو بلی مجھے اور ہادی کو خواب میں نظر آتی تھی۔ بالکل اُسی طرح کی بلی ہمارے گھر میں آنے لگی تھی۔ مجھے یہ بہت عجیب لگا۔
ہم نے اپنی بیٹی کا نام سمرینہ رکھا تھا۔ سمرینہ اُس بلی کے ساتھ بہت خوش رہتی تھی۔ اکثر سمرینہ اُس کے ساتھ رات کو بھی کھیلتی ہوئی ملی تو میں نے ہادی سے کہا کہ اس بلی کو بہت دور چھوڑ کر آ جاؤ۔ پر اُس نے میری بات ہنسی میں اڑا دی۔

اب سمرینہ تین سال کی ہو گئی تھی اور دوسرے گاؤں سے ہادی کی ماں کے مرنے کی خبر آئی تو سب رشتے دار وہاں آ گئے۔ پھر ہادی نے فیصلہ کیا کہ اب ہم اپنے ہی گاؤں میں رہیں گے اور پھر ہم اپنے گاؤں واپس چلے گئے۔

☆......☆......☆

ہادی نے اپنا کام بھی یہاں شروع کر دیا۔ ہم نے سمرینہ کا سب کو یہ ہی بتایا تھا کہ سمرینہ ہماری ہی بیٹی ہے کسی کو سمرینہ کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ اب اس گھر میں، میں، ہادی اور ہماری بیٹی سمرینہ رہتے تھے۔
ہادی کی بہنوں کی شادی ہو چکی تھی اور ہادی ایک ہی بھائی تھا چار بہنوں کا۔
ہمیں یہاں آئے ہوئے ابھی ایک ہی ہفتہ ہوا تھا کہ وہ بلی جو دوسرے گاؤں میں تھی وہ اب یہاں بھی آنے لگی۔ میں نے ہادی سے کہا کہ مجھے اس بلی سے بہت ڈر لگتا ہے۔''
پگلی یہ تو ایک جانور ہے۔ ہماری سمرینہ کی محبت میں آ گئی ہوگی۔ اس سے کیا ڈرنا۔''
اب سمرینہ بولنے لگی تھی۔ مجھے اماں اور ہادی کو بابا پکارنے لگی تھی۔ جب سے ہم یہاں آئے تو ایک ایک کر کے گھر کی ساری مرغیاں غائب ہونے لگی تھیں۔ حیرت کی بات تھی کہ مرغی کے بس پر دڑبے میں ملتے تھے۔ باقی سب کچھ غائب ہوتا تھا۔ ایک ایک کر کے پورا دڑبہ خالی ہو گیا۔
ہادی نے کہا کہ کوئی جانور دڑبے میں جا کر مرغیاں کھا جاتا ہوگا۔ لیکن مجھے اس بات کی سمجھ نہ آئی تھی۔ پھر یہ سلسلہ بند ہو گیا۔
سمرینہ اب کافی خوش رہنے لگی تھی۔
کچھ دنوں بعد ہماری ایک بکری مری ہوئی ملی جیسے کسی نے ایسے نوچ نوچ کر کھایا ہو۔
اُس دن تو ہادی بھی ڈر گیا۔ جب وہ بکریوں کو کھانا ڈالنے اُن کے پاس گیا تو اُس نے زور زور سے چلا کر مجھے پکارا۔ میں بھاگی بھاگی آئی تو میں نے دیکھا کہ ایک بکری آدھی کھائی ہوئی پڑی تھی۔ کسی جانور نے بکری کا دل نکال کر کھایا ہو۔ پھر خوب گوشت نوچ کے کھایا ہو۔ اب یہ روز کا معمول بن گیا۔ آئے دن ایک بکری آدھی کھائی ہوئی ملتی تھی۔ مرغیوں کی طرح بکریوں کے ساتھ

بھی یہی ہوا۔ ایک ایک کر کے پوری بھینسیں، بکریاں، کوئی جانور کھا گیا اب تو ہادی نے کہا اللہ جانے کون سا جانور گاؤں میں آ گیا ہے۔ جو ہمارے گھر کے جانور کھا گیا ہے۔ اب تو صرف چار بھینسیں بچی تھیں۔ ہادی نے کہا کہ ہمارے گھر جانور نہیں بچ پا رہے تو ایسا کرتے ہیں کہ ہم یہ بھینسیں بیچ دیتے ہیں۔''

اور اُسی رات ایک بھینس کو اُسی طرح کھایا۔ اب تو ہادی نے فوراً تین بھینسیں بیچ دیں۔ اِدھر سمرینہ اب گیارہ سال کی ہو گئی تھی۔ لیکن وہ اب بھی اپنی عمر سے بڑی لگتی تھی۔ ایسا لگتا جیسے وہ کوئی اٹھارہ سال کی خوبصورت دوشیزہ ہو۔

اب تو اُس کے لیے رشتے بھی آنے لگے تھے۔ ہمیں اپنی بیٹی سے بہت پیار تھا۔ وہ گاؤں کے اسکول میں پڑھتی تھی، جو صرف مڈل تک تھا۔ وہ زیادہ تر اکیلی رہتی تھی۔ اس لیے اب وہ اسکول بہت شوق سے جانے لگی تھی۔

وہ اپنی کلاس میں سب سے بڑی لگتی تھی۔ ہادی کو فکر ہونے لگی کہ وہ اپنی کلاس میں سب سے بڑی ہے۔ اس لیے انہوں نے کہا کہ اب اسکول چھوڑ دو۔'' یہ بات سُن کر اُس نے رو رو کے اپنا برا حال کر دیا۔

''نہیں میں تو اسکول جاؤں گی۔'' پھر میں نے اور ہادی نے سوچا کہ اسکول میں ایسا کیا ہے جو یہ اسکول جانا چاہتی ہے۔ پڑھائی میں تو بہت کمزور ہے۔ پھر ایسا کیا ہے اسکول میں۔''

ہم اُس کے آگے مجبور ہو گئے اور اُس کو اسکول جانے دیا۔

☆......☆......☆

ایک دن وہ اسکول سے بہت دیر سے گھر آئی۔ ہم لوگ پریشان ہو گئے اُس سے پوچھا کہ کیا ہوا اتنی دیر سے کیوں آئی ہو تو اُس نے کہا کہ دوست کے گھر چلی گئی تھی۔''

میں نے اُسے سمجھایا کہ بیٹا بغیر بتائے کسی کے گھر نہیں جاتے۔'' پھر اُس نے کہا۔

''اچھا اماں اب نہیں جاؤں گی۔''

ایک گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ پورے گاؤں میں شور مچ گیا۔ شرفو کی بیٹی نیلوفر گھر سے غائب ہے۔ جو سمرینہ کے ہی اسکول میں پہلی جماعت میں پڑھتی تھی۔ اُسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے رات ہو گئی تھی۔

صبح جب سمرینہ اسکول گئی تو ہمارا دل بہت ڈر رہا تھا کہ بیچارے شرفو کی بیٹی بھی تو اسی اسکول میں پڑھتی تھی اللہ جانے وہ کہاں چلی گئی ہے۔ اُسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا وہ مل کر ہی نہیں دی۔

اُس دن سمرینہ وقت سے بہت پہلے اسکول سے آ گئی۔ میں نے پوچھا کیا ہوا بھئی آج جلدی چھٹی ہو گئی کیا۔'' پر وہ چپ رہی۔

میرے زیادہ اصرار پر اُس نے بتایا کہ اماں میری طبیعت ٹھیک نہیں۔'' میں خاموش ہو گئی۔ پھر میں سودا لینے بازار گئی۔ جب واپس آئی تو پتا چلا کہ شرفو کی بیٹی کی لاش مل گئی ہے۔ شرفو اور اُس کی بیوی کا برا حال تھا۔ میں بھی وہ لاش دیکھنے گئی۔ اُس کی لاش کو دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ نیلو کی لاش کو بالکل اُسی طرح نوچا گیا تھا جیسے ہمارے گھر کے سارے جانور مرے تھے۔

میں بہت دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ سمرینہ چپ چپ ہے۔ بس وہ بیٹھی رہتی اور اپنی بلی کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ ایک دن میں گھر سے باہر گئی جب گھر آئی تو وہ پورے گھر میں دکھائی نہ دی۔ پھر چھوٹے کمرے میں سے باتوں کی آواز سنائی دی۔ جیسے دو عورتیں باتیں کر رہی ہوں۔ میں کان لگا کر سُننے لگی۔ ایک دم سمرینہ نے دروازہ کھولا تو وہ ڈر گئی اور کہنے لگی۔

''اماں تم یہاں کیا کر رہی ہو۔''

میں نے اُس سے پوچھا اور کون ہے اندر۔'' تو وہ ایک دم بولی۔ ''کوئی نہیں کوئی بھی تو نہیں ہے۔''

''پگلی جب کوئی نہیں تو اس میں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو بس ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔''

اُسی دن رات کو ہم سونے کے لیے لیٹے تو میری لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ جب رات کو میری آنکھ کھلی تو سمرینہ میرے اردگرد چکر لگا رہی تھی۔ میں ڈر گئی، میں نے ڈرتے ڈرتے سمرینہ کو آواز دی تو وہ ایک دم کمرے سے بھاگی۔ میں اُس کے پیچھے بھاگی جب دوپٹا لینے واپس کمرے میں گئی تو سمرینہ اپنی جگہ پر لیٹی سو رہی تھی۔ میں نے ہادی کو اٹھایا اور یہ سب بتایا تو ہادی نے میری بات پر یقین نہیں کیا اور بولا۔

''تم نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہے۔سو جاؤ رات بہت ہوگئی ہے۔'' جیسے تیسے میں سوگئی۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو میری نظر سب سے پہلے سمرینہ پہ پڑی۔ اُس کے چہرے پر ایک شیطانی مسکراہٹ تھی۔ اور اُس کے برابر میں وہی بلی مجھے گھور رہی تھی۔ اتنے میں اذانیں شروع ہوگئیں اور وہ بلی چلاتی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی۔

میں نے جلدی سے وضو کیا اور نماز پڑھی اور جب دعا مانگ کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو سمرینہ مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

''کیا ہو گیا سمرینہ۔ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہی ہو۔''

اس نے مجھے بے رخی سے جواب دیا ''مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ کھانا دو۔'' میں اٹھی اور اُسے کھانا دیا۔ میں اُسے دیکھ رہی تھی وہ کھانے میں مصروف ہوگئی پھر میں اپنے کام کاج میں لگ گئی اور وہ اپنے اسکول کی تیاری کرنے لگی۔

اب جب بھی سمرینہ میرے سامنے آتی میرے دل میں ڈر کی لہر دوڑنے لگتی۔ اُس کے اسکول جانے کے بعد میں اس کے ابا کے دکان پر گئی۔ جہاں ہادی مٹکے بیچا کرتا تھا۔ ہادی نے مجھے ہانپتے کانپتے دیکھا تو وہ پریشان ہو گیا اور بولا۔

''تو یہاں کیا کر رہی ہے۔ اور سمرینہ کہاں ہے؟'' میں نے کہا۔

''چل گھر چل تجھ سے ایک بات کرنی ہے۔'' ہادی اور میں گھر پہنچے تو میں نے کہا جس راز کو ہم نے پندرہ سال چھپایا اب اُس راز سے مجھے خود ڈر لگنے لگا ہے۔''

ہادی نے کہا۔ ''چل پگلی! کیسی باتیں کر رہی ہے۔''

میں نے اُسے آج رات کا قصہ سنایا۔ تو ہادی نے کہا کہ یہ تیرا وہم ہوگا۔ تیری بیٹی اب بڑی ہوگئی ہے۔ تجھے اب اس کی شادی کی فکر لگی رہتی ہے۔ اسی وجہ سے تو اُلٹے سیدھے خواب دیکھتی ہے اور ڈری رہتی ہے۔ چل میں آج ہی فضلو چاچا سے اپنی بیٹی سمرینہ اور اُن کے بیٹے شرجیل کے بیاہ کی بات کروں گا۔

لیکن میں نے کہا جو تمہاری بہن نے کہا ہے اپنے کام چور بیٹے شوکت کے لیے اُس کا کیا ہوگا۔ تمہاری بہن میرے بال نوچ لے گی۔''

ہادی نے کہا کہ نیک بخت یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔ میں اُسے دیکھ لوں گا۔''

ہادی خوشی خوشی چلا گیا۔ اتنے میں میری نظر دیوار پر پڑی تو وہ بلی مجھے ہی دیکھ رہی تھی میں نے اُسے بھگا دیا اور سمرینہ کی شادی کے سپنے دیکھنے لگی۔

☆......☆......☆

دروازہ دھڑ دھڑ بجنے لگا۔ میں نے دوڑ کر دروازہ کھولا تو سمرینہ کے اسکول سے استانی نے ایک بچہ بھیجا تھا۔

میں بھاگی بھاگی اسکول گئی تو استانی صاحبہ نے مجھے کہا کہ آپ کی بہن سمرینہ کو آئے دن لے جاتی ہیں۔ اس طرح اس کی پڑھائی میں حرج ہوتا ہے۔''

''میری بہن! میری تو کوئی بہن نہیں۔'' میں استانی کی بات سن کر چونک گئی تھی۔

''کہاں جاتی ہے سمرینہ۔''

استانی نے کہا کہ مجھے نہیں پتا سمرینہ ہی کہتی ہے کہ میری خالہ مجھے لینے آئی ہیں۔ اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ یہ بول کر وہ چلی جاتی ہے۔'' میں ڈر گئی کہ میری بیٹی ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ کہاں جاتی کچھ پتا نہ تھا۔ میں نے اُسے بہت ڈھونڈا کہیں نہ ملی تو میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ میں رو دھو کر گھر گئی۔

ابھی میں گھر آ کر بیٹھی ہی تھی کہ سمرینہ آ گئی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہاں گئی تھی۔ تمہاری استانی نے آج مجھے اسکول بلوایا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ تم آئے دن اسکول سے جلدی چلی جاتی ہو کہاں جاتی ہو تم۔'' سمرینہ نے گھبرا کر جواب دیا۔

''اماں میں دوست کے گھر گئی تھی۔ اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔''

''مجھے تو بتا کر جانا چاہیے تھا نا۔'' میں بہت ڈر چکی تھی پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ سمرینہ جھوٹ بول رہی ہے۔

☆......☆......☆

میں نے رات ہادی سے اس بات کا ذکر کیا تو ہادی پریشان ہوگیا اور بولا کہ ہماری بیٹی ہاتھ سے نکل رہی ہے۔ اس کی جلد از جلد شادی کرنی پڑے گی۔ خوشی کی بات یہ کہ فضلو چاچا نے شرجیل اور سمرینہ کی شادی کے لیے ہاں کردی ہے۔ اس کی شادی جلد ہی کردیں گے۔ تم

بیاہ کی تیاری کرو۔"

پھر ہم سوگئے، رات کو میری آنکھ کھلی تو سمرینہ غائب تھی۔ میں نے سوچا گئی ہوگی پانی پینے، میں گہری نیند میں تھیں۔اس لیے جلد سوگئی۔

جب صبح میری آنکھ کھلی تو سمرینہ کے منہ پر خون کے دھبے تھے میں نے جلدی سے اُسے اپنے کلیجے سے لگالیا اورڈر کے مارے کہا۔

"کیا ہوگیا میری بیٹی کو۔ یہ خون کیسے نکل گیا۔" اتنے میں سمرینہ اُٹھ گئی اور گھبرا کر بولی۔

"اماں وہ پتا نہیں کیسے نکلا۔" اور جلدی سے وہ منہ دھونے چلی گئی۔ میں سمرینہ کے لیے روٹی ڈالنے لگی اور دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ کیا ہوا ہوگا سمرینہ کو۔ یہ خون کے دھبے کہاں سے آئے۔

میں پریشان ہی رہی سمرینہ کو کھانا کھلا کر میں اُسے حکیم کے پاس لے کر گئی۔ حکیم نے کہا سمرینہ بالکل ٹھیک ہے۔ میرے دل میں ٹھنڈ پڑگئی تب پتا چلا کہ سمرینہ بالکل ٹھیک ہے۔ہم نے سمرینہ کی جلد ہی فضلو چاچا سے تاریخ مانگ لی۔ فضلو چاچا نے ہمیں تین دن کا وقت دے دیا۔ہم بہت خوش تھے۔دل کے کسی کونے میں خوشی تھی تو کسی کونے میں اُداسی تھی کہ سمرینہ ہمیں چھوڑ کر اپنے گھر چلی جائے گی۔

میں جلدی سے گھر گئی اور سمرینہ کو اسکول کے لیے تیار کیا اور اسے اسکول بھیجا۔اسکول بھیج کر میں اپنے کام میں لگ گئی۔تھوڑی ہی دیر بعد سمرینہ واپس آگئی۔

میں نے پوچھا۔"اسکول سے واپس کیوں آگئی تو اُس نے جواب دیا کہ آج اسکول بند ہے۔استانی صاحبہ نہیں آئیں۔"

اتنے میں شور مچ گیا۔ باہر جا کر دیکھا تو ایک جگہ ہجوم لگا ہوا تھا۔میں نے وہاں جا کر دیکھا تو میں گھبرا گئی۔ جیسے جانوروں اور شرفو کی بیٹی نیلوفر کا حال ہوا تھا بالکل اُسی طرح استانی کا بھی وہی حال تھا۔ میں گھبرا کر گھر بھاگی تو سمرینہ گھر کی دہلیز پر بیٹھی ہجوم کی طرف دیکھ رہی تھی۔اور مجھ سے پوچھنے لگی۔

"کیا ہوا اماں؟ یہ ہجوم کیسا؟" میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا اور کمرے میں چلی گئی۔اور میں خیالوں میں کھوگئی اور اس کی بچپن سے لے کر اب تک کی ساری باتیں سوچنے لگی۔اب میں بہت ڈر گئی تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ میں بہت پریشان ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

ہادی جب دکان سے گھر واپس آیا تو میں نے اُسے ساری باتیں بتائیں۔ہادی بھی پریشان ہوگیا اور مجھے تسلی دے کر کہا۔

"تم پریشان نہ ہو کل اس کا بیاہ بھی کرنا ہے۔اُس کی تیاری کرو۔" یہ کہہ کر ہادی سوگیا اور میں بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔

رات پھر میری آنکھ کھلی تو سمرینہ بستر سے غائب تھی۔اور باہر سے ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے کسی کو گھسیٹا جارہا ہو۔ میں نے گھبرا کر ہادی کو اٹھایا تو ہادی بے خبر سو رہا تھا وہ نہیں اٹھا تو میں نے جا کر دیکھا تو کوئی بھی نہیں تھا وہاں۔ پھر میں سمرینہ کو ڈھونڈنے لگی۔ مجھے سمرینہ نہیں ملی تو میں واپس کمرے میں گئی تو سمرینہ اپنی جگہ پر لیٹی سو رہی تھی۔

پوری رات میں خوف کے مارے جاگتی رہی۔

صبح ہوتے ہی میں مسجد کے امام کے پاس گئی اور اُن سے اپنا مسئلہ بیان کیا تو انہوں نے کہا کہ بیٹی تُو فکر نہ کر۔ میں اذان دے کر تیرے گھر آتا ہوں۔ پھر آ کر دیکھتا ہوں کیا مسئلہ ہے۔"

ڈرتے ڈرتے جب میں گھر میں داخل ہوئی تو سمرینہ اور وہ بلی مجھے گھور رہی تھیں اور سمرینہ مجھ سے پوچھنے لگی۔

"اماں تُو کہاں گئی تھی۔"

"میں کام سے گئی تھی۔" یہ کہہ کر میں کمرے میں چلی گئی۔

آج سمرینہ کی بارات آنے والی تھی۔ ہادی بھی شادی کے کاموں میں مصروف تھا۔ میں پریشانی میں بھی شادی کی تیاری میں مصروف ہوگئی۔ جب بھی میں نماز پڑھتی یا اللہ کا نام لیتی تو سمرینہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھتی کہ وہ مجھے ابھی کھا جائے گی۔اور جب بھی میں اُسے نماز پڑھنے کا بولتی تو وہ مجھے جھڑک کر وہاں سے چلی جاتی۔

اب تو سمرینہ کو پتا چل گیا تھا کہ میں سب جان چکی ہوں۔تو وہ میرے آگے پیچھے گھومنے لگی تھی۔ میں صفائی کرتے کرتے چھوٹے کمرے میں چلی گئی جس میں

کباڑا ابھرا تھا۔ وہ کمرا بسالوں سے بند تھا۔ اس کمرے کے پاس کوئی آتا جاتا نہیں تھا۔ میں نے کہا شادی کا گھر ہے آج اس کمرے کی بھی صفائی کرلوں۔ پھر کیا تھا اس کمرے میں داخل ہوتے ہی عجیب سی بدبو میری ناک سے ٹکرائی۔ میں سمجھی چوہا مرگیا ہے۔ میں نے تلاش شروع کردی کہ بدبو کہاں سے آرہی ہے۔ میں نے کباڑا اِدھر اُدھر کیا تو زمین کھدی ہوئی ملی، ایسا لگا کہ کسی نے ابھی اسے بند کیا ہو۔ میں نے تھوڑی مٹی ہٹائی تو کچھ ہڈیاں نظر آئیں۔ میں نے اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اور مٹی ہٹائی تو ایک دم ٹپ ٹپ کرکے میرے ہاتھ پر خون گرنے لگا جب میں نے اوپر دیکھا تو کسی عورت کا سر نظر آیا۔ جس میں سے خون ٹپک رہا تھا۔ میں فوراً وہاں سے دروازے کی طرف بھاگی کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی میں نے دروازہ کھولا تو مولوی صاحب دروازے پر کھڑے تھے، میں نے فوراً انہیں گھر کے اندر بلایا اور چھوٹے کمرے میں لے کر گئی تو مولوی صاحب نے کہا۔

''بیٹا فوراً اس جگہ سے باہر نکلو۔''

وہ پانی دم کرکے لائے تھے مجھ پر اور گھر پر چھڑکنے لگے۔

اُن کے پانی چھڑکتے ہی گھر میں سے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ مولوی صاحب اور میں جب بھاگے بھاگے سمرینہ کے کمرے میں گئے تو سمرینہ بال کھولے بیٹھی جنگلی جانوروں کی آواز نکال رہی تھی۔ کمرے میں ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ایک سے زائد جانور چلا رہے ہوں۔ مولوی صاحب نے مجھے کہا کہ بیٹی تم باہر جاؤ اور قرآن شریف کی تلاوت کرتی رہو تاکہ تم پر یہ چیزیں حملہ نہ کردیں۔''

میں وہاں سے فوراً نکل گئی مولوی صاحب نے تالے پر دم کرکے انہیں واپس بند کردیا اور میرے پاس آکر بولے۔

''بیٹا اس کی ولادت کب ہوئی تھی۔'' اس پر میں نے مولوی صاحب کو سب سچ سچ بتادیا کہ ہم نے اسے یتیم سمجھ کر پالا ہے۔ یہ ہمیں دوسرے گاؤں کی مسجد کے قریب والی کچرا کنڈی سے ملی تھی۔ اور مولوی صاحب جب سے یہ ہمارے گھر میں آئی ہے، تب سے گھر میں عجیب سی وحشت پھیل گئی ہے۔ لیکن ہم نے سب کچھ نظر انداز کرکے اس کی پرورش کی ہے۔'' میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ میں آپ سے گزارش کرتی ہوں اس کے سوا میری کوئی اولاد نہیں۔ اس کو کسی بھی طرح آپ ٹھیک کردیں۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔''

مولوی صاحب نے مجھے جواب دیا کہ بیٹا اگر تو انسان کی پرورش کرتی تو میں تیری مدد بھی کرتا پر تو نے تو ایک شیطانی طاقت کی پرورش کی ہے۔''

یہ سن کر میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ پھر مجھے ہوش نہ رہا کہ میں کہاں ہوں۔

جب مجھے ہوش آیا تو مولوی صاحب مجھ پر دم کررہے تھے۔ اور ہادی پولیس والوں سے کچھ بات کررہا تھا۔ میں ایک دم اٹھی اور سمرینہ کا پوچھنے لگی کہ سمرینہ کہاں ہے۔''

ہادی نے مجھے کچھ بتانے ہی لگا تھا کہ مولوی صاحب نے ہادی کو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ اور کہا کہ بیٹا پہلے تُو ٹھیک ہوجا پھر بتاتے ہیں۔''

میں نے جب ہادی سے پولیس کے بارے میں پوچھا تو ہادی نے جواب دیا کہ چھوٹے کمرے میں سے انسانوں اور جانوروں کی لاشیں ملی ہیں۔ کچھ لاشیں پرانی ہوچکی ہیں اور کچھ تازہ ہیں جو سمرینہ کی اسکول کی استانی کی ہے۔ جس کا پورا دھڑ غائب تھا بس سر لٹکا ہوا تھا۔''

میں نے جاکر دیکھا تو کمرہ پورا صاف پڑا تھا۔ پولیس اپنی پوری تحقیقات کرچکی تھی۔ ہادی نے مجھے پورا قصہ سنایا کہ سمرینہ برابر والے قبرستان سے مردے لاکر کھایا کرتی تھی۔ پولیس نے قبرستان جاکر دیکھا تو کتنی ہی لاشیں غائب تھیں۔''

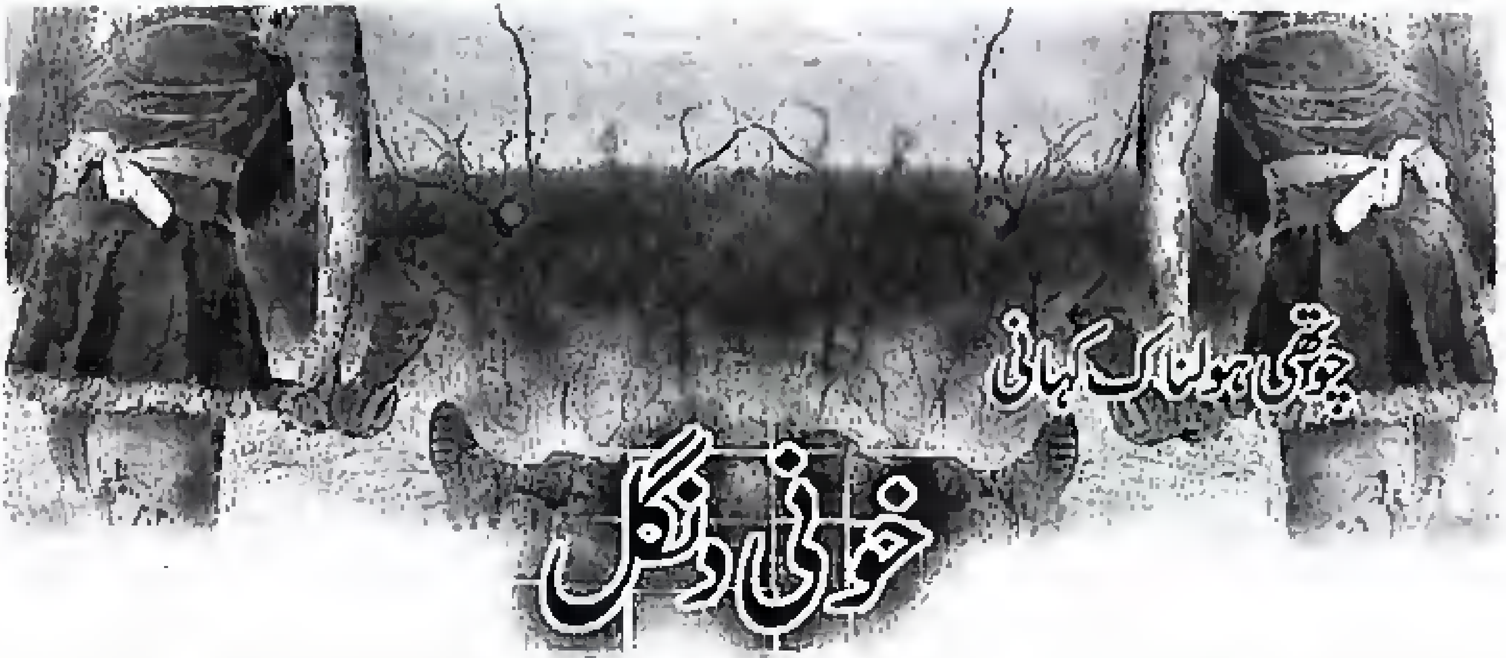
میں نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ سمرینہ کہاں ہے تو انہوں نے کہا کہ تُو نے بچی نہیں شیطان پالا تھا جو اپنی ماں کے ساتھ یہاں رہ رہی تھی'' اس پر میں نے کہا۔

''ماں!! میں نے تو اپنے گھر میں کسی اور کو نہیں دیکھا۔''

اس پر مولوی صاحب نے بتایا کہ ''وہ جو بلی سمرینہ کے ساتھ رہتی تھی وہ اس کی ماں تھی۔''

یہ سُن کر میرا جسم دہشت سے کانپنے لگا۔ اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کہ آج میری بیٹی سمرینہ کی ڈولی اٹھنی تھی۔ میں تو ایک ایسی بدنصیب ماں تھی کہ اپنی بیٹی کی ڈولی تو کیا جنازہ بھی نہ اٹھتا دیکھ پائی۔ یہ بھی میری تیسری بدنصیبی کہ ایک اولاد کو پال کر بھی بے اولاد ہوں۔

☆☆......☆☆



سکندر حبیب

اُس پہلوان کی کتھا، جس پر دو آتمائیں ایک ساتھ حملہ آور ہو گئی تھیں

''آدھی سے زیادہ رات گزر گئی تھی اور میں تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ مغرب کی طرف سے آتی ہوئی یخ بستہ مست ہوائیں وجود سے ٹکرا کر آگے نکل جاتیں۔ جس سے انگ انگ سے سرشاری کی ایک لہر اُجاگر ہونے لگتی۔ دودھ جیسی سفید چاندنی تاریکی کو ہٹا کر زمین کے گوشے گوشے کو اپنی بانہوں میں سمیٹے ہوئے تھی۔

ایسے موسم میں ڈر و خوف بھلا پاس کہاں پھٹکنے والا تھا۔ ویسے بھی میں کئی بار اس راستے سے گزر چکا تھا۔ مگر آج یہ سہانی رات عجیب سی لطف دے رہی تھی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں اتنی رات کو کہاں جا رہا تھا تو سنیے۔

مجھے شروع سے ہی پہلوانی کرنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ بڑے بڑے پہلوانوں کو کبڈی یا کشتی کرتے دیکھ کر میرے دل میں ارمان پیدا ہو جاتے کہ کاش میں بھی انہی کی طرح ایک پہلوان ہوتا۔ میں نے ماضی کے نامور پہلوانوں کی کتب اور تصاویر بھی جمع کر رکھی تھیں۔ گاما پہلوان، نور الدین پہلوان، رستم ہند پہلوان وغیرہ میرے آئیڈیل تھے، پھر میں نے یہ ارادہ مستحکم کر لیا کہ میں بھی ان کی طرح ایک دن بڑا پہلوان بنوں گا۔ ہمارے گاؤں گوجرانوالہ کے مغربی نکڑ میں ایک مشہور و معروف گاؤں کوٹ پہلوان تھا۔ جہاں تقریباً بچے بوڑھے اور عورتیں بھی پہلوان تھیں۔ وہاں کی عورتوں میں عام عورتوں سے زیادہ زور اور جوش تھا۔

اپنے شوق کو مدنظر رکھ کر میں روزانہ ہی اس گاؤں میں پہلوانی کے گُر سیکھنے جایا کرتا تھا۔ مجھے اپنے استاد جن کا اصل نام تو معلوم نہیں تھا۔ لیکن سارے جاننے والے انہیں بھولا پہلوان کے نام سے جانتے پہچانتے تھے۔ وہ بہت مہربان شخصیت کے حامل تھے۔ انہوں نے جی جان سے مجھ پر محنت کی اور پہلوانی کے تمام گُر مجھے اچھی طرح سے سکھانے شروع کر دیے۔

اس وقت میری عمر سولہ سترہ سال کے درمیان تھی۔ مگر قد کاٹھ سے میں پچیس چھبیس سال کا دکھائی دیتا تھا۔ چوڑی چکلی چھاتی کے ساتھ بازوؤں میں قوت بھی کمال کی تھی۔ اپنی عمر کے دو تین لڑکوں کو تو میں ایسے ہی پچھاڑ دیتا تھا۔ کوٹ پہلوان، پہلوانوں کا گڑھ تھا۔ لیکن میرے آگے بہت ہی کم پہلوان ٹک پاتے تھے۔ اتنی چھوٹی عمر میں اتنے بڑے بڑے

پہلوانوں کو مات دینے پر استاد صاحب مجھ سے بہت خوش تھے۔ وہ مجھے ہمیشہ اصل نام کے بجائے صرف 'گجر' کہا کرتے تھے۔

اس دن استاد کے گھر میں شادی کا فنکشن تھا، اگلے دن ان کی چھوٹی بہن کی بارات آنی تھی۔ استاد نے کہا۔

''بیٹا گجر کل ذرا جلدی آ جانا، کام کاج کی بھاگ دوڑ تم ہی کو سنبھالنی ہے۔''

استاد کا حکم تھا، نہ کرنے کی مجال ہی نہ تھی، لہٰذا اگلے دن میں وقت پر حاضر ہو گیا۔ اس گھر کے افراد تو جیسے میرے بغیر کوئی کام ادھورا ہی سمجھتے تھے۔ آنے والے مہمانوں کے لیے تواضع وغیرہ کرنا، بارات کے لیے شامیانے لگوانے اور کھانا پکانے والوں کو سامان وغیرہ پہنچانا، یہ سارے کام میرے ذمے تھے۔

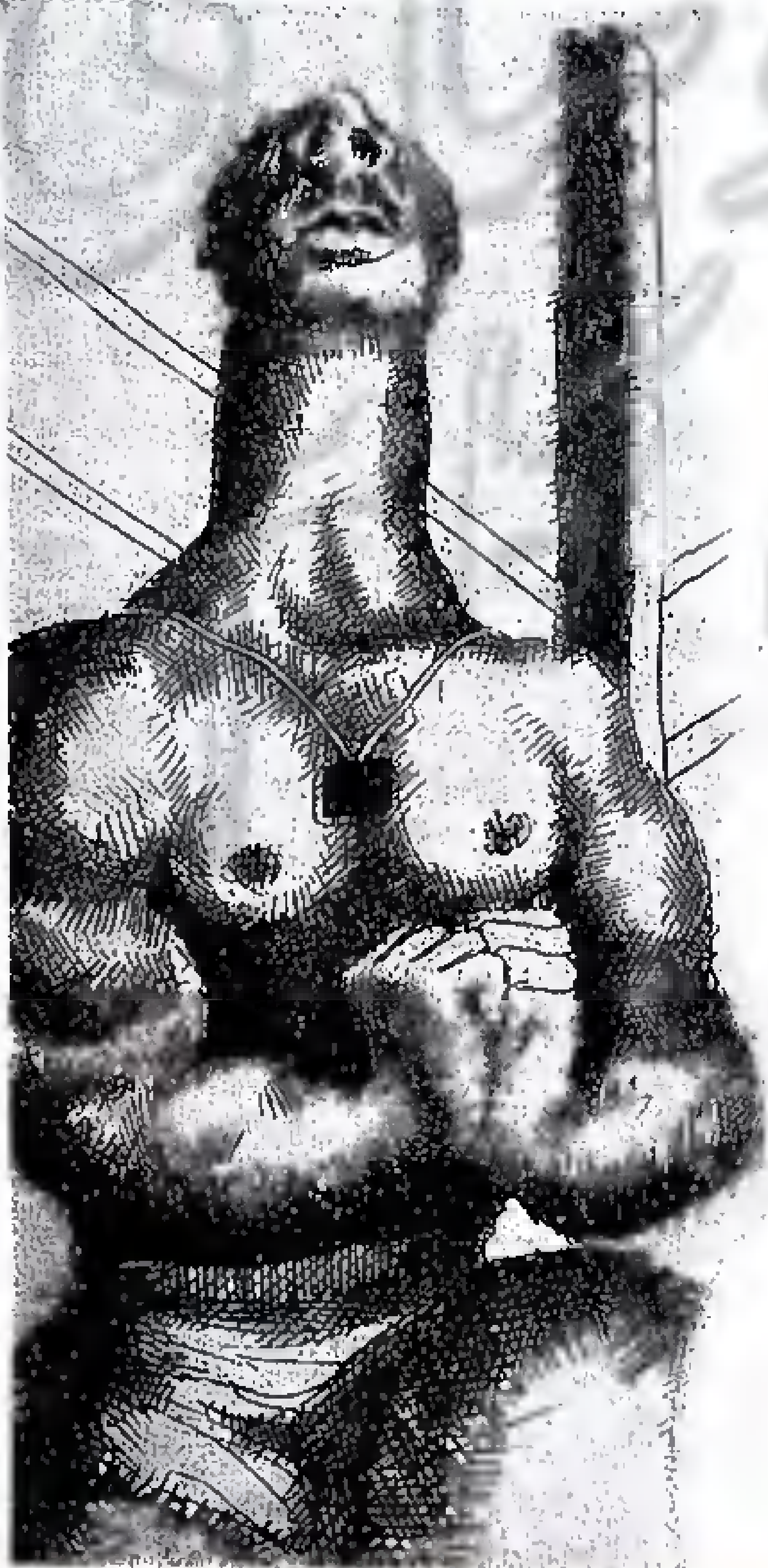
کسی کام سے میں، گھر میں داخل ہوا تو استانی (استاد کی بیوی) نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔

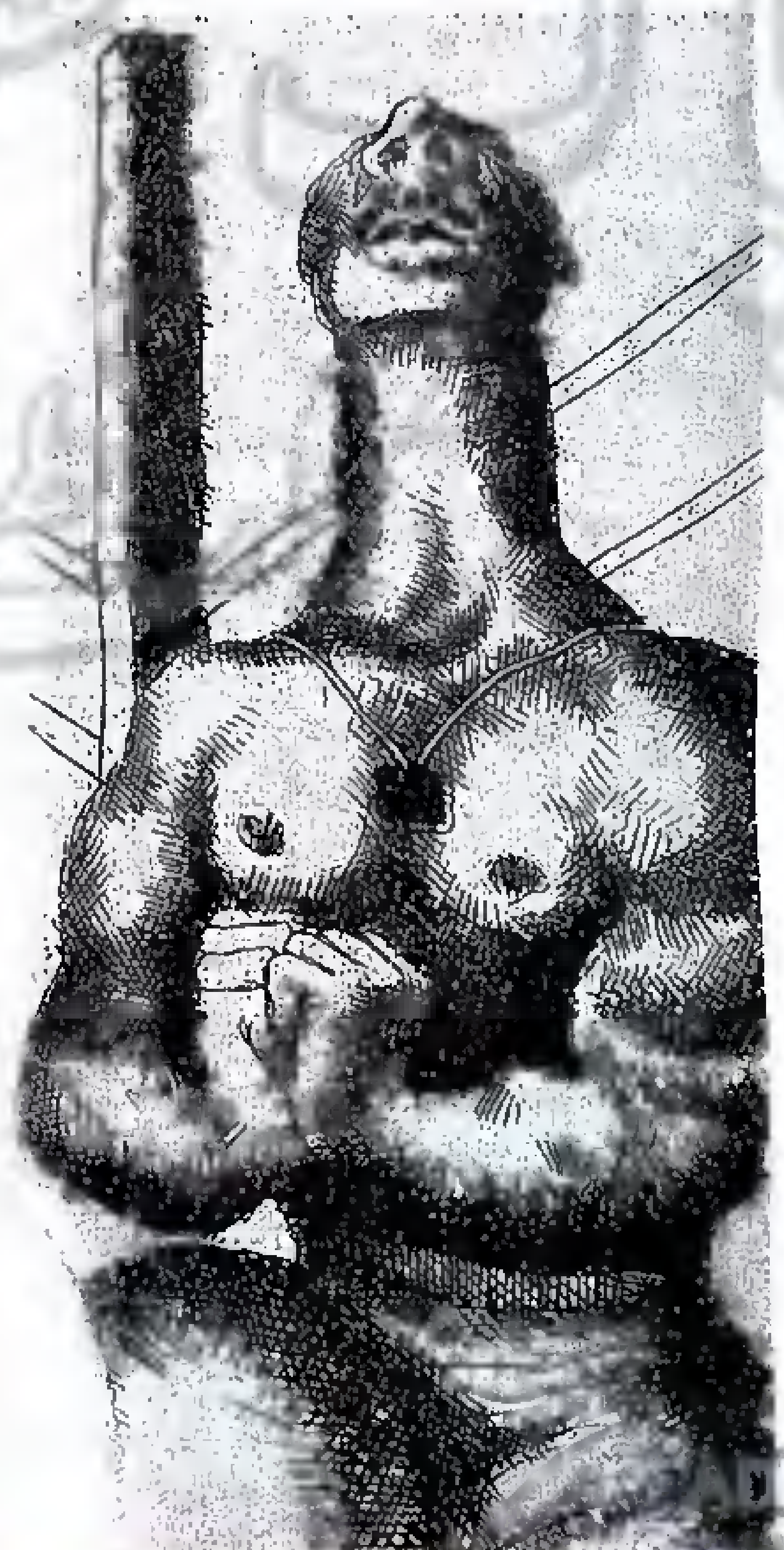
''کیا بات ہے باجی؟'' میں ہمیشہ انہیں باجی کہا کرتا تھا۔

''ذرا ساتھ والے گھر میں جانا۔ یاسمین کب سے گئی ہے کپڑے استری کرنے......! ابھی تک نہیں آئی۔ ہاں اگر اس نے کپڑے استری کر لیے ہوں تو کپڑے تم اٹھا لانا۔'' انہوں نے حکم دیتے ہوئے کہا۔

''لیکن باجی! میں تو یاسمین کو جانتا تک نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''او...... ہاں میں بھی کتنی بدھو ہوں۔'' انہوں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''یاسمین میری سہیلی کی چھوٹی بہن ہے، خاص طور پر اس شادی میں گوجرانوالہ شہر سے آئی ہے۔ بس جو لڑکی اس گھر میں





کپڑے استری کر رہی ہوگی وہی یاسمین ہے۔ جاؤ ذرا جلدی آنا۔''

ساتھ والا گھر استاد صاحب کے چچا کا تھا، مگر شادی کی اصل رونق تو یہاں تھی۔ اس گھر میں مہمانوں کا اچھا خاصا ادھم مچا ہوا تھا۔ اس گھر میں خوب صورت حسین لڑکیاں ہاتھوں میں مہندی رچائے، بالوں میں موتیے کے پھولوں کی لڑیاں ڈال کر سفید کلیوں کی طرح اِدھر اُدھر چہک رہی تھیں۔

''خالہ وہ لڑکی کہاں ہے جو کپڑے استری کرنے آئی ہے۔ اس کا نام یاسمین ہے شاید؟'' میں نے استاد کی چچی سے پوچھا۔

''اوپر ہے بیٹا مگر دھیان سے جانا۔ یہ آج کل کی لڑکیاں بہت نٹ کھٹ ہوتی ہیں۔'' وہ راز داری سے بولیں۔

''ایسی کوئی بات نہیں خالہ جی۔'' یہ کہہ کر میں مسکراتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ سیڑھیوں کے پاس ہی ایک کمرہ تھا۔ جس کا دروازہ بند تھا۔ میں جیسے ہی اس کے قریب پہنچا۔ یک دم وہ دروازہ کھلا اور ایک لڑکی ہوا کے جھونکے کی مانند برآمد ہوئی۔ اس نے ہاتھ میں ہینگر پر لٹکی ہوئی قمیض کچھ اس انداز سے اٹھا رکھی تھی کہ اس کا وجود گھٹنوں تک اس کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ صرف پاؤں ہی نظر آ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں اگلا قدم اٹھاتا۔ اس لڑکی کا اوپر اٹھا ہوا ہاتھ میری آنکھ میں جا لگا۔ لاکھ ضبط کے باوجود بھی میرے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی۔ میں ایک دم پیچھے ہٹا اور آنکھ پر ہاتھ رکھ لیا۔ بوکھلاہٹ سے لڑکی کے ہاتھ سے ہینگر سمیت قمیض نیچے گر گئی۔ لڑکی کے خوبصورت گلابی چہرے پر حیرت کی پرچھائیاں ابھر آئیں۔ جھیل سی گہری آنکھیں مجھ پر جمائے نہ جانے کتنی دیر تک وہ مجھے دیکھتی رہی۔

''یہ..... یہ کیا کر دیا لڑکی؟ کہیں بچے کی آنکھیں تو نہیں نکال دی۔ دیکھو بے چارہ کیسے آنکھ پر ہاتھ رکھے کھڑا ہے۔'' پیچھے سے خالہ اس پر برس پڑیں۔

''بیٹا میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا کہ ان لڑکیوں سے بچ کر رہنا۔ میں کب سے ان کی ادھچھی حرکتیں دیکھ رہی ہوں۔'' وہ لہجہ سخت کرتے ہوئے بولیں۔

''چھوڑیں خالہ! شادی کے گھر میں ایسی گہما گہمی ہو ہی جاتی ہے۔'' میں نے جلدی سے مداخلت کی تاکہ لڑکی مزید عتاب سے بچ سکے۔ کیونکہ میری نظر میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ لیکن خالہ بھی چپ رہنے والی نہیں تھیں۔ میں اس معاملے کو وہیں چھوڑ کر آنکھ ملتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ابھی چند سیڑھیاں ہی عبور کی تھیں کہ سامنے ایک بنتِ حوا نظر آئی۔ اس نے ایک ہاتھ میں کافی سارے تہہ شدہ کپڑے اٹھا رکھے تھے۔ کپڑوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ صرف اس کی ٹانگیں ہی نظر آ رہی تھیں، باقی سارا وجود پیچھے کہیں غائب تھا۔ میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

'واہ..... کتنا زور ہے اس کے بازوؤں میں! یعنی محترمہ ٹارزن بننے کے چکر میں ہیں۔' میں نے سوچا۔

''ایں..... او.....'' اچانک اس لڑکی کے ہاتھ سے کپڑے گرنے لگے۔ دوسرے ہی لمحے میں وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ اور کپڑوں سمیت مجھ پر آن گری۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں سیڑھیوں پر لڑکھڑاتے ہوئے نیچے آ گرے۔ نیچے میں، اوپر کپڑے اور پھر اوپر سے وہ لڑکی..... دھڑام کی آواز سن کر تمام خواتین بھاگتی ہوئی ہمارے گرد جمع ہو چکی تھیں۔ لڑکیوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اور کئی ایک نے تو ازراہِ مذاق دو فقرے بھی کسے تھے۔ جبکہ خالہ سمیت دوسری بڑی عمر کی عورتیں ہمدردی کی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

''ہائے میری کمر.....'' وہ لڑکی جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''دیکھ کر نہیں چل سکتے تھے آپ..... سارے کپڑوں کا ستیاناس کر دیا۔ کتنی محنت سے میں نے استری کیے تھے۔'' لڑکی ایکدم حواس باختہ لہجے میں بولی۔

''ائے..... ہے لڑکی! خدا کا خوف کر، الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔'' خالہ بس شروع ہو گئیں۔ ''غلطی اس بے چارے کی تھوڑی ہے۔ جوانی دکھانے کا شوق

تو تجھ کو چڑھا ہوا تھا۔ پہلے اس اقراء کی بچی نے اس کی آنکھ نکال کر رکھ دی۔ واہ...... کیا زمانہ تھا ہمارا لڑکیاں۔ شادی کے بعد بھی ایک ایک مہینے تک شرماتی تھیں، مگر آج کل کی تو ہوا ہی نرالی ہے۔ لڑکیاں تو لڑکوں سے بھی دو ہاتھ آگے جا چکی ہیں۔''

''خالہ صحیح کہہ رہی ہیں یاسمین...... تم خوامخواہ اس سے لڑ رہی ہو۔ تمہیں تو اس سے معافی مانگنی چاہیے۔'' اس لڑکی نے میری طرف داری کی جس نے پہلے میری آنکھ پر وار کیا تھا۔ اس کا نام اقراء تھا۔

''اچھا بابا...... سوری۔'' یاسمین نے جھنجلا کر کہا اور کپڑے اٹھانا شروع کر دیے۔ اسی اثناء میں میں بھی اٹھ چکا تھا۔

''بیٹا تو اب تھک گیا ہوگا۔'' خالہ مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ ''صبح سے کام پر لگا ہوا ہے اب کچھ دیر آرام کر لے۔ اقراء چلو تم اس کے ساتھ آدھے کپڑے اٹھاؤ اور خبردار اگر کسی نے کوئی حرکت کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' خالہ نے کہا۔

''میں وہاں سے استاد کے گھر میں آ گیا۔ سامنے کمرے میں صوفے پر ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اگر انسانی وجود کو کچھ دیر آرام میسر آ جائے تو طبیعت ہشاش بشاش ہو جاتی ہے، کچھ دیر بعد میں نے غیر ارادی طور پر آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا تو داخلی دروازے پر باجی کے ساتھ یاسمین اور اقراء کھڑی تھیں۔ اقراء ہنس ہنس کر باجی کو کوئی بات سنا رہی تھیں۔ باجی کے چہرے پر چھائے تاثرات سے اس بات کا پتا چل رہا تھا کہ وہ اس بات سے کافی لطف اندوز ہو رہی ہیں، دفعتاً انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے جھٹ آنکھیں بند کر لیں، کچھ دیر بعد میں نے آنکھیں کھول کر دوبارہ دیکھا تو باجی کا دھیان دوسری طرف تھا۔

دفعتاً برق کوندے کی طرح یہ سوال میرے دماغ میں لپکا کہ یقیناً یہ باتیں میرے ہی بارے میں ہو رہی ہیں۔ یاسمین بھی ساتھ کھڑی تبسم کی پنکھڑیاں بکھیر رہی تھی۔ اچانک یاسمین نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ہم دونوں کی نگاہیں آمنے سامنے ہو چکی تھیں۔

پھر میری نظریں اس کی نگاہوں میں اُترتی چلی گئیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اس کی نیلی نگاہوں کے ساگر کی گہرائی میں ڈوبتا جا رہا ہوں۔ یا میرے دل کی ساری دھڑکنیں یکجا ہو کر اس کی دھڑکنوں میں شامل ہو گئی ہوں۔

وہ بہت ہی خوبصورت دلکش اور من موہنی تھی۔ اس کے سرخ رخساروں پر تروتازہ پھول کھلے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی سیاہ زلفیں چہرے پر ایسی بچ رہی تھیں۔ جیسے چودہویں کا چاند کالے بادلوں سے نظر آ رہا ہو۔ نہ جانے ہم دونوں مبہوت بنے ایک دوسرے کو کتنی دیر تک دیکھتے رہے، تب اقراء نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

''ہیلو...... کہاں نظریں جمائے گم ہو گئی؟'' پھر اس نے جب اس کی نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے میری طرف دیکھا تو باجی کے ساتھ اس کا بھی نقرئی قہقہہ گونجا۔ یاسمین نے مسکراتے ہوئے نگاہیں نیچے کر لیں، جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے جلدی سے رخ دوسری طرف کر لیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں نے کن اکھیوں سے ان کی طرف دیکھا تو باجی ان دونوں کو گھر سے باہر لے جا چکی تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

''گجر بھائی! آپ کو باجی بلا رہی ہیں۔'' کچھ دیر بعد مجھے ایک لڑکے نے آواز دی۔ تو میں باجی کی طرف آ گیا۔ استاد کی طرح وہاں کے لوگ بھی مجھے صرف گجر ہی کہا کرتے تھے۔ اصل نام سے کوئی بھی واقف نہیں تھا اور نہ ہی میں نے کسی کو بتایا تھا۔

''وہ ساتھ والے گھر میں جانا! سیڑھیوں کے پاس جو کمرہ ہے اس کے دروازے کے پاس ہی الماری ہے وہاں پر میری انگوٹھی پڑی ہوئی ہے وہ لے آؤ یہ لو چابی......!'' باجی نے چابی میرے ہاتھ میں تھمائی۔ میں وہاں سے دوسرے گھر میں آ گیا۔ سیڑھیوں کے پاس والا کمرہ مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو یاسمین اور اقراء وہاں پر موجود تھیں۔ اقراء اس کے خوبصورت ہاتھوں میں مہندی لگا

رہی تھی۔ اس کے بھرے بھرے گورے سڈول بازو سیاہ لباس میں قیامت ڈھا رہے تھے، جب کے اقراء سرخ لباس میں اس سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ میں سیدھا الماری کی طرف بڑھا۔

''کیا ڈھونڈ رہے ہیں آپ؟'' یاسمین کی آواز کمرے میں ایسے گونجی جیسے کسی نے ساز پر کوئی غزل چھیڑ دی ہو۔

''دل کھو گیا ہے میرا۔ اسے تلاش کر رہا ہوں۔'' میں نے انگوٹھی نکال کر جیب میں ڈال لی اور ان کی طرف گھوم گیا۔

''آپ کو تو نہیں ملا؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... جب آپ سیڑھیوں سے گرے تھے تو اس وقت وہ مجھے کپڑوں کے ڈھیر کے نیچے پڑا ہوا مل گیا تھا۔ میں نے چپکے سے اُٹھا کر اپنے دل کے نہاں خانے میں رکھ لیا۔'' اس نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے، آگ دونوں طرف لگ چکی ہے۔'' اقراء ہنسی۔

''آگ...... پاگل یہ تو محبت ہے، جو دل و دماغ پر مسلط ہو چکی ہے۔ شریانوں میں خون کی طرح دوڑ رہی ہے۔ جانتی ہو اقراء میں نے برسوں جو خواب دیکھا تھا آج اس کی تعبیر مل گئی ہے۔'' یاسمین آنکھیں بند کیے کہیں دور کھوئی ہوئی تھی بس اس کے لب ہل رہے تھے۔

''آپ کے کیا خیالات ہیں مسٹر گجر؟'' اقراء شرارتی لہجے میں ہونٹ دانتوں تلے دبا کر بولی۔

''ایسی محبت تو قسمت والوں کو ملتی ہے...... مجھے اپنی محبت پر ناز ہے۔'' ابھی بات میرے منہ میں ہی تھی کہ باہر سے استاد کی آواز نے چونکا دیا۔ ارے مارے گئے۔ میں جلدی سے باہر آ گیا۔ انہوں نے میری بوکھلاہٹ دیکھ کر قہقہے لگا دیے۔

''یار گجر! پھول کم پڑ گئے ہیں۔'' استاد بولے۔

''تم میری موٹر سائیکل لے جاؤ اور جلدی سے مزید پھول لے آؤ۔ بارات آنے والی ہے۔''

انہوں نے چابی مجھے دے دی۔ بازار وہاں سے زیادہ دور نہ تھا، لہٰذا پھول لے کر میں جلدی واپس آ گیا۔ پھر پتا چلا کہ بارات تو رات کو آنے والی ہے۔ اس وقت دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ میں دوبارہ کام پر لگ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سورج مغرب کی گود میں جا سویا اور شام کے دھندلکے پھیل گئے۔

اس دوران یاسمین مجھے کئی بار مل چکی تھی۔ اس نے دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا تھا۔ میں اس سے یہ اقرار کر چکا تھا۔

''میں بھی تم سے سچی محبت کرتا ہوں۔ تمہارا رشتہ مانگنے میں بہت سی رکاوٹیں کھڑی ہو سکتی ہیں، لہٰذا کوئی مناسب وقت دیکھ کر میں باجی سے بات کروں گا۔ پھر ان کے ذریعے بات آگے بڑھے گی۔ کیونکہ ہماری محبت کے بارے میں اقراء کے علاوہ باجی کو بھی سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔'' میں باجی کے پاس کھڑا کسی چیز کے متعلق بات کر رہا تھا کہ گاؤں سے بلال کا فون آ گیا۔

''یار اس وقت کہاں ہو؟ جلدی سے یہاں آ جاؤ۔ ہم کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ میں اور اسد کئی چکر لگا چکے ہیں۔ اور جناب ہیں کہ موبائل بھی نہیں اٹھا رہے۔'' میں نے اس سے معذرت کی اور ایک گھنٹے تک آنے کا وعدہ کر کے فون بند کر دیا۔

بلال میرا بہت اچھا دوست تھا اور صبح چھ بجے اس کی سعودیہ کی فلائٹ تھی، جس کی وجہ سے اس نے رات کو ایک پارٹی دوستوں کے لیے رکھی تھی۔ اس پارٹی میں میری شرکت ضروری تھی۔ اب مجھے استاد سے ملنا تھا۔ گھر جانے کے لیے اُن کی اجازت لینا لازمی تھی۔ میں نے انہیں ہر جگہ تلاش کیا، مگر وہ کہیں نظر نہ آئے۔ پھر ایک آدمی نے بتایا کہ وہ ساتھ والے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ اسی کشمکش میں دو گھنٹے گزر گئے اور بارات آ گئی، پھر میری مصروفیات اس قدر بڑھ گئیں کہ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ اچانک مجھے بلال کا خیال آیا اور میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر استاد کو ڈھونڈنے لگا، پھر چند آدمیوں کے بیچ وہ نظر آ گئے۔ میں نے ان سے جانے کی اجازت مانگی۔

''پاگل ہو گیا ہے کیا؟ جو اس وقت جائے گا۔

آدھی رات کو......؟'' انہوں نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے مجھے ڈانٹا۔

''میرا گاؤں جانا بہت ضروری ہے استاد۔'' پھر میں نے اپنے اور بلال کے تعلقات کے بارے میں بتایا۔

''میرا تو مشورہ یہی ہے کہ تم اس وقت نہ جاؤ۔ اگر پھر بھی جانا ضروری ہے تو کسی کو ساتھ لے جاؤ۔''

''میں کوئی بزدل آدمی نہیں ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ مجھے کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔'' اور پھر میں یاسمین سے ملنے واپس گھر آ گیا۔

''اچھا یاسمین! اب صبح ملاقات ہوگی۔ میں اس وقت اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔''

''آپ اس وقت جا رہے ہو۔ آپ کو ڈر نہیں لگتا؟'' وہ حیران زدہ لہجے میں بولی۔

''ڈر کیسا...... بس مجبوری ہے اور مجبوری سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں......؟'' میں نے اسے تسلی دی۔

''شادی کی اس رنگا رنگ اور پُرمسرت تقریب جہاں ہر سُو مہ جبینوں کے نقرئی قہقہے مزید جان ڈال رہے تھے۔ میں وہاں سے نکل آیا تھا۔ آنے والے رنگین لمحات کے تصور لیے آگے بڑھنے لگا۔ گاؤں کوٹ پہلوان سے نکل کر اب میں ایک فرلانگ آگے کھیتوں میں نکل آیا تھا۔ گلیوں میں بہت سے آوارہ کتوں سے واسطہ پڑا۔ جنہوں نے بھونک بھوک کر پورا گاؤں سر پر اٹھا رکھا تھا۔ کچا راستہ تھا جو کوٹ پہلوان سے نکل کر ایک کافی لمبا چکر کاٹ کر ہمارے گاؤں گجرانوالہ کی طرف جاتا تھا۔ اردگرد کا ماحول دیکھ کر یاسمین کا تصور میری نگاہوں کے سامنے آ گیا اور میں اسی دھن میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

چند فرلانگ چلنے کے بعد مجھے اپنے بائیں طرف دو ایکڑ کے فاصلے پر ایک کافی بڑا بیری کا قد آور درخت دکھائی دیا۔ اردگرد کے دیہات والے اسے پکی بیری کے نام سے پکارتے تھے۔ اور اس کے متعلق بہت ہی عجیب و غریب افواہیں تھیں کہ یہ درخت آسیب زدہ ہے اور اس کی نحوست آس پاس کے کھیتوں میں بھی ہے۔ استاد کی تاکید تھی کہ میں اس بیری سے جتنا بھی بچ کر چلوں اچھا ہے، لہٰذا میں اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد پانی کا تالاب نظر آیا۔ تالاب کے کنارے پر جو راستے کے ساتھ ہی تھا۔ ایک برگد کا درخت کافی پرانا موجود تھا۔ لوگوں نے اس درخت کے اطراف ایک بڑا سا چبوترہ بنا رکھا تھا۔ گرمیوں میں جب لوگ اس تالاب میں نہانے کے لیے آئے تو برگد کی چھاؤں میں اس چبوترے پر بیٹھا کرتے تھے۔ ساتھ ہی پکی اینٹوں کا بنا ہوا ایک کمرہ تھا۔ جو نہ جانے کب سے بند پڑا تھا۔

جب میں اس کمرے کے نزدیک پہنچا تو خوف کا ایک جھونکا نجانے کہاں سے آ کر میرے اعصاب پر مسلط ہوگیا۔ کمرے کو عبور کر کے میں جیسے ہی چبوترے کے قریب پہنچا تو ہوا کے دوش پر لہراتی ایک کھنکھناتی ہوئی نسوانی آواز نے میرے قدم روک لیے۔

''رُکیے جناب! ایسی بھی کیا جلدی ہے؟'' آواز میں بڑا ترنم تھا۔

'لڑکی...... وہ بھی اس جگہ پر؟' میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھ سے چند قدموں کی دوری پر ایک پری جمال دوشیزہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی گوری رنگت، سیاہ کھلی زلفیں مست ہوا کے دوش پر لہرا رہی تھیں۔

''جی......؟ آپ نے مجھ سے کچھ کہا۔'' انجان لڑکی کو دیکھ کر دل خوف کی شدت سے دھک دھک کرنے لگا۔

''ظاہر ہے یہاں آپ کے سوا ہے ہی کون؟'' وہ مترنم آواز میں بولی۔

''جی کہیے، کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بڑے جلد باز ہو تم۔'' وہ پھر سے مسکرائی۔

''مگر میں تو آپ کو جانتا تک نہیں۔'' میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔ ''پھر آپ نے مجھے روکا کیوں؟''

''لیکن میں تو آپ کی رگ رگ سے واقف ہوں، مدثر......''

اس کے منہ سے اپنا اصل نام سُن کر میں تو اچھل ہی پڑا۔ یہ لڑکی میرا اصلی نام کیسے جانتی ہے۔ حالانکہ استاد کے علاوہ اس گاؤں میں میرا اصل نام کوئی بھی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی میں نے کبھی کسی کو بتایا تھا، لوگ صرف گجر ہی کہا کرتے تھے۔ میں بس سوچ کر رہ گیا۔

''تم میرا اصلی نام کیسے جانتی ہو۔'' میں نے اسے کریدا۔

''میں نے کہا نا کہ میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ آپ اس گاؤں گجرانوالہ کے ہیں نا۔'' اس نے سامنے کی طرف انگلی اٹھائی۔ جہاں ہمارے گاؤں کی جھلملاتی روشنیاں دور سے متحرک نظر آ رہی تھیں۔

''کبڈی کھیلنے کے بہت شوقین ہو اور یہاں استاد بھولا کے ہاں سیکھنے آتے ہو۔ آج اس کی بہن کی شادی ہے۔ آپ اتنی رات کو اس لیے جا رہے ہو کہ آپ کے ایک دوست نے سعودیہ چلے جانا ہے۔ کیوں سب کچھ ٹھیک کہا نا میں نے......؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''کمال ہے آپ میرے بارے میں اتنا کچھ جانتی ہیں۔ غلطی کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اچھا یہ بتائیں آپ کا نام کیا ہے اور رہتی کہاں ہیں۔ اس گاؤں کی تو نہیں......'' میں سمجھ رہا تھا کہ وہ استاد کی کوئی رشتہ دار ہوگی۔

''سجنا نام ہے میرا......اور یہ ساری زمین اپنی ہی تو ہے۔ جہاں دل نے چاہا رہ لیا۔'' وہ کاندھے اچکاتے ہوئے مسکرائی۔

''اچھا اسی گاؤں کی ہیں۔ مگر اتنی رات کو یہاں اکیلے کیا کر رہی ہیں۔ ڈر نہیں لگتا۔''

''ڈر...... اونہہ......'' اس نے میری بات کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔

''مجھے کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا اور سچ پوچھیں تو میں یہاں آپ کا ہی انتظار کر رہی تھی۔'' وہ بولی۔

''میرا انتظار......؟ اگر مجھ سے ملنا ہی تھا تو دن میں کسی وقت مل لیتیں۔ اتنی رات کو ویرانوں میں بھٹکنے کی کیا ضرورت تھی۔'' میں نے حیرانگی سے کہا۔

''اچھا موقع ہے ورنہ آپ نہیں جانتے کہ میں کتنی مشکل سے دن گزار رہی تھی۔ میں روزانہ ہی آپ کو دیکھتی اور آپ سے اکیلے ملنے کی آرزو دل میں دم توڑ دیتی۔ اک برسوں کی پیاس تھی جو میرے من میں سلگتے ہوئے انگاروں کی طرح اندر ہی اندر مجھے جلا رہی تھی۔ اس پیاس کو بجھانے والا آپ کے سوا مجھے کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں خود کو بہت اکیلی محسوس کرنے لگی تھی۔ جیسے میں تنہا ایک بڑے ریگستان میں کھڑی ہوں۔ آس پاس پانی کا ایک قطرہ تک نہیں۔ پیاس سے گلا خشک ہوا جا رہا ہو اور اس میں کانٹے چبھ رہے ہوں۔ پھر کچھ لمحوں میں بے آب مچھلی کی طرح تڑپ کر موت سے ہمکنار ہو جاؤں گی۔ اور اچانک پھر آپ مجھے نظر آئے جو میرے لیے میٹھے چشمے سے کم نہیں۔ میری یہ برسوں کی پیاس صرف آپ کی محبت سے ہی بجھ سکتی ہے۔ آپ کا پیار ہی امرت بن کر اُسے ٹھنڈا کر سکتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اُس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔

'کہیں یہ لڑکی غلط تو نہیں، یا ہو سکتا ہے یہ کوئی بہت سنگین مذاق کر رہی ہو؟' میں نے سوچا۔ افق پر یہ سوچ ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ جن میں مستی کا خمار تھا۔

''اگر آپ پیاسی ہیں تو میں آپ سے زیادہ پیاسا ہوں۔'' میں نے گرمجوشی سے ہاتھ دبایا کیوں نہ اس لڑکی کا جواب مذاق میں دیا جائے۔

''سچ......!'' اس کی باچھیں کھل گئیں۔ جیسے اسے میری بات کا یقین نہ آیا ہو۔

تم سچ کہہ رہے ہو تو پھر آؤ نا ایک دوسرے کی پیاس بجھاتے ہیں۔'' اس نے مضبوطی سے میری کلائی پکڑی اور تقریباً کھینچتی ہوئی کمرے کی طرف جانے لگی۔ یہ بات میں نے جلد ہی محسوس کر لی کہ اس کے ہاتھ کی گرفت عام لڑکیوں کے مقابلے میں کافی سخت تھی۔ ابھی ہم کمرے اور چبوترے کے درمیان ہی پہنچے تھے۔ جس کا درمیانی فاصلہ دس بارہ فٹ ہوگا کہ دفعتاً پانی کے تالاب میں ہلچل سی ہوئی۔ جیسے کوئی تیرتا ہوا ہماری طرف آ رہا ہو۔

''لگتا ہے تالاب میں کوئی ہے۔ جلدی کرو کہیں چھپ جاتے ہیں۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو بدنامی ہوگی۔'' میں نے اپنی کلائی چھڑانا چاہی مگر ایسا محسوس ہوا جیسے میرا ہاتھ جلکسی وزنی چٹان کے نیچے ہو۔ وہ لڑکی ذرا برابر بھی نہ سرکی۔

''ڈرنے کی ضرورت نہیں یہ میری سہیلی روپا ہے۔ یہ بھی میرے ساتھ ہی تھی۔ اب نہا کر باہر آ رہی ہے۔''

پھر دوسرے ہی لمحے ایک نوجوان حسین لڑکی تالاب سے نکل کر ہمارے پاس آ گئی۔ وہ لڑکی سنجنا سے کافی مشابہت رکھتی تھی۔ صرف معمولی سا فرق ہوگا۔ روپا شاید کپڑوں سمیت نہا کر آئی تھی۔ اس لیے اس کا لباس بدن سے چپکا ہوا تھا۔ جسے دیکھ کر میرے جذبات انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگے۔ مگر جلد ہی میں نے اُن پر قابو پالیا۔

"تو یہ ہے وہ لڑکا......؟ جس کے بارے میں تم ہمیشہ کہا کرتی تھیں۔" وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں یہ وہی ہے میرا برسوں کا خواب...... اب تم کچھ دیر کے لیے یہاں سے چلی جاؤ۔ پھر بعد میں تمہاری باری ہوگی۔" سنجنا کے کہنے پر وہ مکان کے عقبی حصے کی جانب غائب ہوگئی۔

"مکان کے دروازے پر پہنچ کر سنجنا نے اس کی کنڈی کھول دی۔ بوسیدہ سا دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ اندر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا، جیسے کوئی گہری قبر ہو۔

"اندر چلو رک کیوں گئے؟" اس نے شوخ لہجے میں میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"سنجنا میں تو مذاق کر رہا تھا۔ آپ تو سچ مچ سنجیدہ ہوگئیں۔ ویسے بھی میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔" میں دروازے سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"بڑے سنگدل انسان ہو اور شاید تھوڑے سے بے وقوف بھی...... سامنے حسن کا جام چھلک رہا ہے۔ آگے بڑھو اور اسے ہونٹوں سے لگالو۔ آج اس مستانی رات کے رنگین لمحات کو ہمیشہ کے لیے میرے نام کردو۔" اس نے پھر میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ مگر میں نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

"سنجنا میں تو اب تک سمجھ رہا تھا کہ تم محض کوئی مذاق کررہی ہو۔ لیکن تم ایک نمبر کی بدکردار نکلیں۔ تم جیسی لڑکیاں پیار کے نہیں نفرت کے قابل ہوتی ہیں۔ کم از کم اپنی نہیں تو میری ہی عزت کا خیال کرو۔ اگر اس گاؤں کا کوئی شخص مجھے تمہارے ساتھ اس طرح دیکھ لے تو پھر میری آبرو پامال ہونے میں کون سی کسر رہ جائے گی۔ اور میں تم جیسی لڑکیوں کے منہ نہیں لگنا چاہتا۔ پیچھے ہٹو۔"

میں نے اسے ایک طرف دھکا دے کر قدم واپسی کی طرف موڑ لیے۔

وہ بھاگ کر میرے آگے دیوارِ چین کی طرح کھڑی ہوگئی۔ اور سخت لہجے میں بولی۔

"بھاڑ میں گئی تمہاری عزت...... یہاں سے میری پیاس بجھائے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ چلو پیچھے۔" اس نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر میری چھاتی پر مارے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ کسی لڑکی نے نہیں۔ بلکہ کسی مضبوط شخص نے مارے ہوں۔ میں اچھل کر پیچھے کی جانب گر پڑا، لیکن دوسرے ہی لمحے میں پھرتی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"تم لڑکی ہو اس لیے تمہارا لحاظ کر رہا ہوں۔ اب اگر ایسی کوئی حرکت کی تو ہاتھ توڑ دوں گا تمہارے۔ چلو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" میں نے یہ دھمکی اسے اس لیے دی کہ وہ خوفزدہ ہوکر بھاگ جائے۔ لیکن غصے سے اس کے ہونٹ سکڑنے لگے اور آنکھیں لال ہوکر اندھیرے میں بلور کی طرح چمکنے لگیں۔

"تم ایسے نہیں مانو گے۔ تمہارے ساتھ کچھ کرنا پڑے گا۔" اس نے گھمبیر انداز میں کہا۔ اور ساتھ ہی قوت سے بھرپور تھپڑ میرے رخسار پر جڑ دیا۔ میری جگہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو یقیناً گر کر بے ہوش ہو جاتا۔ بڑی مشکل سے میں اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔ نہ جانے اس کے تھپڑ میں کیسی تاثیر تھی کہ درد کی اذیت میرے پورے جسم میں سرایت کر گئی۔ میں گال پر ہاتھ رکھ کر حیرت سے اس لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

"کچھ گڑ بڑ ہے اور یہ لڑکی ہے کیا چیز......؟ کیا یہ نازک اندام لڑکی انسان ہو سکتی ہے۔ نہیں ہرگز نہیں، لہٰذا اس سے زیادہ اُلجھنا مناسب نہیں۔" میں نے سوچا۔

"دیکھو تم جو کوئی بھی ہو میری بات مانو۔ مجھے اس وقت جانے دو۔ میرے دوست میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ لہٰذا پھر کبھی ملنے کا پروگرام بنا لیتے ہیں۔"

"واہ...... مجھے پاگل سمجھا ہے کیا تم نے؟ اس کے بعد تم مجھے تو کیا اس گاؤں میں بھی نظر نہیں آؤ گے۔ ویسے بھی کس نے دیکھا ہے کل...... جو کچھ ہو وہ ابھی ہو۔" اس نے کہا۔

''اچھا چلو......'' میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے میرا ہاتھ جھٹنے کے انداز میں پکڑ لیا اور ہم کمرے کی طرف چلنے لگے۔ اچانک وہ دروازے کے باہر ہی رُک گئی۔

''کیوں اندر نہیں چلنا۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں اب یہاں پر ہی......'' اس نے میری گردن کے گرد اپنے دونوں بازو حمائل کر دیے۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی پکڑ اس کے بازو پر مضبوط کی اور اسے اندر کی طرف دے مارا۔ پھر میں نے یہ دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا کہ وہ اندر گر چکی ہے یا نہیں...... بس واپسی کے لیے سرپٹ دوڑنے لگا۔ مگر جیسے ہی میں چبوترے سے تھوڑا آگے پہنچا۔ تو میرے قدم وہیں رُک گئے۔ سامنے اس کی سہیلی روپا ہاتھ میں ایک چمک دار خنجر لیے وحشی انداز میں کھڑی تھی۔ ساتھ ہی وہ میری طرف بڑھی۔

''دیکھو اسے پھینک دو۔ ورنہ یہ لگ جائے گا۔'' اسے خنجر لہراتے دیکھ کر میں پیچھے ہٹنے لگا۔

''کیوں پھینک دوں۔ کیا میں تمہاری ملازمہ ہوں۔'' وہ بھنویں تان کر سخت لہجے میں بولی۔

''تم کیا سمجھتے ہو ہم تمہیں اتنی آسانی سے جانے دیں گے۔'' روپا نے کہا۔ دفعتاً پیچھے سے سجنا نے مجھے جکڑ لیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کا دائرہ بنا کر میرے پیٹ کے گرد سختی سے بھینچ لیے۔

''چھوڑو مجھے!'' میں نے خود کو چھڑانے کے لیے اِدھر اُدھر وجود کو جھٹکے دیے۔ لیکن وہ کسی چھپکلی کی طرح میری پشت کے ساتھ چمٹی رہی۔

''اگر ہمت ہے تو چھڑا لو۔'' اس کی بات سُن کر مجھے تاؤ چڑھنے لگا اور میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کلائیاں پکڑ کر گرفت قائم کی اور پوری قوت سے اس کی گرفت کو دائیں بائیں کھولنے لگا۔ اس کی پکڑ بہت ہی زیادہ مضبوط تھی۔ مگر میں دھیرے دھیرے کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ اچانک اس نے یک دم گرفت دوبارہ قائم کی اور مجھے پشت سے اُٹھا کر منہ کے بل زمین پر گرا دیا۔ اب میں زمین پر منہ کے بل پڑا ہوا تھا اور وہ میرے اوپر تھی۔ اس کا وزن منوں بھاری محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے اوپر کوئی نازک لڑکی نہیں بلکہ ہاتھی لیٹا ہوا ہو۔

میں نے دونوں ہاتھوں کو زمین پر پھیلایا اور اوپر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

''لگاؤ لگاؤ زور دیکھتے ہیں تم سچ مچ کے پہلوان ہو یا پھر......؟'' روپا نے تمسخرانہ انداز میں بات ادھوری چھوڑ دی۔

''میں بڑی مشکل سے اُٹھ کھڑا ہوا اور سجنا کے وجود کو لے کر اُلٹے قدم کمرے کی طرف لے جانے لگا۔ کمرے کی دیوار پر میں نے خود کو دے مارا اور سجنا نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں منہ کے بل گر پڑا۔ مگر پھر تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور واپس بھاگنے کے لیے پلٹا ہی تھا کہ کوئی بھاری چیز میرے سر پر پڑی۔ میرا دماغ گھومنے لگا اور آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میں نے سر کو تھام کر ڈگمگاتے قدموں سے سامنے کی طرف دیکھا۔ روپا ہاتھ میں ڈنڈا لیے اس انداز میں کھڑی تھی کہ دوسرا وار مجھ پر کر سکے۔ لیکن میرے ہوش و حواس بے قابو ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں گر پڑتا۔ سجنا نے بھاگ کر مجھے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔

''یہ تم نے کیا کیا روپا؟ مارا کیوں اسے؟'' سجنا کا یہ آخری جملہ تھا جو میرے کان میں پڑا پھر مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ میں کہاں ہوں۔

☆......☆......☆

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک نرم و گداز بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ سر کے نیچے تکیہ موجود تھا۔ میں جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سر میں اس جگہ ہاتھ لگا کر دیکھا جہاں روپا نے ڈنڈا مارا تھا۔ مگر درد کا نام و نشان تک نہ تھا۔ بلکہ میں خود کو پہلے سے بہتر محسوس کر رہا تھا۔ میں بستر سے اُٹھ کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ در و دیوار پر انگوری رنگ کا پینٹ کیا ہوا تھا۔ لکڑی کا بنا دروازہ کافی خوبصورت تھا۔ ایک اہم بات یہ تھی کہ چھت کے وسط میں کپڑے میں لپٹا ہوا ایک ہیرا لٹک رہا تھا۔ جس نے پورے کمرے کو روشن کر رکھا تھا۔ میں دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ یہ ایک ہال نما کمرہ تھا۔ یہاں پر بھی چھت کے وسط میں لٹکا ہوا ایک ہیرا روشن تھا۔ کمرے کے درمیان میں ایک کافی بڑا مجسمہ نصب تھا۔ جو پورے کا پورا سونے کا تھا۔ یہ شاید کسی عورت کا تھا۔ کیونکہ اس کے نسوانی خطوط نظر آ رہے تھے۔ سامنے

ایک اور کمرہ تھا۔ جس کا دروازہ بند تھا۔ میں دبے پاؤں اس طرف بڑھنے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں دروازہ کھول کر دیکھتا اندر سے ایک نسوانی قہقہہ سنائی دیا۔

''یہ تو سنجنا کی آواز ہے۔'' میں چونکا۔

''روپا! تم نے وہ محلول تو اُسے پلا دیا ہے نا۔'' سنجنا نے پوچھا۔

''ہاں..... مگر وہ محلول تو انسانوں کے لیے بہت طاقت ور ہوتا ہے۔ اس سے تو وہ ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا۔'' روپا بولی۔

''روپا! مانا کہ اس محلول کو پینے سے انسان کو درد کا احساس نہیں ہوتا اور رگوں میں خون کی روانی بھی تیز ہو جاتی ہے۔ مگر اس شکار کا مزہ ہی کیا ہے جو تمام تر رعنائیوں سے بھرا ہو۔'' سنجنا بولی۔

''وہ تو پہلے ہی پہلوان ہے اب تم نے اسے مزید قوت بخش دی ہے۔ لگتا ہے سنجنا تمہارے ارادے کچھ اور ہی ہیں۔'' روپا معنی خیز انداز میں بولی تو سنجنا نے قہقہہ لگایا۔

''ویسے ایک بات ماننی پڑے گی۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں وہ اندر سے کافی مضبوط شخص ہے۔ کچھ تو اس کے اندر صلاحیت موجود ہے ورنہ حسن کو دیکھ کر کون کافر نہیں بہک جاتا۔'' سنجنا کی بات پر دونوں نے بلند قہقہہ لگا دیا۔

''لیکن اسے ہوش کب آئے گا؟'' روپا نے پوچھا۔

''بس کچھ لمحوں کی بات ہے پھر اپنی پیاس بجھے گی۔'' سنجنا نے جواب دیا۔

''اچھا..... تو یہ بات ہے۔'' میں نے خود سے کہا۔ یہ دونوں میرے خون سے اپنی پیاس بجھانا چاہتی ہیں۔ میں دروازے سے ہٹ کر ادھر اُدھر کوئی راستہ تلاش کرنے لگا تاکہ جلد از جلد ان کے چنگل سے نکل سکوں۔ دفعتاً ایک جگہ ایک خلا سا نظر آیا جہاں پر ہلکا سا اندھیرا نظر آ رہا تھا۔

''کہیں یہ باہر جانے کا راستہ تو نہیں؟'' میں اس طرف چل پڑا۔ یہ ایک چار فٹ اونچی اور تین فٹ چوڑی سرنگ تھی۔ میں اس میں داخل ہو گیا۔ اندر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ آگے جانا کہیں میرے لیے خطرناک نہ ہو۔ اس سوال نے میرے قدم وہیں روک دیے۔ کیا پتا یہ سرنگ آگے جاتی بھی ہے یا پھر بند ہے اگر روشنی کا انتظام ہو جائے تو آگے جانے کا راستہ با آسانی معلوم ہو سکتا ہے۔ پھر ایک خیال میرے ذہن میں آیا اور میں جلدی جلدی واپسی کی طرف چلنے لگا۔ جلد ہی اس کمرے میں آ گیا جہاں پر میں پہلے لیٹا ہوا تھا۔ پھر میری نظر اس ہیرے کی طرف اُٹھ گئی۔ جو چھت کے وسط میں مجھ سے تقریباً سات فٹ کی بلندی پر لٹک رہا تھا۔ میں نے کسی نہ کسی طریقے سے وہ ہیرا نیچے اُتار لیا اور واپس سرنگ میں آ گیا۔ وہ دونوں ابھی تک کمرے میں موجود تھیں۔ کیونکہ ان کا دروازہ پہلے کی طرح بند تھا۔ ہیرے کی روشنی آگ کی طرح سرنگ میں پھیلنے لگی۔ میں جھک کر جلدی جلدی آگے بڑھنے لگا۔

سرنگ اندر سے بالکل صاف ستھری تھی۔ نہ کوئی جالا نہ کوئی کیڑا وغیرہ..... یہ سرنگ کافی بڑی تھی۔ تقریباً دس پندرہ منٹ چلنے کے بعد ختم ہو گئی اور خود کو میں نے ایک ہرے بھرے کشادہ جنگل میں پایا۔ میں ہیرے کی روشنی میں اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ سرنگ کا وہ دہانہ جس کے اوپر میں کھڑا تھا۔ ایسے غائب ہو گیا۔ جیسے کبھی تھا ہی نہیں اور زمین پہلے کی طرح ہم وار ہو گئی۔ اچانک گھنٹیوں کے شور کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ جیسے انہیں کوئی بہت زور سے بجا رہا ہے۔

لگتا ہے آس پاس ہندوؤں کا کوئی مندر ہے۔ پھر واقعی میرا اندازہ صحیح نکلا۔ سامنے کچھ فاصلے پر ایک مندر کے آثار نظر آ رہے تھے جیسے اکثر ہم فلموں میں دیکھا کرتے تھے۔ میں ہیرے کی روشنی میں اس کی طرف بڑھنے لگا۔ پیروں کے نیچے سے پتوں کی چرچراہٹ بلند ہو رہی تھی، پھر کچھ دیر بعد میں مندر میں داخل ہو چکا تھا۔

یہ کافی پرانا اور خستہ حال مندر تھا۔ سامنے ہندوؤں کی کالی دیوی کا ایک بھیانک کریہہ صورت بت نصب تھا۔ جس کے ایک ہاتھ میں ایک تیز دھاری تلوار نظر آ رہی تھی۔ اطراف کی دیواروں پر تین مشعلوں نے اس کے کالے پیٹ کو روشن کر رکھا تھا۔ اس ویران جنگل بیابان میں مندر کا ہونا ایک عجیب معما ہے۔ میری سوچ ابھی اسی شاہراہ پر ہی تھی کہ پیچھے سے کسی نے میرے

کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ڈر کی کیفیت سے میں اچھل پڑا اور جلدی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

وہ تقریباً تیس بتیس سالا گندی رنگت کی عورت تھی جس کے ماتھے پر کافی بڑی بندیا سجی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں وحشت کے آثار اور کھلے بالوں میں وہ کسی چڑیل سے کم نہیں لگ رہی تھی۔

''کک...... کون ہو تم؟'' میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''گھبراؤ نہیں میں نینا ہوں۔ میں اپنے عمل کے زور سے تمہیں یہاں تک لے آئی ہوں۔ ورنہ وہ دونوں چڑیلیں تمہارا خون چوس لیتیں۔ یہ مہا کالی کا مندر ہے، تم یہاں پر بالکل محفوظ ہو۔ مجھے مہا کالی نے ایسی شکتیاں دان کی ہیں کہ لوگوں کو ہر بری آتما سے بچا سکوں۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ، مگر وہ دونوں یہاں تک آ گئیں تو......؟'' میں نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''وہ یہاں پر نہیں آ سکتیں اور اگر آ بھی گئیں تو میں اُن کو ختم کر دوں گی۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے اب ایک اور مہربانی کر دیجیے کہ مجھے گھر تک پہنچا دیں۔''

''ٹھیک ہے تم یہاں پر رکو اور کہیں جانا نہیں، میں کچھ کرتی ہوں۔'' ساتھ ہی وہ مندر سے باہر نکل کر درختوں میں کہیں غائب ہو گئی۔ میں پریشانی سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ یہ میں نہ جانے کس مصیبت میں پھنس گیا۔ کاش میں شادی کی تقریب کو چھوڑ کر نہ آیا ہوتا۔ یا پھر کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لیتا۔ میں اس گھڑی کو کوس رہا تھا کہ پچھلے راستے پر پتوں میں سرسراہٹ پیدا ہونے لگی۔ اس راستے سے کوئی چل کر اسی طرف آ رہا تھا۔ جہاں سے ابھی ابھی میں گزر کر آیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا چہرہ روشنی میں واضح ہوا تو وہ سنجنا تھی۔ جسے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکنیں اچھل کود کرنے لگیں۔ اگلے ہی ثانیے میں وہ میرے قریب آ گئی۔

''تمہیں کس نے کہا تھا کمرے سے باہر نکلنے کو۔ اب چلو یہاں سے......'' سنجنا تحکمانہ انداز میں بولی۔

''کمرے سے یہ کسی کے کہنے پر نہیں، بلکہ اپنی جان بچانے کی خاطر نکلا ہے۔ اب یہ تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔'' پیچھے سے نینا برآمد ہوئی۔ جس کے ہاتھ میں ایک تھال تھا۔ جس کے اندر لال رنگ کا پاؤڈر سا موجود تھا اور اس کے اوپر ایک چراغ جل رہا تھا۔

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے سنجنا...... میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ مجھے تم سے خطرہ ہے۔ اگر نینا بروقت اپنے عمل سے مجھے یہاں تک نہ لاتی تو یقیناً تم دونوں میرا قصہ اب تک ختم کر چکی تھیں۔ اب تم جاؤ یہاں سے......''

میری بات سُن کر سنجنا کا چہرہ غصے سے تلملانے لگا۔ اس نے نظریں گھما کر نینا کی طرف دیکھا۔

''شیرنی کے منہ سے نوالہ چھین کر تُو نے بہت بڑی بیوقوفی کی ہے نینا...... پانی میں رہ کر مگر مچھ سے دشمنی...... یہ تجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ تُو تو خود گندگی کا ڈھیر ہے۔ ہیرے کو کوئلے کا نام دے کر جو تُو نے اس کے دل میں شبہ پیدا کیا ہے۔ تجھے اس کی بہت بھیانک سزا ملے گی۔''

''مدثر یہ جو تمہاری ہمدرد بن رہی ہے۔'' سنجنا مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''یہ تو خود سیکڑوں سال پرانی ایک بھٹکی ہوئی بدروح ہے۔ اس کا نام سرسوتی ہے۔ جب یہ زندہ تھی تو بہت بدصورت تھی۔ یہ جس گاؤں میں رہتی تھی وہاں کے لوگ اسے نحوست یافتہ سمجھتے تھے۔ اور یہ تھی بھی ایسی۔ جس عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوتا۔ یہ اس گھر میں چکر لگاتی تو وہ بچہ مر جاتا۔ لوگ اس پر بھنا گئے اور ایک رات اسے اس کے گھر میں ہی زندہ جلا دیا۔ اس کی روح بھٹک گئی اور لوگوں کو ہراساں کرنے لگی۔ لوگوں نے ایک بہت بڑے رشی سے رابطہ کیا اور اس مہان رشی نے اسے یہاں اس مندر میں قید کر دیا۔ اس نے قید میں رہ کر کالی کی پوجا کو وار بنا لیا۔ تب وہ اس کے سامنے نمودار ہوئی اور اس نے بتایا کہ جولائی کا پورن ماشی یعنی تیز چاندنی کی رات کو اکیلا گزرے گا۔ اس کے خون سے میرے بت کو نہلا دینا۔ تمہیں تمہارا شریر مل جائے گا۔ کالی دیوی کی یہ مہا پجارن تجھے اس کی بلی دے کر اپنا کھویا ہوا وجود حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ہمارا ارادہ تو محض تم سے دو گھڑی تفریح و مذاق تھا۔ یہ خود تم کو جان سے مارنا چاہتی ہے۔ تم اس کی باتوں میں مت آؤ۔ اور میرے ساتھ یہاں سے چلو تا کہ تمہیں گھر پہنچا دوں۔ پھر میں اسے بتاتی ہوں کسی کی چیز پر جبراً قبضہ

جمانے کی سزا کیا ہوتی ہے۔'' سنجنا نے تفصیل سے نینا کے بارے میں بتایا۔

''دیکھ سنجنا میرے کام میں رکاوٹ مت بن۔ ورنہ تجھے کھڑے کھڑے زمین میں گاڑ دوں گی۔'' نینا کی دھمکی سنجنا سے برداشت نہ ہوسکی۔ وہ آگے بڑھی اور ایک بھرپور تھپڑ اس کے رُخسار پر دے مارا۔ ساتھ ہی نینا چکرا کر منہ کے بل زمین بوس ہوگئی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھالی دور جا گری اور چراغ بجھ کر ایک جانب گر پڑا۔

نینا تیزی سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور آنکھیں بند کر کے زیرلب کچھ پڑھنے لگی۔ پھر اس کے اندر سے ایک سایہ نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے نینا کا روپ اختیار کر لیا۔ اب وہاں پر ایک کے بجائے دو نینا کھڑی تھیں۔

''تو سنجنا کو دیکھ اور میں اس لڑکے کی بلی دیتی ہوں۔'' نینا نے اپنے ہمزاد کو حکم دیا تو وہ کسی چیل کی طرح اچھل کر سنجنا پر جا گری۔ سنجنا اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور پشت کے بل زمین پر گر پڑی۔ اس کے اٹھنے سے پہلے نینا کے ہمزاد نے اُٹھ کر کسی نومود بچے کی طرح اٹھایا اور باہر کی طرف گھما کر پھینک دیا اس کا وجود اڑتا ہوا مندر سے باہر درختوں کے پیچھے کہیں جا گرا۔ ہمزاد وہاں سے ہوا میں معلق اس کے پیچھے چلا گیا۔

''لڑکے جلدی سے مہا کالی کے قدموں میں جھک جاؤ۔ تاکہ تمہاری کالی ماتا کے چرنوں میں بلی دے کر میں ہمیشہ کے لیے اپنا وجود پالوں۔'' نینا کے ہاتھ میں ایک خوفناک تلوار نمودار ہوچکی تھی۔ اس نے تلوار لہراتے ہوئے مجھے کالی کے بت کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

''زبان سنبھال کر بات کر بدروح میں کوئی تیرا غلام نہیں ہوں۔ جو تیرا حکم مانوں۔ بھاگ جا یہاں سے ورنہ اسی تلوار سے تیرے ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا اور میں جان دے دوں گا مگر اس بت کے آگے کبھی نہیں جھکوں گا۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''پھر مجھے یہیں تیرا سر کاٹنا پڑے گا۔'' وہ تلوار سیدھی کر کے میری طرف بڑھنے لگی۔ میں الٹے پاؤں پیچھے ہونے لگا۔ یہاں تک کہ میں دیوار کے ساتھ جا لگا۔ وہ میرے نزدیک پہنچ کر فخریہ انداز میں مسکرانے لگی۔ پھر اس نے تلوار اٹھا کر اطمینان سے میری گردن کا نشانہ لے کر ماردی۔ بجلی جیسی رفتار سے میں ایک طرف ہوگیا اور تلوار کا وار دیوار پر جا لگا۔ وہاں پر ایک ہلکا سا دھماکہ ہوا اور چھوٹا سا شگاف پڑ گیا۔ وہ تلوار لے کر پھر میری طرف بڑھی اور جلدی سے مجھ پر وار کردیا۔ میں پھر جلدی سے نیچے بیٹھ گیا۔ تلوار کا وار میرے سر کے اوپر سے گزرا اور نینا کا رُخ دیوار کی طرف ہوگیا۔ میں پھرتی سے اٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اسے دیوار کی طرف دھکا دے دیا۔ اس کا کندھا اور منہ دیوار سے ٹکرائے۔ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ منہ کے بل گر پڑی۔

میں نے موقع غنیمت جانا اور اس کے اٹھنے سے پہلے اسے کمر سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور سر کے بل زمین پر دے مارا۔ پہلوانی کا یہ ایک مخصوص داؤ تھا۔ جس سے سر اور کندھے متاثر ہوتے تھے۔ اس کے حلق سے ایک خوفناک چیخ بلند ہوئی اور وہ سر تھام کر زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ میرے خیال میں اسے بے ہوش ہوجانا چاہیے تھا۔ لیکن اگلی گھڑی میں وہ یوں اُٹھ کھڑی ہوئی جیسے اسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''ابھی تم بچے ہو۔'' وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ ساتھ ہی اس نے لپک کر میری گردن ایک ہاتھ سے دبوچ لی۔ مجھے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے مجھے پینٹ سے پکڑا اور ایسے اوپر اٹھا لیا۔ جیسے میں کوئی چھوٹا سا بچہ ہوں۔ میں ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ اس نے گھما کر مجھے بت کی طرف اچھال دیا۔ میں اُڑتا ہوا دائیں پہلو کی جانب گرا کندھا اور سر کا کچھ حصہ درد کی اذیت سے بری طرح متاثر ہوا۔

''نینا نے متکبرانہ انداز میں مسکرا کر ہاتھ تھوڑا سا اوپر اٹھایا تو ایک اور تلوار اس کے ہاتھ میں چمکنے لگی۔ وہ پُر اعتماد قدموں سے میری طرف بڑھنے لگی۔ میں لیٹے لیٹے اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر دیکھنے لگا۔ پھر میری نظر کالی کے ہاتھ میں موجود تلوار پر جا کر جم گئی۔ میں جلدی سے اٹھا اور جلدی سے اس کے ہاتھ سے تلوار نکال لی۔ پھر دونوں ہاتھوں میں تلوار تھامے اس کے وار کے لیے چوکس کھڑا ہوگیا۔

''اس نے تیزی سے مجھ پر وار کیا۔ میں نے جلدی

سے تلوار آگے کر دی۔ آسمانی بجلی چمکی۔ مجھے اپنے ہاتھوں میں بہت زیادہ درد محسوس ہونے لگا اور تلوار میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ اب مجھ پر دیوانہ وار، وار کر رہی تھی۔ مگر میں خود کو بچاتا ہوا بت کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ وہ غصے سے میری طرف بڑھی اور میں پیچھے ہٹتے بت کے ساتھ جا لگا۔ اس نے اندھا دھند مجھ پر وار کر دیا۔ اگر سیکنڈ کے بارہویں حصے میں، میں نیچے نہ بیٹھ جاتا۔ تو یقیناً اس بار تلوار میرا کام کر دیتی۔

اچانک ایک فلک شگاف دھماکا ہوا اور کالی کے بت کے کئی ٹکڑے فرش پر بکھر گئے۔ تلوار اس کے ہاتھ سے ایسے چھوٹ گئی۔ جیسے وہ بہت کمزور ہو چکی ہو۔

''دفعتاً سنجنا کسی وحشی شیرنی کی طرح اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں نینا کے ہمزاد کا سر تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک خنجر...... سر کو اس نے نینا کے قدموں میں پھینک دیا۔

''دیکھ اس کا انجام......'' وہ گرجی۔ ''اب تیرا حال بھی یہی ہوگا۔'' پھر اس نے پوری قوت سے خنجر نینا کے پیٹ میں اتار دیا۔ نینا کے حلق سے ایک دلدوز چیخ فضا میں بلند ہوئی۔ پھر سنجنا نے یکے بعد دیگرے اس کے پیٹ میں کئی وار کر دیے۔ خنجر اس کے پیٹ میں ہی گھسا تھا اور وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گر پڑی۔ سنجنا نے رُخ موڑ کر میری طرف دیکھا۔

اور...... اس سے پہلے کہ وہ کوئی دوسری بات کرتی۔ اچانک نینا کے وجود میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سنجنا کا پاؤں پکڑ کر پوری قوت سے دوسری طرف اچھال دیا۔ سنجنا پشت کے بل مندر کے داخلی دروازے پر جا گری نینا کا وجود کئی فٹ اوپر کو اچھلا اور چھت کے پاس جا کر سیدھا ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے پیٹ سے خنجر کو ایسے نکالا جیسے مکھن سے بال...... پھر اس نے وہیں سے خنجر کا رُخ سنجنا کی طرف کر لیا۔

''اس سے پہلے کہ نینا سنجنا کے اوپر گر کر خنجر کو اس کے جسم کا حصہ بنا دیتی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ...... نیچے پڑی ہوئی تلوار اٹھائی اور نینا کی طرف اچھال دی۔ نینا سنجنا کے اوپر چند فٹ کی دوری پر رہ گئی تھی۔ تلوار کسی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح نینا کے پہلو میں جا گھسی اور وہ کربناک چیخ کے ساتھ ایک جانب جا گری۔

سنجنا نے جلدی سے اُٹھ کر اس کے جسم سے تلوار نکالی اور ایک ہی وار سے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ ایک دم اس کے وجود کو آگ نے پکڑ لیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہاں پر سیاہ راکھ پڑی ہوئی تھی۔ جو ہولے ہولے ہوا میں تحلیل ہونے لگی۔

''اب چلو یہاں سے......'' سنجنا نے اپنا نام ہاتھ میری آنکھوں پر رکھ دیا۔ تو مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ پھر تھوڑی دیر بعد میں اور سنجنا تالاب کے پاس کھڑے تھے۔

''مدثر! ہم دونوں واقعی تمہارے خون سے اپنی پیاس بجھانا چاہتی تھیں۔ مگر جان سے مارنا ہرگز نہیں تھا۔ لیکن یہاں تصویر کا رُخ ہی پلٹ گیا۔ میری برسوں کی پیاس...... ادھوری پیاس ہی رہی۔ مگر تم ہمیں خون آشام یا چڑیلیں مت سمجھنا...... اور دوسری بات نہ تو ہم ہندو مذہب سے ہیں اور ہم نے تمہیں اپنے اصلی نام بتائے۔ یقین مانو مجھے واقعی تم سے دلی محبت ہے۔ خیر تم اب گھر جاؤ۔ ہمارے بچھڑنے کا ٹائم آ گیا ہے۔ کیونکہ تھوڑی دیر بعد فجر کی اذان ہونے والی ہے۔'' وہ اُداس لہجے میں بولی۔

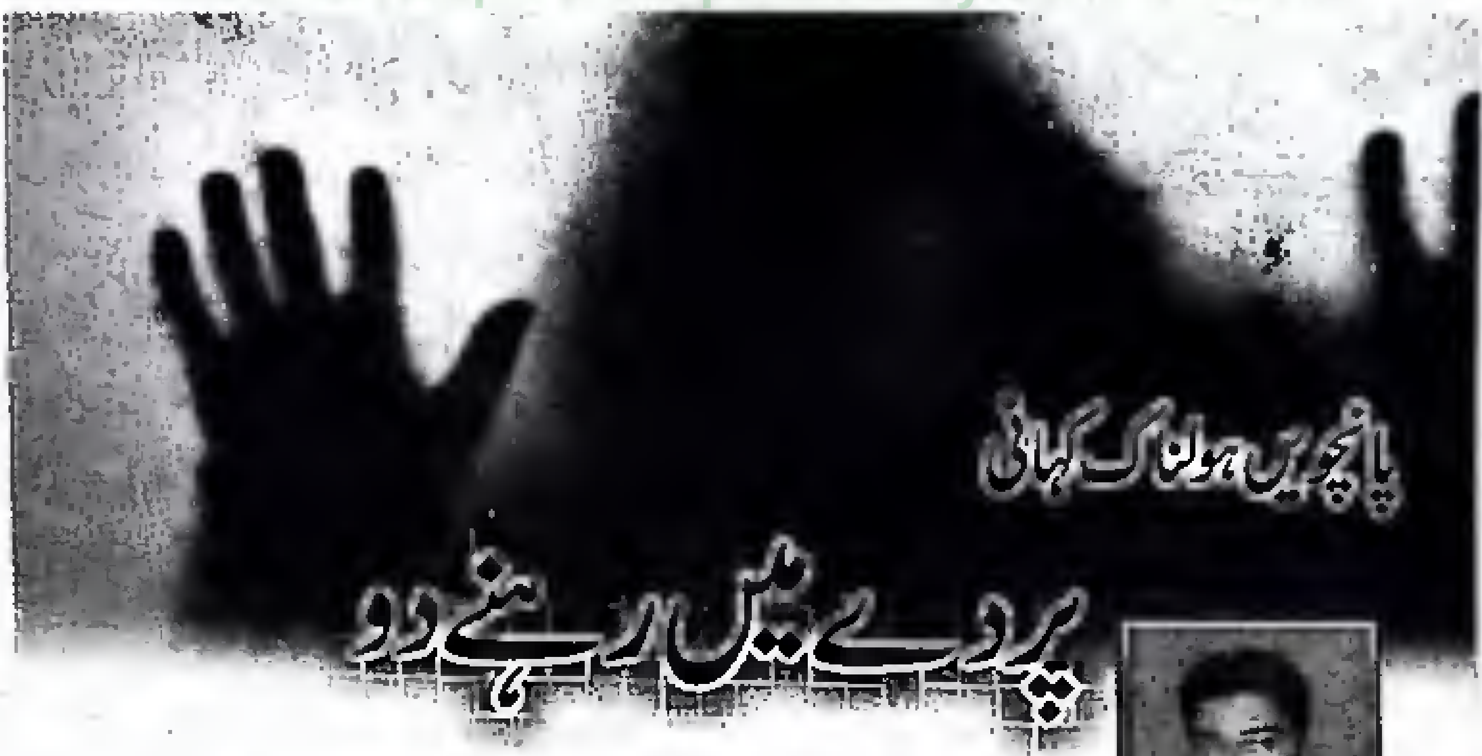
''میں اس سے بہت کچھ کہنا اور سننا چاہتا تھا۔ لیکن صرف الوداعی کلام کے ساتھ ہاتھ ہلایا اور گاؤں جانے والے راستے پر قدم بڑھا دیے۔''

چند قدم چلنے کے بعد میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ بجھے بجھے سے انداز میں ہاتھ لہرا رہی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں نمی کی جھلک نمایاں نظر آ رہی تھی۔ میں نے اپنے جذبات پر قابو پایا اور گاؤں کی طرف چل پڑا۔

آج بھی اس خونی دنگل کی یاد میرے دل میں اپنی جوت جگا دیتی ہے۔

سنجنا...... سنجنا کے بارے میں، میں مزید جاننا چاہتا تھا۔ مگر...... جو خدا کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ شاید زندگی کے کسی اور مقام پر میرا سنجنا سے سامنا ہو جائے۔ یہ میرا یقین ہے کہ اب کی بار وہ مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دے گی۔

☆☆......☆☆





علی حسنین تابش

اُس طبیب کی کتھا، جس پر ایک چڑیل عاشق ہوگئی تھی



میں نے اک امیر گھرانے میں آنکھ کھولی۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا تھا۔ اور وہ مجھ سے بے حد پیار کرتے تھے۔ میری پرورش میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ چھوڑی گئی۔ میری ہر خواہش کو مانا گیا۔

میرے والد کا شمار شہر کے مشہور اور قابل طبیبوں میں ہوتا تھا۔ اور دور دور سے مریض اُن کے پاس آتے تھے۔ اور اللہ پاک کے رحم و کرم سے شفاء یاب ہوتے تھے۔

صبح شام میرے والد صاحب کے پاس مریضوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ میں جب اسکول سے واپس لوٹتا تو والد صاحب بڑے خوش ہوتے اور میرے ساتھ گھر جا کر دوپہر کا کھانا کھاتے اور پھر میں کچھ دیر کو آرام کی غرض سے لیٹ جاتا اور اپنی آنکھیں موند لیتا اور نیند مجھے اپنی آغوش میں لے لیتی، کچھ خبر نہ ہوتی۔

اور میں ہر شام اپنے ابو جان کے ساتھ ان کے کلینک پر آ جاتا اور ان کی تمام مصروفیات کو دیکھتا رہتا۔ اور ان کی بھی یہ خواہش تھی کہ میرا بیٹا بڑا ہو کر ڈاکٹر بنے گا۔ اور سچ تو یہ تھا کہ مجھے بھی ڈاکٹر بننے کا بہت شوق تھا۔

یہ واقعہ ان دنوں کا ہے جب میں 7th کلاس کا اسٹوڈنٹ تھا۔ اور اپنی روٹین کے مطابق روز شام کو اپنے والد صاحب کے ساتھ کلینک پر آ جاتا تھا۔ ایک شام سورج ڈھلنے کو تھا۔ ہر سو سکوت چھا چکا تھا۔ میں L.C.D پر کارٹون دیکھنے میں مصروف تھا۔

میں نے اچانک کلینک کے دروازے پر نظر ڈالی تو اک لمبی سی دبلی پتلی عورت کو برقعے میں ملبوس کھڑا پایا۔ اس کے چہرے پر حجاب بھی تھا۔ مگر نہ جانے کیوں اُسے دیکھتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور اک انجانا سا خوف میری رگ رگ میں سما گیا۔ میں اسے دیکھتا رہا۔

وہ آ کر والد صاحب کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنا مسئلہ شیئر کرنے لگی۔ میں اک ڈر سا دل میں بسائے دوبارہ کارٹون دیکھنے میں محو ہو گیا۔ لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی وقفے وقفے بعد میری نظر اس پر پڑ ہی جاتی۔ اس کی شربتی آنکھیں ایسی کہ نار کا اک الاؤ جل رہا ہو۔ مجھے اس کی آنکھوں سے خوف محسوس ہونے لگتا تھا۔

میں نے اپنی کرسی کا رُخ دوسری طرف موڑ لیا۔ تقریباً 15 منٹ تک وہ عورت کلینک میں موجود رہی اور میں اپنے وسوسوں پر قابو نہ پا سکا۔ گاہے بگاہے میرے خیالات اس کی طرف چلے جاتے تھے۔ آج سے پہلے ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔

جب وہ دوا لے کر رخصت ہونے لگی تو اس نے مجھے اس انداز سے دیکھا کہ جیسے وہ مدتوں سے مجھ سے آشنا ہو۔ کہنے لگی۔

''پیارے شہزادے! سدا جیتے رہو۔'' اور میرے سر پر پیار دے کر چلی گئی۔ اس کی شربتی آنکھوں کی وہ ناری چمک میرے دل کو چیر کے رکھ دینے والی تھی۔ میں اپنی کرسی پر بیٹھا کانپتے وجود سے اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

☆......☆......☆

''بابا جان! یہ کون تھی؟'' میں نے کانپتی آواز سے اس کے جانے کے بعد اپنے والد سے سوال کیا۔ تو وہ مسکرا کر کہنے لگے۔

''اتنے سہمے ہوئے کیوں ہو؟ ایک دماغی مریضہ ہے۔ دوا دی ہے جلد صحت یاب ہو جائے گی۔''

یہ بات کہہ کر وہ پھر کچھ لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ اور میں اپنے ذہن میں ابھرتے وسوسوں کو پابند سلاسل نہ کر پایا۔ اور وہاں سے اُٹھ گیا۔

☆......☆......☆

اب اکثر اس عورت کا کلینک پر آنا جانا لگا رہتا تھا۔ کیونکہ بقول والد صاحب اس کا علاج ایک لمبے عرصے تک چلنا تھا۔ جب وہ چند ہفتوں کے بعد آتی تو اس کے آنے کا وقت ہمیشہ ساڑھے چھ بجے ہی ہوتا تھا۔ مجھے اس بات نے بے حد حیرت میں ڈال رکھا تھا۔ وہ جب بھی آتی تو خاص طور پر میرا پوچھتی اور جاتے وقت تک اس کی مانند نار شربتی آنکھیں چاروں اطراف میرے وجود کی متلاشی ہوتی تھیں۔

اور میں اُس کے آنے سے قبل ہی پچھلے کمرے میں جاکر بیٹھ جاتا تھا۔ جہاں میرے کہنے پر والد صاحب نے L.C.D یا C.D کی جگہ تبدیل کروا دی تھی۔ جب اس کی آمد ہوتی تھی۔ جانے اک عجب سا سکوت ماحول پر طاری ہوتا تھا۔ اس کی چال پُر اسرار قسم کی تھی۔ اس کے ہاتھ کی انگلیاں یوں تھیں جیسے سنپولیے ہوں اور اس کے پیر بھی عام پیروں سے کچھ زیادہ لمبے تھے۔

والد صاحب کے بتانے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک بیوہ عورت ہے اور اپنے شوہر کی وفات کے بعد اس کا دماغ کچھ ٹینشن اور اپنے شوہر کے فراق کی وجہ سے بیمار ہو چکا ہے۔

اور والد صاحب کے علاج سے اب وہ صحت یابی کی طرف گامزن ہے۔ مگر میرے دل میں جو خوف پرورش پا رہا تھا۔ اس کا میں کیا کرتا؟

☆......☆......☆

وقت گزرتا گیا۔ اور اس کے دل میں میرے لیے پیار بڑھتا ہی چلا گیا۔ اب تو والد صاحب خصوصی طور پر مجھے دوسرے کمرے سے بلوا کر اس سے ملواتے تھے۔ اور میں لرزتے قدموں سے آکر اس کے سامنے بیٹھ جاتا تھا۔ میری راتوں کی نیند حرام ہو چکی تھی۔ اس کا بھیانک چہرہ، انگارے اگلتی آنکھیں رات بھر مجھے سونے نہیں دیتی تھیں۔

☆......☆......☆

خیر یہ سلسلہ جاری رہا اور جب میں نے میٹرک میں نمایاں کامیابی حاصل کی تو مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ دلا دیا گیا۔ میں بہت خوش تھا۔ اور اپنی منزل کو پانے کا متلاشی تھا۔

کالج ٹائمنگ کے بعد اب میں والد صاحب کے ساتھ اِن کے کلینک میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ اب مجھ میں کچھ بہادری بھی آچکی تھی۔ اس عورت کو بھی اب میں ہی ڈیل کرتا تھا۔ مگر نا جانے کیوں میں اب بھی اسے نارمل نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات عام انسانوں کی سی نہ تھیں۔ اور اُس کی آنکھیں تو ویسے ہی وحشت خیز تھیں۔ لیکن اس کے لہجے میں اس قدر مٹھاس تھی کہ کسی کا ذہن بھی اس کے دوسرے پہلوؤں پر نہ جاتا جیسے اس کا اٹھنا بیٹھنا، دھیرے دھیرے چلنا اور انگارہ آنکھوں سے چاروں اطراف گھورتے ہی رہنا۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن مجھے تو پہلی ملاقات سے ہی اس کی حرکات و سکنات پر شک تھا مجھے وہ ایک نارمل انسان کے بجائے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگتی تھی۔

☆......☆......☆

ایک روز یونہی اتفاق سے اپنے کلینک پر اکیلا تھا۔ اور والد صاحب شہر سے باہر کسی ضروری کام سے گئے ہوئے تھے کہ اچانک پائل کی چھن چھن دھیرے دھیرے میرے کانوں میں رس گھولتی گئی اور وہ مجسمۂ حیرت میرے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ میں اسے آنٹی کہا کرتا تھا۔ بہرکیف طبیعت کا پوچھنے کے بعد میں اُٹھ کھڑا ہوا اور دوائی لینے کی غرض سے دوسرے کمرے کا رخ کیا۔ جب واپس لوٹا تو میرے قدم وہیں پر منجمد ہو گئے۔ اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

ڈر اور خوف کی اک لہر میرے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ یوں لگا کہ پیروں تلے زمین ہی نہ ہو۔ وہ عورت بغیر حجاب کے میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اُس کی خوبصورتی دیکھ کر میں دنگ رہ گیا تھا اور مجھے سو فیصد یقین تھا اُس نے حجاب میرے لیے ہی اتارا تھا۔ حالانکہ ایسا پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ وہ مجھے اچانک دیکھ کر ٹھٹک سی گئی اور جلدی سے حجاب کی اوٹ میں ہو گئی۔ میری عادت نہ تھی فضول سوالات کرنے کی۔ اس لیے بس دوائی دی اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

میں سوچتا ہی رہ گیا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ اس رات بھی میں ٹھیک سے سو نہ سکا۔ اور بار بار اسی کا خوف میرے دل و دماغ میں برقی لہریں دوڑاتا رہا۔

دن گزرتے گئے۔ اور اس کا خوف میرے دل میں گھر کرتا گیا۔ اور اُسے جاننے کی خواہش دل میں مچلتی رہی۔ والد صاحب میری اس کیفیت سے ناواقف تھے۔ اس لیے اکثر وہ مجھے کھویا کھویا دیکھ کر یہ پوچھا کرتے کہ بیٹا کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتاؤ۔‘‘ میں کہتا۔

"نہیں بابا جان کچھ نہیں بس ویسے ہی۔"

☆......☆......☆

میری شادی ہو چکی تھی۔ اور اب لاریب میری زندگی کی ہمسفر بن کر آ چکی تھی۔ میں اکثر اس سے بھی اس بارے میں بات کرتا مگر وہ بھی والد صاحب کی طرح شاید میری اس اُلجھن سے ناآشنا ہی رہی۔ یا شاید ایسی باتوں پر وہ کچھ خاص یقین نہیں رکھتی تھی اور وہ مجھے بس اتنا ہی کہہ دیتی۔

"اتنا مت سوچا کرو آپ......"

☆......☆......☆

وہ عورت اب بھی ویسی ہی تھی۔ اس پر عمر کا کوئی اثر نہ پڑا تھا۔ اور اب وہ بہت کم آیا کرتی تھی۔ والد صاحب ضعیف العمر تھے۔ اور میرے ہی کہنے پر اب وہ زیادہ گھر میں رہا کرتے تھے۔ لاریب کی صورت میں انہیں اللہ پاک نے فرمانبردار بیٹی سے نوازا تھا جو کہ ہر وقت میرے ابی ابو کی خدمت کرتی رہتی تھی۔ اور وہ دل و جان سے ہم تینوں کو چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

ایک روز جب وہ عورت دوا لے کر واپس لوٹی تو میرے پاس بیٹھے میرے دوست نے اس کے بارے میں پوچھا۔ تو میں نے اُسے ساری روداد سنا ڈالی۔ وہ میری باتیں سُن کر حیران بھی تھا اور شریری ہنسی اس کے چہرے پر بار بار اپنے ڈیرے جمالیتی تھی۔

شاید اسے میری باتوں کا یقین نہ آ رہا تھا۔ اس نے اس کے بارے میں معلوم کرنے کا سوچا اور کہا۔

"میں اس کا مکمل پتا کر کے تمہیں بتاؤں گا یہ کون ہے؟"

☆......☆......☆

اور پھر ایک دن میرے اس دوست کی کال آئی اور اس نے کہا۔

"پیارے اس تمہاری مریضہ کا پتا لگ چکا ہے۔ تم تیار رہو میں آ رہا ہوں تمہارے پاس......" اتنا کہہ کر اس نے کال ڈس کنیکٹ کر دی۔ میرے دماغ میں سیکڑوں وسوسوں نے جنم لینا شروع کر دیا۔ اور بے چینی اپنے عروج پر تھی۔ انتظار کی گھڑیاں تو ویسے بھی جان لیوا ہوتی ہیں۔

20 منٹ بعد میرا دوست آن پہنچا اور میرا انتظار ختم ہوا۔ ہم نے کلینک بند کیا اور ایک شاپنگ مال میں چلے گئے۔

میرے دوست کے مطابق وہ جیولری کی ایک شاپ پر موجود تھی۔ ہم بھی وہیں جا کر بیٹھ گئے اور اس کی حرکات کو نوٹ کرنے لگے۔ وہ عورت مجھے اچھی طرح جانتی تھی اس لیے میں نے اس کے سامنے آنے سے گریز کیا۔

وہ دکان سے نکل کر ایک طرف کو چل دی۔ ہم بھی اس کی تائید کی میں اور اس کے نقش قدم پر چلتے گئے۔ دور جا کر وہ اک محلے کا رُخ کر گئی۔ میرے دوست کی اچانک فون کال آئی اور وہ سننے کی غرض سے رُک گیا۔ اور مجھے پیچھے جاتے رہنے کا اشارہ کیا۔

میں چلتا چلا جا رہا تھا۔ ایک ویران سی گلی سے ہوتا ہوا ایک عجیب سا رستہ آ گیا تھا۔ وہ ایک ویران سا میدان میں تھا۔ وہاں ہر طرف گھاس اور عجیب و غریب قسم کے پودے اگے ہوئے تھے۔ اور ان ہی کے درمیان سے وہ اک پگڈنڈی سے گزر رہی تھی۔ جو کہ ناہموار تھی۔ وہاں سے گزرتے ہوئے با آسانی قدم لڑکھڑا جاتے تھے۔

مجھے حیرت کا دھچکہ لگا کہ الٰہی! یہ میں کہاں آ گیا ہوں۔ میرے شہر میں یہ جگہ بھی ہے اور مجھے پتا ہی نہیں۔" میں اس کا پیچھا کرتے کرتے وہاں چلتا رہا۔ میری نگاہیں چاروں اطراف پھیلے اس جنگل نما میدان کو حیرت سے تکے جا رہی تھیں۔

دوپہر کا وقت تھا اور سورج اپنی مکمل تپش سے ہر شے کو جلا دینے کے موڈ میں لگ رہا تھا۔ پسینے سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ اور میرا دوست تو نا جانے کہاں کھو گیا تھا۔ اک خوف چاروں اطراف سے میرا طواف کر رہا تھا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے ایک آدھ گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد اچانک جھاڑیاں شروع ہو گئیں۔ اس کی طرف گندے پانی کا تالاب تھا۔ جس میں سے بدبو دور دور تک ماحول کی فضا کو آلودہ کیے ہوئے تھی۔ میرے چہرے سے خوف و اضطراب

کی لہریں عیاں تھیں۔ اور یہ سوچ بار بار مجھے محو حیرت زدہ کیے دیتی تھی کہ ایسا علاقہ میرے شہر میں ہے لیکن کبھی اس کے بارے میں معلوم ہی نہ پڑا تھا۔

☆......☆......☆

اچانک میری نگاہیں اس عورت کی متلاشی تھیں۔ مگر وہ اب میری نگاہوں سے اوجھل کہیں جھاڑیوں میں غائب ہوچکی تھی۔ میں ایک بے چینی کی کیفیت میں مبتلا ہوگیا۔ اور اسے اپنے چاروں اطراف ڈھونڈنے لگا۔ کچھ آگے جاکر جھاڑیوں سے پرے اک جھونپڑی نما گھر پر میری نظریں ٹھہر گئیں۔ میں اسی جھونپڑی کی سیدھ میں چل دیا۔ میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ میرے وجود پر ایک کپکپی سی طاری تھی۔ مگر ایک غیب کی طاقت میرے وجود کو اپنے طرف کھینچے چلی جارہی تھی۔

میں اس جھونپڑی کے قریب جا پہنچا۔ اور میرے ہاتھ اک انجانی حرکت سے خود بخود اس دروازے پر جالگے اور وہ کھل گیا۔

سامنے اک حسین و جمیل لڑکی کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ چہرے سے وہ ایک حسینہ معلوم ہوتی تھی اور جب میری نظر اس کے پیروں پر پڑی تو خوف کے مارے میری چیخ نکل گئی۔ اس کے پاؤں پیچھے کی طرف مڑ چکے تھے۔ اور اس کا سراپا نہایت ہی دہشت ناک ڈائن میں تبدیل ہوچکا تھا۔ میرے حواس جواب دے چکے تھے۔ اور مجھے سب کچھ گھومتا ہوا دکھائی دینے لگا اور میں وہیں بے ہوش ہوکر گر پڑا۔

☆......☆......☆

مجھے جب ہوش آیا تو میں اپنے بند کلینک کے دروازے کے باہر پڑا تھا۔ اور میرا وہی دوست مجھے پانی کے چھینٹے مار مار کر ہوش دلانے کی کوشش کررہا تھا۔

چند منٹوں بعد میرے حواس قائم ہوئے اور مجھے میرے دوست نے اٹھا کر باہر پڑے ایک بنچ پر بٹھایا اور چابی لے کر کلینک کا دروازہ کھولا۔

میں اب کچھ نارمل تھا مگر وہ ہیبت ناک و دلخراش منظر بار بار میری نگاہوں کے سامنے تھے۔

غزل

محبتوں کا خمار اُترا تو ہم نے جانا
ہمارے دل میں جو خار اُترا تو ہم نے جانا

میاں محبت ہے رائیگانی مسافتوں کی!
کوئی نہ دریا کے پار اُترا تو ہم نے جانا

یہ چاند چہرے، ستارہ آنکھیں، انہیں فنا ہے
حسیں گلوں سے نکھار اُترا تو ہم نے جانا

ہمارے گھر میں جو روشنی تھی، فریب تھا وہ
جو روشنی کا غبار اُترا تو ہم نے جانا

وہ سُوئے کُوفہ، سناں تھی بابر، چراغ نہ تھا
فراتِ غم کا جو وار اُترا تو ہم نے جانا

شاعر: احمد سجاد بابر

کچھ طبیعت سنبھلی تو اس پُراسرار عورت کو پھر سے کلینک کے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ وہ اسی برقعے میں ملبوس حجاب کیے ہوئے تھی۔ میرے قدموں میں تھرتھراہٹ نے ڈیرے جمالیے۔ میرا دوست میرے عقب میں ہی بیٹھا تھا۔ اس نے آکر ہم دونوں کو سلام کیا اور سرگوشی کی طرح میرے قریب ہوکر کہا۔

”کچھ چیزوں کو پردے ہی میں رہنے دیا جائے تو اچھا ہوتا ہے۔ کچھ راز عیاں ہونے سے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ چل دی اور پھر کبھی کلینک پر نہ آئی۔

اس رات یہ سارا واقعہ میں نے لاریب کو سنایا تو اسے میری حالت سے میری بات کا یقین ہوگیا اور اب وہ میری پہلے سے بھی زیادہ فکر کرتی ہے۔ اک انجانا سا خوف آج بھی میرے دل میں نمودار ہوجاتا ہے جب اس عورت کا اصل چہرہ میرے دل میں ابھرتا ہے۔

☆☆......☆☆

زہر بھری دنیا سے تین شاہکار داستانیں
ان کی انفرادیت ہی ان کا حسن ہے

زہریلی کوکھ

حاسم وقاص

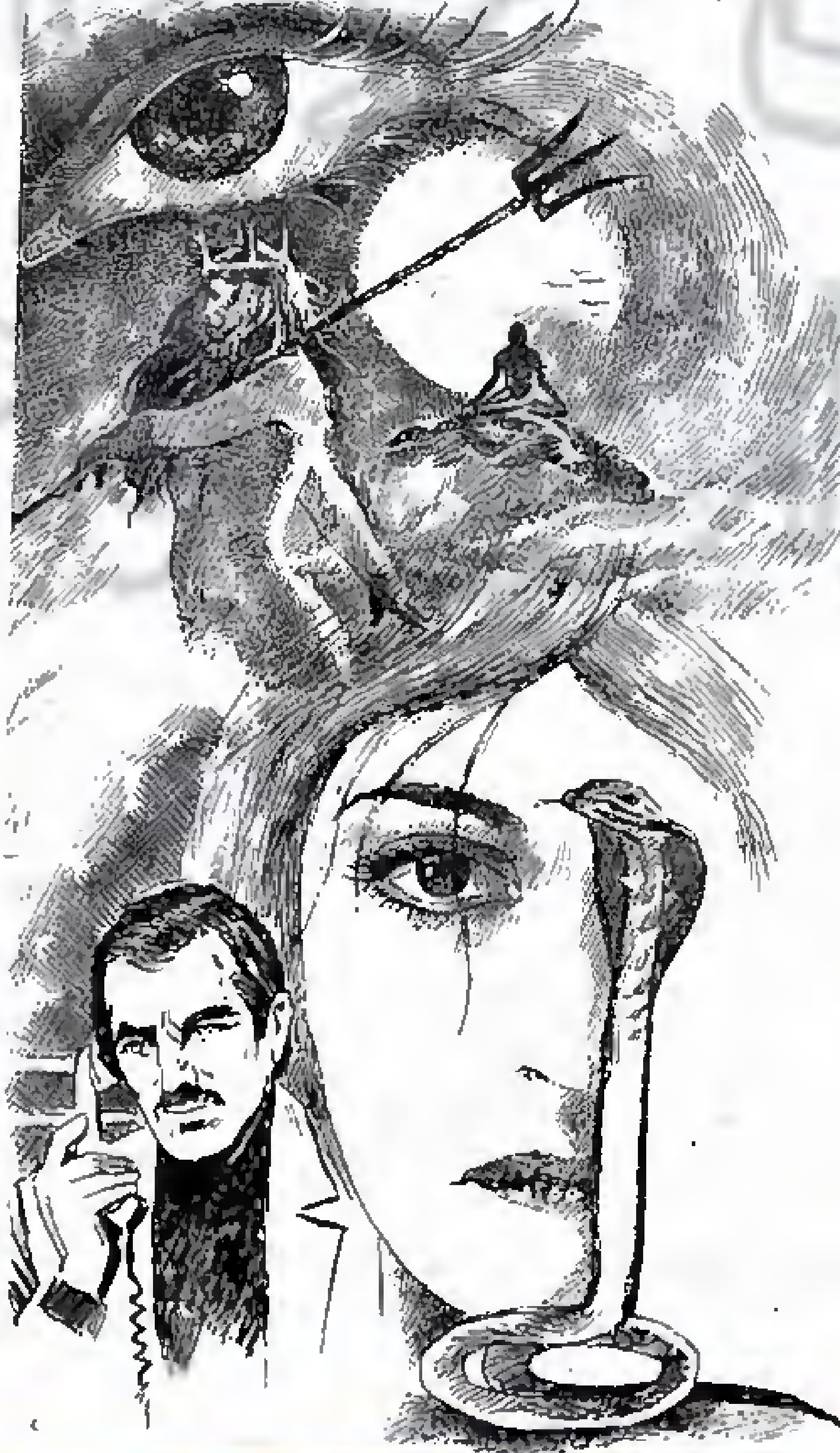
ایک گائناکالوجسٹ کا قصۂ عجب، جسے ناگ ناگن کی کہانی، کہانی ہی لگتی تھی مگر جب......

80 کی دہائی میں جب میں ایم بی بی ایس کی اسٹوڈنٹ تھی۔ تب سری دیوی کی ناگ، ناگن کے موضوع پر یکے بعد دیگرے دو فلمیں نگینہ اور نگاہیں ریلیز ہوئی تھیں۔ ہر خاص و عام کی طرح میں نے بھی یہ فلمیں بڑے ذوق و شوق سے دیکھی تھیں۔ دیکھتے ہوئے خوف بھی محسوس ہوتا تھا۔ اور دلچسپی بھی لیکن میرے لیے یہ سب فلمی تھا اور اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ یوں بھی ان دنوں وقت اس قدر تیز نہیں دوڑتا تھا۔ اور نہ ہی زمانہ اتنا ایڈوانس تھا اس لیے لوگ ایسی تفریحات میں گم رہنا پسند کرتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ فلم بھی گزرے زمانے کا حصہ بن گئی اور یہ سوچیں گم گشتہ یادیں...... لیکن ابھی سن 2015ء میں کچھ ایسا واقعہ رونما ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ ناگ، ناگن صرف Fantasies ہی نہیں بلکہ یہ تو حقیقت ہے۔ ایک ایسی حقیقت جس کو بے حد فلمایا گیا ہے اور اس پر اس قدر کہانیاں لکھی گئی ہیں کہ لوگ اسے ماورائی سوچ ہی سمجھنے لگے ہیں۔ مگر یہ حقیقت اپنی جگہ پنجے گاڑے پھنکار رہی ہے۔

میری ایک خوشحال فیملی ہے۔ میرے میاں فرزند علی ایک بینکر ہیں اور میری اکلوتی بیٹی سیماب ایم بی بی ایس کی طالبہ، میں خود شہر کی جانی مانی گائناکالوجسٹ ہوں۔ اللہ نے عزت بھی دی ہے اور مرتبہ بھی۔ گائنی اور آبس کے حوالے سے پورے شہر میں الحمدللہ میری ایک پہچان ہے۔

یہ سال کا تیسرا مہینہ تھا۔ سردیاں بس رخصت ہو چکی تھیں۔ موسم پھولوں والا تھا۔ ایسے ہی ایک عام سے دن میں اپنے ہاسپٹل میں بیٹھی مریض دیکھ رہی تھی کہ ایک نوعمر لڑکی میرے پاس اینٹی نیٹل وزٹ کے لیے آئی۔ اس کے مطابق اس کے حمل کا آٹھواں مہینہ تھا۔ کیس ہسٹری لینے کے بعد جب میں نے اس کا الٹرا ساؤنڈ کیا تو لمحے بھر کو مجھے افسوس سا ہوا۔ اس کے حمل کو اسقاط کی ضرورت تھی۔ کیونکہ الٹرا ساؤنڈ میں مجھے Cord (ماں کو بچے کے ساتھ جوڑنے والی شریان) کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا۔ سر دھڑ، دل ہاتھ پاؤں بچے کا کوئی عضو بھی نہیں۔ آٹھویں مہینے پر Cord کے علاوہ کچھ نہ نظر آنے کا مطلب تھا کہ بچہ وجود میں ہی نہیں آیا۔ ایک ماں جو آٹھ مہینے سے پیٹ میں اس امید پر بوجھ لیے گھوم رہی ہے کہ یہ بوجھ اس کے ہونے والے بچے کا ہے۔ جب اسے معلوم ہوگا کہ اولاد کا وجود ہی نہیں تو پھر کیسا محسوس کرے گی۔

بہر حال اللہ کی مرضی کے آگے ہماری کیا مجال۔
''تمہارے شوہر تمہارے ساتھ آئے ہیں؟'' گلا کھنکارتے ہوئے میں نے بات کی ابتداء کی۔
''نہیں۔'' کہتے ہوئے لڑکی کی اُداسی تھوڑی مزید بڑھ گئی۔''میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔'' لڑکی کی بات سُن کر مجھے دھچکا سا لگا۔ایک نوعمر لڑکی جو حاملہ تھی اور جس کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور میرے پاس بھی اسے سنانے کے لیے اچھی خبر نہ تھی۔
''بہت افسوس ہوا، تو تم کس کے ساتھ اِدھر اسپتال آئی ہو؟'' میں چاہتی تھی کہ اسے بری خبر دوں تو کوئی رشتہ دار تو موجود ہو جو اور نہیں تو وہ کم از کم اس لڑکی کو دلاسہ دے سکے۔
''میں اکیلی آئی ہوں ڈاکٹر صاحبہ، آپ جو بتانا چاہتی ہیں، بتائیں۔'' لڑکی شاید مضبوط اعصاب کی مالک تھی یا پھر اس نے حوادثِ زمانہ کچھ اس قدر سہے تھے کہ مضبوط ہونا پڑا تھا۔
''دیکھو ندا......'' سامنے رکھی اس کی سلپ سے میں نے اس کا نام پڑھا تھا۔''تمہاری پریگننسی تمہیں اولاد نہیں دے سکتی۔الٹراساؤنڈ پر بچے کا نام ونشان ہی نہیں بلکہ چند نالیاں اور رگیں ہی ہیں جو وجود میں آئی ہیں اور ان کا حل بس کیرج کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔'' مضبوط اعصاب کی لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔شاید اُس کی برداشت اتنی ہی تھی۔
''حوصلہ کرو ندا۔'' میرے پاس اس کے لیے تسلی کے دو بول ہی تھے۔
''ڈاکٹر صاحبہ......'' ہچکیوں کے درمیان وہ گویا ہوئی۔
''وہ رگیں اور نالیاں نہیں، وہ سانپ ہے۔'' وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی اور میں اس کا منہ تکنے لگی۔
شاید اس کا دماغ خراب ہے۔اس قدر نازک وقت پر



ایسی بات کرنا جس کی کوئی تک ہی نہ بنتی تھی۔
"ندا ایسا ہوتا ہے بعض اوقات حمل مکمل وجود میں نہیں آتا۔ میں نے اپنے کیریئر میں ہزاروں ایسی پریگنینسیز دیکھی ہیں۔" میں سمجھانے کے لیے مزید کچھ کہتی مگر وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔
"ڈاکٹر صاحبہ وہ سانپ ہے۔"
"تمہیں ایک گائناکالوجسٹ کے علاوہ ایک سائیکاٹرسٹ کی بھی ضرورت ہے۔" میں اکتا کر بولی۔ سائیکاٹری ہمیشہ مجھے ناپسندیدہ رہی تھی اور ایسے مریضوں سے جب بھی میرا پالا پڑا مجھے بیزاری ہی ہوئی تھی۔ میری اکتاہٹ کو ندا نے بھی محسوس کیا تھا۔ اسی لیے چند لمحے تو وہ مجھے خاموشی سے دیکھتی رہی اور پھر گویا ہوئی۔
"کیا آپ میرا اس کیرج ڈیل کریں گی؟"
"بے شک۔" میری اکتاہٹ اطمینان میں بدلنے لگی۔
"اسی کام کے لیے تو میں یہاں بیٹھی ہوں۔"

☆......☆......☆

ندا کو آپریشن تھیٹر میں شفٹ کرنے سے پہلے جو میں نے احتیاطاً دوبارہ الٹرا ساؤنڈ کیا۔ حقیقتاً Cord کے علاوہ کچھ وجود میں نہ آیا تھا اور میں Cord کو الٹرا ساؤنڈ مشین کے ڈسپلے پر مختلف زاویوں سے دیکھنے لگی۔ تو یکدم مجھے احساس ہوا کہ وہ Cord نہیں سانپ ہی ہے۔ لمحے بھر کو تو میں چونک گئی اور پھر مجھ پر جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی۔ اسی لیے تو مجھے سائیکاٹری پسند نہیں اور میں سائیکاٹرسٹ مریضوں سے اجتناب ہی کرتی تھی کہ بندے کا اپنا دماغ گھومنے لگتا ہے۔
Cord اور سانپ کے تخیل کو جھٹکتی، میں نے اسٹاف کو پیشنٹ شفٹ کرنے کے آرڈر دیے اور چند منٹوں بعد میں آپریشن تھیٹر میں واش اپ ہوئے تھیٹر گاؤن پہنے کھڑی تھی۔
"ڈاکٹر صاحبہ اینستھزیا (بے ہوشی) دینے لگا ہوں۔" اینستھیٹسٹ نے مجھے مطلع کیا تھا اور میں نے سر کو خم دیتے ہوئے واضح کیا تھا کہ میں ان کی بات سن چکی ہوں۔ اس سے پہلے کہ فاضل ڈاکٹر بے ہوشی کا سامان کرتے، میں نے دیکھا کہ اینستھزیا کا کچھ سامان ان کے ہاتھ سے گر پڑا ہے اور وہ اونچی آواز میں ایک کونے کی طرف اشارہ کررہے ہیں۔
"وہاں سانپ ہے۔" لمحوں میں میری نظروں نے اینستھیٹسٹ کی نظروں کا تعاقب کیا اور لمحوں کے اندر میں سن سی رہ گئی۔ گوکہ سانپ تھیٹر میں رکھے آلات کے ڈبوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ لیکن میں اس کی ایک جھلک دیکھ چکی تھی۔
خوف سے زیادہ جس چیز نے مجھ پر غلبہ پایا وہ غصہ تھا۔ یہ اسپتال میری ذاتی ملکیت تھا اور یہاں کا سارا عملہ میرا ملازم تھا۔ تھیٹر کے اٹینڈنٹ سے ایسی غلطی ہرگز قابل قبول نہ تھی۔ آپریشن تھیٹر کو جراثیم سے پاک رکھنے کا اپنا کلیہ ہوتا ہے۔ جوتے اور کپڑے بدل کر تھیٹر کے مخصوص کپڑے اور جوتے پہن کر آنا پڑتا ہے۔ کسی قسم کا حشرات الارض قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ ماحول کو جراثیم سے پاک رکھنے کے لیے مختلف گیس استعمال کی جاتی ہیں تاکہ سرجری کے دوران مریض اردگرد سے انفکشن نہ لے اور اس کام کے لیے باقاعدہ عملہ ہوتا ہے۔ ایک ایسا ماحول جہاں مکھی اور چیونٹی کا ہونا بھی قابلِ گرفت ہوتا ہے وہاں سانپ کا ہونا......
"ماجد کہاں مر گیا ہے۔ اسے میرے آفس میں بھیجو۔" قریباً چیختے ہوئے میں نے تھیٹر کے انچارج کو طلب کیا تھا اور مناسب لفظوں میں اینستھیٹسٹ سے معذرت کرنے لگی۔ سانپ کی موجودگی میں آپریشن کہاں ممکن تھا۔ چند منٹ بعد ماجد گرتا پڑتا میرے آفس میں آیا اور صفائیاں دینے لگا۔
"میں نے ہر قسم کی سٹرلائزیشن مین ٹین کی تھی۔ میں خود حیران ہوں کہ سانپ...... آپ خود دیکھیں میڈم پہلے بھی کوئی مچھر، مکھی یا چیونٹی آپ کو تھیٹر میں نظر آئی تو پھر سانپ کیونکر......" ماجد نے اپنی صفائی میں جیسے پوری تقریر کہہ دی۔ میں خاموشی سے سنتی رہی۔ آخر میں بس یہ کہا۔

''کل سے جاب پر آنے کی ضرورت نہیں۔کل کلیئرنس کے لیے اکاؤنٹنٹ سے مل لینا۔'' ایک سانپ تھیٹر میں گھس آیا تھا۔اس میں تھیٹر انچارج کی نااہلی کے علاوہ اور کسی چیز کا عمل دخل نہ تھا۔ میرا فیصلہ بروقت اور صحیح تھا۔اگر خدانخواستہ سانپ کوئی نقصان پہنچا دیتا تو......

ماجد نے مزید صفائی دی بھی تو میں نے کان نہ دھرے اور ماجد کے جانے کے بعد ندا میرے کمرے میں آئی۔

''ڈاکٹر صاحبہ میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''آؤ بیٹھو۔'' گو کہ میں اس وقت کسی سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن خیر......'' ندا کچھ لمحے تو بیٹھی ہچکچاتی رہی پھر گویا ہوئی۔

''ڈاکٹر صاحبہ وہ آپریشن تھیٹر میں سانپ......''

''ویری سوری ندا، ایسا پہلی بار ہوا ہے، میں نے متعلقہ عملے کو برخاست کر دیا ہے مگر پھر بھی سوری کہ تمہیں تکلیف کا سامنا کرنا پڑا اور تمہارا مس کیرج ٹالنا پڑا۔''

''ڈاکٹر صاحبہ ایسی بات نہیں......'' لب کچلتی ندا کے انداز مجھے عجیب لگے۔

''بات یہ ہے کہ یہ وہی سانپ تھا۔ جس کی امانت میں اپنے پیٹ میں لیے گھوم رہی ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' میں اچنبھے سے ندا کو دیکھنے لگی۔

''میرے پیٹ میں جو چیز آپ الٹراساؤنڈ میں دیکھ رہی ہیں۔ وہ سانپ ہی ہے۔ کوئی Cord یا نالی نہیں اور میں اس کے لوٹنے اور حرکت کرنے کو محسوس بھی کرتی ہوں۔''

''تمہیں واقعی سائیکاٹرسٹ کی ضرورت ہے۔'' میں نے اس بار سوچ کو الفاظ کی شکل نہیں پہنچائی۔

''میں جانتی ہوں ڈاکٹر صاحبہ آپ سوچ رہی ہیں کہ یہ لڑکی پاگل ہے۔ لیکن براہ مہربانی میری کہانی سن لیں، پھر کوئی فیصلہ کیجیے گا۔'' میں اسے وقت کی کمی کا بہانہ کر کے انکار کرنے والی تھی مگر پتا نہیں کیا سوچ کر میں نے کہا۔

''سناؤ۔'' اور چند لمحوں بعد وہ مجھے اپنی داستان سنا رہی تھی۔ جو میں من وعن آپ کے گوش گزار کر رہی ہوں۔

☆......☆......☆

عادل اور ندا کی شادی ارینج میرج تھی۔ لیکن شادی تو ایسا بندھن ہے کہ محبت خود بخود دل میں پیدا کر لیتا ہے۔ دنوں میں دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے کے بغیر ایک پل گزارنا مشکل ہو گیا۔ ہنی مون کے لیے دونوں میاں بیوی نے وادیٔ کاغان کے دلکش نظاروں کو اپنی آنکھیں سیراب کرنے کے لیے چنا۔ وادیٔ کاغان تو جیسے دنیا میں ہی ایک جنت تھی۔ ندا مسحور ہو کر ان نظاروں کی دلکشی میں کھو سی گئی۔ زندگی بھر کا ہم سفر ساتھ ہو تو وقت کچھ اور حسین لگتا ہے۔ لمحے برف کے گالوں سے لگتے ہیں۔

رہنے کے لیے کیمپ کا انتخاب کیا گیا۔ عموماً سیر و سیاحت کے لیے آئے کپلز ہوٹلز میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں لیکن ایڈونچر کے شوق میں ندا نے کیمپنگ کی فرمائش کی۔ عادل کیمپنگ کے حق میں تو نہیں تھا لیکن نو بیاہتا بیوی کی بات ٹالنا بھی مشکل تھا۔ سو دونوں میاں بیوی نے ایک کیمپ ہائر کیا۔

یہ پورے چاند کی رات تھی۔ دونوں میاں بیوی بے تحاشا ہنستے ہوئے خوشیاں کشید کر رہے تھے۔ تب عادل کا دل چائے پینے کو چاہا۔

''آؤ چائے پی آتے ہیں۔'' دونوں میاں بیوی کیمپ کے اندر بیٹھے تھے۔

''نہیں تم لے آؤ چائے۔'' ندا نے شال کو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے کہا تھا۔

''تم اکیلے کیسے بیٹھو گی؟''

''تم کون سا صدیاں لگاؤ گے۔ دس منٹ میں تو آ جاؤ گے۔''

''نا بابا، رات کے وقت تمہیں اکیلا چھوڑ کر ہرگز نہ جاؤں گا۔ اسی لیے میں کیمپ میں رہنے کے خلاف تھا۔ ہوٹل میں ہوتے تو اس طرح کے مسائل تو نہ

ہوتے۔"

"ڈیئر! اسے مسائل نہ سمجھو ان باتوں کو انجوائے کرو۔" بالوں کی ایک آوارہ لٹ چہرے پر آئی۔ ندا ہاتھ بڑھا کر اسے سمیٹنے لگی تو عادل نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا تھا اور تھوڑا آگے سرکا، محبت سے لٹ کو کان کے پیچھے کیا۔

"جانِ من۔" وارفتگی سے ندا کو دیکھتے ہوئے عادل کہہ رہا تھا۔

"تو اپنی جانِ من کے لیے چائے بھی نہ لاؤ گے؟"

"لیکن......"

"لیکن کچھ نہیں۔ اتنی دیر میں تم آ بھی جاتے۔"

عادل، ندا کو چھوڑ کر جانا تو نہیں چاہتا تھا لیکن جب ندا زیادہ اصرار کرنے لگی تو نا چاہتے ہوئے بھی عادل چلا گیا اور آج ندا سوچتی تھی کہ کاش وہ عادل کو نہ بھیجتی تو یہ سب نہ ہوتا۔

"کاش......"

عادل کے جانے کے بعد ندا شال کو مزید اچھی طرح لپیٹتی، آس پاس پھیلی خاموشی کو محسوس کرنے لگی۔ وہ خاموشی جس میں اسرار تھا۔ مگر پھر بھی کس قدر دلکش سی لگتی تھی۔ خوش کن خیالوں میں ڈوبی ندا سوچ رہی تھی کہ آج وہ چائے پیتے ہوئے وہ عادل کو وہ خوشخبری سنائے گی جو وہ پچھلے ایک ہفتے سے چھپا رہی تھی۔

ہاں وہ پریگنینٹ تھی۔

عادل کی خوشی کا کیا عالم ہوگا۔ تصور ہی تصور میں وہ عادل کے سرخ چہرے کو انار ہوتے دیکھ رہی تھی اور اسے خوشی سے بے حال ہوتے ہوئے...... تبھی اسے اپنے پیچھے سرسراہٹ کا احساس ہوا۔ مڑ کر دیکھا تو لمحے بھر کو ساکن ہو گئی۔

یہ ایک چھوٹا سا سانپ تھا جس کی موٹائی جھاڑو کے تنکے سے زیادہ نہ ہوگی۔ بل کھاتا، رینگتا جا رہا تھا۔

خوف اور دہشت نے دل میں پنجے تو گاڑے، مگر اگلے لمحے ان کی جگہ ہمت نے لے لی۔ کالج میں اسپورٹس گرل کا ٹائٹل لینے والی لڑکی نے گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے خیمے کے کونے میں پڑے پتھر سے اس سانپ کا سر کچل دیا۔ اور کس قدر غلط کیا۔ وہ بے ضرر سا سانپ کا بچہ تو اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا اور کچھ کہہ بھی نہ رہا تھا۔

مگر......

تبھی ایک کُرلاتی آواز آئی اور ایک موٹا دھاری دار سانپ رینگتا ہوا سامنے آ گیا۔ حقیقی دہشت نے تو اب گھیرا تنگ کیا تھا۔ سانپ کے بچے کو مارنا تو آسان تھا اور اس سانپ کو......

اسی وقت کسی شوخ دھن کی سیٹی بجاتا عادل ہاتھوں میں چائے کے کپ لیے داخل ہوا۔

ندا کو یوں خیمے کے ایک سرے پر کانپتے اور اس کے سامنے ایک سانپ کو پھن پھیلا کر بیٹھے دیکھ کر لمحے بھر کو اس کے اپنے حواس گم ہو گئے لیکن وہ مرد تھا حواس پر قابو پاتے ہوئے وہ لپکا اور خیمے میں موجود اپنے سامان میں موجود پروفیشنل کیمرے کی راڈ سے سانپ کو سر پر ضرب مارنے کی کوشش کرنے لگا۔ سانپ نے اپنے بچاؤ کی کوشش کی مگر عادل میں جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ یکے بعد دیگرے سانپ کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکن پھر ندا نے جو دیکھا وہ اس کی زندگی کے بدترین لمحوں میں سے ایک تھا۔ سانپ نے عادل کو ڈنک مارا اور وہ لمحوں میں نیلا ہو گیا۔ جسم کو جھٹکے لگے اور اگلے لمحے وہ فانی دنیا سے کوچ کر گیا۔ ندا پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے مجازی خدا کا نیلا جسم دیکھ رہی تھی۔

تبھی ندا نے دیکھا وہ سانپ جس نے اس کے شوہر کی جان لی ہے انسانی روپ میں آ رہا ہے اور چند لمحوں بعد وہ سانپ نیلی بڑی آنکھوں والی سفید لباس میں ملبوس ایک عورت کی شکل میں اس کے سامنے تھا۔

"تم نے میرے بچے کو مار دیا۔ اور تمہارا شوہر مجھے مار دینا چاہتا تھا۔ تم انسان کس قدر وحشی ہوتے ہو۔" عورت کی آنکھوں میں آنسو اٹکے تھے اور ان اٹکے آنسوؤں کے پیچھے قہر نمایاں تھا۔

☆......☆......☆

اس سے زیادہ ہوا میں بنی گئی کہانی سننے کا مجھ میں حوصلہ نہ تھا۔ اسی لیے میں نے ندا کو ٹوک دیا۔

''ندا جو قصے تم سنا رہی ہو۔ وہ فلموں میں اچھے لگتے ہیں۔ ڈائجسٹوں میں ان موضوعات پر کہانیاں دلچسپی کی حامل لگتی ہیں لیکن حقیقت میں......''

''میں سچ کہہ رہی ہوں، یہ حقیقت ہے۔'' اور میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئی شاید آج کا دن ہی خراب تھا۔ اس فضول گوئی میں مزید وقت ضائع کرنے کا میرا ہرگز دل نہ تھا۔

میں اٹھی اور اپنے آفس میں موجود کیبنٹ کے خانے کھنگالنے لگی اور کچھ دیر بعد مجھے مطلوبہ چیز مل گئی۔ یہ ایک وزیٹنگ کارڈ تھا۔ کارڈ میں نے ندا کو تھما دیا۔

''ڈاکٹر صبیحہ میری بہت اچھی دوست ہیں۔ شہر کی جانی مانی سائیکاٹرسٹ ہیں۔ میرے خیال میں تمہیں ان سے ملنا چاہیے۔'' ندا ٹکر ٹکر مجھے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے الٹ پلٹ کر کارڈ کو دیکھا۔ موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں میں آن ٹھہرے اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں جھوٹ نہیں کہہ رہی، ڈاکٹر صاحبہ بہرحال آپ کو یقین نہیں آ رہا تو کوئی بات نہیں۔ کسی کو بھی یقین نہیں آتا۔ کل کیا میرا آپریشن ہو جائے گا۔'' وہ مِس کیرج کا پوچھ رہی تھی۔ لمحے بھر کے لیے میرا دل چاہا انکار کر دوں۔ ذاتی ناپسندیدگی کی وجہ سے مریض کو انکار کرنے کی مجھے نہ میرا پروفیشنل اجازت دیتا تھا اور نہ ہی میرا ضمیر، اسی لیے میں نے اثبات میں جواب دیا۔

''انشاء اللہ کل تمہیں جونیئر ڈاکٹرز اور نرسنگ اسٹاف بتا دیں گی۔'' ندا کے جانے کے بعد میں نے چند ایک او پی ڈی کے مریض دیکھے۔ مگر دماغ اُدھر ہی اٹکا رہا۔

''عورت کے پیٹ میں سانپ کا بچہ۔'' یہ سوچ تو جیسے میرے دماغ سے چپٹ کر رہ گئی اور میں کراہ کر رہ گئی۔ اسی لیے تو میں نفسیاتی مریضوں سے اجتناب کرتی تھی۔ شکر ہے گھر آ کر یہ خیالات ذہن سے محو ہوئے۔ اور شام کی چائے پیتے ہوئے باتوں ہی باتوں میں، میں نے یہ بات فرزند کو بتا دی اور بات بتانے کے درمیان ہی مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے یہ بات کیونکر فرزند کو بتائی۔

فرزند بلا کے توہم پرست تھے۔ جن بھوت پریت تو جیسے ان کے ساتھ جیتے تھے۔ اور ایسی باتوں کو وہ کبھی ہوائی باتیں نہ گردانتے تھے۔

''نادیہ تم یہ آپریشن نہیں کرو گی۔'' چائے کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے فرزند کہہ رہے تھے۔

''مگر کیوں؟''

''جب تمہیں الٹرا ساؤنڈ پر سانپ کا وہم ہوا تو ممکن ہے اس لڑکی کی باتیں ٹھیک ہوں۔''

''فرزند مجھے صرف وہم ہی ہوا ہے۔'' میں نے زور دے کر کہا تھا۔

''جو بھی ہے، تم آپریشن نہیں کرو گی ایسے ہی مسئلے نہ پیدا ہو جائیں۔ بھئی مجھے تو شروع سے ناگ ناگن کی باتوں پر یقین ہے۔ بھئی کوئی وجہ تو ہے کہ لوگ صدیوں سے ایسے قصے سنتے اور بنتے آ رہے ہیں۔'' اور میں پہلو بدل کر رہ گئی۔ شوہر نامدار کی بات سے روگردانی کرنا بھی اچھا نہ تھا اور اسپتال میں ایڈمٹ کیے مریض کو بلاوجہ آپریشن کے بغیر مجھے ڈسچارج کر دینا بھی غلط تھا۔

''یہ بتاؤ فرزند کیا تم اپنے بینک میں اکاؤنٹ کھلوانے کے لیے آنے والے کلائنٹ کو اس لیے کسی دوسرے بینک میں ریفر کرو گے کہ وہ تمہیں سانپوں کی ماورائی کہانی سنائے۔''

''مگر نادیہ اگر کلائنٹ یہ کہے کہ آپ بلاشبہ میرے پیسوں کو اپنے بینک میں رکھیں مگر میرا ایک سانپ بھی حفاظت کے لیے آپ کے لاکر میں رہے گا تو میں یقیناً اسے کسی دوسرے بینک ریفر کروں گا۔''

''افوہ آپ سے بات کرنا ہی فضول ہے۔'' میں غصے سے کپ اٹھاتی کچن کی طرف جانے لگی۔

''اس پیشنٹ کو آپریشن کے بغیر ہی ڈسچارج کر دینا۔'' پیچھے سے فرزند کی آواز نے میرا تعاقب کیا تھا اور میں جلے دل کے ساتھ یہ سوچنے لگی اب کیا

کروں؟

☆......☆......☆

یادوں کی فسوں خیزی تھی۔ منظر دھندلا سا تھا۔ عکس چھلک چھلک کر منظر میں ڈھلتا تھا۔

''میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ بچہ جننے کے عمل میں عورت جان نکلنے جتنی تکلیف سے گزرتی ہے۔'' عادل کی آواز ہمیشہ مسحور کن ہوتی تھی۔

''ہاں شاید۔'' ندا مسکراتے شرماتے بولی تھی۔ یہ شادی کے ابتدائی دن تھے۔ ابھی پورا ہفتہ بھی نہ ہوا تھا۔

''بس پھر ہم بچہ پیدا نہیں کریں گے۔'' عادل نے یکدم فیصلہ کرلیا۔

''ہم۔'' ندا ہنسی تو ہنستی چلی گئی۔

''ہم کا مطلب آپ بھی حاملہ ہوسکتے ہیں؟'' ندا کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔ عادل نے گھور کر ندا کو دیکھا تھا۔

''ابھی بتاتا ہوں۔'' اس سے پہلے کہ عادل ندا کو اپنی گرفت میں لیتا، ندا بیڈ پھلانگتی یہ جا وہ جا۔ منظر میں قہقہے بکھر کر رہ گئے۔

منظر تحلیل ہوکر ابھرا تو اب ندا اور عادل بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے ایک دوسرے سے جڑے بیٹھے تھے، کمبل ٹانگوں پر پھیلا تھا۔

''میں تمہیں مرتے دم تک نہیں چھوڑوں گا۔''

''نہیں، میں آپ کو چھوڑ کر جاؤں گی۔''

''میں پہلے مروں گا۔ اب تو میں خدا سے یہ دعا مانگا کروں گا کہ میری عمر بھی تمہیں لگائے۔''

''نہ جی آپ کے بغیر میں نہ رہ پاؤں گی۔'' ندا نے اپنا سر عادل کے کندھے پر ٹکایا اور آنکھیں موندلیں۔

یادوں نے جو نیا منظر پیش کیا وہ رگ وجان سے جیسے جان نکالنے والا تھا۔

کیمپ میں چاند کی چاندنی نے ملگجی سی روشنی کی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں لگا انرجی سیور بھی روشنی پھیلا رہا تھا۔

عادل کا نیلا ہوتا وجود ساکن سا زمین پر پڑا تھا۔

اور سفید پاؤں کو چھوتے لباس میں بڑی آنکھوں والی ناگن آنکھوں میں غم وغصہ لیے جیسے پھنکار رہی تھی۔

''تم نے میرے بیٹے کو مار ڈالا۔ پتا ہے ناگن زندگی میں صرف ایک دفعہ ہی حاملہ ہوتی ہے۔'' ناگن کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔ ندا کبھی مرے ہوئے عادل کو دیکھتی اور کبھی سانپ سے عورت کا روپ لیے اس ناگن کو۔

''تم نے میرا شوہر مار ڈالا۔'' ندا کے منہ سے الفاظ نکلے تو جیسے الفاظ خود ہی گریہ کرتے تھے۔

''میں اسے نہ مارتی تو وہ مجھے مار ڈالتا تم نے میرا بچہ کیوں مارا۔'' دونوں کو اپنا غم لاحق تھا۔ ندا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''وہ ایک معصوم بچہ ہی تھا۔ تمہارا کیا بگاڑ رہا تھا۔'' ناگن کی آنکھیں سرخ سے سرخ تر ہوتی گئیں۔ جیسے لال انگارے ندا کے آنسو تو جیسے اُسے نظر ہی نہیں آرہے تھے۔ تبھی بولتے بولتے ناگن نے رُک کر ندا کو غور سے دیکھا اور جیسے نظروں میں تولا۔

''تم خود بھی حاملہ ہو۔'' ندا سسکتی رہی اور اپنی چیخیں دباتی رہی۔

''میں خدا سے دعا مانگتی ہوں کہ تم اب ایک انسان نہ جنو، بلکہ ایک سنپولیا جنو اور وہ میرا بچہ ہوگا۔ وہ میرا ہوگا، وہ میرا ہوگا، میرا ہوگا۔ اے خدا دیکھ تیرے انسان اپنے سے کم تر مخلوق کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔

اے خدا مجھے میرا بیٹا لوٹا۔ اے خدا......'' ناگن کی آواز بلند ہوتی گئی۔ بلند ہوتی گئی۔ اور اس کا سفید وجود ایک گولے کی شکل اختیار کرنے لگا اور گولہ تحلیل ہونے لگا۔

''ندا، اِدھر کھڑکی میں کیوں کھڑی ہو؟'' ندا کی ماں دروازہ کھول کر اندر کمرے میں آئی تو ندا ماضی سے حال میں آئی۔

''کچھ نہیں ویسے ہی۔'' ماں سے آنسو چھپاتی ندا کھڑکی سے باہر جھانکتی رہی۔ اس وقت وہ اسپتال کے ایک کمرے میں تھے تبھی دستک دے کر نرس کمرے میں آئی۔

''یہ گاؤن پہن لیں اور پھر تھیٹر چلیں۔'' نرس نے گاؤن پہنانے میں ندا کی مدد کی اور چند منٹوں بعد ندا تھیٹر میں تھی۔

☆......☆......☆

یہ آپریشن میں نے ہی کرنا تھا اور ثابت کرنا تھا کہ یہ ناگ ناگن کی باتیں سب بے کار، جھوٹ کی باتیں ہیں۔ لیکن فرزند سے اجازت لینا بھی مسئلہ تھا۔

لیکن میں نے اجازت لے ہی لی۔

''وضو کر کے تھیٹر جاؤ گی۔ سورۃ یٰسین پڑھو گی اور بسم اللہ پڑھ کر آپریشن شروع کرو گی۔'' فرزند کی عائد کردہ بھی شرطیں آسان تھیں۔ میں جھٹ پٹ راضی ہوگئی۔

بے ہوشی کے بعد میں نے انڈکشن کے لیے نرس کو متعلقہ ٹیکے لگانے کو کہا۔ اس نے ٹیکے لگائے اور میری دیگر ہدایات پر عمل کرنے لگی اور کچھ دیر بعد ندا کے وجود سے میں نے Cord برآمد کرنا شروع کر دی۔

مگر یہ Cord تو دھاری دار اور سیاہ تھی۔ لمحے میں میرے ہاتھ کانپنا شروع ہوگئے۔ میرے اسسٹنٹ میرا منہ تکنے لگے۔

یہ Cord تو نہ تھی۔

''میم یہ......'' لرزتی آواز سے اسسٹنٹ پوچھ رہی تھی۔ تبھی میں نے اپنے لب ہلتے محسوس کیے اور سورۃ یٰسین کی آیات میرے لبوں پر تھیں۔

ندا کے وجود کو جھٹکا لگا اور ایک مکمل سانپ میرے ہاتھ میں تھا۔ بچہ ریسیو کرنے کے لیے موجود نرس نے سانپ کو دیکھ کر چیخ ماری اور تیورا کر گر پڑی۔ تبھی تھیٹر کے کونے سے ایک اور سانپ نکلا اور سفید ہیولے کی آڑ میں وہ عورت کا روپ دھار گیا۔ اس سفید اُجلے لباس والی عورت نے میرے ہاتھ سے سانپ لے لیا۔

''شکریہ ڈاکٹر صاحبہ!'' یہ کہتے ہوئے وہ ایک بار پھر سفید غبار کی زد میں غائب ہوتی گئی۔ تھیٹر میں موجود تمام عملہ خوف و دہشت سے یا تو بے ہوش ہو چکا تھا یا پھر تھیٹر سے فرار ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں بھی فرار کا سوچتی میری نظر ندا کے چہرے پر گئی بے ہوشی کے زیر اثر وہ سوئی تھی۔ مگر تفکر کی گہری لکیریں اس کے چہرے پر نقش تھیں۔

شاید خدا نے یہ کام میرے ذمے رکھا تھا۔ ہمت سے کام لیتے ہوئے میں نے آپریشن مکمل کیا۔ بے ہوشی کی مجھے بھی تھوڑی سوجھ بوجھ تھی۔ بے ہوشی والے ڈاکٹر صاحب بھی غائب ہو چکے تھے۔ چنانچہ میں خود اسے بے ہوشی سے واپس لائی۔

تھیٹر سے باہر کہرام سا برپا تھا۔ اور جب میں گلوز اُتارتی تھیٹر سے باہر نکلی تو سب سے پہلے جونیئر ڈاکٹر میری طرف لپکی۔

''میڈم یہ سب کیا تھا؟ میری تو جان ہی نکل گئی۔'' جونیئر ڈاکٹر کی بات سُن کر سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے میں نے بس اتنا کہا۔

''خدا بے نیاز ہے۔''

☆......☆......☆

اگلے دن ہی میں نے ماجد کو بلا کر اسے دوبارہ تھیٹر کا چارج سنبھالنے کا کہا وہ بخوشی راضی ہوگیا۔ اور دو دن بعد ندا کو ڈسچارج کر دیا گیا تو وہ مجھ سے ملنے آئی۔

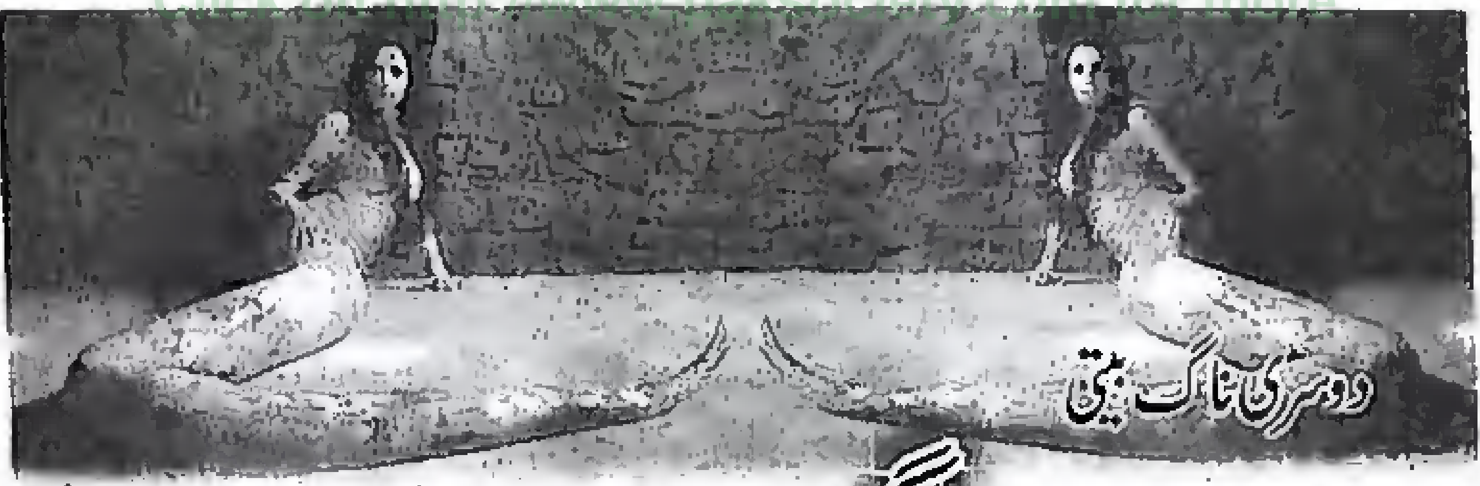
میں ایک عورت کے پیٹ سے سانپ نکال کر دم بخود تھی اور وہ عورت جس نے سانپ کو جنا تھا۔ اس کی کیا حالت ہوگی۔ یقیناً میں چاہ کر بھی اس کی کیفیت کو نہیں سمجھ سکتی تھی۔

''ندا حوصلے سے کام لو، جو ہوگیا سمجھو ڈراؤنا خواب تھا۔ نئی زندگی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔'' ندا ٹکر ٹکر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں پانیوں سے بھرنے میں زیادہ وقت نہ لگا۔

''ڈاکٹر صاحبہ وہ ناگن تو اپنا بچہ لے گئی اور میں، میں نے بھی تو اپنا شوہر گنوایا ہے۔ میرا عادل کیسے واپس آئے گا، کہاں سے واپس آئے گا۔'' ٹوٹے الفاظ اس کے لبوں سے نکلے تھے اور وہ سسک پڑی۔

اب کی بار میرے پاس اسے تسلی دینے کے لیے دو بول بھی نہ تھے۔

☆☆......☆☆



ناگن دوست



مجید احمد جائی

اُس لکڑہارے کو ایک دن ناگن کی جان بچانی پڑ گئی تھی، اور پھر......




مجھے ڈر نہیں لگتا۔ ارے۔ ارے بھائی آپ کیوں ڈر گئے؟

ہاں تو مجھے ڈر نہیں لگتا۔ آپ کو یقین نہیں آتا تو آزما لیجیے۔ میں اکثر راتوں کو تن تنہا سفر کرنا پسند کرتا ہوں۔ کھیت کھلیان ہوں یا ریگستان۔ دن ہو یا رات، میں ہزاروں میل تنہا سفر کرتا ہوں۔ مجھے رات کو سفر کرنا بہت بھلا لگتا ہے۔ یوں سمجھیں کہ رات کے وقت سفر کرنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔

میں جنگلی شہزادہ ہوں۔ یہ مت سمجھ لیجیے کہ، میں جنگل کا شیر ہوں۔ نہیں بھائی۔ میں تو ڈر کا شہزادہ ہوں۔ آپ مجھے جیسے چاہیں ڈرا لیں، لیکن میرے وجود میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ نہ میرے پسینے چھوٹیں گے، نہ خوف طاری ہوگا، نہ میرے رونگٹے کھڑے ہوں گے۔ نہ جسم کے بال کھڑے ہوں گے۔

میں بہادر ہوں۔ رب تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرنے والا، مجھے میرے رب نے بہت طاقت سے نوازا ہے۔ ڈرنا بھی اُسی ذات سے چاہیے۔ اُس کے بنائی ہوئی مخلوق سے ڈرو گے تو جان کی امان نہیں پاؤ گے۔ میرے اندر بھی رب رحمان کے جلال، عذاب کا ڈر ہر وقت رہتا ہے۔ ہاں مگر میں ایک رات بہت زیادہ ڈر گیا تھا۔ میرے رواں رواں کانپ اٹھا تھا۔

وہ ایک بھیانک رات تھی۔ خون آلودہ رات، رازوں بھری رات، اُس رات کے بعد میں آج تک نہیں ڈرا، شاید زندگی کی آخری سانس تک نہ ڈروں۔ آپ بھی جاننا چاہتے ہیں، اُس رات کیا ہوا۔ ٹھہریے۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ پہلے یہ تو جان لیجیے کہ میں کون ہوں؟

میرا نام رحیم ہے، اور رحم کرنا میرا پیشہ۔ میں اپنے پیشے میں مہارت رکھتا ہوں، مجھے میرے رب نے رحم کرنا سکھا دیا ہے۔ گھنے جنگل کے دوسرے کونے میں میرا خاندان آباد ہے۔ ذریعہ معاش کے لیے مجھے جنگل کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سفر کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ جنگل ہزاروں میل پھیلا ہوا ہے۔

میں لکڑہارے کا واحد چشم و چراغ ہوں۔ میرے بعد، اُن کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ کیوں نہیں ہوئی؟ مجھے کیا معلوم؟ ہاں مگر رب رحمان بہتر جانتا ہے۔ دُنیا والے تو کہتے ہیں کہ دونوں عمر کی اُس حد میں پہنچ گئے ہیں جہاں اولاد پیدا نہیں ہوسکتی۔ یعنی دونوں بانجھ پن میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

میرے والدین کی ساری محبت، میرے حصے میں آئی۔اُنہوں نے خوب اچھی طرح میری پرورش کی۔میں شرارتی وارد ہوا ہوں، اور بَلا کا ذہین بھی۔لکڑہارے کا بیٹا ہوں، اِسی لیے پڑھنے لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔جنگل والوں کا تعلیم سے کیا لینا دینا۔جنگل میں ایسا کوئی نظام ہوتا بھی نہیں ہے۔بس یوں سمجھیں دُنیا والوں کی نظروں میں ہم جنگلی ہیں۔لیکن اب تو اچھے خاصے پڑھے لکھے بھی جنگلی بنے ہوئے ہیں۔اپنے ہاتھوں سے، اپنوں کے گلے گھونٹ رہے ہیں۔

ہاں تو میں بتا رہا تھا، میرا خاندان تین افراد پر مشتمل ہے۔عزت کی کھاتے ہیں، رب تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اُس کی زمین پر کپڑے بچھا کر بے فکری کی نیند سو جاتے ہیں۔

جب سے میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے بابا کے ساتھ، خود کو جنگل میں لکڑیاں کاٹتے پایا۔ہم دونوں باپ، بیٹا لکڑیاں کاٹتے اور اُن کو گٹھڑیوں کی صورت باندھ کر، شہر میں بیچ آتے، یوں ہمارا گزر بسر ہو رہا تھا۔جمع کرنے کی عادت ہم نے سیکھی نہیں تھی۔پرندوں کی طرح روز رزق کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے تھے۔ہم ہر روز شہر نہیں جا سکتے تھے، ہاں ہفتے میں دو بار ضرور لکڑیاں بیچنے جاتے تھے، اور ان کے بدلے کھانے پینے کی چیزیں خرید لاتے۔شہر کے مناظر بہت عجیب تھے۔بارلیش لوگ بھی ڈنڈی مارنے سے باز نہیں آتے تھے۔

وقت بے مہار اونٹ کی طرح اپنی مستی میں گزرتا چلا گیا۔میرے بابا نے مجھے زندگی گزارنے کے طور طریقے سکھا دیے تھے۔خود کی حفاظت، جنگلی جانوروں سے اپنا بچاؤ اور بہت کچھ، یوں سمجھیں، میں مکمل جنگجو بن گیا تھا۔کچھ ڈر میرے والد نے ختم کر دیا تھا اور پھر رب رحمان کا خاص کرم بھی تھا، یوں سمجھیں میں نڈر پیدا ہوا تھا۔سولہ سال کا عرصہ پل بھر میں گزر گیا اور میں لڑکپن سے ہوتے ہوئے جوان ہو گیا۔اب میں خوبرو، طاقتور نوجوان بن گیا تھا۔قد کاٹھ لمبا، لمبی لمبی مونچھیں، ناک کے نیچے لہلہاتی تھیں۔نشیلی آنکھیں، ستواں ناک، جنگلی تھا مگر بَلا کا



حسین تھا۔ چٹا گورا رنگ، لال گلال گال، گلاب کی طرح سُرخ ہونٹ، جب بھی خود کو آئینے کے سامنے لے جاتا تو مجھے شرم نہیں آتی تھی۔ خود سے نفرت نہ خود کشی کرنے کا کوئی پروگرام بنتا تھا۔ اگر میں خوبصورت نہ بھی ہوتا تو زندگی پانے کا شکریہ ضرور ادا کرتا، بنانے والی ذات کے سر بسجود ضرور ہوتا۔ ہاں مگر بدصورت شخص کو دُنیا والے طعنوں سے مار دیتے ہیں۔

انسانوں کے رُوپ میں سانپ بنے بیٹھے ہیں۔ سا۔نپ۔ سانپ۔ یہی سانپ ہی تو، جس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے۔ میں ڈر گیا تھا۔ میرے پسینے چھوٹ گئے تھے۔

یہ معمول کی رات تھی۔ میں نے لکڑیاں کاٹ کر، اپنے گھر کے صحن میں لا کر رکھیں اور کھانا بنایا۔ ہاں جی۔ میں اپنا اور اپنے ماں، باپ کا کھانا خود تیار کرتا ہوں۔ ماں باپ بوڑھے ہو چکے ہیں اور میری شادی نہیں ہوئی۔ نہ مجھے شادی کر کے خود کو قید ہونا تھا۔ رشتے داروں میں آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ والدین کی عمر آرام کرنے کی تھی، اِسی وجہ سے ان کو کام سے روک دیا تھا۔ میں خانہ داری بھی سیکھ چکا تھا۔ مرد کے ساتھ ساتھ عورت بھی تھا۔ ارے بھائی۔ آپ کیوں حیران ہو گئے۔ میرا مطلب ہے میں جب گھر کی ہانڈی روٹی کرتا تو اُس وقت کسی عورت سے کم نہیں تھا اور جب جنگل کی طرف جاتا، مرد بن جاتا تھا۔ جنگل کا قانون میرے اوپر لاگو نہیں تھا۔ میرے اپنے اصول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں رحم رکھ چھوڑا ہے۔ جنگل میں کوئی جانور مصیبت میں ہوتا تو میں مدد کرنے کو بھاگتا۔ جنگل کے سبھی جانور میرے دوست تھے۔

اب آپ یہ بھی جاننے کی کوشش کریں گے کہ سانپ میرا دوست کیسا بنا۔؟ تو میرے بھائی، زبان میں بڑی طاقت ہے۔ ہاں تو میں بتا رہا تھا، کھانا پکاتے کھاتے، کھلاتے رات کافی چڑھ آئی تھی۔ کھانا کھاتے ہی میرے امی، ابو سو گئے تھے۔ ایک میں تھا جو جاگ رہا تھا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ عجیب بے قراری تھی، کروٹیں بدلتا رہا۔ لیکن بے چینی برقرار تھی۔ کوئی ایسی کشش تھی جو مجھے تڑپا رہی تھی، اور گھر سے باہر کو جانے کے لیے اُکسا رہی تھی۔ پھر وہی ہوا، بے اختیار میرے قدم باہر کو اُٹھ گئے اور میں گھر سے نکل کر جنگل کی طرف چل پڑا۔

گھنا جنگل، ہر سو خاموشی ہی خاموشی۔ ہر چیز ساکت دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے اِس زمین پر کوئی روح ہے ہی نہیں۔ کالی رات نے ماحول کو خوف زدہ کر دیا تھا۔ چاند ستارے تو کبھی کبھار دیدار کراتے تھے۔ جیسے بچے بچپن میں آنکھ مچولی کا کھیل کھیلتے ہیں۔ جنگل نے اندھیرے کی بُکل اوڑھ رکھی تھی۔ لیکن۔

لیکن سفید دودھیا سی روشنی میرے گھر سے جنگل کی طرف بہت دُور تک چلی جا رہی تھی۔ کالی اندھیری رات میں وہ روشنی بڑی دل فریب لگ رہی تھی۔ روشنی اتنی تیز تھی کہ زمین کے سینے پر پڑی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی واضح دِکھ رہی تھی۔ میں اِسی روشنی کا دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ اس کی مدہوشی میں کھو سا گیا۔ روشنی کو پکڑنے کی چاہ میں، اُس کے پیچھے چُپ چاپ چلا جا رہا تھا۔ نجانے اِس میں ایسی کون سی کشش تھی کہ بے اختیار میرے قدم اُٹھتے چلے جا رہے تھے۔ سنسان راستا اور پھر گھنا جنگل، جہاں کوئی بشر نہیں تھا، وحشی درندوں کی آماجگاہ، شیر چیتا، گیدڑ، بندر، خرگوش اور جانے کیا کیا۔ میں اکیلا تھا۔

مجھے روشنی اپنی جانب کھینچے چلی جا رہی تھی۔ اچانک خشک پتوں کی تیز سرسراہٹ سے میرے قدم رُک گئے۔ ڈر کی لہر جسم میں دوڑ گئی۔ جنگلی خرگوش، میرے سامنے سے ڈر کر گزر گیا۔ اُسی نے میری توجہ بھٹکا دی تھی۔ میں رُکا ضرور تھا لیکن گھبرایا نہیں۔ چلتے چلتے میرے قدم اچانک رُک گئے۔

سامنے جو منظر تھا، اُس نے مجھے حیرت میں مبتلا کر دیا۔ کانٹوں بھری جھاڑیاں تھیں اور اُن سے تھوڑے فاصلے پر کالا مشکی ناگ پھن پھیلائے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اُس کے لب خون آلودہ تھے۔ اُس کی بے قراری دیدنی تھی۔ بے چینی سی اُس کے اردگرد محو رقص تھی۔ بدحواسی میں کبھی دُم کی طرف دیکھتا، تو

امید کا دیا

سال رواں کے آخری سورج کی کرنیں آنکھوں میں آنسو اور دل میں تڑپ لیے الوداع ہو رہی ہیں۔ وہ دعا کرتی ہیں کہ اے خدا اس ملک کو بربادی سے بچانا، اس دھرتی کو ویرانی سے محفوظ رکھنا۔ اس سال بھی دہشت گردوں کے ہاتھوں سیکڑوں معصوموں اور بے گناہ افراد نے اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا پائی۔ کیا گزرتی ہے ان والدین کے دلوں پر جب ان کے سامنے ان کے معصوموں کے جنازے آتے ہیں اور وہ جیتے جی مرجاتے ہیں۔ وہ کیسے جیتے ہوں گے، جن کے گھروں کے چراغ بجھ گئے اور دیکھتے دیکھتے آشیانے جل کر خاک میں مل گئے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر رات کے بعد صبح کا اجالا ہوتا ہے۔ ہر مایوسی کے بعد امید کا دیا جلتا ہے، ہر زخم بھر جاتا ہے، جب وقت مرہم بنتا ہے، اس لیے اے ہم وطنو! ہمت نہ ہارنا اور قدم سے قدم ملا کر چلنا کیوں کہ نئے سال کا سورج طلوع ہونے والا ہے۔ خدا کرے کہ نیا سال ہم سب کے لیے مسرت و خوشیوں سے بھرا پیغام لے کر آئے۔ ہر دن اور ہر پل دل میں نئی امنگیں اور امیدیں پیدا ہوں۔ قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ نوجوان ہمارے ملک کا سرمایہ ہیں، اس لیے نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ متحد ہو کر ایمانداری اور محنت سے اس ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کریں۔

مرسلہ: ریاض حسین تبسم چوہان۔ فیصل آباد

کبھی نیلے آسمان کی طرف۔ ایک نظر جھاڑیوں کی طرف ڈال لیتا تھا۔ جیسے دشمن جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا ہو، مگر۔ اس سے دشمن کیسے چھپ سکتا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی ہمدرد کی تلاش میں ہو۔ اس کی بے قراری میں محسوس کر سکتا تھا، وہ کسی مصیبت میں تھا۔

یہی لمحے تھے، جب میں ڈر گیا تھا، زندگی میں پہلی اور آخری بار ڈرا تھا۔ خوف سے میرے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ میرا روں روں کانپ اٹھا تھا۔ میں تھر تھر کانپنے لگا تھا، جیسے مجھے سردی لگی ہو اور میرے جسم پر کپڑے تک نہ ہوں۔ سامنے وحشی سانپ پھن پھیلائے بیٹھا تھا اور دوسرا راستا کوئی نہیں تھا کہ میں اختیار کرتا۔

مزے کی بات تو یہ تھی، جس روشنی کی چاہ میں، میں گھر سے نکلا تھا، وہ ختم ہو رہی تھی۔ آگے کا منظر ڈرا دینے والا تھا۔ میری منزل کہاں تھی، نہیں معلوم۔ بس کسی پاگل کی طرح گھر سے نکل آیا تھا۔ اور اب نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا اور نہ آگے بڑھ سکتا تھا۔ پیچھے گھپ اندھیرا تھا اور سامنے ڈسنے کو بے تاب بیٹھا تھا۔ میں ڈر گیا۔ گھپ اندھیرے میں اپنی زندگی کا انجام سوچ لیا تھا۔ موت آئی کہ یہ آئی۔ میرے لب ہلنے لگے۔ میں اپنے پیدا کرنے والے کو پکار رہا تھا۔ وہی ذات تو تھی جو مجھے بچا سکتی تھی۔

میں بھی اپنے رب کو پکار رہا تھا۔

دل میں رب کی یاد تھی اور آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔ اچانک میری نظر سانپ کے پچھلے حصے یعنی (دم) پر پڑی۔ میری جیسے چیخ نکل گئی۔ جذبہ ہمدردی امڈ آیا۔ اب میں سمجھا کہ وہ بے چین کیوں تھا؟ وہ رب رحمان سے مدد مانگ رہا تھا۔ اور رب رحمان نے مجھے اس کی مدد کے لیے، صحن سے یہاں تک کا سفر کرایا تھا۔ اس کا اور میرا رب ایک ہی تو تھا۔ اس دن کے بعد میرے دل سے خوف، ڈر نکل گیا۔ اب بڑے سے بڑا خطرہ ہو، تو میں نہیں ڈرتا۔

میرے قدم، سانپ کی طرف بڑھنے لگے۔ دو قدم کے فاصلے پر ہی مشکی ناگ میرا منتظر تھا۔ سانپ

کے قریب پہنچا تو وہ کسی معصوم بچے کی طرح سہا بیٹھا تھا۔ ورنہ سانپوں کے بارے تو سنا تھا، یہ دودھ پلانے والی ماں تک کو نہیں بخشتے۔ اپنی ماں کو بھی ڈس لیتے ہیں۔ میں سارا معاملہ جان گیا تھا۔ سانپ کیوں بار بار اپنی دم کی طرف دیکھ رہا تھا اور آسمان کی طرف بھی دیکھتا تھا۔

اُس کی دُم لہولہان تھی، خون بہہ رہا تھا، شاید مرنے کے قریب تھا۔ اگر میں اُس وقت نہ پہنچتا تو وہ تڑپ تڑپ کر مر جاتا۔ لیکن ابھی اُس کی زندگی باقی تھی اور رب تعالیٰ نے مجھے وسیلہ بنا کر بھیجا تھا۔ میرے نظریں اُس کی دم پر ٹک گئیں۔ اُس کی دُم سے تھوڑا منہ کی طرف تین عدد کانٹے، اُس کے جسم کے آر پار ہو چکے تھے۔ خون بھی اُدھر سے نکل رہا تھا۔ پہلے پہل، سانپ نے کانٹوں کو نکالنے کی کوشش کی ہوگی لیکن ناکام رہا۔ شاید زیادہ خون اِسی صورت بہہ گیا تھا۔

میں نے "بسم اللہ!" پڑھی اور ایک ہاتھ سانپ کے جسم پر مضبوطی سے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے یکے بعد دیگرے تینوں کانٹے نکال لیے۔ اِس دوران سانپ نے ہلکی سی حرکت کی تھی۔ کانٹے نکلتے ہی سانپ پُرسکون سا ہوگیا۔ جیسے اُس کا درد ختم ہوگیا ہو۔ میں نے اپنی قمیض سے کپڑا پھاڑ کر اُس کی مرہم پٹی کردی، تاکہ اور خون نہ بہے۔ پٹی کرتے ہی، میں دونوں ہاتھوں کو صاف کرنے کے انداز میں ایک دوسرے پر مارے اور سانپ سے تھوڑا دُور ہو کر بیٹھ گیا۔ پیچھے گھنا کیکر کا درخت تھا۔ اُس کے تنے سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندھ لی۔ لبوں پر رب رحمان کا نام مچلنے لگا۔ یا اللہ! تیرا شکر ہے۔ آج تیری مخلوق کے کام آیا۔ یہی الفاظ میرے لبوں پر گردش کرنے لگے تھے۔

آج زندگی میں پہلی بار کسی وحشی درندے کو آنسو بہاتے دیکھا تھا۔ ہاں میں نے کالے مشکی ناگ کو روتے، آنسو بہاتے دیکھا تھا۔ میرے آنکھوں نے دیکھا کہ اُس کی گول گول آنکھوں سے دو موٹے موٹے پانی کے قطرے نکل کر زمین بوس ہو گئے تھے۔ یہی تو آنسو تھے۔ دوسرے ہی لمحے وحشی مشکی ناگ نے اپنا سر میرے قدموں میں رکھ دیا۔ تشکر بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ جیسے میرا شکریہ ادا کر رہا ہو۔ رب تعالیٰ نے وحشی درندے کو بھی جھکنا سکھا دیا تھا۔ اُس کے دل میں رحم ڈال دیا تھا۔ میرے آنکھیں بھی آنسوؤں سے تر بتر تھیں۔ ہم دونوں ہی رو رہے تھے۔ کیسا منظر تھا۔ نیلا آسمان خاموش کھڑا مسکرا رہا تھا، ملائکہ جیسے ہمیں مبارک باد دے رہے ہوں۔ میرا دل خوش تھا۔ رب رحمان نے امتحان سے سُرخرو کر دیا تھا۔

میں نے کالے ناگ کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ محبت اور چاہت کے جذبوں سے سرشار ہو کر کتنی دیر، سانپ کے جسم کا لمس، اپنے اندر، اپنی روح تک محسوس کرتا رہا۔ میں پُرسکون ہو گیا۔ میری روح تک سرشار ہو گئی تھی۔ میں اپنی سگی اولاد کی طرح اُسے پیار کر رہا تھا۔

آج کے پُرفتنہ دَور میں انسان اپنی اولاد سے اِتنا پیار نہیں کرتا، یہ تو پھر بھی وحشی درندہ تھا۔ ایک خطرناک سانپ۔ نجانے اپنی زندگی میں کتنی زندگیوں کے چراغ گُل کیے ہوں گے۔ کتنوں کا ڈسا ہوگا۔ کتنوں کو اپنے زہر سے موت کی نیند سے سُلا دیا ہوگا۔ کتنوں کا خون پیا ہوگا، لیکن آج۔ آج وہ درندہ نہیں ایک مظلوم تھا۔

کتنے لمحے یونہی بیت گئے اور سانپ اپنی منزل کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں بھی وہاں سے گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر کیسے پہنچا، کچھ یاد نہیں۔ ہاں مگر اُس رات پُرسکون نیند آئی تھی۔ دن چڑھے بابا نہ اُٹھاتا تو جانے کب تک سوتا رہتا۔

وقت کا کام ہے گزرنا، سو یہ اپنی مستی میں گم صم گزرتا چلا جاتا ہے۔ میں بھی اپنی زندگی کی مستیوں میں گم ہو گیا۔ اور اِس واقعے کو تقریباً بھول ہی گیا تھا۔ چھ ماہ بعد، میں جنگل میں اکیلا لکڑیاں کاٹنے میں مصروف تھا کہ شکاریوں کا گروپ وہاں آن دھمکا۔ وہ جنگل سے شکار کرنا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے منع کر دیا۔ ارے بھائی یہ جنگل میرا ہے۔ میں یہاں شکار کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اِسی بات پر تُوں تُوں، مَیں مَیں ہوگئی اور بات ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔

جنگل میں امن تھا، جانوروں سے مجھے محبت تھی

اور کسی جانور کی موت، میں اپنی آنکھوں سے کیسے دیکھ سکتا تھا۔ جانوروں کے لیے میں مسیحا تھا۔ ان کا ہمدرد، ہم نوا، وہی تو میرے دُکھ سُکھ کے ساتھی تھے۔ اُنہی میں، میں پل پوس کر جوان ہوا تھا۔ اب کیسے، اِن شکاریوں کو شکار کرنے دیتا۔ میں نے اُنہیں منع کیا لیکن میرا منع کرنے کا، ان پر اثر نہ ہوا اور وہ ہاتھا پائی پر اُتر آئے۔ وہ مجھے پیچھے دھکیلتے ہوئے آگے کو بڑھ گئے۔ تھوڑی دُور سامنے ہرن چر رہا تھا۔ انہوں نے اُس پر بندوقیں تان لیں۔ لمحہ بھر میں انہوں نے فائر کھول دیا۔ فائر ہرن کو نہیں بلکہ آسمان کی طرف کھل گیا۔ یا پھر غیر ارادی طور پر ایسا ہوا تھا۔ اتنے میں چیخوں کی آواز پورے جنگل میں پھیل گئی۔ پل بھر میں شکاری زمین پر اُوندھے منہ، بے سدھ پڑے تھے۔ کالے ناگوں کا گروپ، ان کے جسموں کو ڈس رہا تھا۔ اُن میں ایک بوڑھا سانپ درمیان میں پھن پھیلائے بیٹھا تھا۔

جیسے ہی ایک سانپ میری طرف بڑھا، وہ بوڑھا سانپ آگے آگیا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کے منہ سے منہ ملایا۔ جانے کوئی بات ہوئی ہوگی۔ پھر دونوں شانت ہو گئے۔ بوڑھا سانپ میری طرف دیکھ رہا تھا اور باقی تمام سانپ اُس کے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔ میں دُور کھڑا ان کو ہی دیکھ رہا تھا۔ بوڑھا سانپ میری طرف بڑھنے لگا تو باقی بھی اُس کی نقل کرنے لگے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں ڈر گیا، میری جان پر بن گئی تھی، شکاریوں کا جو حشر ہوا تھا میرے سامنے تھا۔ شاید اب میری باری تھی۔

پہلے تو میں ڈر گیا لیکن دوسرے ہی لمحے میں پُرسکون ہو گیا، کیونکہ میری نظر اُس پٹی والے سانپ پر پڑی، جس کے میں کانٹے نکالے تھے۔ ابھی تک وہ پٹی اُس کے جسم کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے اُس نے نشانی کے طور پر سنبھال رکھی ہو۔ ابھی تک اُس سے چھٹکارا حاصل نہیں کیا تھا۔

چند ساعتوں میں، کالا مشکی ناگ میرے پاؤں چھو رہا تھا۔ اس کے باقی ساتھی بھی میرے اردگرد جمع تھے۔ چند شراتی، میرے جسم پر چڑھ دوڑے تھے۔ لیکن میں گھبرایا نہیں، بلکہ خوش ہو رہا تھا، جیسے باپ اپنے بچوں کے ساتھ ''بچہ'' بن کر کھیلتا ہے۔ میں بھی اُن کے ساتھ کھیلنے لگا تھا۔ تب مجھے پتا چلا کہ وہ سانپ مادہ تھا، یعنی سانپنی تھی۔ اور اُس کے اردگرد پھرنے والے اُس کے بچے تھے۔

آج کالے مشکی ناگ نے مجھے شکاریوں سے بچا کر، اپنا بدلہ چکا دیا تھا۔ شکاری، اپنے کیے کی سزا بھگت چکے تھے اور مجھے اپنے دوستوں سے ملا گئے۔ میں نے سانپ کی پٹی کھول دی، اُس کے زخم مندمل ہو گئے تھے اور اب معمولی سے نشان باقی تھے۔

اِس واقعے کو دو سال بیت چکے ہیں۔ میں آج بھی جنگل میں تن تنہا گھومتا ہوں۔ میرے ماں، باپ اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ مجھے اکیلے رہتے ہوئے کوئی پریشانی نہیں ہے کیونکہ یہی ناگن میری مدد کرتی رہتی ہے۔ میں جہاں بھی جاتا ہوں، خود کو حصار میں پاتا ہوں، کوئی غیبی میری مدد کر رہا ہوتا ہے۔ میں جب گھر پہنچتا ہوں، میرا کھانا تیار ہوتا ہے، مجھے کھانا نہیں بنانا پڑتا۔ یہ کارنامے سانپنی ہی دے رہی ہے۔ سانپنی کھانا پکاتی ہے اور پھر اپنی دُنیا میں لوٹ جاتی ہے۔ ہاں میرے اردگرد وہ موجود رہتی ہے، مجھے کسی سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کیونکہ میری مدد کرنے کے لیے میرے دوست ہر وقت موجود رہتے ہیں، یہ الگ بات ہے وہ میرے سوا کسی کو نظر نہیں آتے۔ جنات غیر مرئی ہوتے ہیں جو ہر کسی کو نظر نہیں آتے۔ وہ ناگن، اصل میں جنات سے تھی۔ مومن جنات سے، یہ انسان دوست ہوتے ہیں، انسانوں کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ یہی راز ہے جو میرے سینے میں قید تھا، آج اِس راز سے اِس لیے پردہ اٹھایا کہ میری زندگی ابدی زندگی سے قریب تر ہے اور یہ راز بھی میرے زندگی کے ساتھ ہی دفن ہو جاتا۔

جو اللہ! کی مخلوق کے ساتھ رحم اور محبت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے ستر ماؤں سے بھی بڑھ کر پیار کرتا ہے۔ بس دیکھنے والی آنکھ، سوچنے کے لیے دماغ، اور دل میں یاد الٰہی شامل ہو۔

☆☆.....☆☆



چترہاری سانپ کا مذاق



ذرغام محمود

تھرپارکر کے صحرا سے، اُس شخص کا قصہ جسے ایک چترہاری سانپ نے اپنے اشاروں پر نچادیا

رات کے اندھیرے نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے گاڑی سڑک کنارے روکی میں تین گھنٹے سے مسلسل گاڑی چلا رہا تھا اور ابھی سات آٹھ گھنٹے کا سفر باقی تھا میں نے گاڑی کا انجن بند کیا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ آج چاند کی چودہ تاریخ تھی۔ ہر سو ایک رومانی سی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ اجالا اتنا تھا کہ ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ میں نے اپنا سفر ڈسٹرکٹ امرکوٹ جسے اب عمر کوٹ کہا جاتا ہے وہاں سے شروع کیا تھا۔ میری منزل کراچی شہر تھی میں رہنے والا تو عمر کوٹ کا ہوں مگر نوکری کے سلسلے میں، میں نے کراچی میں رہائش اختیار کرلی ہے۔ میرے والدین اور خاندان کے دیگر افراد عمر کوٹ ہی میں رہائش پذیر ہیں لہٰذا ہر ہفتہ پندرہ دن میں میرا کراچی سے عمر کوٹ آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اس وقت بھی میں دو دن عمر کوٹ میں گزار کر کراچی جا رہا تھا۔

میں ڈسٹرکٹ عمر کوٹ سے نکل کر تھر پارکر کے عظیم صحرا میں سفر کر رہا تھا۔ میں نے گاڑی سے اتر کر چند لمبی لمبی سانسیں لیں اور اپنے چاروں اطراف نظریں دوڑائیں۔ دور دور تک ہولناک سناٹا تھا۔ کہیں آبادی کا نام و نشان تک نہیں تھا کہیں کہیں کوئی ٹنڈ منڈ سا درخت سڑک کنارے نظر آتا، ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوا چل رہی تھی یہی ہوا دن کے وقت گرم اور جان لیوا ہوتی ہے۔ ریگستان کا یہ فائدہ ہے کہ وہ جلدی ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ تیز ہوا ریت پر دلکش نقش و نگار بنا رہی تھی۔ میں نے سڑک کنارے بیٹھ کر اپنی انگلیاں ریت میں ڈالیں تو ٹھنڈک کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں بے شک کراچی میں رہتا تھا مگر ہوں تو اس عظیم ریت مہاساگر کا بیٹا۔ میرے خون میں یہاں کی خوشبو رچی بسی ہے۔

کچھ دیر میں ریت میں انگلیاں ڈالے بیٹھا رہا پھر میں نے اٹھ کر گاڑی سے پانی کی بوتل نکالی اور منہ سے لگالی۔ پانی پی کر میں دوبارہ گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ ابھی میں گیئر ڈال کر گاڑی آگے بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ میری نظر سامنے سڑک پر پڑی۔ میری گاڑی سے تیس بتیس گز کے فاصلے پر ایک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ میں سانپ کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ چترہاری سانپ تھا۔ اس کی کھال چاند کی روشنی میں چمک رہی تھی اور سنہری مائل مٹیالی جلد پر پڑے

سیاہ دھبے اسے مزید خوفناک بنا رہے تھے۔
چترہاری سانپ کو دیکھ کر میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میں اپنی گاڑی میں ساکت بیٹھا رہ گیا۔ چترہاری سانپ سندھ کے ریگستان کا خطرناک ترین سانپ ہے یہ سانپ انتہائی زہریلا ہوتا ہے۔ اس کی نسل تقریباً معدوم ہو چکی ہے۔
چترہاری سانپ کو دیکھتے ہی مجھے اپنے عزیز دوست رضا کا خیال آیا۔ رضا میرا سب اچھا دوست ہے بلکہ میرا اور اس کا بھائیوں والا معاملہ ہے۔ رضا کراچی کی ایک لیبارٹری میں کام کرتا ہے اور سانپ اور سانپ کے زہر پر تحقیق کر رہا ہے۔ رضا کا خیال آتے ہی بے اختیار میرا دل چاہا کہ میں اس سانپ کو پکڑلوں اور رضا کو گفٹ کر دوں یقیناً رضا ایسا تحفہ پا کر بہت خوش ہو گا۔
یہ سوچ کر میں نے اپنے حواس بحال کیے اور ڈیش بورڈ سے اپنا بتیس بور کا ریوالور نکالا اور آہستہ سے گاڑی کا دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکل آیا۔
سانپ اسی طرح کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اس کی دوشاخہ زبان بار بار منہ سے باہر آ رہی تھی وہ شاید شکار پر حملہ کرنے والا تھا۔ میں نے اس کی نظروں کی تعاقب میں دیکھا سامنے درخت کے نیچے دو موٹے تازے چوہے بیٹھے تھے۔ سانپ انہیں شکار کرنا چاہتا تھا۔ یہ غنیمت تھا کہ سانپ نے اب تک مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اپنا ریوالور سیدھا کیا اور سانپ کے سر کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ ٹھیک اسی وقت سانپ نے بھی چوہوں پر چھلانگ لگائی مگر ریوالور سے نکلی گولی کی رفتار سانپ کی رفتار سے بہت تیز تھی سانپ گولی کھا کر زمین پر گر پڑا اور بے سدھ ہو گیا۔ میں دوڑ کر اس کے قریب پہنچا۔ گولی چلنے کی آواز سناٹے میں دور تک گئی مجھے ڈر تھا کہیں گولی چلنے کی آواز سن کر



پولیس کی کوئی گاڑی ادھر نہ آ جائے کیونکہ چترہاری سانپ کا شکار قانوناً ممنوع ہے، لہٰذا میں نے جلدی سے ایک لکڑی کی مدد سے سانپ کے مردہ جسم کو اٹھایا اور اپنی گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈالا اور جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کر کے وہاں سے روانہ ہو گیا۔

گاڑی کے اندر مدہم روشنی میں سانپ کا چمکدار جسم بہت خوفناک دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اپنا دھیان بٹانے کے لیے دھیمے سروں میں گنگنانا شروع کر دیا۔ میں تصور کی آنکھ سے رضا کو دیکھ رہا تھا جو چترہاری سانپ کو پا کر بے حد خوش تھا۔ اسی وقت گاڑی کو ایک زوردار جھٹکا لگا شاید سڑک پر کوئی گڑھا تھا جس میں گاڑی کا ٹائر چلا گیا تھا گاڑی کے جھٹکے کے ساتھ ہی نہ جانے کیسے پچھلی سیٹ پر رکھا سانپ اچھل کر میری گردن سے لپٹ گیا میرے منہ سے ایک تیز چیخ نکل گئی اور میں نے بے اختیار اپنے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل سے ہٹائے اور سانپ کو اپنی گردن سے الگ کر کے پچھلی نشست پر پھینک دیا۔ اسٹیئرنگ وہیل چھوٹنے کی وجہ سے گاڑی سڑک پر لہرا گئی اور سڑک سے اتر کر ریت میں گھس گئی اور ایک جھٹکا کھا کر گاڑی بند ہو گئی۔ میں جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اترا اور اپنی سانسیں بحال کیں پھر میں نے پانی کی بوتل نکالی اور پانی پیا تاکہ اپنے حواس بحال کر سکوں۔ تھوڑی دیر میں، میں نے اپنے خوف پر قابو پایا پھر میں نے سانپ کو ہلا جلا کر دیکھا مگر سانپ ساکت پڑا تھا۔ اس میں زندگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ شاید گاڑی کو لگنے والے جھٹکے کی وجہ سے سانپ اچھل کر میرے اوپر آ گیا تھا، میں نے سوچا اور دوبارہ گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے اسے سڑک پر لایا اور اپنا سفر شروع کیا مگر اب میرے اندر اس اعتماد کا کہیں پتا نہیں تھا جو سفر شروع کرتے وقت مجھ میں تھا۔

گاڑی اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ رات بیتی جا رہی تھی۔ میں نے ایک پٹرول پمپ پر رک کر پٹرول بھروایا اور اپنا سفر طے کرنے لگا۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ میں نے بدین ڈسٹرکٹ بھی پار کر لیا تھا اب میرا سفر ٹھٹھہ ڈسٹرکٹ میں جاری تھا۔ ٹھٹھہ کے بعد کراچی تھا۔ میں گنگناتے ہوئے گاڑی چلا رہا تھا سانپ کا خوف میرے ذہن سے نکل چکا تھا۔ میں دھیمے سروں میں ایک مشہور نغمہ گنگنا رہا تھا۔ اسی وقت میری نظر بیک مرر پر پڑی۔ بیک مرر میں جو منظر مجھے نظر آیا وہ مجھے دہشت زدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ خون میری رگوں میں جمنے لگا میرے ہونٹ نیم وا انداز میں کھل گئے۔ میری آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئیں بیک مرر میں منظر ہی اتنا خوفناک تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسے ہو گیا۔ میں نے گاڑی کی رفتار کم کی اور آہستہ آہستہ گردن گھما کر دیکھا سانپ پچھلی سیٹ پر گردن اٹھائے بیٹھا تھا۔ اس کی دوشاخہ زبان بار بار باہر نکل رہی تھی۔ اس کا منہ اس کے اپنے خون سے سرخ ہو رہا تھا جس پر جابجا ریت لگی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بجلیاں کوند رہی تھی۔

خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے گاڑی روکنی چاہی مگر اسی وقت سانپ نے تیزی سے اپنی جگہ تبدیل کی اور میرے سامنے اسٹیئرنگ وہیل سے ذرا اوپر آ کر بیٹھ گیا، گویا حکم دے رہا ہو کہ گاڑی چلاتے رہو۔

خوف اور ڈر کیا ہوتا ہے مجھے آج احساس ہو رہا تھا موت میرے سامنے سانپ کی صورت میں بیٹھی تھی۔ سانپ کی زبان بار بار منہ سے باہر آ کر مجھے مزید خوفزدہ کر رہی تھی۔ چترہاری سانپ کا کاٹا تو پانی بھی نہیں مانگتا۔ میں دل ہی دل میں اس وقت کو کوس رہا تھا جب میں نے سانپ کے شکار کا سوچا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے اپنے بچاؤ کی تدبیر سوچ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مردہ سانپ زندہ کیسے ہو گیا۔ اسی وقت گاڑی کسی ابھری ہوئی جگہ سے گزری اور گاڑی کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ جھٹکا سانپ کو انتہائی ناگوار گزرا اور اس نے غصیلی نظروں سے مجھے گھورا اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ میں دل ہی دل میں کلمہ پڑھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میرا ہاتھ آہستہ آہستہ ڈیش بورڈ

کی جانب بڑھنے لگا جہاں میرا ریوالور رکھا تھا مگر..... مگر شاید سانپ نے میرا ارادہ بھانپ لیا اس نے فوری طور پر اپنی جگہ تبدیل کی اور وہ ڈیش بورڈ پر جا کر بیٹھ گیا میرے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس نکلی اور میں نے سارا دھیان گاڑی چلانے پر لگا دیا۔

مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ آخر سانپ نے مجھے ابھی تک ڈسا کیوں نہیں کیونکہ چترہاری سانپ کی فطرت ہے کہ وہ شکار کو زیادہ مہلت نہیں دیتا۔

''یا اللہ تو ہی کوئی سبب بنا۔ مجھے اس مصیبت سے نجات دلا......'' میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی اور اپنے بازو پر بندھے امام ضامن کو محسوس کیا جو سفر شروع کرنے سے پہلے اماں جان نے دعائیں پڑھتے ہوئے باندھا تھا۔

میری گاڑی آہستہ آہستہ ٹھٹھہ شہر میں داخل ہو رہی تھی ٹھٹھہ شہر کے باسی اپنے گھروں میں سکون سے سو رہے تھے مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

سانپ میری برابر والی سیٹ پر آ چکا تھا اور وہاں بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے دوشاخہ زبان بار بار اس کے منہ سے باہر نکل رہی تھی شاید وہ مجھے خوفزدہ کر کے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسی وقت گاڑی کے قریب سے ایک ٹرک گزرا جس نے تیز ہارن بجایا۔ ہارن کی تیز آواز سن کر سانپ کے جسم میں لرزہ سا پیدا ہوا اور اس کے غصے میں اضافہ ہو گیا وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگا گویا یہ قصور بھی میں نے کیا ہو۔

اچانک سانپ کی دل میں کیا سمائی کہ وہ اپنی دم کے بل پر کھڑا ہو گیا اس کا منہ میرے چہرے کے انتہائی قریب آ گیا اس کی گرم گرم سانسیں میرے چہرے کو جھلسانے لگیں میرا خون رگوں میں خشک ہونے لگا خوف سے میرا برا حال تھا میرا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا آج کی رات میرے آخری رات ہو سکتی ہے مجھے اماں جان اور ابا جان کا خیال آ رہا تھا اگر..... اگر مجھے کچھ ہو گیا تو اماں جان کا کیا حال ہو گا اور ابا جان..... گو ابا جان سخت گیر ہیں وہ مجھ سے پیار بھی بہت کرتے ہیں آخر میں ان کی اکلوتی اولاد

نماز کی شان

جب تو نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو سارے آسمان تک رحمت الٰہی گھٹا بن کے چھا جاتی ہے۔ فرشتے تیرے چہرے کی طرف جمع ہو جاتے ہیں۔ ایک فرشتہ پکارتا ہے کہ اے نمازی اگر تو دیکھ لے کہ تیرے سامنے کون ہے اور تو کس سے بات کر رہا ہے تو قسم ہے اس پاک ذات کی جس نے تجھے پیدا کیا تو قیامت تک سلام نہ پھیرے۔

مرسلہ: سلمیٰ۔ بحرین

ہوں۔

''یا اللہ اپنے حبیب ﷺ کے صدقے مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دے۔'' میں نے صدقِ دل سے دعا مانگی۔ میرے حلق میں کچھ پھنسنے لگا اور پھر خود بخود میرے آنسو بہہ نکلے۔

سانپ میرے چہرے کے بہت قریب تھا۔ اس کی دوشاخہ زبان میرے گالوں کو چھو رہی تھی۔ اچانک سانپ کے دل میں کیا سمائی کہ وہ دوبارہ اپنی پرانی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا اور وہیں سے مجھے گھورنے لگا۔

ٹھٹھہ شہر پیچھے رہ گیا اب میں گھارو شہر سے گزر رہا تھا۔ بس کراچی آنے والا تھا اسی وقت میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ مجھے معلوم تھا کہ رضا صبح جلدی اٹھنے کا عادی ہے لہٰذا کراچی شہر میں داخل ہوتے ہی میں نے گاڑی کا رخ ماڈل کالونی کی جانب موڑ دیا، جہاں رضا کا بنگلہ تھا۔

مساجد سے فجر کی اذانوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اجالا اتنا ہو گیا تھا کہ اب ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ سانپ میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا اس کی نظریں میرے اوپر جمی تھیں۔ میں نے رضا کے بنگلے کے سامنے پہنچ کر گاڑی روکی اور دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر سانپ نے میرے ارادے کو بھانپ لیا اور ایک زور کی پھنکار ماری۔ میرا ہاتھ

جہاں تھا وہیں رک گیا پھر میں نے اپنا دوسرا ہاتھ آہستہ سے اسٹیئرنگ وہیل سے ہٹا کر ہارن تک لایا اور ہارن بجا دیا۔ ہارن کی تیز آواز چاروں طرف پھیل گئی ہارن کی تیز آواز سن کر سانپ نے نہایت ناگواری سے میری جانب دیکھا مگر میں نے پروانہ کی اور دوسری بار بھی ہارن بجادیا۔

تھوڑی دیر میں رضا آنکھیں ملتا ہوا بالکونی میں آیا۔ میری گاڑی دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے چیخ کر کچھ کہا جو میں نہ سن سکا۔ تھوڑی دیر بعد رضا بنگلے سے نکلتا ہوا نظر آیا۔ وہ میری گاڑی کے پاس آتے ہوئے بولا۔

''کیا پیروں میں مہندی لگی ہوئی ہے جو گاڑی سے نیچے نہیں اتر رہے ہو۔''

جملہ مکمل کرتے ہی رضا کی نظر سانپ پر پڑی۔ وہ فوراً صورتحال کی سنگینی کو سمجھ گیا اور بڑی تیزی سے الٹے قدموں واپس بنگلے کی جانب دوڑ گیا۔ میں نے کن انکھیوں سے سانپ کی جانب دیکھا وہ بار بار پھنکار کر مجھے ڈرا رہا تھا۔

اسی وقت رضا اپنے بنگلے سے باہر آتا نظر آیا اس کے ہاتھ میں اسپرے کرنے والی مشین تھی وہ گاڑی کی دوسری جانب کی کھڑکی پر آیا جہاں سانپ بیٹھا تھا پھر اس نے اپنی ناک پکڑ کر مجھے اشارہ کیا میں اس کا اشارہ سمجھ گیا وہ مجھے سانس روکنے کا کہہ رہا تھا میں نے ایک لمبی سانس اپنے پھیپھڑوں میں بھری اور سانس روک لی۔

میرے سانس روکنے کے بعد رضا نے اسپرے مشین کا رخ سانپ کی جانب کیا اور مشین کا بٹن دبا دیا اسپرے مشین میں شاید بیہوشی کی دوا تھی۔

سانپ پر جیسے ہی اسپرے کی پھوار پڑی وہ اچھلا اور اس نے مجھے ڈسنے کی کوشش کی مگر میں نے چیختے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر چھلانگ لگا دی سانپ میرے پیروں سے لپٹتا ہوا گاڑی سے باہر آگرا۔ میں نے اسے اپنے پیروں سے جھٹکا اور دور جا کھڑا ہوا۔

''ارے...... ارے گھبراؤ نہیں...... یہ بیہوش ہو چکا ہے۔'' رضا نے کہا اور اس نے سانپ کو اپنے ہاتھوں میں اس طرح اٹھالیا جیسے وہ ربڑ کا بنا ہوا ہو۔

میں نے گاڑی لاک کی اور رضا کے ساتھ اس کے بنگلے میں داخل ہوا۔ ڈرائنگ روم تک پہنچتے پہنچتے میں نے مختصراً رضا کو رات بھر کی روداد سنائی۔ رضا سانپ کو لے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا جسے وہ لیبارٹری کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ ملازم میرے سامنے چائے رکھ گیا تھا۔ میں چائے کی شدید طلب محسوس کر رہا تھا لہٰذا میں چائے پینے لگا۔

تھوڑی دیر بعد رضا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں وہ ہی سانپ تھا جس نے رات بھر میرا جینا حرام کیا ہوا تھا۔ سانپ اب ہوش میں تھا۔ رضا نے سانپ میرے اوپر اچھالتے ہوئے کہا۔

''یہ بالکل بے ضرر سانپ ہے۔''

''کیا مطلب۔'' میں نے سانپ سے بچتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ تم نے اسے جو گولی ماری تھی اس نے اس سانپ کی زہریلے دانت ہی اڑا دیے تھے۔'' رضا نے جواب دیا۔

''یہ کیسے ممکن ہے۔'' میں حیرت زدہ رہ گیا۔

''وہ ایسے ممکن ہے کہ شکار کے وقت چتر ہاری سانپ اپنے دونوں زہریلے دانت باہر کی جانب نکالتا ہے تاکہ شکار کو ڈس سکے۔

جب تم نے اسے گولی ماری تو یہ شکار کر رہا تھا اور جیسے ہی اس نے شکار کرنے کے لیے اپنے زہریلے دانت باہر نکالے، تم نے گولی چلا دی اور گولی نے اس کے دونوں زہریلے دانت ختم کر دیے اسی لیے یہ تمہیں ڈس نہیں سکا اور تم رات بھر ایک بے ضرر سانپ سے ڈرتے رہے جو کسی کو ڈسنے کے قابل نہیں تھا۔'' رضا نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

رضا کی بات سن کر میرے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس نکل گئی اور میں نے پلٹ کر سانپ کو دیکھا سانپ قالین پر اپنا دھڑ اوپر کیے مجھے گھور رہا تھا۔ بے اختیار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

☆☆......☆☆



فرعون کے قیدی

حمیرا خان

اُس جوڑے کی کہانی، جسے مصر میں ہنی مون منانا پڑا اور وہ فرعون کے محل میں......

دور دور تک چاندنی رات کا فسوں پھیلا تھا۔ کھلی جگہ میں ویسے بھی چاندنی رات کی خوبصورتی زیادہ محسوس ہوتی ہے اور یہاں تو چاروں طرف جہاں جہاں تک نظر جاتی تھی اونچے نیچے ٹیلوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا، ایسے میں چاندنی اندھیرے کے ساتھ مل کر عجیب عجیب ہیولے بناتی اور دیکھنے والے کی نظر کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی ہے۔ یہاں بھی یہی حال تھا مگر وہاں دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ مشرق کی طرف دو آمنے سامنے لگے دو خیمے انسانوں کی موجودگی کا پتا ضرور دے رہے تھے لیکن اس وقت شاید وہ بھی نیند کی وادیوں میں کھوئے ہوئے تھے اس لیے ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔

''دن بھر ان ویرانوں میں پھرتے ہیں یہ کافی نہیں تھا جو رات بھی یہاں گزار رہے ہیں۔ اچھے بھلے کسی ہوٹل میں رات گزارتے اور سکون سے تو سوتے'' بار بار کروٹیں بدلنے کے بعد آمنہ بڑبڑاتے ہوئے جھنجلا کے اٹھ بیٹھی اور ناراض نظروں سے اپنے قریب لیٹے عدنان کو دیکھنے لگی جو بیوی کے غصے اور ناراضگی سے بچنے کے لیے سونے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔

''مجھے پتا ہے تم جاگ رہے ہو۔ آنکھیں کھولو مجھ سے بات کرو بلکہ چلو باہر چلتے ہیں۔ میرا تو دم گھٹ رہا ہے اس جگہ پر'' آمنہ نے بستر سے اٹھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر عدنان کو بھی کھینچ کر اٹھانا چاہا مگر اس نے آمنہ کا ہاتھ کھینچ کر اسے بھی واپس بٹھا دیا۔

''یار سونے کی کوشش کرو گی تو نیند آئے گی نا۔ مجھے تو بہت ت ت نیند آرہی ہے'' عدنان نے ''بہت'' پر زور دیتے ہوئے کہا اور ساتھ میں ایک زوردار جمائی لیتے ہوئے آمنہ کی طرف التجائیہ نظروں سے دیکھا، خیمے میں پھیلی ہلکی ہلکی روشنی میں آمنہ نے عدنان کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی مگر اس کے لیے روشنی ناکافی تھی۔ وہ عدنان کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑا کر پھر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''سوتے رہو تم۔ میں اکیلے جا رہی ہوں'' خیمے سے باہر کا رخ کرتے ہوئے اس نے کہا اور مڑ کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا کہ شاید وہ بھی اس کے ساتھ آنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو مگر اس نے سکون سے کروٹ لیتے ہوئے کہا بھی تو صرف اتنا۔

''دھیان سے جانا اور دیکھو زیادہ دور مت نکل جانا'' عدنان کے انداز پر آمنہ کڑھ کر رہ گئی۔

''مشورے کا شکریہ'' وہ غصے سے کہتی سر جھکا کر باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

آمنہ اور عدنان کی شادی کو پانچ سال ہونے کو آئے تھے مگر وہ ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھے، بظاہر اس کی کوئی وجہ بھی سامنے نہیں تھی جس کا علاج کروایا جاسکتا بس اللہ کی طرف سے ہی دیر تھی مگر دنیا یہ سب کب سمجھتی ہے سو کبھی ہمدردی تو کبھی طنز کی صورت انہیں ان کی اس محرومی کی احساس اکثر دلوایا جاتا تھا جیسا کہ ہمارے ہاں ہوتا ہے۔ عدنان بھی دوسرے مردوں کی طرح ایسی باتوں کو ہنس کر ٹال دیا کرتا تھا لیکن آمنہ کے لیے ان باتوں کو نظر انداز کرنا مشکل ہوتا جارہا تھا تبھی عدنان کے لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ دن بہ دن چڑچڑی ہوتی جارہی تھی۔ انہی دنوں میں عدنان کے دوست علی نے مصر کی سیر کا پروگرام بنایا اور عدنان کو بھی ساتھ چلنے پر زور دیا مگر عدنان اس صورتِ حال میں آمنہ کو اکیلا چھوڑ کر جاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا تبھی علی نے پلان بنایا کہ وہ دونوں اپنی بیویوں کو بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔ اب عدنان کے پاس انکار کی کوئی وجہ نہ بچی تو جھٹ پٹ پروگرام بنا اور دونوں اپنے اپنے ضروری کام نمٹانے میں لگ گئے۔ اس دوران مصر جانے کے سارے انتظامات بھی ہوگئے اور وہ دونوں اپنی اپنی بیوی کے ہمراہ اس وقت مصر میں تھے۔

کوئی مصر میں جائے اور اہرام مصر نہ دیکھے یہ بھلا کیسے ممکن ہے۔ سو وہ بھی سارا دن وہیں گھومتے رہے تھے۔

آمنہ کی نسبت علی کی بیوی فائزہ اس ٹرپ پر کافی پرجوش دکھائی دے رہی تھی۔ فائزہ اور علی کزنز تھے اور ان کی لومیرج تھی۔ ان کی شادی کو ابھی ایک سال ہی گزرا تھا۔ آج سپیشل پرمیشن لے کر انہوں نے اہراموں کے قریب ہی خیمے لگالیے تھے۔ یہ ان سب کا مشترکہ فیصلہ تھا۔ وہ لوگ رات کی وقت بھی اس جگہ کو دیکھنا چاہتے تھے کہ وہاں رہتے کیا محسوس ہوتا ہے



وہ یہ سب محسوس کرنا چاہتے تھے، مگر تھکن کے باعث اب وہ تینوں سو چکے تھے لیکن بے آرامی کے سبب آمنہ سو نہیں پارہی تھی تبھی باہر نکل آئی تھی۔

☆......☆......☆

باہر نکلتے ہی آمنہ کی پہلی نظر سامنے والے خیمے پر پڑی، وہاں مکمل طور پر خاموشی تھی۔

''ایسے ویرانے میں بھی کتنے مزے سے سوئے ہوئے ہیں یہ لوگ اور ایک میں ہوں۔ ایک پل کو بھی نہیں سو پارہی، شاید میں نے ہی ان کے ساتھ آکر غلطی کی مجھے نہیں آنا چاہیے تھا'' اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر بیزاری سے سوچا تبھی اسے ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دیں۔

''شاید صبح والے لوگ ہیں جو اس وقت بھی کام میں لگے ہوئے ہیں'' انہوں نے دن میں ایک گروپ کو وہاں کام کرتے دیکھا تھا جو ایک جگہ پر کھدائی کرنے میں مصروف تھے۔ وہ کھلنڈرے نوجوانوں کا ایک گروپ تھا جس میں دو لڑکیاں اور تین لڑکے شامل تھے تینوں کا تعلق یورپ کے کسی ملک سے تھا۔ جب یہ لوگ وہاں گھومتے ہوئے ان کے پاس سے گزرے تو دونوں گروپس کے درمیان مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا تھا پھر وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے تھے اور آمنہ لوگوں کا گروپ آگے نکل آیا تھا۔

''ارے یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے لیکن آواز تو ابھی تک سنائی دے رہی ہے'' آمنہ اپنی سوچوں میں گم بے خیالی میں اس جگہ آ پہنچی تھی جہاں اس نے صبح ان لوگوں کو کھدائی کرتے دیکھا تھا مگر یہ دیکھ کر اسے بہت حیرت ہوئی تھی کہ وہاں پر کوئی بھی موجود نہیں تھا ''مگر یہ آوازیں۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے چاروں طرف دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگی کہ آوازیں کس سمت سے سنائی دے رہی تھیں تبھی اچانک سرنگ میں روشنی چمکی اور پھر سے سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا لیکن وہ روشنی کسی لیمپ یا بیٹری وغیرہ کی نہیں تھی بلکہ وہ ایسی روشنی تھی جیسے کسی مشعل کے جلنے سے پیدا ہوتی ہے جیسی قدیم وقتوں میں بادشاہ اور اُمراء روشنی کے لیے استعمال کرتے تھے۔

''اوہ تو وہ لوگ اندر ہیں اور کام کر رہے ہیں'' ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی ایک لڑکی سرنگ کے دہانے پر کھڑی دکھائی دینے لگی جیسے ہی اس کی نظر آمنہ پر پڑی وہ مسکرائی اور اس کی طرف آنے لگی۔

آمنہ خاموشی سے کھڑی اس لڑکی کو اپنے پاس آتے ہوئے دیکھتی رہی۔ چاند کی روشنی میں لڑکی کی گوری رنگت خوب چمک رہی تھی۔ ''ہائے میں لزا ہوں اور آپ؟'' وہ لڑکی دایاں ہاتھ آمنہ کی طرف بڑھاتے ہوئے خوشگوار لہجے میں اس سے مخاطب ہوئی۔

''میں آمنہ کراچی سے، مطلب پاکستان سے'' اس نے خود ہی وضاحت کر دی۔

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر لیکن اس ویرانے میں اس وقت تنہا کیوں گھوم رہی ہیں آپ؟'' لڑکی بڑے اپنائیت بھرے لہجے میں پوچھنے لگی جس پر آمنہ نے اسے وہاں پہنچنے تک کی ساری کہانی سناڈالی۔

''آپ لوگ اس وقت بھی یہاں کام کر رہے ہیں؟'' آمنہ نے بھی بات کرنے کی غرض سے سوال کر ڈالا۔

''دن ہو رات ہو کوئی بھی وقت ہو ہم نے تو ہمیشہ ہمیشہ یہیں رہنا ہے'' لڑکی عجیب سے انداز میں ہنسی۔

''کیا مطلب آپ لوگ مصر سے ہیں؟ میں تو سمجھی آپ لوگ یورپ سے ہیں مگر آپ کے چہرے کے نقوش تو مصریوں جیسے ہی ہیں'' چاند کی روشنی میں لزا کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے آمنہ نے کہا تو اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کی بجائے لزا ایک بار پھر ہنس دی۔

''تم میرے ساتھ چلو گی؟'' لزا ایک لمحے میں آپ سے تم پر اتر آئی لیکن اس کے انداز میں اتنی اپنائیت تھی کہ اس کا تم کہہ کر مخاطب کرنا بھی آمنہ کو بالکل بُرا نہیں لگا۔

''کہاں؟'' آمنہ نے بے ساختہ پوچھا۔

''جہاں بھی میں لے جاؤں، ہاں اتنا وعدہ ہے کہ بہت کمال کی چیزیں دکھاؤں گی تمہیں'' لزا نے جیسے لالچ دیا، آمنہ نے کچھ ہچکچاتے ہوئے اپنے پیچھے

اس طرف دیکھا جہاں ان لوگوں کے خیمے لگے ہوئے تھے آمنہ اور خیموں کے درمیان میں آنے والے اونچے ٹیلے نے خیموں کو اس کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔

''تم اہرام مصر دیکھنے آئی ہو اور وہ جس طرح میں تمہیں دکھا سکتی ہوں کوئی نہیں دکھا سکتا'' آمنہ کو پیچھے دیکھتے دیکھ کر وہ اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اسے قائل کرتے ہوئے مزید کہا۔

''آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے انسان ہی تو ہیں کون سا مجھے کھا جائیں گے'' عدنان کی تمام ہدایات کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ لزا کے ساتھ چل پڑی۔ لزا کا رخ اسی طرف تھا جہاں کچھ دیر پہلے آمنہ نے روشنی دیکھی تھی۔

جیسے ہی وہ دونوں اس جگہ پر پہنچیں اچانک کئی مشعلیں ایک ساتھ جل اٹھیں اندھیرے میں ہونے والی اس اچانک تیز روشنی نے آمنہ کی آنکھوں کو چندھیا دیا۔ کچھ لمحوں تک تو وہ کچھ دیکھ ہی نہیں سکی اور جب وہ دیکھنے کے قابل ہوئی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی...... اس کے سامنے مٹی دھول سے بھری سرنگ کی بجائے ایک خوبصورت راہداری جیسی جگہ تھی جو بہت خوبصورتی سے سجی ہوئی تھی دیواروں پر جگہ جگہ مشعلیں لگی ہوئی تھیں اور صرف اتنا ہی نہیں وہاں دو لوگ تلواریں نیام میں ڈالے مستعد انداز میں کھڑے تھے ان کے چہروں پر سختی اور بے خوفی جھلکتی تھی۔ آمنہ جیسے کسی ٹرانس میں آگئی تھی۔ وہ بولنا چاہتی تھی۔ بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر اس سے کچھ بھی بولا نہیں جا رہا تھا وہ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ خوفزدہ بھی تھی۔

''اندر چلو'' لزا نے اس بار حکمیہ انداز میں اس سے کہا تھا اور اس میں حکم عدولی کی طاقت اور ہمت نہیں تھی۔ اس نے لزا کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔ ان کے آگے بڑھتے ہی دونوں مردوں کے جسموں میں حرکت ہوئی انہوں نے خاص انداز سے گردن کو خم دے کر ان کا استقبال کیا اور پھر سے پہلی والی پوزیشن میں آگئے۔ ایک دو موڑ مڑنے کے بعد وہ ایک ہال نما جگہ کے سامنے جا کر رکے۔

''سنو لڑکی! اندر ہمارے آقا ہیں۔ اندر جاتے ہی انہیں سجدہ کرنا۔''

''میں کسی انسان کو سجدہ نہیں کر سکتی۔ میں مسلمان ہوں'' آمنہ کی خاموشی یکدم ٹوٹی تھی۔ اس کی بات پر لزا نے بڑی خونخوار نظروں سے اسے دیکھا اور بولی۔

''جیسا میں کہہ رہی ہوں ویسا ہی کرنا اگر زندہ رہنا چاہتی ہے تو ورنہ۔'' لزا نے بات ادھوری چھوڑ دی لیکن اس کا لہجہ اس قدر سرد اور بے رحم تھا کہ آمنہ خوف سے جھرجھری لے کر رہ گئی۔

''آؤ!'' لزا نے ایک بار پھر حکمیہ انداز میں کہا اور ہال میں داخل ہوگئی۔ ہال کیا تھا گویا کسی دربار کا سیٹ لگا ہوا تھا۔ انتہائی خوبصورتی سے سجا ہوا کمرہ تھا وہ، بیش قیمت ہیرے جواہرات دیواروں پر آویزاں تھے۔ کئی لوگ دائیں بائیں قطار میں سر جھکائے بیٹھے تھے اور سامنے تخت تھا جس پر ایک بڑی عمر کا مرد براجمان تھا۔ اس کا لباس بہت شاہانہ تھا، گلے میں موتیوں کی لڑیاں اور انگلیوں میں قیمتی نگینوں سے سجی انگوٹھیاں پہنے وہ ان دونوں کی طرف ہی متوجہ تھا۔

لزا ہال میں داخل ہوتے ہی سجدے میں گر گئی تھی جبکہ وہ حیران پریشان ارد گرد دیکھ رہی تھی تبھی لزا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس انداز میں جھٹکا دیا کہ وہ بے اختیار گھٹنوں پر گر گئی وہ اس افتاد کے لیے ہرگز تیار نہ تھی اسی لیے اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔

''نظریں نیچی رکھو اور سجدہ کرو'' لزا کی غراتی ہوئی سرگوشی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی مگر وہ بے حس و حرکت اسی انداز میں بیٹھی سامنے تخت پر بیٹھے شخص کو گھورتی رہی اس نے فرعونوں کے بارے میں کئی کتابیں پڑھ رکھی تھیں اور اس وقت اسے یہی لگ رہا تھا جیسے وہ سالوں پیچھے کسی فرعون کے دربار میں پہنچ گئی تھی۔

''گستاخ لڑکی تمہیں ہمارے دربار میں آنے کی تمیز نہیں'' تخت پر بیٹھے شخص نے سخت جلالی لہجے میں کہا۔ بے اختیار آمنہ کی نگاہیں جھک گئیں۔

''اس لڑکی کو دربار میں پیش ہونے کے آداب سکھاؤ اور اس گستاخی کے لیے اسے پانچ کوڑے لگائے جائیں'' اس نے شاہانہ لہجے میں حکم دیا۔ لزا جو

اب سجدے سے اٹھ بیٹھی تھی۔ لیکن ابھی تک سر جھکائے گھٹنوں پر بیٹھی تھی اس حکم کے ملتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی لیکن اس کی نظریں اور سر ابھی تک جھکا ہوا تھا۔

''جو آپ کا حکم!'' اس نے سر کو ہلکے سے خم کرتے ہوئے انتہائی ادب سے کہا اور بت بنی آمنہ کا ہاتھ تخت سے تھامتے ہوئے تخت کی طرف پیٹھ کیے بنا پیچھے کی طرف چلتے ہوئے ہال سے باہر نکل آئی۔

''تم کون ہو یہ سب کیا ہے؟ کیا یہاں کسی ڈرامے کی شوٹنگ چل رہی ہے؟'' آمنہ کے پوچھنے پر لزا پھر سے قہقہہ لگا کے ہنس پڑی۔

''بیوقوف لڑکی تمہیں اب تک یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ تم کہاں ہو؟ تم فرعون کے دربار سے ہو کر آئی ہو اور اب قید خانے میں جا رہی ہو، جہاں تمہیں سزا دی جائے گی'' لزا کی بات سن کر آمنہ بے حد گھبرا گئی۔

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی پلیز مجھے جانے دو۔'' آمنہ اب رونے لگی تھی۔ اتنے میں ایک لحیم شحیم شخص ان کے قریب آیا اور آمنہ کو کھینچتا ہوا ایک طرف بڑھنے لگا، آمنہ مسلسل چلاتے ہوئے خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کی کوئی کوشش کامیاب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس شخص کے مقابلے میں وہ ایسے تھی جیسے کوئی چھوٹی سی گڑیا۔

جس جگہ وہ پہنچے وہ کوئی قید خانہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ اس شخص نے آمنہ کو ایک بڑے سے پتھر پر پیٹ کے بل لٹا دیا اور اس کے بازوؤں اور پیروں کو زنجیروں کی مدد سے پتھر سے باندھ دیا۔ اس دوران آمنہ مسلسل روتی اور چلاتی رہی لیکن اس کی کسی بات کا اس شخص پر کوئی اثر نہیں ہوا، وہ اس طرح سارے کام کر رہا تھا جیسے کوئی روبوٹ ہو۔ اس کے بعد اس نے ایک کوڑا اٹھایا اور اسے جانچنے لگا۔ کوڑے کو دیکھ کر آمنہ کے خوف میں مزید اضافہ ہو گیا وہ اور زور سے چلا کر رحم کی درخواست کرنے لگی۔ اس شخص نے اس کی پیٹھ پر کوڑے مارنا شروع کیے درد اور تکلیف کی اذیت سے آمنہ کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔

دوسرے ہی کوڑے پر وہ بے ہوش ہو گئی لیکن وہ شخص اس پر توجہ دیے بنا اپنے کام میں لگا رہا۔ اس کے بعد اس نے زنجیریں کھول دیں اور کمرے سے چلا گیا۔

☆......☆......☆

آمنہ کو ہوش آیا تو وہ ابھی تک اوندھے منہ اس پتھر پر پڑی تھی۔ اس نے سیدھا ہونے کی کوشش کی تو تکلیف کی شدت سے اس کی چیخ نکل گئی۔ اس کی کمر بری طرح زخمی تھی بہت آہستہ آہستہ وہ اٹھ کر بیٹھنے میں کامیاب ہوئی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی اسے سب کچھ یاد آ رہا تھا لیکن ابھی تک یہ سب اسے کوئی بھیانک خواب لگ رہا تھا۔ صرف کمر میں ہونے والی تکلیف اسے اس سب کے حقیقت ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔ اس کے کپڑے کوڑوں کی ضرب سے چیتھڑوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ چل نہ سکی اور وہیں فرش پر گر گئی۔ دوبارہ کھڑے ہونے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد وہ ہاتھ اور پیروں کی مدد سے سرک کر آگے بڑھنے لگی۔ کمرے سے باہر آ کر اس نے اندازے سے اس سمت میں بڑھنا شروع کیا جس راستے سے وہ اس جگہ داخل ہوئی تھی۔ اب وہاں ہر طرف صرف اندھیرا تھا کمر کی تکلیف کی وجہ سے اسے آگے بڑھنے میں مشکل پیش آ رہی تھی لیکن پھر بھی وہ بڑھتی رہی تبھی اسے دور روشنی دکھائی دی۔ کوئی مشعل ہاتھ میں اٹھائے اس کی طرف چلا آ رہا تھا پکڑے جانے کے خوف سے آمنہ ایک طرف دبک کر بیٹھ گئی لیکن روشنی قریب ہوتی چلی گئی جیسے جیسے روشنی قریب آ رہی تھی مشعل اٹھانے والے کے خدوخال واضح ہوتے جا رہے تھے اور جونہی وہ شخص پوری طرح روشنی کے دائرے میں آیا آمنہ خوف سے جامد ہو کر رہ گئی۔ مشعل اٹھانے والا انسان کوئی گوشت پوست سے بنا انسان نہیں تھا بلکہ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ وہ آمنہ کی طرف توجہ دیے بنا آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس کے آگے گزرنے کے بعد آمنہ کو کچھ ہوش آیا اور وہ پہلے سے زیادہ تیزی سے آگے کی طرف بڑھنے لگی لیکن وہاں کہیں بھی کوئی روشنی دکھائی نہیں دے رہی تھی نہ ہی کوئی ایسا راستہ

جہاں سے باہر جایا جا سکتا۔ اب اسے گھٹن کا احساس ہو رہا تھا جو کہ وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔
''مجھے کسی بھی طرح اس جگہ سے باہر نکلنا ہے ''اس نے خود سے کہا اور دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھنے لگی، دو چار قدم چلنے کے بعد ہی وہ کسی چیز سے ٹکرائی اور گر پڑی وہ ہاتھوں سے ٹٹول کر محسوس کرنے لگی کہ وہ کس چیز سے ٹکرائی ہے۔ وہ کوئی بڑا سا باکس تھا جس نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔ اس نے دوبارہ اس پر ہاتھ پھیرا تا کہ اندازہ کر سکے کہ وہ کتنا چوڑا ہے۔ ہاتھ پھیرتے ہوئے کسی خیال سے اس کے دل میں خوف پیدا ہونے لگا۔
''تابوت۔ کیا یہ کوئی تابوت ہے؟'' آمنہ نے خود سے سوال کیا اس سے پہلے کہ وہ اس بارے میں کچھ اور سوچتی اسے لزا کی آواز سنائی دی۔
''تم یہاں سے نہیں جا سکتی ہو کبھی نہیں۔ تمہیں یہیں مرنا ہوگا۔'' دیکھے بنا بھی آمنہ بتا سکتی تھی کہ وہ لزا کی آواز تھی۔ آمنہ نے آواز کی سمت دیکھا اسے لزا کی جگہ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ دکھائی دیا۔ آنکھوں کی جگہ دو گڑھے اسے مزید خوفناک بنا رہے تھے۔ وہاں کوئی مشعل نہ تھی مگر نہ جانے کہاں سے آنے والی روشنی میں آمنہ کو ارد گرد کی ہر چیز بالکل واضح دکھائی دینے لگی تھی۔ اس ڈھانچے میں حرکت ہوئی اور اس نے ایک قدم آمنہ کی طرف بڑھایا۔ آمنہ چیخ مار کر پیچھے ہٹی اور باکس سے ٹکرا کر وہیں گر پڑی۔ وہ واقعی کوئی تابوت تھا جس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی، آمنہ سے کچھ فاصلے پر آ کر وہ ڈھانچہ رک گیا۔
''پلیز مجھے جانے دو میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں مر جاؤں گی یہاں'' آمنہ نے روتے ہوئے ڈھانچے سے التجا کی۔
''تو مر جاؤ، تم بھی مر جاؤ جیسے میں مری تھی۔ کیا مجھے کسی نے بچایا تھا؟ معلوم ہے کتنا چیخی تھی میں۔ کتنا روئی تھی کتنی تکلیف سے میری جان نکلی تھی۔ جانتی ہو تم؟ تم کیسے جان سکتی ہو مگر آج تم سب جان جاؤ گی، سب کچھ جو میرے ساتھ ہوا'' ڈھانچہ جہاں کھڑا تھا وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ آمنہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی اب اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ چلا سکتی۔
''بہت خوبصورت تھی میں۔ سب سے خوبصورت اور چہیتی کنیز'' اس کی آواز میں فخر اور غرور جھلکنے لگا آمنہ خاموشی سے اسے سن رہی تھی۔
''سب کچھ تھا میرے پاس۔ ایک اشارے پر دنیا کی ہر نعمت میرے سامنے حاضر کر دی جاتی تھی مگر پھر۔'' وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی اور جب اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا تو اس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش محسوس ہونے لگی۔
''پھر میرا مالک! میرا خدا فرعون گہری نیند سو گیا۔ نہ جانے کب تک کے لیے اس کے لیے اہرام پہلے سے تیار تھا۔ اسے دوبارہ اٹھنا تھا اس لیے سب ساز و سامان کے ساتھ کئی غلاموں کو بھی اس کے ساتھ دفن کر دیا گیا اور میں۔'' لزا سسکنے لگی ''میں اس کی چہیتی کنیز مجھے تو اس کے ساتھ ہی رہنا تھا ہمیشہ ہمیشہ، سب کے ساتھ مجھے بھی زندہ دفن کر دیا گیا اور یہ دیکھو میری طرف کیا حال ہوا میرے خوبصورت جسم کا'' لزا نے اپنی طرف اشارہ کیا اور پھر بولنے لگی۔
''ایک ایک لمحہ قیامت تھا۔ جانے کتنا عرصہ بیت گیا ہے اور ہم اب تک یہاں ہیں ہمیں باہر جانا ہے پھر سے اپنی دنیا بسانی ہے مگر ہم ایسا نہیں کر سکتے بس ہم یہیں رہتے ہیں اور جو کوئی لڑکی اس طرف آتی ہے میں اسے بھی اسی طرح مارتی ہوں جیسے میں مری تھی سسک سسک کر'' وہ اب بے دردی سے بول رہی تھی۔
''دیکھو تمہارے ساتھ جو ہوا بُرا ہوا لیکن اس سب میں میرا کوئی قصور نہیں۔ پلیز مجھے جانے دو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے باہر جانے دو'' آمنہ تڑپ تڑپ کر رونے لگی مگر لزا جیسے اس کی کوئی بات سن ہی نہیں رہی تھی۔
''تو میرا کیا قصور تھا؟ تم ہی بتاؤ کیا میں اس قابل تھی کہ میرے ساتھ یہ سب ہوتا'' لزا اور کچھ نہیں کہہ پائی اور فضا میں اس کی سسکیوں کی آواز گونجنے لگی۔
''تمہارا قصور تھا۔ تم نے ایک انسان کو خدا مانا

تھا۔ اس سے بڑا قصور اور کیا ہو سکتا ہے بھلا'' موت کو سامنے دیکھ کر آمنہ جیسے بے خوف ہو گئی تھی اور اب تیز لہجے میں لزا کو اس کا قصور بتا رہی تھی۔

''چپ ہو جاؤ۔ میرے خدا کے بارے میں اب کچھ مت بولنا، ورنہ تمہیں پہلے سے بڑھ کر سزا دی جائے گی۔ سمجھیں تم'' لزا غصے سے چلا کر بولی ''مرو یہیں'' یہ کہتے ہوئے وہ وہاں سے جانے لگی۔ آمنہ نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی وہ جگہ ایک بار پھر اندھیرے میں ڈوب گئی۔

''اے میرے مالک میری مدد فرما! میں گواہی دیتی ہوں کہ تُو واحد ہے اور تیرا کوئی شریک نہیں، مجھے اس قید سے رہائی دلا مالک'' آمنہ سجدے میں گری خدا کو پکارنے لگی اور پھر جانے کب دم گھٹنے کی وجہ سے اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔

☆......☆......☆

''مجھے لگتا ہے اسے ہوش آ رہا ہے'' یہ عدنان تھا جو کسی سے کہہ رہا تھا۔ آمنہ آنکھیں کھول کر بے یقینی سے اپنے پاس موجود عدنان، علی اور فائزہ کو دیکھنے لگی جو پریشان چہروں کے ساتھ اسے دیکھ رہے تھے۔

''اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو امی'' عدنان نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔

''مجھے کیا ہوا تھا؟'' آمنہ نے پوچھا تو عدنان اسے بتانے لگا۔

''صبح میں جاگا تو تمہیں تیز بخار تھا اور تم بے ہوش تھیں۔ تمہارے ماتھے پر پانی کی پٹیاں رکھیں اور انجیکشن لگایا تب جا کے دو گھنٹوں بعد تم نے آنکھیں کھولی ہیں۔ شاید رات میں تمہیں کسی کیڑے نے کاٹ لیا تھا۔ تبھی تمہاری یہ حالت ہوئی مگر تم فکر مت کرو ہم کچھ ہی دیر میں یہاں سے روانہ ہو جائیں گے اور آئندہ کبھی کوئی ایسا ایڈوینچر نہیں کروں گا۔ مجھے معاف کر دو پلیز'' عدنان جانے کیا کیا کہے جا رہا تھا مگر آمنہ کے ذہن میں صرف ایک ہی سوال بار بار ابھر رہا تھا۔

''تو کیا وہ سب خواب تھا؟؟'' عدنان بھائی آپ لوگ باہر جائیں میں بھابی کا منہ ہاتھ دھلا کر انہیں کپڑے بدلوا دوں۔ دیکھیں تو کتنے خراب ہو رہے ہیں شاید بھابی رات خوب گھومی ہیں باہر اور وہیں انہیں کسی چیز نے کاٹ لیا'' فائزہ کے کہنے پر عدنان اور علی اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر چلے گئے۔ فائزہ کی بات سن کر آمنہ نے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی وہ خراب نہیں بلکہ بہت زیادہ خراب ہو رہے تھے۔

''اگر وہ سب خواب تھا تو میرے کپڑوں کو کیا ہوا؟'' وہ الجھنے لگی۔

''یہ لیں بھابی ہاتھ منہ دھو لیں پلیز۔ ہوٹل چل کر نہا لیجیے گا'' فائزہ کے کہنے پر وہ خاموشی سے ہاتھ منہ دھونے لگی اور پھر فائزہ نے اسے اس کے کپڑے نکال کر دیے۔ جسم کو حرکت دینے پر آمنہ کو جسم میں بہت زیادہ درد محسوس ہوا جسے اس نے برداشت کر لیا لیکن کمر پر ہونے والی تکلیف ناقابلِ برداشت تھی تبھی ہونٹ بھینچنے کے باوجود آمنہ کے ہونٹوں سے سسکاری نکل گئی۔

''کیا ہوا بھابی آپ ٹھیک تو ہیں نا'' فائزہ جو دوسری طرف منہ کیے کھڑی تھی گھبرا کر پوچھنے لگی۔

''ہاں ٹھیک ہوں۔ میری کمر میں بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ ذرا دیکھو پلیز کیا ہوا ہے؟'' آمنہ کپڑے بدل چکی تھی فائزہ نے اس کی کمر پر سے قمیض کو تھوڑا سا اوپر سرکا کر دیکھا تو گھبرا گئی۔

''بھابی یہ کیا ہوا آپ کی کمر پر تو لمبے لمبے زخم ہو رہے ہیں یوں جیسے۔'' وہ کہتے کہتے رکی جیسے زخموں کی نوعیت بتانے کے لیے الفاظ سوچ رہی ہو۔

''جیسے کسی نے میری کمر پر کوڑے مارے ہوں؟؟'' آمنہ نے بے ساختہ اس کی بات مکمل کی۔

''اوہ ہاں بالکل ایسے ہی، مجھے لگتا ہے آپ کو بہت زہریلے کیڑے نے کاٹا ہے۔ ہمیں فوراً ہوسپٹل جانا چاہیے میں عدنان بھائی کو بلاتی ہوں۔'' فائزہ گھبرائے ہوئے لہجے میں کہتی باہر نکل گئی۔

''تو وہ خواب نہیں سچ تھا تو میں وہاں سے باہر کیسے آئی؟؟ میں اپنے خیمے تک کیسے پہنچی؟؟'' یہ اور اسی طرح کے سوال آمنہ کے ذہن میں سر اٹھا رہے تھے لیکن یہ وہ سوال تھے جن کا جواب اسے کبھی بھی کوئی بھی نہیں دے سکتا تھا۔

☆☆......☆☆

بھوت ٹرین



ممتاز احمد

اُس مسافر کا قصہ عجب، جسے بھوتوں کا باراتی بن کر بھوت ٹرین میں سفر کرنا پڑ گیا تھا



کچھ عرصہ پہلے مجھے ایک کام کے سلسلے میں اپنے شہر سے کافی دور ایک دوسرے شہر جانا پڑا۔ جہاں جانا تھا اُس کی مسافت ہمارے شہر سے سولہ گھنٹے کی تھی۔ چنانچہ میں نے ریل گاڑی کو سفر کا ذریعہ بنایا۔ کام سے فراغت میں تین دن لگ گئے چنانچہ اپنے کام نمٹا کر میں نے واپسی کے لیے رختِ سفر باندھا اور ریلوے اسٹیشن پر آ گیا اور ٹکٹ لے کر پلیٹ فارم پر ایک خالی بنچ پر بیٹھ گیا۔ ٹرین کے آنے میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ پڑا تھا۔ اسی اثناء میں ریلوے اسٹیشن کی مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز بلند ہوئی تو میں نے فوراً مسجد کا رُخ کیا۔ وضو کر کے باجماعت نماز ادا کی۔ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں سجدہ ریزی کے بعد تسبیحات، ذکر اذکار اور اپنے مرشد سرکار کے بتائے ہوئے وظائف پورے کرنے کے بعد دوبارہ پلیٹ فارم پر آ کر بیٹھ گیا۔

میرا شروع سے ہی ایک معمول ہے وہ یہ کہ میں ہمیشہ گھر سے باہر جانے سے پہلے آیت الکرسی کی تلاوت کرتا ہوں اور پھر گھر سے باہر جانے کی دعا پڑھ کر باہر نکلتا ہوں۔ یہ اسی معمول کی برکت ہے کہ اللہ کریم نے ہمیشہ مجھے حادثات سے محفوظ رکھا ہے۔

اس پلیٹ فارم پر رش کچھ زیادہ تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا پلیٹ فارم پر ایک مریل سا بلب روشن تھا جس کی برائے نام روشنی تھی۔ میری بائیں جانب پچاس یا ساٹھ کے قریب مرد و زن پلیٹ فارم پر بیٹھے تھے۔ جن کے لمبے لمبے قد تھے اور وہ سب چوغے پہنے ہوئے تھے، جن کی وجہ سے اُن کے چہروں کی نین نقش واضح نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ آپس میں دھیمے لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ اُن کی آوازیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے مشابہہ تھیں۔ اُن لوگوں کی نقل و حرکت سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ کسی شادی کی تقریب میں جا رہے ہیں۔

کچھ دیر کے بعد ٹرین آ گئی مگر اُس میں سے کوئی بھی مسافر نیچے نہیں اُترا وجہ یہ تھی کہ پوری ٹرین خالی تھی اور ٹرین کی صرف ایک ہی لمبی اور بڑی سی بوگی تھی چنانچہ اُن ہی کے ساتھ میں بھی ٹرین میں سوار ہو گیا اور ایک سنگل سیٹ پر بیٹھ گیا۔

جیسے ہی سب لوگ سوار ہوئے ٹرین چل پڑی۔ پہلے تو ٹرین سُست رفتار سے چلتی رہی اور پھر ایک دم اُس نے رفتار پکڑ لی اور اتنی تیز رفتاری سے چلنے لگی جس طرح ہوائی جہاز فضا میں اُڑنے سے پہلے رن وے پر دوڑتا ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے یوں محسوس ہوا جیسے ٹرین زمین سے اوپر کی طرف اُٹھ رہی ہے اور چند لمحوں کے بعد ٹرین جہاز کی طرح فضا میں اڑنے لگی اور ٹرین کا ریلوے لائن پر چلنے کا شور بھی ختم ہو گیا۔ ٹرین فضا میں بلند ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے بڑا عجیب سا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا میں جیسے جہاز میں بیٹھا ہوں۔ مجھے کچھ خوف اور گھبراہٹ محسوس ہوئی تو میں نے درود شریف کا ورد شروع کر دیا اور اپنا دھیان ہٹانے کے لیے باہر دیکھنے لگا مگر سوائے گھپ اندھیرے کے مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ٹرین انتہائی تیز رفتاری سے اُڑ رہی تھی مگر کوئی شور نہ تھا اور نہ ہی بوگی کی کھڑکیوں سے تیز ہوا اندر آ رہی تھی اور دوسری حیرانگی کی بات یہ تھی کہ ٹرین میں سوار تمام افراد مجھے یکسر نظر انداز کیے ہوئے تھے۔

درود پاک کی تلاوت سے مجھے بے حد سکون محسوس ہوا اور سارا ڈر خوف گھبراہٹ ختم ہو گئی۔ ٹرین اسی طرح فضا میں اڑتی رہی اور تین گھنٹے محوِ پرواز رہی اور پھر ٹرین آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی اور ایک دم ٹرین کے پہیوں کا شور آنا شروع ہو گیا۔ چند منٹ کے بعد ٹرین ایک اسٹیشن پر رُک گئی۔ میں بھی اُن لوگوں کے ساتھ نیچے اُترا تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا کہ یہاں دن تھا اور سورج نکلا ہوا تھا وہ سب لوگ ایک جانب چل پڑے تو میں بھی اُن کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

کوئی آدھا گھنٹہ چلنے کے بعد ایک مٹیالے رنگ کی ایک بہت بڑی بلڈنگ نظر آئی اور وہ سب اُس میں داخل ہو گئے اور بلڈنگ میں بنے کمروں میں جانے لگے۔ ایک خالی کمرے میں، میں بھی داخل ہو گیا۔ وہاں بڑا شاندار بیڈ پڑا تھا۔ جیسے ہی میں بیڈ پر لیٹا مجھے نیند آ گئی اور میں گہری نیند سو گیا۔

مجھے نہیں معلوم میں کتنی دیر تک سوتا رہا۔ اچانک

کسی نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا۔ جیسے ہی میری آنکھ کھلی تو دیکھا دو بھاری بھرکم عورتیں میرے سامنے کھڑی تھیں تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم بھی بارات کے ساتھ آئے ہو؟''

تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ایک عورت نے کسی کو 'شیاک' کہہ کر آواز دی تو اگلے لمحے ایک بونے قد کا بندہ آ گیا۔ عورت نے اُسے کہا کہ یہ بھی باراتی ہے تو اسے جلدی سے تیار کر کے لے آؤ۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئیں اور اُس بندے نے مجھے ایک چمکدار چوغا پہنا دیا اور سر پر بڑی سی پگڑی باندھ دی اور مجھے اپنے ساتھ لے کر ایک باغ میں آ گیا جہاں بہت چہل پہل تھی اور فرش پر قالین بچھے ہوئے تھے۔ جن پر انواع اقسام کے کھانے لگائے جا رہے تھے۔ بڑی بڑی طشتریوں میں عجیب قسم کے کھانے تھے اور اُن کھانوں سے سڑاند اور ھمک آ رہی تھی۔ کچھ پھل بھی پڑے تھے۔

جب کھانا لگ چکا تو سب کھانے میں مشغول ہو گئے مگر میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کیونکہ اُن کھانوں سے اٹھنے والی سڑاند اور ھمک سے مجھے متلی ہو رہی تھی۔ میں نے ایک دو پھل کھائے جن کا ذائقہ کڑوا کسیلا اور ترش تھا۔ میں خاموشی سے بیٹھا رہا۔ جب کھانا ختم ہو گیا تو تمام طشتریاں اور برتن اُٹھا لیے گئے پھر آواز آئی کہ اب گانہ (شادی کے موقع پر پنجاب کی ایک رسم) باندھنے کی رسم ہو گی چنانچہ اُن کی عورتیں تمام مردوں کی کلائی پر چمڑے کا بنا پھول جو کہ ایک ڈوری کے ساتھ منسلک تھا وہ باندھنے لگیں۔ میرے بھی بائیں بازو کی کلائی پر ایک گانہ باندھ دیا گیا۔ پھر شور بلند ہوا کہ اب رخصتی ہو گی اور ساتھ ہی ایک بڑی سی ڈولی میں دلہن کو بٹھا دیا گیا جسے دو آدمیوں نے اپنے کاندھوں پر رکھ لیا۔ پھر سب مرد عورتیں کوئی عجیب سا گیت گانے لگیں اور سب لوگ اُسی راستے پر واپس چل پڑے جہاں سے آئے تھے۔ میں بھی اُن کے پیچھے چل پڑا۔

کوئی آدھا گھنٹہ چلنے کے بعد وہی ریلوے اسٹیشن آ گیا جہاں سے ہم ٹرین سے اُتر کر آئے تھے۔

پلیٹ فارم پر ٹرین کھڑی تھی اُن لوگوں کے ساتھ میں بھی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ جیسے ہی سب لوگ سوار ہوئے اگلے لمحے ٹرین چل پڑی، جیسے انہی کے انتظار میں رُکی ہوئی تھی۔ ٹرین چلتے چلتے پہلے کی طرح زمین سے فضا میں اڑنے لگی۔

☆......☆......☆

جب آئے تھے تو یہ سب لوگ آرام سے سفر کرتے رہے مگر اب ایک دھما چوکڑی شروع ہو گئی۔ سب مرد اور عورتیں ناچنے لگے اور اونچی اونچی آواز میں کوئی گیت گانے لگے۔ وہ کون سی زبان تھی۔ کیا گا رہے تھے۔ کیا بول رہے تھے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کافی دیر تک وہ ہلہ گلہ کرتے رہے اور میں ٹرین کے ڈبے کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھا رہا۔

پھر وہ سب ایک دم خاموش ہو گئے اور اعلان ہوا کہ اب دُلہن اپنے ہاتھ سے تمام مردوں کو مٹھائی کھلائے گی اور دولہا سب عورتوں کو مٹھائی کھلائے گا۔ سب لوگ آمنے سامنے ترتیب سے بیٹھ گئے۔ ایک جانب عورتوں کی قطار بن گئی اور دوسری طرف مرد بیٹھ گئے۔ دولہا اور دلہن اپنی اپنی جگہ سے اٹھے اور دونوں نے ایک ایک تھال مٹھائی کا اٹھا لیا۔ دولہا عورتوں کی طرف چلا گیا اور دلہن مردوں کی طرف آ گئی۔ دلہن جیسے ہی کسی مرد کے پاس آتی وہ منہ کھولتا اور دلہن مٹھائی کا ٹکڑا اُس کے منہ میں ڈال دیتا اسی طرح دولہا عورتوں کو مٹھائی کھلانے لگا۔ میں مردوں والی لائن کے آخر میں بیٹھا تھا جیسے ہی دلہن میرے قریب آئی اور اُس نے اپنے ہاتھ میں مٹھائی کا ٹکڑا میرے منہ میں ڈالنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو میری نظر اُس کے چہرے پر پڑی وہ ایک انتہائی بدصورت اور کریہہ شکل کی عورت لگی اُس کی آنکھوں کی جگہ پر ایسے لگ رہا تھا جیسے دو دہکتے انگارے جل رہے ہوں۔ اُس کے نتھنوں سے شوں شوں کی آواز کے ساتھ ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا۔ اُس کا منہ کھلا ہوا تھا اور لمبے لمبے کالے سیاہ دانت نظر آ رہے تھے۔ میں اُس کے چہرے کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ اُس کے ہاتھ کی انگلی میرے گال پر ہلکی سی ٹکرائی۔ مجھے ایسا لگا جیسے سخت گرم

موت کی یاددہانی

ایک شخص کی حضرت عزرائیل علیہ السلام کے ساتھ دوستی تھی۔ ایک دن وہ آدمی کہنے لگا کہ یار تمہارے ساتھ دوستی ہے کبھی اس دوستی کا حق بھی ادا کرو گے۔'' عزرائیل علیہ السلام کہنے لگے۔ جیسا کہو دوست جو ہو۔'' وہ شخص کہنے لگا۔'' جب میرے جانے کا وقت ہو مجھے بتا دینا تاکہ میں تیاری کرلوں۔'' عزرائیلؑ کہنے لگے۔'' بہت اچھا۔'' ایک دن حضرت عزرائیلؑ تشریف لائے اور کہا۔''چلیے۔'' دوست نے کہا ''کدھر چلیں؟'' عزرائیل علیہ السلام نے کہا'' جہاں سب جاتے ہیں۔'' اس شخص نے کہا کہ آپ نے تو میرے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا کہ آپ مطلع کریں گے تاکہ میں اپنی تیاری کرلوں۔'' فرمایا میں نے آپ کو آگاہ کیا تھا لیکن آپ نے سوچا ہی نہیں سمجھا ہی نہیں۔ ایک دن میں ساتھ والے گھر میں آیا تھا۔ ایک دن سامنے والے گھر میں، ایک دن پیچھے والے گھر میں آیا تھا۔ آیا تھا یا نہیں؟'' دوست کہنے لگا آئے تھے۔'' عزرائیل علیہ السلام نے کہا۔'' بس یہی میرا طریقہ ہے۔ میں جب بھی آتا ہوں اسی طرح آتا ہوں۔''

حسنِ انتخاب: سدرہ انور علی۔ جھنگ، صدر

سلاخ کا کونہ چھو گیا ہو۔ میری ایک دم چیخ نکل گئی اور میں تھوڑا پیچھے ہٹ گیا۔ میری چیخ کی آواز سن کر وہ سب میری طرف متوجہ ہو گئے۔ دلہن پیچھے ہٹ گئی تو انہوں نے مجھے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

اُن کی گرفت اتنی سخت تھی ایسا لگتا تھا جیسے ان کے ہاتھ لوہے کے بنے ہوئے ہیں۔ کسی نے کہا کہ اس کو شمورش کے پاس لے چلو۔''

تو وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے ایک بزرگ کے پاس لے گئے جو کہ یقیناً اُس خاندان کا سربراہ ہوگا۔

شمورش نے بہت غصے سے اور گھور گھور کر میری طرف دیکھنا شروع کر دیا اور اپنے ساتھی سے پوچھا کہ یہ آدم زاد کہاں سے آ گیا۔''

تو سب نے کہا کہ پتا نہیں یہ کب اور کیسے یہاں آ گیا ہے۔'' خوف سے میری گھگھی بندھی ہوئی تھی تو شمورش نے حکم صادر کیا کہ اس آدم زاد کو گاڑی سے باہر پھینک دو۔ یہ کہاں سے رنگ میں بھنگ ڈالنے آ گیا ہے۔''

پھر وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے دروازے کی طرف لے گئے۔ اب مجھے اپنی موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ میں نے آیت الکرسی اور درود پاک کا ورد شروع کر دیا۔ انہوں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور چلتی گاڑی جو کہ فضا میں جہاز کی طرح اُڑ رہی تھی سے مجھے باہر پھینک دیا۔

میں تیزی سے نیچے زمین کی طرف گرنے لگا اور ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے۔ میں جوں جوں نیچے کی طرف آ رہا تھا میری ہمت جواب دے رہی تھی پھر اچانک یوں ہوا کہ مجھے ایسا لگا جیسے دو مہربان ہاتھوں نے مجھے تھام لیا ہے اور میں اب ایسے فضا سے زمین کی طرف آ رہا تھا جس طرح خلا باز پیرا شوٹ کے ذریعے زمین پر اترتے ہیں۔ اب میں بڑے آرام سے زمین پر آ رہا تھا جیسے ہی زمین کے نزدیک پہنچا میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا گیا اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆......☆......☆

پتا نہیں کتنی دیر میں نیند یا بے ہوشی میں رہا ہوں گا۔ میری آنکھ اُس وقت کھلی اور ہوش آیا جب ٹرین کے انجن نے تیز ہارن بجایا۔ میں یکلخت بیدار ہو گیا۔ پہلے تو مجھے سمجھ نہیں آئی کہ میں کہاں ہوں مگر چند لمحوں کے بعد مجھے ادراک ہوا کہ میں تو اُسی ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ہوں جہاں سے میں نے اپنے شہر واپس آنا تھا اور نماز مغرب کی ادائیگی کے بعد ٹرین کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

ٹرین نے روانگی کے لیے وسل دیا تو میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور دوڑ کر ٹرین کے ایک ڈبے میں سوار ہوگیا اور ایک خالی سیٹ پر بیٹھ بلکہ ڈھے گیا۔

میرے جسم کا رواں رواں دکھ رہا تھا۔ جوڑ جوڑ سے درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ مجھ سے سیٹ پر بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ میرا پورا جسم بخار سے پھنک رہا تھا۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ گاڑی چل پڑی تھی۔ اگلے اسٹیشن پر گاڑی رُکی تو کچھ مسافر نیچے اترے اور ایک برتھ خالی ہوگئی۔ میں فوراً برتھ پر لیٹ گیا اور گزرے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگا تو میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی کہ میں کن حالات سے گزرا ہوں۔

میں نے آیت الکرسی، دیگر آیات مبارکہ اور درود پاک کا ورد شروع کیا تو مجھے کچھ کچھ سکون محسوس ہوا مگر میرے گال پر جہاں دُلہن کی انگلی ٹکرائی تھی وہاں بہت سخت جلن اور درد ہو رہا تھا۔ جسم پر کوئی سخت گرم لوہا یا کوئی اور چیز لگنے سے جلنے کے بعد جو شدید جلن ہوتی ہے۔

گاڑی ایک اسٹیشن پر رُکی تو پتا چلا کہ یہاں ٹرین کا بیس منٹ کا اسٹاپ ہے۔ میں ہمت کر کے گاڑی سے نیچے اترا اور اسٹیشن کی مسجد میں وضو کر کے نمازِ عشاء ادا کی تو کافی حد تک میری طبیعت میں ٹھہراؤ آ گیا۔ مجھے بھوک بالکل بھی نہیں تھی لہٰذا میں نے پانی کا ایک گلاس پیا اور برتھ پر لیٹ گیا۔ گاڑی کب چلی مجھے نہیں علم کیونکہ برتھ پر لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی تھی۔

اگلی صبح جب میں بیدار ہوا تو میری طبیعت کچھ بہتر تھی مگر گال کی جلن بدستور تھی۔

☆......☆......☆

خدا خدا کر کے جب گاڑی میرے شہر پہنچی تو میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور ریلوے اسٹیشن سے باہر آ کر ایک رکشہ لیا اور اپنے گھر جانے کی بجائے سیدھا اپنے پیر صاحب مرشد سرکار کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلام اور اُن کی قدم بوسی کے بعد کچھ بولنے لگا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور فرمانے لگے مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ تم پر کیا بیتی۔''

پھر فرمانے لگے کہ خوش نصیب ہو جو جنات کے درمیان اتنی دیر رہے اور اُس چڑیل، جو کہ دلہن کے روپ میں تھی سے بال بال بچے۔ اگر تم وہ مٹھائی کھا لیتے تو بس پھر......'' اتنا کہہ کر مرشد خاموش ہو گئے۔

پھر فرمانے لگے کہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے تم جنات کے چنگل سے بحفاظت نکل آئے۔ یہ سب اللہ کے پاک کلام، آیات ربانی اور وظائف کی برکت ہے کہ تمھیں کچھ نہیں ہوا۔''

پھر مرشد پاک نے مجھے دم کیا اور دو تعویذ لکھ کر دیے کہ ایک پانی میں گھول کر پی لو اور دوسرے تعویذ کو نہانے والی بالٹی میں ڈال کر اُس پانی سے نہا لو۔''

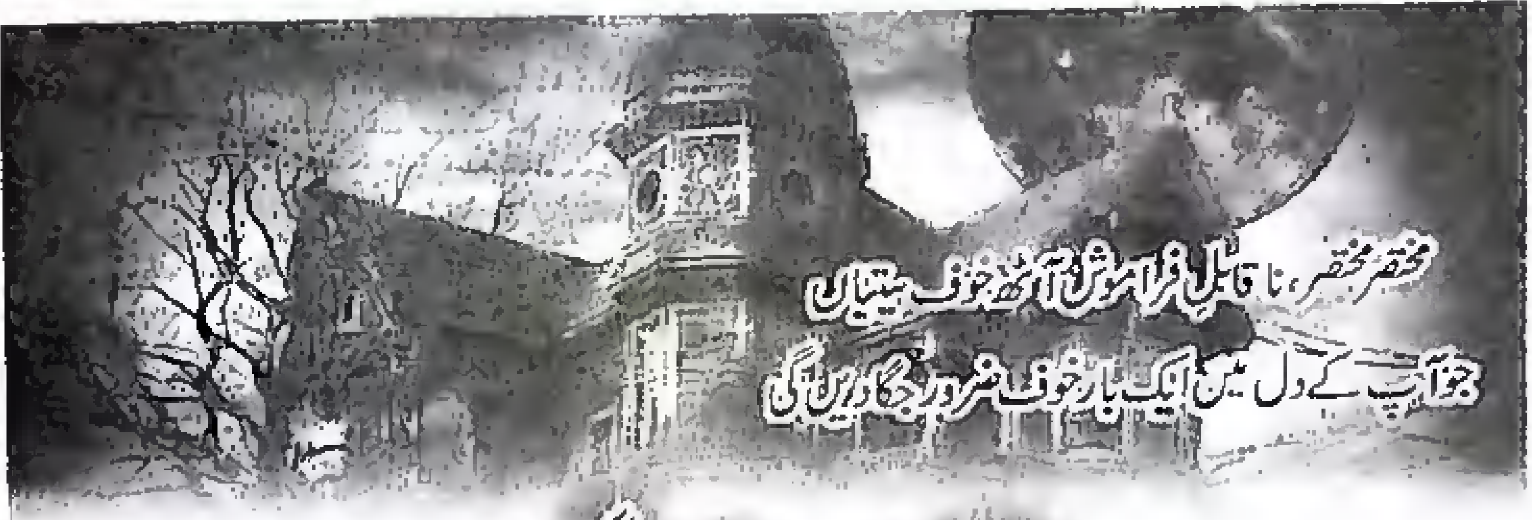
میں نے مرشد سرکار کے آستانے سے لنگر کھایا اور گھر جا کر پہلے تعویذ والا پانی پیا اور پھر پانی والی بالٹی میں دوسرا تعویذ ڈال کر غسل کیا تو میری طبیعت ایک دم ہلکی پھلکی اور فریش ہوگئی۔ گال کی جلن بھی ختم ہوگئی۔ اور ہاں وہ جو گانا میری بائیں کلائی پر باندھا گیا تھا وہ ابھی تک بندھا تھا۔ میں نے وہ کھول کر رکھ دیا جو آج تک میرے پاس ہے۔ مگر میں نے کبھی وہ دوبارہ نہیں باندھا۔

☆......☆......☆

جب میں نے اپنے بیوی بچوں کو یہ واقعہ سنایا تو وہ بالکل بھی یقین نہیں کر رہے تھے۔ سب کی رائے یہی تھی کہ میں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ مگر میں نے جب اُن سب کو وہ چمڑے کا بنا ہوا پھول اور ڈوری دکھائی تو سب حیران پریشان ہو گئے اور بالآخر سب کو یقین کرنا پڑا کہ یہ سب کچھ خواب میں نہیں بلکہ حقیقی طور پر میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہے۔

میں جب بھی کبھی اُس بھوت ٹرین کے سفر کو یاد کرتا ہوں تو تمام واقعات میرے سامنے اس طرح آ جاتے ہیں جیسے سینما اسکرین پر کوئی فلم چل رہی ہو اور خوف سے تھوڑی دیر کے لیے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بھوت ٹرین کا یہ سفر مجھے کبھی بھی نہیں بھولتا۔

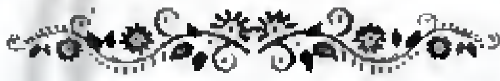
☆☆......☆☆



جنوں والا بنگلہ

محمد اسماعیل بروہی

جنوں والے اس بنگلے کی دہشت آج بھی قائم ہے، یقین نہ آئے تو خود جا کر دیکھ لیں

آج سے تقریباً 20 سال پہلے کی بات ہے کہ ہمارے گاؤں سے شہر جانے والی سڑک کچی تھی۔ کچی سڑک کی وجہ سے آنے جانے کے لیے گاؤں والوں کو بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے سڑک کچی تھی تو آمدورفت کے لیے گاڑیاں بھی نہیں آسکتی تھیں۔ لہٰذا لوگ بیل گاڑی یا تانگے پر شہر جایا کرتے تھے۔ سواری کے لیے زیادہ تر تانگے تھے اور سامان وغیرہ جیسے اناج، کھاد وغیرہ لانا یا شہر لے جانا پڑتا تو بیل گاڑی پر لاتے تھے۔

شفیع بھائی کی بھی ایک بیل گاڑی تھی، جسے چلا کر وہ اپنا گزر بسر کرتے تھے۔ ان کے دو طاقتور اور خوبصورت بیل تھے۔

بڑے زمیندار اپنے اناج وغیرہ ٹریکٹر ٹرالی پر لے جاتے تھے اور چھوٹے زمیندار یا ہاری اپنا اناج شفیع بھائی کی بیل گاڑی پر لے جاتے تھے اور شہر سے کھاد وغیرہ خرید کر شفیع بھائی ہی کی بیل گاڑی پر لاتے تھے۔

شفیع بھائی کی بیل گاڑی پورے گاؤں میں مشہور تھی۔ جس کو جو بھی کام پڑتا تو وہ شفیع بھائی کو کہتا تھا۔ شفیع بھائی دن بھر میں شہر کے دو چکر لگاتے تھے۔ اور شام سے پہلے پہلے گھر آتے تھے۔ وہ شادی شدہ اور تین بچوں کے باپ تھے۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ اُن کی بیوی نیک اور گھریلو عورت تھی۔

بڑی بیٹی تیرہ سال، دوسری دس سال اور بیٹا آٹھ سال کا تھا۔ شفیع بھائی اپنی زندگی میں بہت خوش تھے۔ گزارا اچھا ہوتا تھا، ہر طرح کا سکون ہی سکون تھا۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ اُن کی زندگی میں ہلچل مچ گئی۔

اس سال گندم کا سیزن تھا۔ ہر طرف گندم کی کٹائی ہو رہی تھی۔ اور پھر گندم کی خرید و فروخت بھی شروع ہوگئی۔ ہر کوئی کچھ اناج اپنے لیے اسٹور کرتا اور کچھ اناج شہر بیچ کر اپنی دوسری ضروریات پوری کرتا۔

گاؤں مغرب کے طرف اور شہر مشرق کی طرف تھا اور درمیان میں لمبا اور دھول مٹی اُڑاتا کچا راستہ تھا۔ شہر اور گاؤں کے بیچ میں ایک پرانا بنگلا تھا۔ جو رستے کے ایک طرف، کچھ فاصلے پر درختوں کے جھنڈ کے درمیان میں کھڑا تھا۔ یہ بنگلا آزادی سے پہلے سکھوں کا تھا۔ جسے آزادی کے بعد سکھ چھوڑ گئے اور پھر یہ آباد نہ ہوا۔ بنگلا چار چار کمروں پر مشتمل چار منزلہ تھا۔ یعنی پہلی منزل پر چار چار کمرے دوسری، تیسری اور چوتھی منزل پر بھی چار کمرے تھے۔ جس کے اردگرد حویلی نما دیوار جو کہ گر چکی تھی اور بنگلا اب تک کھڑا تھا۔ جس کے اردگرد بڑے بڑے درخت اور کانٹے دار جھاڑیاں اُگ آئی تھیں۔ جو بھی اس راستے سے گزرتا تو اس دیو نما بنگلے کو دیکھتا تو

خوف سے لرز جاتا تھا۔

وہ بنگلا جنوں والے بنگلے کے نام سے مشہور تھا۔ کیوں کہ مشہور تھا اس میں جنوں کا بسیرا تھا۔ جو بھی قریب سے گزرتا اسے اندر سے باتیں کرنے یا بچوں کے رونے یا ہنسنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ کبھی کبھی گزرنے والوں پر پتھر بھی برستے تھے۔ جن سے بہت سے لوگ زخمی بھی ہوئے تھے۔

کبھی کسی کو درختوں کے قریب اونٹ چرتے نظر آتے۔ کسی کو گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دیتی۔ کچھ لوگ وہاں بچے کھیلتے دیکھتے، کچھ لوگوں نے بنگلے کی

☆......☆......☆

ایک دن شفیع بھائی اپنی مزدوری میں مصروف تھے۔ بیل گاڑی پر اناج کی بوریاں لاتے انہوں نے تیسرا چکر بھی لگالوں۔ تیسرا چکر لگا کر بیل گاڑی سے اناج اُتار کر وہ واپس نکلنا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے جلدی جلدی سامان اپنی چادر میں باندھ کر بیل گاڑی پر رکھا اور بیلوں کو تیزی سے ہانکنا شروع کر دیا۔ جب وہ شہر سے نکلے تھے تو سورج غروب ہو گیا تھا۔ اب شفیع بھائی کے دل میں خوف جاگا تھا۔

جب وہ شہر سے آتے آتے جنوں والے بنگلے کے



آخری منزل کی چھت پر لڑکیوں کو کھڑے بھی دیکھا تھا تو کسی نے لڑکیوں کو بال سکھاتے دیکھا تھا۔

اور جنوں کی موجودگی کا اشارہ پایا تھا۔

بنگلے کے اردگرد کی جن کی زمین تھی وہ زمینوں پر جب بھی کام کرنے گئے انہیں کچھ نہ کچھ دکھائی دیتا۔

جو کسان ہل چلاتا اُسے پتھر لگتے وہ بے چارہ بھاگ جاتا تھا۔ جو زمینوں پر کام کرنے آتا اُسے بڑا سا سانپ دکھائی دیتا یا بڑی سی چیل اُن پر حملہ کرتی تھی۔ لوگ بے چارے ڈر کر بھاگ جاتے تھے پھر جنوں والے بنگلے کے اردگرد کی زمین بنجر ہونے لگی تھی۔

قریب سے گزر رہے تھے۔ تو چاند اپنے جوبن پر تھا۔ ایسی چاندنی تھی کہ دن کا سماں تھا۔ اچانک شفیع بھائی کے کانوں میں کچھ آوازیں سنائی دیں۔ وہ آوازیں بنگلے سے آرہی تھیں۔ جیسے بہت سی عورتیں آپس میں لڑ رہی ہوں۔ وہ بھی چلا چلا کر۔ عورتوں کے تیز بولنے اور چلانے کے شور سے اُن کا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ شفیع بھائی کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔

''یا اللہ خیر!'' وہ تیزی سے بیلوں کو ہانکنے لگا۔ اور ایکدم عورتوں کا چلانے کا شور ختم ہوا گیا۔ تو شفیع کے کانوں میں چھن چھن کی آواز آنے لگی۔

جب یہ چھن چھن کی آواز قریب اور واضح سنائی دینے لگی تو شفیع بھائی نے مُڑ کر پیچھے دیکھا تو حیران رہ گئے۔

کوئی جوان عورت اُن کے پیچھے چلی آرہی تھی۔ حسین گورا چٹا رنگ اور سونے کے زیورات سے لدی وہ ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ چاند کی چاندنی میں اس کا حسن غضب ڈھا رہا تھا۔ شفیع بھائی کو خوف نے آگھیرا اور وہ بیلوں کو تیزی سے ہانکنے لگے۔

''اے رُکو!'' شفیع بھائی کے کانوں میں اُس کی آواز ٹکرائی۔ تو انہوں نے بیل گاڑی کو اور تیز کر دیا۔

''ارے اے رُکو! مجھے ساتھ لے چلو۔ میں تیرے ساتھ چلوں گی۔'' عورت شفیع بھائی کے بیل گاڑی کے پیچھے دوڑنے لگی۔ شفیع بھائی نے بیلوں پر لاٹھی برسائی تاکہ اور تیز چلیں۔ اب عورت بھاگ بھاگ کر بیل گاڑی پر چڑھنے لگی۔ تو شفیع بھائی نے اسے دھکا دیا۔ اور وہ دھڑام سے گرگئی۔ کچھ لمحے بعد وہ دھول میں غائب ہوئی۔ اور پھر اُٹھ کر بیل گاڑی پر چڑھنے لگی اور شفیع بھائی نے پھر دھکا دیا۔ وہ پھر گر پڑی۔ اور پھر اُٹھ کر بیل گاڑی پر چڑھنے لگی۔ جب وہ چڑھتی تو شفیع بھائی ایک ہاتھ سے بیلوں کی رسی تھامے دوسرے ہاتھ سے اسے دھکا دے کر گراتے رہے۔ بیل بھی پوری قوت سے دوڑ رہے تھے۔ آخر کار وہ عورت پیچھے رہ گئی اور شفیع بھائی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے گھر پہنچ کر دم لیا۔

☆......☆......☆

گھر آتے ہی بیلوں کو گاڑی سے کھول دیا۔ بیل بھی تیزی سے دوڑنے کی وجہ سے ہانپ رہے تھے۔ شفیع بھائی بیلوں کو باندھ کر بیوی سے کہا کہ گاڑی پر چادر میں بندھا ہوا سودا سلف پڑا ہے۔ اُسے اٹھا لاؤ۔'' جب بیوی گاڑی سے سامان اٹھانے لگی تو کیا دیکھتی ہے کہ سامان کے پاس اک ہار پڑا تھا۔ وہ شفیع بھائی سے کہنے لگی۔

''یہ ہار کس کا ہے؟'' جب شفیع بھائی نے ہار دیکھا تو دنگ رہ گئے۔ اک بھاری سونے کا ہار تھا، جو یقیناً اسی جن عورت کے گلے سے گرا تھا۔ تو شفیع بھائی نے پورا واقعہ اپنی بیوی کو سنایا تھا۔

ان کی بیوی کی خوف سے جیسے چیخ ہی نکل گئی اور اُس نے ہار پرے پھینک دیا۔ جسے شفیع بھائی نے اُٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا کہ کل کرم دین چاچا کو دکھاؤں گا۔ وہ جو کہیں گے ویسا کریں گے۔''

اور یوں وہ کھانا کھا کر سوگئے۔

تقریباً آدھی رات کو شفیع بھائی چیخ مار کر اٹھ بیٹھے۔ بیوی نے دیکھا تو وہ بے ہوش تھے۔ وہ دوڑ کر پڑوسیوں کو بلا لائی۔

شفیع بھائی بے ہوش پڑے تھے۔ یہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔

بیوی نے رو رو کر سب کو جن عورت والا قصہ سنایا۔ کسی نے کہا کہ کرم دین چاچا کو لاؤ اور فوراً کرم دین چاچا کو بلایا گیا اور کرم دین چاچا آیا اور کچھ پڑھ کر...... شفیع بھائی پر پھونک ماری تو شفیع بھائی آنکھ کھول کر اُٹھ بیٹھے۔

کرم دین چاچا نے سب کو وہاں سے جانے کو کہا تو سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ پھر کرم دین چاچا نے شفیع بھائی سے پوچھا۔ تو شفیع بھائی نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ پھر کہنے لگے۔

''ابھی میں سویا ہوا تھا کہ اِک عورت میرے جسم کے اوپر چڑھنے لگی۔ میں سیدھا سویا ہوا تھا۔ جیسے خواب میں دیکھ رہا تھا۔ کچھ جاگی اور کچھ سوتی ہوئی ملی جلی کیفیت میں تھا۔

وہ عورت میرے جسم کے اوپر آ کر سینے کے بل لیٹ گئی۔ میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے تو میں جاگ گیا۔ جب اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اُس مکروہ شکل کی عورت کے خوف ناک چہرے سے میں خوف کھا کر چلا اٹھا اور میں چیخ کر بے ہوش ہوا۔''

چاچا کرم دین شفیع کے باتیں سن کر گہری سوچ میں پڑ گئے۔

اب ہر تیسرے چوتھے دن شفیع بھائی کے ساتھ ایسا ہی ہونے لگا تھا کہ آدھی رات کو وہ چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتے۔ ان کی بیوی کرم دین چاچا کو لے آتی تھی۔ وہ اُسے دم کرتا تو شفیع بھائی ہوش میں آتے۔

کرم دین چاچا وہ ہار جنگلے کے قریب جا کر پھینک آئے تھے۔ پھر بھی شفیع بھائی کی حالت برقرار تھی۔ بیوی الگ پریشان، بچے الگ خوف زدہ۔ شفیع بھائی کو پیروں، فقیروں، اور عاملوں کے پاس لے جایا گیا۔ پھر بھی ان کی حالت جوں کی توں رہی۔

☆......☆......☆

کسی نے کرم دین چاچا کو فقیر اطہر عطر والے کے بارے میں بتایا۔ تو وہ جا کر فقیر اطہر عطر والے کو لے آئے۔

فقیر اطہر عطر والے بہت پہنچے ہوئے عامل اور بزرگ تھے۔ آتے ہی انہوں نے پہلے شفیع بھائی کو پانی دم کر کے دیا۔ اور کچھ لکڑیاں جمع کروائیں۔ اور اُن کی لکڑیوں کو آگ لگا دی۔ اور کچھ پڑھنے لگے۔ شفیع بھائی بھی آگ کے قریب دیدے پھاڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ کرم دین چاچا کے ساتھ ساتھ کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

فقیر اطہر عطر والے نے پڑھتے پڑھتے، جیب سے عطر کی چھوٹی سی شیشی نکالی، ڈھکن کھولا اور آگ میں انڈیل دی اور آگ مزید بھڑک اٹھی۔ اور فقیر بابا نے اُٹھ کر اک جلتی ہوئی لکڑی اٹھائی اور شفیع بھائی کے پاؤں پہ رکھ دی۔ اور شفیع بھائی نسوانی آواز میں چیخ اٹھے۔

''مجھے مت جلاؤ! مجھے چھوڑ دو! مجھے شفیع سے عشق ہو گیا ہے۔''

فقیر اطہر عطر والے جلال میں آئے اور کہنے لگے۔

''ابھی تو میں نے صرف تیرا پاؤں جلایا ہے۔ اب میں تجھے آگ میں پھینکوں گا۔''

شفیع بھائی نسوانی آواز میں روتے ہوئے فقیر اطہر عطر والے کے پاؤں پر گر گئے۔ فقیر بابا اپنی چھڑی شفیع بھائی کی کمر پر برسانے لگے۔

شفیع بھائی نسوانی آواز میں چیختے چلاتے رہے مگر فقیر بابا انہیں مارتے رہے۔ پھر شفیع بھائی نسوانی آواز میں کہنے لگے۔

''اگر میں جاؤں گی بھی تو اسے برباد کر کے جاؤں گی۔''

''تم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔'' فقیر بابا برابر شفیع بھائی کو چھڑی سے مارتے رہے۔ آخر شفیع بھائی بے ہوش ہو گئے۔ اب فقیر بابا ہاتھ روک کر...... دور جا کر بیٹھ گئے۔ اور آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنے لگے۔

کچھ دیر بعد آنکھیں کھول دیں۔ بجھی بجھی آواز میں کہنے لگے کہ میں اِن کی چھوٹی بیٹی کو بچا نہ سکا۔ وہ آئی تھی۔ شفیع کے سب گھر والوں کو مار کر شفیع پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔ باقیوں کو اللہ کے فضل و کرم سے بچایا۔ پر وہ پھر بھی اپنا کام کر گئی۔ اور شفیع کے چھوٹی بیٹی کو مار گئی ہے۔''

جب بابا نے بات ختم کی تو شفیع کے گھر سے رونے کی آواز آئی۔ سب بھاگ کے وہاں گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ شفیع کی چھوٹی بیٹی مر چکی ہے۔ اُس کی بیوی رو رو کر سب کو بتا رہی تھی کہ میری بیٹی ٹھیک ٹھاک تھی کہ اچانک تڑپنے لگی اور رونے لگی کہ ماں مجھے بچاؤ یہ عورت میرا گلا دبا رہی ہے۔ بس کچھ ہی لمحوں میں اُس کی گردن لڑھک گئی۔''

فقیر اطہر عطر والے شفیع کی جن سے جان خلاصی کی پر جن نے پھر بھی اک بچی کو مار کر جان چھوڑی تھی۔

رو دھو کر شفیع بھائی اور اُن کے گھر والوں کو صبر آ ہی گیا۔ جاتے وقت فقیر اطہر عطر والے سے گاؤں کے لوگوں نے کہا تھا۔

''سائیں جی اس بنگلے سے بھی جنوں کا بسیرا ختم کرا دو۔''

''فقیر سائیں نے کہا کہ آپ ان کے طرف نہ جاؤ تو وہ بھی آپ کو تنگ نہیں کریں گے۔''

کرم دین چاچا نے کہا کہ سائیں! شفیع نے تو انہیں تنگ بھی نہ کیا تھا۔ شفیع تو اپنے رستے سے گزر رہا تھا......''

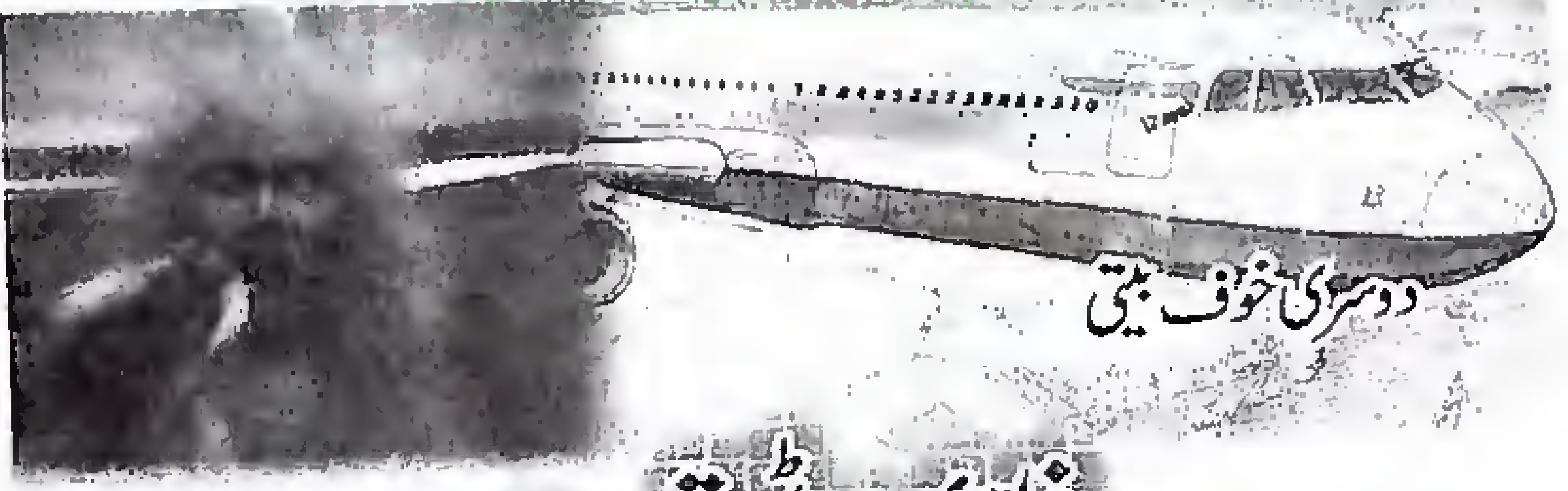
فقیر نے کہا کہ کرم دین جب شفیع وہاں سے گزر رہا تھا تو اس وقت جنوں کی عورتوں میں آپس میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ وہ جن عورت گھر سے ناراض ہو کر باہر آئی تھی۔ تو شفیع سے اُس کا سامنا ہوا اور وہ شفیع پہ عاشق ہو گئی تھی۔ اِس طرح شفیع ان کے چنگل میں پھنس گیا تھا۔ یہ کہہ کر اطہر عطر والے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

قارئین یہ جنوں والا بنگلا آج بھی موجود ہے۔ لوگ آج بھی اس سے خوف کھاتے ہیں۔

کرم دین چاچا اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ مگر انہوں نے سب لوگوں کو وہ قرآنی آیتیں یاد کرا دی تھیں۔ جو بھی یہاں سے گزرتا ہے۔ یہی آیتیں پڑھ کر خیر و عافیت سے گزر جاتا ہے۔

شفیع بھائی بھی اب سکون سے زندگی گزار رہے ہیں۔ معلوم نہیں۔ کب جنوں والے بنگلے سے آسیب ختم ہو گا۔ خدا کے بھید خدا ہی جانے۔

☆☆......☆☆



فلائٹ ٹو تربت

شمسہ قمر

ایک ایئر ہوسٹس کی زندگی میں پیش آنے والا پُراسرار قصہ

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں ایئرلائن میں کام کرتی تھی۔ ہماری فلائٹس اندرون ملک اور بیرون ملک ہوتی تھیں۔ اندرون ملک چھوٹی چھوٹی جگہوں پر فوکر جہاز آپریٹ ہوتا تھا اور باقی شہروں میں بڑے اور درمیانے جہاز جایا کرتے تھے۔

سردیوں کے دن تھے۔ میری اُن دنوں ڈومیسٹک فلائٹس تھیں۔ شام کو ڈیوٹی لیٹر ملا کرتا تھا کہ اگلے دن آپ کی جو فلائٹ ہو پتا چل جاتا تھا۔ گھنٹی کی آواز سن کر میری ماما نے کچن سے نوکر کو کہا کہ جا کر دیکھے کون ہے۔ وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں میرا لیٹر تھا۔ میں نے کھول کر دیکھا تو تربت کی۔ فوکر فلائٹ تھی۔ تربت بلوچستان کے ساحلی علاقے میں ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ میں نے ڈیوٹی دیکھ کر برا سا منہ بنایا کیونکہ مجھے فوکر فلائٹ پسند نہیں تھیں۔ یہ جہاز چھوٹا ہوتا ہے اور اس کا شور بہت ہوتا ہے۔ خیر نوکری کی نوکری ہوتی ہے جانا تو تھا۔

صبح چھ بجے میں سستی سے اٹھی، منہ ہاتھ دھو کر تیار ہوگئی۔ Pick Up آیا تو ایئرپورٹ روانہ ہوگئی۔ سب گھر والے اپنے اپنے نرم لحافوں میں دبکے ہوئے تھے۔ میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور روانہ ہوگئی۔

☆......☆......☆

فوکر جہاز پر ایک پائلٹ دوسرا Co-pilot اور ایک فلائٹ اسٹورڈ اور ایک ائرہوسٹس ہوتی ہے۔ خیر جہاز پر سب مسافر سوار ہوئے اور ہم نو بجے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔ پہلے ہم گوادر رکے اور پھر تربت پہنچتے پہنچتے ہمیں شام کے پانچ بج گئے۔ ہم نے جیسے تیسے لینڈ کیا۔ مسافر اُترے تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اور ہم نے ابھی واپس بھی جانا تھا۔ ہماری فلائٹ چونکہ گوادر میں لیٹ ہوگئی تھی اس لیے ہم تربت بھی لیٹ پہنچے۔ چھوٹے شہروں سے مغرب کے بعد اندھیرے میں ٹیک آف نہیں ہوتا تھا کیونکہ سہولیات نہیں ہوتی تھیں۔ اس لیے جب جہاز خالی ہوگیا تو کپتان ہمارے پاس آ کر بولا۔

”بھئی بری خبر ہے۔ ہم واپس نہیں جا سکتے۔ اب ہم صبح جائیں گے۔ یہاں کے ایک ملازم کے گھر ہم رات ٹھہریں گے۔“

میں گھبرائی نہیں کیونکہ ایئرلائن میں کسی بھی وقت کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ جس کے لیے ہم ذہنی طور پر تیار رہتے تھے۔

چنانچہ ہم سب اُتر کر ایک گاڑی میں بیٹھے جو ہم چاروں کو جس میں، میں فلائٹ اسٹورڈ کپتان اور Co-pilot شامل تھے، لے کر اس آدمی کے گھر پہنچی۔

☆......☆......☆

یہ ایک کچا پکا سا گھر تھا۔ جس میں شاید تین کمرے تھے اور بہت بڑا کچا صحن تھا۔ میزبان نے ہمیں ویلکم کیا اور ہمیں کپڑے تبدیل کرکے ایزی ہونے کے لیے کہا۔ اس نے ایک کونے والے کمرے کی طرف اشارہ کرکے مجھے کہا کہ آپ اس کمرے میں چلی جائیں چنانچہ میں اس کمرے میں چلی گئی۔

یہ ایک درمیانے سائز کا کمرہ تھا۔ جس میں صرف دو چارپائیاں تھیں۔ ایک پر بستر لگا تھا اور دوسری بستر سے محروم خالی چارپائی تھی۔ آخر میں ایک باتھ روم تھا۔ جہاں میں نے



چینج کر کے منہ ہاتھ دھویا اور تھوڑی دیر کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گئی۔ اتنی دیر میں دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے پوچھا تو ایک عورت کی آواز آئی کہ آپ آ کر کھانا کھالیں۔"

اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا تو سیاہ لباس میں ایک خوبصورت عورت کھڑی تھی۔ اس نے کہا کہ آپ کھانا کھالیں۔ پھر لائٹ چلی جائے گی۔"

"کھانا اتنی جلدی؟" پھر آداب مہمان نوازی نبھاتے ہوئے میں باہر آ گئی۔

آسمان پر چودھویں کا چاند اپنی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ باہر تقریباً اندھیرا تھا۔ صرف چاند کی چاندنی کی وجہ سے میں دیکھ پا رہی تھی۔

"یہاں دراصل کچھ گھنٹے بجلی دی جاتی ہے پھر ہم کچھ دیر سونے تک جنریٹر چلا لیتے ہیں۔ اس لیے آپ سب لائٹ جانے سے پہلے کھانا کھالیں۔"

وہ مجھے لے کر کونے والے کمرے کے پاس پہنچی جہاں سے ہلکی سی روشنی باہر آ رہی تھی۔ ہم اندر داخل ہوئے تو وہ باہر رک گئی کیونکہ اندر میرے کولیگ تھے، اس لیے وہ شاید ہچکچا رہی تھی۔ چنانچہ میں اندر داخل ہوئی کھانا دسترخوان پر لگا ہوا تھا۔

"آیئے آیئے۔" میزبان نے کھڑے ہو کر میرا استقبال کیا اور بولا۔

"آپ نے اچھا کیا کہ خود ہی آ گئیں۔ میں ابھی آپ کو بلانے آنے ہی والا تھا۔"

میں نے جواب دیا کہ میں بلانے پر ہی آئی ہوں۔"

"بلانے پر! آپ کو کون بلانے آیا؟" میزبان حیرانی سے بولا۔

"وہ باہر کھڑی ہیں۔ ایک خاتون آئی تھیں غالباً آپ کی مسز ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"میری مسز؟ میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی اور یہاں میرے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا۔"

"ارے بھئی! وہ ابھی باہر ہی ہوں گی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے دروزاہ کھول دیا لیکن باہر کسی کا نام ونشان تھی نہیں۔ یہ دیکھ کر میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ میرے ساتھ ساتھ باقی سب بھی پریشان ہو گئے۔ اب پتا نہیں انہیں میری بات کا یقین آیا بھی تھا کہ نہیں لیکن میں ضرور پریشان ہو چکی تھی۔

خیر ہم سب نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد میزبان بولا کہ ابھی آدھے گھنٹے میں لائٹ چلی جائے گی۔ آپ لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے جائیں۔ جنریٹر کا پیٹرول بھی تھوڑا ہے اور یہاں سے بہت دور جا کر پیٹرول لانا پڑتا ہے۔"

مجھے اُسی کمرے میں اکیلے رہنا تھا۔ باقی تینوں کو بھی کمرے دے دیے گئے تھے جو کہ انہوں نے شیئر کر لیے تھے۔

"یہاں تو بڑا سناٹا ہے بھئی۔" کپتان بولے۔

"جی ہاں بس ہم تو عادی ہیں۔ آپ بڑے شہر والوں کو یقیناً عجیب لگ رہا ہوگا۔" اور پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

''مس جی! آپ ڈریے گا مت۔ یہاں شاید ہوائی چیزیں ہوتی ہیں۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ یہ جگہ ذرا ہٹ کر ہے اور رات لائٹ بھی نہیں ہوتی تو لوگ مختلف باتیں کرتے ہیں۔''

''اچھا دیکھتے ہیں۔'' یہ کہہ کر میں اپنی نڈر فطرت کی وجہ سے پریشان نہیں ہوئی۔

''اچھا بھئی اب سوتے ہیں۔'' کپتان نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

''میں بہت تھک گیا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئے۔

میں نے صحن میں قدم رکھا تو سردی کا احساس ہوا۔ اچھی خاصی سردی تھی جو کھانا کھا کر اور زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ باہر اندھیرے کا راج تھا۔ دور سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ جھینگروں کی آواز بھی خاموشی میں خاصی پُراسرار لگ رہی تھی۔

مجھے اس آدمی کی بات یاد آ گئی اور مجھے اب محسوس ہوا کہ جیسے کوئی میرے پیچھے ہو۔ میں نے جونہی مڑ کر دیکھا تو ایک ہیولہ سا محسوس ہوا۔ میں نے اپنے قدم تیز کر دیے اس ہیولے نے بھی تیز چلنا شروع کر دیا۔ میں نے ہلکا سا دوڑنا شروع کیا تو اس نے بھی دوڑنا شروع کر دیا۔ میں گھبرا گئی۔ اور جونہی دروازے کے پاس پہنچی۔ تو وہ میرے سر پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے گھوم کر اپنے ہاتھ سے اُسے دھکا دیا تو وہ دھڑام سے گر کر کراہنے لگا اور پھر تیزی سے اُٹھ کر میری طرف بڑھا۔ تاریکی کی وجہ سے مجھے اس کی شکل صاف نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں دوبارہ اسے دھکا دیتی اس نے ہنسنا شروع کر دیا اور بولا۔

''مس جی! مس جی! کیا کر رہی ہیں۔''

میں نے اُس کی آواز پہچان لی وہ اسٹور ڈ تھا۔ ہنستے ہوئے کہنے لگا کہ میں نے سوچا کہ آپ کی بہادری کو چیک کیا جائے۔ لیکن بھئی مان گئے۔ آپ تو واقعی بہادر ہیں۔''

میں نے اسے کہا کہ یہ کیسا بھونڈا مذاق ہے۔'' اور اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔

ابھی میں واش روم سے نکلی ہی تھی کہ لائٹ چلی گئی۔ میں نے اندھیرے میں ٹٹول کر اپنا بستر تلاش کیا اور لیٹ گئی۔ تھکی ہوئی تو تھی ہی اس لیے لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔

☆......☆......☆

نجانے رات کا کون سا پہر تھا کہ ٹھک ٹھک کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے غور سے سننے کی کوشش کی کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے کمرے میں سے ہی آ رہی ہے۔ دروازے کے ساتھ ہی خالی چارپائی تھی آواز ایسی تھی جیسے کسی چارپائی کے چاروں پائے ایک جیسے نہ ہوں اور کوئی اس پر بیٹھا اس کو دائیں بائیں ہلا رہا ہو اور یہ آواز پیدا ہو رہی ہو۔ میں پہلے تو سنتی رہی کہ یہ شاید میرا وہم ہے۔ لیکن یہ وہم نہیں تھا۔ آواز رہ رہ کر برابر آ رہی تھی۔

میں ہمت کر کے اٹھی کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ وقت کا کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں ٹٹول کر دروازے کے قریب بچھی چارپائی کے پاس پہنچ گئی اور ہاتھ سے اس کو دائیں بائیں ہلا کر دیکھا کہ شاید پائے ایک جیسے نہ ہوں لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ چارپائی ٹھیک تھی پھر خود پر ہنسی آئی کہ اگر پائے ایک جیسے نہ بھی ہوتے تو اس کو اگر کوئی ہلا رہا تھا تو وہ زیادہ پریشانی کی بات ہوتی۔ خیر میں واپس اپنی چارپائی پر گئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ آواز بند ہو چکی تھی۔

ابھی میری آنکھ لگی بھی نہیں تھی کہ مجھے ایسا لگا کہ میری دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر کسی نے مجھے الٹا لٹکا دیا ہے۔ میں بہت زیادہ ڈر گئی اور میرے حلق سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ پوری کوشش کر کے میرے حلق سے ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی اور مجھے کسی نے واپس چارپائی پر پھینک دیا۔ میری سانس رُک سی گئی تھی۔ نہ مجھ میں ہمت تھی کہ باہر نکل سکتی اور مدد کے لیے کسی کو بلاتی کافی دیر تک تو میں ہل بھی نہ سکی۔

اسی حالت میں پڑے پڑے صبح ہو گئی۔ میں نے خود کو سنبھالا اور باہر نکلی تو کوئی نظر نہ آیا۔ میرا واپس کمرے میں جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ میں دوسرے والے کمرے میں گئی تو وہاں سب تھے۔ میری جان میں جان آئی۔

سب نے پوچھا کہ رات کیسی گزری۔''

لیکن میں نے پہلے تو کچھ نہیں کہا پھر جب ساری روداد سنائی تو میزبان پریشان سا ہو گیا اور بولا کہ میں نے آپ سے کہا تھا نہ کہ یہاں کچھ ہے لیکن آپ نے شاید یقین نہیں کیا۔''

خیر دن تھا اس لیے میں اپنے کمرے میں گئی اور تیار ہو کر ہم سب واپس فلائٹ پر روانہ ہو گئے۔

سارا راستہ میں یہی سوچتی رہی کہ کیا واقعی ان چیزوں کا وجود ہے اور کون میری اس بات پر یقین کرے گا۔ میرے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔

اس واقعے کے گزرے برسوں بیت گئے ہیں۔ لیکن سچ ہے کہ میرا 'ہوائی' چیزوں پر یقین پختہ ہو گیا ہے۔ خدا کی مخلوق کسی روپ میں اور کب ہمیں دکھائی دے جائے۔ کچھ نہیں معلوم۔ مگر حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

☆☆......☆☆



فیروز آباد کی انوری

نوشین آراء

آج بھی فیروز آباد کے لوگ، انوری نام کے آسیب سے دور بھاگتے ہیں



یہ تقریباً 1958ء کا واقعہ ہے۔ انڈیا کے شہر آگرہ کے علاقے فیروز آباد میں چوڑیاں اور شیشے کا کام زیادہ ہوتا ہے۔ جب کسی کو کوئی کام نہیں آتا تو وہ چوڑیوں کا کام کر لیتا وہاں کی عورتیں اور بچے بھی اس کام میں لگے رہتے۔ اُس وقت برصغیر کو آزاد ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ مہنگائی کے پیش نظر ہر ایک کو کام کرنا پڑتا تھا۔

بچے، بوڑھے، عورت، مرد سب ہی کام کر رہے تھے۔ اور برائے نام مزدوری ملتی تھی۔ جس کی وجہ سے مشکل سے پیٹ بھرتا تھا۔

فیروز آباد کے ایک محلے میں انوری کا گھر بھی تھا۔ شریف کی دو بیٹیاں تھیں بڑی بیٹی انوری اور چھوٹی بیٹی سرور ی تھی۔ دونوں عادت میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں۔

انوری شرارتی اور سروری سیدھی سادھی لڑکی تھی۔ بچپن میں اکثر بچوں کو تنگ کرتی بلاوجہ مارتی، اُن کی چیزیں چھین لیتی یا کھیلتے بچوں کی چیزیں چوری کر لیتی۔ جب بچے اپنے والدین سے شکایت کرتے تو اور زیادہ اُن کو تنگ کرتی۔ سب بچے اُس سے ڈرتے تھے۔ تیرہ چودہ سال کی ہوگئی تھی مگر گھر کے کاموں سے دور بھاگتی۔ محلے بھر کے گھروں میں گھسی رہتی اور عورتوں کو ایک دوسرے سے لڑوانے میں وہ ماہر تھی۔ سب لوگ اُس سے تنگ تھے۔ اُس کی ماں تو شکایتیں سُن سُن کر اور پریشان ہو جاتی۔ آخر کافی سوچ بچار کرنے پر انہوں نے اُس کی شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا مگر اُس کی شادی کس سے کی جائے...... یہ سوچ کر ماں پریشان ہوتی کیونکہ اُس کی عادت اور حرکتوں کا سب کو علم تھا۔ اب باہر کے خاندان کا تو کوئی فرد اُس سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اُن کی ماں نے اپنے بھتیجے سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

امجد ایک سیدھا سادھا نوجوان تھا۔ اُس کا اپنی پھوپی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ انوری کے ہاں رہتا تھا۔ اُس کی پھوپی نے امجد سے شادی کی بات کی تو وہ شادی کے لیے راضی ہو گیا۔ اُس نے پھوپی سے کہا کہ آپ ہی میری سب کچھ ہیں۔ جو فیصلہ کریں گی وہ میرے لیے بہتر ہی ہوگا۔'' انوری بھی اِس شادی پر خوش تھی۔

انوری کی ماں نے ایک کمرے کا مکان کرائے پر لے کر اُس کی شادی کر دی۔ وہ دونوں اپنے گھر میں خوش تھے۔ شادی کے بعد انوری نے اپنے آپ کو کافی حد تک تبدیل کر لیا تھا۔ اسی طرح سال بھر کا عرصہ گزر گیا۔ وہ ابھی تک دو سے تین نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح ایک سال اور گزر گیا تھا۔

انوری ماں بننے کے لیے بے چین تھی۔ اس نے دائیوں اور حکیموں سے علاج کروانا شروع کر دیا۔ جب علاج سے بھی اُس کی گود نہیں بھری تو اُس نے پیر فقیروں کے پاس جانا شروع کر دیا۔

جو کچھ وہ بتاتے وہ وہی کرتی۔ کسی نے کہا نئی دلہن کا کپڑا کاٹ کر لے آؤ لیکن وہ ماں بننے والی ہو اب اُس نے محلے کی عورتوں سے ٹوہ لینی شروع کر دی۔ کون سے گھر میں کب شادی ہوئی اور کب ماں بننے والی ہے اُس سے دوستی کرتی اور اس کا دوپٹا کاٹ کر بابا کو دے دیتی۔ کسی نے کہا کہ کسی کا پہلا بچہ ہو اُس کے بال کاٹ کر لے آؤ شرط یہ ہے دو تین ماہ سے زیادہ کا نہ ہو۔

اُس محلے میں انیسہ نام کی ایک عورت تھی۔ اُس کے ہاں کافی منت مرادوں سے ایک بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ اُس کے پاس انوری کا آنا جانا تھا۔ ایک دن انیسہ کھانا پکا رہی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ گھر میں کوئی اور نہیں تھا، اُس کی بچی شمع سو رہی تھی۔ انوری خاموشی سے اندر آئی اور چھوٹی سی قینچی نکالی اور سر کے پیچھے کے بال کاٹ کر رومال میں لپیٹے اور قمیض کی جیب میں چھپا لیے۔ سر پر ہاتھ لگانے کی وجہ سے اُس کی بچی شمع اُٹھ گئی۔ اُس نے رونا شروع کر دیا۔ انیسہ بچی کے رونے کی آواز سُن کر بچی کے پاس آئی تو اُس نے انوری کو بچی کے پاس کھڑے دیکھا تو پوچھا۔

''انوری تو کب آئی۔'' وہ بولی۔

''ابھی ابھی آئی ہوں۔ میں تو تمہیں دیکھ رہی تھی، بچی کو اکیلے چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھیں۔'' انیسہ نے کہا۔

''میں تو باورچی خانے میں تھی۔'' اس طرح تھوڑی باتیں کر کے انوری چلی گئی۔

دوسرے دن بچی کو نہلاتے ہوئے انیسہ نے دیکھا کہ اُس کے بال کٹے ہوئے ہیں تو وہ گھبرا گئی اور اُسے یقین ہو گیا کہ بچی کے بال انوری ہی نے کاٹے ہیں۔'' انیسہ نے اپنی ماں کو بتایا کہ انوری اُس کی بچی کے بال کاٹ کر لے گئی ہے۔ خدانخواستہ میری بچی کو کچھ ہو نہ جائے۔'' انیسہ کی ماں نے اُسے سمجھایا کہ تم فکر نہ کرو۔ اللہ تمہاری بچی کی حفاظت کرے گا۔ بس تم وہم نہ کرو اور بچی پر قرآنی آیات کا دم کرتی رہو۔''

کافی دن تک انیسہ وہم و فکر میں رہی اور اپنی بچی کی حفاظت کے لیے اللہ سے دعائیں مانگتی رہی۔ خدا نے

حفاظت کی اور اُس کی بچی محفوظ رہی۔

☆......☆......☆

انوری اولاد کے لیے در در بھٹکتی رہی۔ دعا، تعویذ، ٹونے ٹوٹکے جو کچھ اُس کو بتایا جاتا وہ کرتی رہتی۔ مگر پھر بھی اس کا ماں بننے کا خواب پورا نہیں ہو پایا۔ اس غم میں وہ بیمار ہوگئی۔ شوہر اور ماں اُس کی تیمارداری کر رہے تھے تب بھی اُسے شکایت ہی رہتی۔

چڑچڑی اور بدزبان تو وہ تھی ہی اب اور زیادہ ہوگئی تھی۔ آٹھ دس دن بیمار رہ کر وہ اچانک اللہ کو پیاری ہوگئی۔ محلے کے لوگ جمع ہوئے، تدفین ہوگئی۔

تیسرے دن سب لوگ دوبارہ جمع ہوئے۔ عصر مغرب کے درمیان فاتحہ خوانی تھی۔ فاتحہ خوانی کے بعد بہت سے لوگ جا چکے تھے۔ گھر کے لوگ ماں بہن شوہر گھر میں موجود سوگوار بیٹھے تھے۔ انوری کے شوہر نے اپنی ساس سے کہا کہ جو کپڑے انوری کے سوئم میں کسی غریب کو دینا ہیں، وہ مجھے دے دیں، میں کسی کو دے کر آجاؤں۔''

ساس نے اپنی دوسری بیٹی سردری سے کہا کہ کمرے میں پلنگ پر جو نیا سوٹ رکھا ہے وہ لے آؤ اور اپنے بہنوئی کو دے دو۔''

سردری کمرے میں جانے سے ڈر رہی تھی، مغرب کا وقت ہونے والا تھا۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ موت کے گھر اکیلے کمرے میں جانے سے اُسے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ ہمت کر کے کمرے میں گئی اور چیختی ہوئی کمرے سے باہر بھاگی۔ خوف سے اُس کے منہ سے کچھ نہیں نکل پا رہا تھا۔ سب اُس سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا ہے کیا دیکھ لیا ہے جو اِس طرح خوفزدہ ہو رہی ہو۔'' وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

''اندر آپا ہے۔'' سب ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔ ماں نے کہا۔

''وہم ہوگیا ہے۔ کیا بک رہی ہے۔ چل میں چلتی ہوں تیرے ساتھ۔''

''نہیں میں نہیں جاؤں گی۔ اندر جا کر خود ہی دیکھ لو۔''

ماں اور بہنوئی ساتھ ہی کمرے میں داخل ہوئے اور خوفزدہ ہوگئے۔ اُن کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ انوری پلنگ پر اپنا نیا سوٹ جو اُس کی بہن کمرے میں لینے گئی تھی وہی جوڑا پہنے بیٹھی تھی۔ اور مسکراتی ہوئی اپنی ماں اور شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

''یہ میرا کمرہ ہے۔ میں یہاں پر ہی رہوں گی۔'' وہ لوگ گم صم اُسے دیکھے جا رہے تھے۔ مغرب کی اذان کی آواز آئی تو وہ غائب ہوگئی۔

سب ہکا بکا رہ گئے۔ اب کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کمرے میں جانے کی۔

ایک دن محلے میں شکیلہ نے اپنے بچے سے دودھ منگوایا۔ آٹھ نو سال کی عمر تھی اُس کی۔ وہ دودھ لے کر واپس آ رہا تھا کہ اچانک انوری نمودار ہوئی اس کے قریب آ کر دودھ کا برتن جھپٹ لیا۔ دودھ پی کر وہ غائب ہوگئی۔ وہ بچہ روتے ہوئے گھر پہنچا اور اپنی ماں سے شکایت کرنے لگا کہ انوری نے میرے ہاتھ سے لے کر سارا دودھ پی لیا ہے۔''

کسی کو اُس کی بات کا یقین نہ آیا بچے کو ڈانٹ کر ماں نے خاموش کروا دیا۔ اب اکثر محلے میں یہی ہونے لگا۔ دودھ، دہی، مٹھائی، کھیر وغیرہ کی انوری دشمن بنی ہوئی تھی۔ جب بھی یہ چیزیں گلی میں کسی کے ہاتھ میں نظر آتیں وہ جھپٹا مار کر کھا لیتی۔ عورتیں بچے اس کی ماں سے شکایت کرتے لیکن اب وہ کیا کر سکتی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ کسی کے ہاں اچھی چیز پکتی یا رکھی ہوئی ہوتی وہ وہاں پہنچ جاتی بلا اجازت اُٹھا کر کھا جاتی۔ محلے کے لوگ تنگ آ گئے تھے۔

انوری کے باپ کو بلا کر کوئی حل نکالنے کا مشورہ کیا۔ اُس کے باپ کو کسی بزرگ سے ملنے کا پتا دیا۔

وہ آگرہ گئے اور بزرگ سے ملے ساری روداد سنانے کے بعد اس مسئلے کا حل نکالنے کے لیے کہا۔ بزرگ مراقبے میں گئے اور تھوڑی دیر میں انوری کے باپ سے کچھ چیزیں منگوائیں۔ جب انوری کے باپ نے چیزیں پہنچا دیں انہوں نے چیزوں پر پڑھ کر واپس دیں کہا کہ یہ سب چیزیں محلے کی گلی کے کونے پر گاڑ دیں۔ باپ نے واپس آ کر ایسا ہی کیا۔

اُس دن کے بعد بھی انوری کو کسی نے نہیں دیکھا۔ یہ واقعہ پڑھنے کے بعد فیروز آباد کے لوگوں کو آج بھی انوری یاد آ جائے گی۔

☆☆......☆☆



ہم نے گھر چھوڑ دیا

فرح انیس

کسی بڑے حادثے سے پیشتر ہی انہوں نے چھوٹا نقصان کر کے خود کو محفوظ کر لیا تھا

خالہ کی دیورانی تھوڑے دن پہلے نئے گھر میں شفٹ ہوئی تھیں۔ وہ اپنی دیورانی سے ملنے ان کے گھر جا رہی تھیں۔ تو میں بھی ان کے ساتھ ان کی دیورانی کے گھر گئی۔ خالہ کی دیورانی کی بیٹی ماہا میری بہت اچھی سہیلی تھی اور ہم نے ساتھ اسکول پڑھا تھا۔

ماہا مجھے دیکھ کر کافی خوش ہوئی اور بہت گرم جوشی سے ملی۔ ماہا مجھے لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ ہم بہت دیر تک اپنا اسکول کا زمانہ یاد کرتے رہے۔ پرانی شرارتوں کو یاد کر کے خوب ہنستے رہے۔ باتوں باتوں میں ماہا کے پرانے گھر کا ذکر نکلا تو میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''پچھلے بیس سال سے تم لوگ اس گھر میں رہائش پذیر تھے اور بقول تم لوگوں کہ ہم لوگ اپنا یہ گھر کبھی نہیں چھوڑیں گے، تو پھر ایسا کیا ہوا تھا کہ تم لوگوں نے آناً فاناً اپنا وہ گھر چھوڑ دیا۔''

میری اس بات پر ماہا تھوڑی دیر کے لیے بالکل چپ ہو گئی۔ میرے اصرار پر آخر اُسے اپنا گھر چھوڑنے کی وجہ بتاتے ہی بن پڑی۔

اٹھارہ فلیٹس پر مبنی یہ 38 سالہ پرانی عمارت جس میں چھوٹے چھوٹے فلیٹس آمنے سامنے بنے ہوئے تھے۔ ہم پچھلے بیس سال سے اس عمارت میں رہائش پذیر تھے۔ میں میری تین بہنیں اور دو بھائی۔ والد کا بہت پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ ہمارا گھر تیسری منزل پر تھا۔ ہمارے سامنے فلیٹ میں میری خالہ رہتی تھیں۔ جن کی دو بیٹیوں کی شادی ہو گئی تھی اور دو بیٹے بھی شادی شدہ تھے۔ خالہ کے دونوں بیٹے ان کے ساتھ رہتے تھے۔ میرے خالو کا ایک سال پہلے انتقال ہوا تھا۔ یہاں میں بتاتی چلوں کہ اس عمارت میں جو سامنے کی طرف فلیٹ تھے ان کے کمروں کی کھڑکیاں گندی گلی میں کھلتی تھیں۔ کیونکہ اُس کے سامنے ایک بڑی کچرا کنڈی تھی۔ اور وہاں ایک پرانا نیم کا درخت تھا۔ جس پر بے تحاشا جالے لگے ہوئے تھے۔

میری خالہ کے گھر میں شروع سے ایک عجیب خاموشی محسوس ہوتی تھی۔ بہت سے گھر کے افراد ہونے کے باوجود بھی ایک پُراسراریت تھی۔ ہم بلڈنگ والوں میں بہت محبت تھی۔ ایک دوسرے کی خوشی، غمی میں شریک ہونا، شام کو عورتیں اپنے کام سے فارغ ہو کر چھت پر آ جاتیں اور ہم بچے کھیل کود

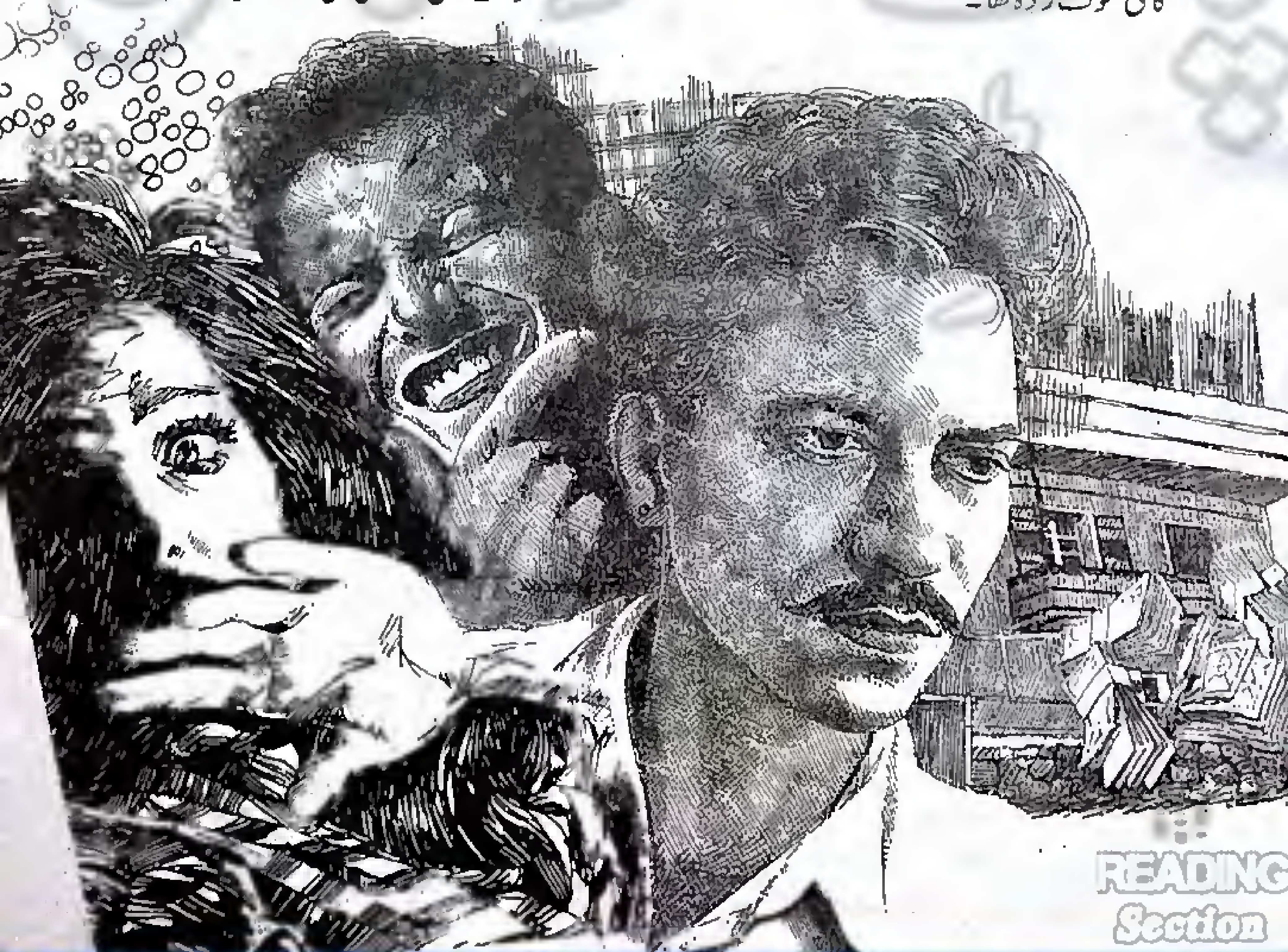
میں لگ جاتے۔ یونہی ہنستے کھیلتے ہم کب بڑے ہوئے پتا ہی نہیں چلا۔

کچھ دنوں سے بلڈنگ میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ مگر کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا بات کیا ہے۔ ہمارے نیچے فلیٹ والی آنٹی جن کا نام مہوش تھا۔ ان کا بیٹا عمر جس کی عمر سولہ سال تھی۔ وہ کرکٹ کا دیوانہ تھا۔ ہماری گلی میں ہی بلڈنگ کے لڑکے اکثر نائٹ میچ رکھتے تھے۔ میرا بھائی کھیلنے نہیں گیا تھا اس کی طبیعت خراب تھی۔ میری شادی شدہ بہنیں رہنے آئی ہوئی تھیں۔ ہم مل کر باتیں کر رہے تھے کہ ہمیں مہوش آنٹی کی چیخوں کی آواز آئی۔ جس پر ہم گھبرا گئے۔ میرا چھوٹا بھائی نیچے دیکھنے گیا تو پتا چلا کہ عمر اپنے گھر کے آگے بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ عمر جب چار بجے بھی گھر نہیں آیا تو احمد انکل نے (عمر کے والد) اس کو نیچے گلی میں دیکھنے جانے کے لیے جونہی دروازہ کھولا تو عمر کو بے ہوش پایا۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ کافی خوف زدہ تھا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن امی اور خالہ مہوش آنٹی کے ہاں گئے تو انہوں نے بتایا کہ عمر رات جب میچ کھیل کر اوپر آیا اپنے گھر کے باہر پہنچ کر اس کی نظر اتفاقاً اوپر جاتی سیڑھیوں پر پڑی تو اس نے دیکھا ایک سفید لباس میں عورت کھڑی ہے۔ اس کی پشت عمر کی جانب تھی۔ اس کے لمبے سفید بال زمین کو چھو رہے تھے۔ اس نے عمر کی جانب مڑ کر دیکھا تو اس کا پورا چہرہ سفید تھا۔ اور آنکھیں بھی سفید، جن کی پتلیاں غائب تھیں۔ اس عورت کو دیکھ کر وہ خوف سے بے ہوش ہو گیا۔ اب امی اور خالہ کافی خوف زدہ ہو گئی تھیں۔

ایک شام خالہ ہمارے گھر بیٹھی ہوئی تھیں۔ چائے کے دوران امی نے خالہ کی بابت دریافت کیا کیونکہ ہم نوٹ کر رہے تھے خالہ کچھ دنوں سے بہت چپ چپ ہیں۔ امی کے پوچھنے پر وہ بتانے لگیں۔ ''رات میں سو رہی تھی کہ آدھی رات کو مجھے



ایسا لگا کوئی کمرے میں گہرے گہرے سانس لے رہا ہے۔ جب کہ کمرے میں میرے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ میں نے اس کو اپنا وہم قرار دیا مگر اب سانس کی آواز تیز ہوگئی تھی۔ پھر مجھے اپنے تکیے پر دباؤ سا محسوس ہوا جیسے کوئی سر رکھ کر لیٹا ہوا ور اب سانس کی آواز صاف مجھے اپنے کانوں میں آرہی تھی۔

خوف سے میرا دم خشک ہو چکا تھا۔ میں آنکھیں بند کیے بستر پر ساکت پڑی رہی۔ خوف کے مارے میں کروٹ تک نہیں لے رہی تھی۔ پھر کب آنکھ لگی کچھ پتا نہیں۔ دوسرے تیسرے دن سکون رہا مگر چوتھی رات مجھے لگا کوئی بیڈ ہلا رہا ہے۔ پھر مجھے اپنے بیڈ کے نیچے آہٹ محسوس ہوئی۔ اس بار تیز سانس لینے کی آوازیں مجھے بیڈ کے نیچے سے آرہی تھیں۔ میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکل کر ٹی وی لاؤنج میں آگئی۔ گھڑی پر نگاہ پڑی تو رات کے تین بج رہے تھے۔

ابھی میں اپنے خوف کو کم کر رہی تھی کہ اچانک لاؤنج کا پنکھا تیز چلنے لگا۔ میں خوف زدہ ہو کر پنکھے کو دیکھنے لگی کہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے لائٹیں جلنا بجھنا شروع ہوگئیں۔ میں وحشت سے گھبراتی کمرے میں بھاگی۔ فجر تک یہی تماشا چلتا رہا۔ اذان ہوتے ہی یہ سلسلہ رُک گیا۔''

خالہ کی اس بات سے ہم سب خوف زدہ ہوگئے تھے۔ خالہ نے ایک بزرگ کو بلایا تو انہوں نے خالہ کی کھڑکی سے نظر آنے والی گندی گلی کی جانب اشارہ کر کے بتایا کہ اس گلی میں جو درخت ہے اس پر بہت طاقتور آسیب ہے اور یہ درخت ایک چڑیل کا مسکن ہے جو جانے کب سے یہاں پر قبضہ کی ہوئی ہے۔ اور سامنے جتنے بھی گھر ہیں، جن کا رخ گندی گلی کی طرف ہے ان گھروں کو اب زیادہ خطرہ ہے۔ پہلے یہ پُراسرار مخلوق خاموش تھی۔ مگر اب یہ اپنی موجودگی ظاہر کر رہی ہے۔''

اب اکثر رات میں بلڈنگ کے لوگوں کو وہ عورت اترتی چڑھتی دکھائی دینے لگی تھی۔ خوف ہمارے دلوں میں بیٹھ گیا تھا مگر اللہ کا شکر ہے کہ ایسا کوئی واقعہ میرے گھر والوں کے ساتھ اب تک پیش نہیں آیا تھا۔ مگر ایک ڈر تو تھا جو کسی وقت بھی رونما ہو سکتا تھا۔

اب شام ہوتے ہی سب اپنے گھروں میں چلے جاتے تھے۔ بلڈنگ میں پہلے والی رونقیں ختم ہوگئی تھیں۔

میرا بہت دل چاہ رہا تھا روحی آنٹی کے گھر جانے کا، اُن سے پچھلے ایک ہفتے سے میں نہیں ملی تھی۔ وہ مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح چاہتی تھیں۔ ان کے تین بیٹے تھے، تینوں باہر سیٹل تھے۔ اور ایک بیٹی اس کی کب کی شادی ہوگئی تھی۔ میرا آنٹی کے گھر بہت آنا جانا تھا۔

شام کے وقت میں اور امی آنٹی کے گھر چلے گئے تو آنٹی بہت زیادہ کمزور لگ رہی تھیں۔ آنکھوں کے نیچے بھی کافی حلقے دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے پوچھا کہ کیا ہوا آنٹی بیمار ہیں آپ؟'' تو آنٹی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بولیں۔

''رات فاروق کو اپنے دوست کے بیٹے کی شادی میں جانا تھا۔ (فاروق روحی آنٹی کے شوہر ہیں) رات میں اکیلی تھی۔ دل بہت گھبرا رہا تھا۔ میں آکر کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہوگئی۔ میری نگاہ درخت پر پڑی تو مجھے لگا جیسے دو آنکھیں مجھے گھور رہی ہوں۔ میں خوف زدہ ہو کر بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔ اپنا خوف زائل کرنے کے لیے میں ٹی وی اونچی آواز میں لگا کر بیٹھ گئی۔ ٹی وی دیکھتے دیکھتے مجھے نیند کے جھونکے آنے لگے تو ٹی وی بند کر کے میں سوگئی۔ سوئے ہوئے پتا نہیں مجھے کتنی دیر ہوگئی تھی کہ مجھے لگا جیسے بیڈ پر کوئی لیٹا ہے۔ رات کے ایک بجے کا وقت ہوگا۔ میں سمجھ گئی کہ فاروق آگئے اور انہوں نے مجھے نیند سے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ بیل بجا کر چابی سے گیٹ کھول کر اندر آگئے ہوں گے۔ میں نے کروٹ بدلی تو خوف سے میرے رونگٹے کھڑے

ہو گئے ہیں۔

میرے برابر ایک عورت لیٹی ہوئی تھی۔ جس کے سفید لمبے بال اس کے منہ کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے میں چیخ مارتی وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے کھڑکی میں گئی اور غائب ہو گئی۔ اس کے بعد مجھے پتا نہیں کیا ہوا تھا۔

جب میری آنکھ کھلی تو فاروق کو اپنے سرہانے پریشان بیٹھے پایا۔ بس تب سے میری یہ حالت ہے میں خوف میں زندگی گزار رہی ہوں اور ہم اب یہ گھر بہت جلد چھوڑ رہے ہیں۔''

روحی آنٹی کی بات میرے ذہن پر سوار ہو گئی تھی کہ اب ہم زیادہ گھر سے بھی نہیں نکلتے تھے۔

☆......☆......☆

ایک رات میری خالہ کا بیٹا اپنے دوست کے گھر گیا ہوا تھا۔ رات آتے آتے اسے دو بج گئے۔ وہ بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ اُسے لگا جیسے کوئی اُس کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ رہا ہے۔ اُس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ تو وہی عورت آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ میرا کزن خوف سے وہیں دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے جیسے کچھ یاد آیا اور اُس نے دل ہی دل میں آیت الکرسی پڑھنی شروع کر دی۔ وہ عورت بہت خاموشی سے میرے کزن کے برابر سے ہوتی ہوئی اوپر چھت کی جانب بڑھ گئی۔

اس طرح کے اور بھی واقعات ہوئے مگر اب ہم لوگ جلد از جلد یہ گھر چھوڑنا چاہتے تھے۔ ہم نے اور خالہ نے اسٹیٹ ایجنسی سے بات کی اور تھوڑی تگ و دو کے بعد ہمارے گھر بک گئے۔ ہم لوگ بہت خوش تھے کہ جس خوف میں ہم نے یہ وقت گزارا تھا یہ ہم ہی جانتے تھے۔ سامان بھی دن کے دن ہی پہنچاتے اور کوشش یہی ہوتی کہ رات کوئی کام نہ ہو۔ پھر تھوڑے ہی دن میں ہم اپنے نئے گھر آ گئے۔

زلیخا ہماری کام والی ماسی پچھلے دو ہفتے سے نہیں آ رہی تھی۔ وہ ہمارے پرانے گھر سے کام پر لگی ہوئی تھی اور کافی پرانی تھی۔ وہ اب بھی اُسی بلڈنگ میں کام کرتی تھی۔ دو ہفتے بعد وہ آئی تو چہرے سے کافی بیمار لگ رہی تھی۔ امی نے پوچھا۔

''کیا ہوا۔'' تو کہنے لگی۔

''باجی کیا بتاؤں۔ نیچے باجی کے ہاں شادی چل رہی ہے۔ تو میں کام کی زیادتی اور باجی کے اصرار پر ان کے گھر رات کو رُک گئی تھی۔ مگر فجر سے پہلے میں گھر کے لیے نکل گئی۔ اب آپ کو تو پتا ہے کہ گندی گلی سے ہی راستہ ہے میرے گھر کا۔ میں تیز تیز چل رہی تھی کیونکہ مجھے گلی میں گھستے ہی خوف آنے لگا تھا۔ ابھی باجی میں درخت تک ہی پہنچی تھی کہ مجھے کسی عورت کے ہنسنے کی آواز آئی۔ میری نظر ڈرتے ڈرتے جوں ہی درخت پر پڑی تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک بھیانک چہرے والی عورت، جس کی آنکھیں سفید تھیں۔ الٹی درخت پر لٹکی ہوئی تھی اور آنکھیں گھما گھما کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ باجی میں گرتی پڑتی کیسے گھر آئی ہوں یہ میں جانتی ہوں۔ دنوں بخار میں پھنکتی رہی ہوں۔''

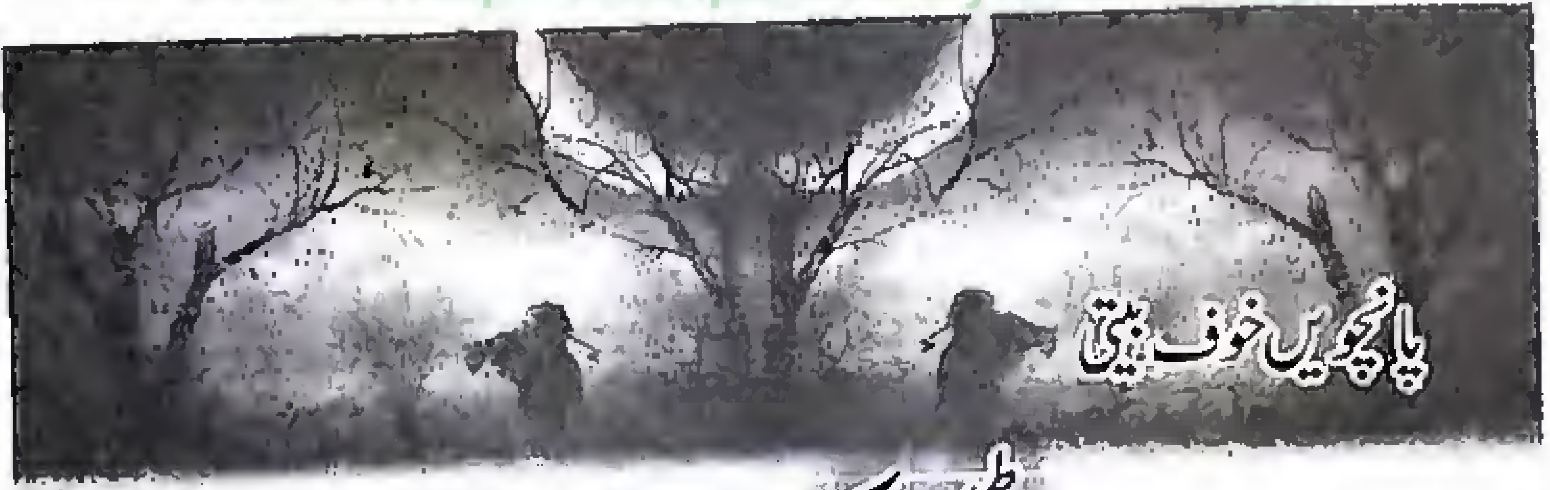
زلیخا کی اس بات سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ اگر خدانہ کرے میں دیکھ لیتی اس عورت کو تو نجانے کیا ہوتا۔'' اس کی بات سُن کر ہم گھر آ گئے۔ پھر میں کئی ماہ بعد جب ان کے گھر گئی تو پتا چلا۔

صلح مشورے کے بعد انہوں نے زلیخا کو کام سے نکال دیا تھا اور اپنے ہی علاقے کی کام والی کو رکھ لیا تھا۔ آج کئی ماہ گزر گئے ہیں۔ ماہا کے ہاں سب کچھ بالکل ٹھیک ٹھیک چل رہا ہے۔

ماہا کے چہرے پر بھی مسکان واپس لوٹ آئی ہے اور اُس کی آنٹی بھی خوش ہیں۔ وقت پر کیے گئے فیصلے ہمیں بہت ساری آفات سے بچا لیتے ہیں۔ زندگی بہت نازک ہے۔ اس کی قدر کریں۔

اپنے گرد قرآنی آیات کا حصار باندھ کر رکھیے کیا پتا آپ بھی کسی ایسے ہی نادیدہ حادثے سے دوچار ہوں تو یہ حصار آپ کی حفاظت کرے گا۔

☆☆......☆☆



ہوٹل کی وہ رات



نفیسہ فضل

ایک نوجوان کے ساتھ مری کے ایک ہوٹل میں پیش آنے والا پُراسرار قصہ

سارہ کی سال گرہ تھی میں نے سوچا کہ میں جاکر اسے وش کروں دراصل سارہ میری اکلوتی پوتی ہے۔ اُس کا بچپن میرے پاس ہی گزرا ہے اب تو ماشااللہ وہ ایمز یونیورسٹی سے ماس کمیونیکیشن میں ماسٹر کررہی ہے۔

وہ مجھے اچانک اپنے درمیان پاکر بے حد خوش ہوئی۔ اس کے کلاس فیلوز آئے ہوئے تھے۔ اس نے ان سب سے میرا تعارف کروایا۔ سب ہی بچے بہت ادب ومحبت سے ملے۔ ان میں سے علی اور کومیل عباس سے تو میں پہلے بھی مل چکی تھی۔ خیر پارٹی کے بعد میں اُٹھ کر اپنے بیٹے طاہر کے پاس آگئی۔ بہو رفعت بھی آکر میرے پاس بیٹھ گئیں۔ ہم باتیں کررہے تھے تو سارہ مجھے بلانے آگئی۔

''دادی امی میرے فرینڈز آپ کو بلا رہے ہیں۔'' سارہ مجھے اپنے ساتھ ہی ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ طاہر اور رفعت بھی میرے ساتھ آگئے۔ ایشال انعم اور اشعر بولے۔

''دادی امی ہمیں پتا چلا ہے کہ آپ کہانیاں لکھتی ہیں۔ ہمیں بھی پڑھنے کے لیے ڈائجسٹ دیں۔'' تب ہی کومیل عباس نے پوچھا۔

''اب آپ کس قسم کی کہانی لکھ رہی ہیں؟''

میں نے کہا کہ دسمبر میں پُراسرار نمبر کے لیے کسی کہانی کی تلاش ہے!'' تب ہی مدثر اور ذیشان نے کومیل سے کہا۔

''یار کومیل اپنا وہ مری والا قصہ سناؤ دادی امی کو۔''

مجھے تو تلاش تھی ہی کسی پُراسرار قصے کی! میں نے جھٹ کومیل سے فرمائش کردی۔

''ہاں ہاں بیٹا سناؤ کیا قصہ ہے۔'' تب کومیل گویا ہوا اور وہاں پر سارہ کے سب فرینڈز بھی ہمہ تن گوش ہوگئے۔

''یہ تین سال پرانی بات ہے۔ میں بیکن اسکول میں جاب کرتا تھا۔ میرے کولیگز صمد' عرشیہ' زارا' ذیشان اور علی نے پروگرام بنایا کہ مری کے ٹور پر چلیں۔ میں تو پہلے ہی گھومنے پھرنے کا شوقین ہوں، جھٹ سے میں نے ہاں کردی اور اگلے ہی ہفتے ہم چار دوست اور تینوں لڑکیاں، انعم' ایشال اور عرشیہ عازم سفر تھے۔ کراچی سے راولپنڈی کا سفر بذریعہ ٹرین کیا۔ ہم نے سلیپر میں بکنگ کرائی تھی۔ خوب ہلہ گلہ کرتے ہم راولپنڈی پہنچ گئے۔

وہاں ہم نے ایک ہوٹل میں کھانا کھایا چائے

وغیرہ پی کر ہم سب تازہ دم تھے۔ اچانک عرشیہ نے تجویز پیش کی کیوں نہ ہم آج یہاں رک جائیں اور شکر پڑیاں کی سیر کرتے ہوئے، فیصل مسجد دیکھ کر، مری کو چلیں۔

اس کی رائے پر سب نے اتفاق کیا، مری میں میرے ماموں کا ہوٹل ہے میں نے فون کر کے انہیں بتا دیا کہ ہم کل مری پہنچیں گے اور ہمیں دو کمرے چاہئیں۔'' ماموں نے کہا۔

''بیٹا بے فکر ہو جاؤ!'' غرض ہم شکر پڑیاں اور فیصل مسجد دیکھ کر صبح صبح مری پہنچ گئے۔

میں نے تو پہلے بھی کئی مرتبہ مری کا سفر کیا ہے جبکہ عرشیہ، صمد، زارا، علی اور ذیشان تو خوبصورت وادیوں کے نظاروں میں کھو گئے۔

جب وین ایک ہوٹل پر کچھ دیر کے لیے رکی تو ہم لوگ بھی نیچے اتر آئے۔ چائے وغیرہ پی کر ہم وین میں آ بیٹھے۔ صبح دس بجے ہم ماموں کے ہوٹل جا پہنچے۔

ماموں نے خود ساتھ جا کر ہمیں دو کمرے کھلوا دیے۔

دونوں کمرے برابر برابر تھے، ایک میں تینوں لڑکیاں اور دوسرے میں ہم چاروں دوستوں نے اپنا سامان رکھا۔ اتنی دیر میں ماموں جان نے ناشتا بھجوا دیا۔ ناشتے کے بعد لڑکیاں اپنے کمرے میں تیار ہونے چلی گئیں اور ہم بھی باری باری شاور لے کر تیار ہو کر باہر آ گئے۔

ہم ٹیرس پر کھڑے تھے اور دور تک ہماری نظریں سفید سفید پہاڑیوں کے مناظر دیکھ رہی تھیں۔ تب ہی تینوں لڑکیاں ایشال، انعم اور زارا آ گئیں کہ چلیں۔''

ہم ان کی پھرتی دیکھ کر حیران ہو گئے۔

''چلیں بھئی۔'' علی نے ذیشان اور مجھ سے کہا۔

''چلو بھئی مگر پہلے ایوبیہ چلتے ہیں۔'' سب اس بات پر متفق تھے۔ اور دوسرے دن بھوربن کا پروگرام بناتے ہم لوگ ہنسی خوشی وہاں سے چل دیے۔

ماموں جان نے گاڑی کا بندوبست کر دیا تھا۔ ہم



سب سارا دن خوب گھومے۔ شام کو میں نے کہا چلو اب واپس ہوٹل چلتے ہیں۔'' مگر علی اور مدثر کا دل نہیں کر رہا تھا کہ ابھی واپس جائیں مگر زارا، انعم، عرشیہ کہنے لگیں۔

''اب ہم تھک گئے ہیں پھر صبح بھوربن بھی جانا ہے۔'' میں نے اور ذیشان نے ان کی تائید کی کہ یہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ پھر ہم ہوٹل واپس آ گئے۔ چائے کے دوران ہم گپ شپ کرتے رہے۔ عرشیہ بولی۔

''اب ہم اپنے روم میں ریسٹ کرنے جا رہے ہیں۔ ڈنر پر ملاقات ہوگی۔'' ان کے جانے کے بعد ہم بھی اپنے اپنے بیڈ پر لیٹ گئے۔

☆......☆......☆

ویٹر کے دستک دینے پر ہماری آنکھ کھلی اس نے کہا آپ لوگ ڈنر کے لیے آ جائیں۔ ٹائم دیکھا تو نو بج رہے تھے۔ ہم لوگ اُٹھ کر جلدی جلدی تیار ہوئے اتنے میں وہ تینوں بھی آ گئیں۔ ہم نے بڑے اچھے ماحول میں کھانا کھایا، کڑائی، بریانی اور ماش کی بھنی دال، نان کے ساتھ۔ مجھے تو بریانی اور دال پسند ہے سب نے اپنی اپنی پسند کا کھانا کھایا اور کولڈ ڈرنک پی کر ہم ٹہلتے رہے۔

سب ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر سونے کے لیے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ہم بہت تھک چکے تھے، لہٰذا لیٹتے ہی ہم نیند کی وادیوں میں اتر گئے۔

ہم گہری نیند میں تھے کہ تیز ہوا سے ہماری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو ایسا لگا جیسے باہر تیز بارش ہو رہی ہے اور ہوا تیز ہے۔ ہم نے اٹھ کر کھڑکیاں بند کیں اور اپنے اپنے بیڈ پر سو گئے۔ ایک گھنٹے بعد محسوس ہوا جیسے کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں اور تیز ہوا کمرے میں آ رہی تھی۔ مگر کھڑکیاں بند تھیں اور کھڑکیوں کے بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ ہم نے کہا موسم خراب ہے اب صبح کیسے بھوربن جائیں گے۔ چلو سو جاتے ہیں۔''

صبح میری آنکھ کھلی تو میں نے پردے ہٹا کر کھڑکیاں کھولی ہی تھیں کہ اشعر، علی، ذیشان بھی اٹھ گئے۔ باہر کا نظارہ قابل دید تھا۔ مگر بارش کا تو کوئی نام ونشان نہیں تھا جبکہ تیز جھکڑ اور بارش کی آوازیں رات بھر سنائی دی تھیں۔

ہم سب تیار ہو کر ناشتے سے فارغ ہو کر بھوربن کی سیر کے لیے نکل گئے۔

ہم سب نے خوب انجوائے کیا قدرت کے حسین نظارہ پہاڑوں سے بہتے چشمے غرض ہم خوب لطف اندوز ہوئے۔

شام ہو گئی تھی گہرے بادل چھانے سے اندھیرا ہو گیا، تب ہم نے واپسی کا ارادہ کیا۔ غرض ہم آٹھ بجے تک ہوٹل واپس آ گئے۔

ماموں نے چائے کا کہا تو ہم نے ٹیرس میں ہی منگوالی جہ بہت مزا آ رہا تھا کیونکہ بارش شروع ہو چکی تھی اور خنکی بھی بڑھ گئی تھی۔ انعم اور عرشیہ کو سردی لگنے لگی تو وہ کمرے میں جانے کا کہنے لگیں اشعر اور علی نے بھی ان کی تائید کی کہ اندر روم میں بیٹھتے ہیں۔''

ہم سب اپنے روم میں آ گئے۔ باتیں ہوتے ہوتے زارا ایک دم سے بولی۔

''یہاں مری میں سنا ہے کہ آسیب ہوتے ہیں۔ ہم تو دو دن سے آئے ہوئے ہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔'' اس پر میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''تم جیسی حسین چڑیلوں کو دیکھ کر آسیب بھاگ گئے۔'' سب نے اس بات پر ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ ہم اسی طرح باتیں کر رہے تھے کہ ویٹر نے آ کر کہا صاحب کھانا لگ چکا ہے۔''

سب کو بھوک بھی زوروں کی لگی تھی سو سب اُٹھ کر چل دیے۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم سب لڑکیوں کے کمرے میں آ گئے۔ مدثر نے کہا۔

''چلو بیت بازی کرتے ہیں۔'' سب راضی ہو گئے۔ پتا ہی نہیں چلا اور رات کا ایک بج گیا۔ میں نے کہ یار اب بس کرو۔ ان لڑکیوں کو بھی سونے دو۔ ہم اپنے روم میں چلتے ہیں۔''

ہم شب بخیر کہہ کر اپنے اپنے روم میں آ کر لیٹ گئے۔

☆......☆......☆

رات کا نجانے کون سا پہر تھا کہ کھڑکیاں

کھڑکھڑانے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ برابر میں علی گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے اُٹھ کر کھڑکیاں بند کیں اور منہ پر چادر لے کر سو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ایسا لگا کسی نے میری چادر کھینچی ہے۔ میں گہری نیند میں تھا کروٹ لے کر سو گیا۔ لڑکیوں کے زور زور سے ہنسنے کی آواز پر میری آنکھ کھلی گئی کہ یہاں بند کمرے میں لڑکیاں کہاں سے آ گئیں؟''

سامنے نظر گئی تو ایسا لگا دو لڑکیاں کھڑی ہنس رہی ہیں مگر یہ تو کوئی اور ہی تھیں۔

علی بھی اُٹھ چکا تھا اس نے بھی ہنسنے کی آوازیں سنی تھیں۔ میں نے اور علی نے ایک ساتھ مدثر اور اشعر کے بیڈ پر چھلانگ لگا دی۔ ہمارا بیڈ ان سے ذرا فاصلے پر تھا۔ وہ دونوں ہڑ بڑا کر اٹھ گئے۔ جیسے ہی اُن کی نظر سامنے اٹھی تو ان لڑکیوں پر ان کی بھی نظر پڑی۔ دروازے کھڑکیاں سب بند تھیں پھر یہ کہاں سے آ گئیں؟''

دیکھتے ہی دیکھتے ان کے برابر میں ایک آدمی بھی آ کر کھڑا ہو گیا۔ بہت لمبا کالا سیاہ تھا، جسم پر بال تھے میں نے نعرہ لگایا یا علی مدد اور ساتھ ہی آیت الکرسی کا ورد اونچی آواز سے شروع کیا۔ اچانک وہ تینوں غائب ہو گئے اور ہم چاروں نے لڑکیوں کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔ ہمارے بری طرح دروازہ پیٹنے پر تینوں لڑکیاں گھبرا کر اُٹھ گئیں۔ ہمیں یوں حواس باختہ دیکھ کر وہ بھی خوف سے لرزنے لگیں۔ اندر آ کر جب ہمارے اوسان بحال ہوئے تو انہیں سب قصہ سنایا۔ عرشیہ اور زارا تو سن کر رونے لگیں اور بولیں۔

''اب ہمیں یہاں نہیں رہنا۔ بس واپس کراچی چلو۔''

صبح تک ہم لوگ جاگتے رہے۔

صبح جب ناشتے پر ماموں سے ملاقات ہوئی تو ہم نے رات والی بات اور اس سے پہلی رات کا قصہ ماموں کو سنایا اور کہا کہ ماموں آپ نے ہمیں آسیب زدہ کمرہ دے دیا۔'' ماموں بولے۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

پھر وہ ہمارے ساتھ کمرے میں آئے کمرہ اسی طرح تھا۔ ہم نے جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹا علی لڑکیوں کے ساتھ ان کے کمرے میں تھا۔ ہم نے سب کھڑکی دروازے بند کیے اور سامان لے کر باہر آ گئے۔ اتنے میں علی بھی زارا، انعم، عرشیہ کا سامان لے کر آ گیا۔ ذرا آگے گئے تو علی بولا۔ میرا بیگ کہاں ہے ہم نے کہا وہاں تو نہیں تھا۔ علی نے کہا بیڈ کے نیچے تھا۔ میں نے کہا تم لوگ یہیں ٹھہرو میں لے کر آتا ہوں۔''

یہ کہہ کر میں کمرے میں گیا تو حیران رہ گیا۔ پردے ہٹے ہوئے تھے، کھڑکیاں کھلی تھیں، جبکہ میں پردے ڈال کے کھڑکیاں بند کر کے آیا تھا۔ میں نے جلدی سے بیڈ کے نیچے سے بیگ نکالا...... مگر یہ کیا کوئی بیگ اپنی طرف کھینچ رہا تھا جبکہ میں اپنی طرف بیگ کھینچ رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں آیا اور میں نے آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا۔ بس کسی نے جھٹکے سے بیگ چھوڑ دیا۔ میں بیگ لے کر دروازے تک پہنچا تھا کہ مجھے ان لڑکیوں اور اس مرد کے قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ میرے اوسان جاتے رہے تھے۔

میرے ساتھیوں نے جو مجھے دیکھا تو گھبرا گئے سب یک زبان ہو کر بولے کہ کیا ہوا کومیل عباس! تو تو بہت دلیر ہے۔'' میرے پسینے بہہ رہے تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ہم نے ماموں کو خدا حافظ بھی نہ کہا۔ پنڈی آ کر ماموں کو فون کر کے بتا دیا۔

کراچی آنے تک مجھے سخت بخار تھا۔ گھر پہنچ کر علی وغیرہ نے میری امی کو سب باتیں بتا دیں۔ امی اسی وقت مجھے لے کر شاہ حیدر عباس صاحب کے پاس گئیں انہوں نے دم کیا۔ پانی پڑھ کر دیا۔ تب کہیں جا کر تین دن بعد میرا بخار اُترا اور میں نارمل ہوا۔''

کومیل کی یہ کہانی میں سچی کہانیاں کے قارئین کے لیے تحریر کر رہی ہوں۔ آپ کو کیسی لگی پلیز اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔

☆☆......☆☆



تین صدیوں بعد بھی

شازیہ محسن

مستقبل کا آئینہ دکھاتی، ایک اسرار بھری حکایت

یہ مہذب لوگوں کا ادارہ تھا اور یہ ادارہ جہاں قائم تھا۔ وہ ایک محل تھا۔ 'قصرِ ڈریکولا' کے طرز پر اس کا نام ہی پڑ گیا تھا۔ 'قصرِ مہذب'۔

اور یہ قلعہ ایک گھنے جنگل میں واقع تھا۔ رات کے سناٹے میں یہ محل اور بھی خوفناک لگتا۔ جیسے بہت ساری ویمپائرز مل کر چیخ رہی ہوں۔ اور ڈریکولا انسان کا خون پینے کے بعد دیواروں پر اُلٹا رینگتا ہوا اپنے تابوت میں بند ہوتے جا رہا ہو۔

کہتے ہیں قصر مہذب میں پہلی بار داخل ہوتے وقت کچھ ایسا ہی احساس ہوتا تھا۔ جیسے بہت ساری چمگادڑوں نے اچانک ایک ساتھ آپ پر شب خون مار دیا ہو۔ ان ساری باتوں کے باوجود یہ ادارہ دن بدن ترقی کر رہا تھا اور مہذب لوگوں کی فہرست میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

وہ ایک بوڑھا شخص تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور ڈراؤنی، چہرے پر پڑی ہوئی دنیا جہان کی لکیریں اُس کے تجربے کار ہونے کی گواہی دے رہی تھیں۔ وہ اس ادارے کا سرپرست تھا۔ ممبر بننے آئے ہوئے لوگوں کو پہلے اس کے طویل اور اُکتا دینے والے انٹرویو سے گزرنا پڑتا تھا۔ یوں انٹرویو کے دوران وہ سوال کم ہی کرتا مگر اس کی برچھی جیسی آنکھیں برابر پوچھے جانے والے کے جسم میں گھسی جا رہی ہوتیں۔

آج اس کا پہلا دن تھا۔ جب اس نے مہذب لوگوں کے اس ادارے میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر کی اور 'قصرِ مہذب' میں اس کے قدم داخل ہوئے تھے۔ اب وہ آقا کے سامنے کھڑا تھا۔ اور اس کی لرزا دینے والی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

''میرے محترم دوست! کیا تم اپنے مہذب ہونے کی کوئی دلیل دے سکتے ہو؟''

''ہاں!'' اس نے سینہ فخر سے پھیلاتے ہوئے کہا۔

''میں جس محلے سے آ رہا ہوں، وہ سفید پوش لوگوں کا محلہ ہے۔ پتا نہیں کہاں سے تین سیاہ فام وہاں آ کر بس گئے تھے۔''

''میرے عزیز شاباش! پھر تم نے کیا کیا؟''

''میں نے تینوں سیاہ فاموں کی قسمت میں بے رحم موت لکھ دی۔''

''شاباش میرے عزیز! ایسا کر کے تم نے برابری کا ثبوت دیا۔ وہ برابری جو آج کے تہذیب یافتہ، ملک کے لیے ضروری ہے۔''

اور پھر وہ مہذب ہونے کی دلیل ہے۔ تاہم تمہیں ایک پل صراط سے گزرنا باقی ہے۔ گزر سکو گے؟''

''ہاں!''

''تو جاؤ!'' بوڑھے کی گہری نیلی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ ''اپنے ان پچیس نئے ساتھیوں کو شامل کر لو۔'' اس نے اشارہ کیا۔

''اور شہر کے متوسط علاقے کی طرف نکل جاؤ، سنا ہے

وہاں بچے کافی پیدا ہو رہے ہیں۔ تم اپنا کام جانتے ہو؟''

''ہاں! یہ بچے سرکش ہیں۔ کل ان کے بگڑے ہوئے تیور انہیں تہذیب سے دور کر سکتے ہیں۔''

''شاباش میرے عزیز! وحشی قوموں کو یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ سرکش اور باغی بنیں۔ اور حکومت کریں۔ یہ عین تہذیب کے منافی ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے بچوں کو تہذیب کی مقدس راہ پر قربان کر دو۔ اور شاباش! وہاں سے فاتح بن کر اور ہماری اس عظیم تہذیب کے لیے بنائی گئی تنظیم میں شامل ہو جاؤ۔''

''جیسا حکم آپ کا۔''

انہوں نے سروں کو جھکا لیا۔

آقا نے تالی بجائی۔

''اب تم لوگ جاسکتے ہو۔''

اور مشینی انداز میں سب آقا کی بتائی گئی سمت کی جانب روانہ ہو گئے۔ شام واپسی پر آقا کو اپنی رپورٹ پیش کرنی تھی۔

نوجوان کی آنکھوں میں پُراسرار سی چمک تھی۔ اور وہ اپنے بازو کی مچھلیوں کے خون میں کئی گنا زیادہ حرارت محسوس کر رہا تھا۔ اور شام میں سارے کے سارے فاتح بن کر لوٹ آئے۔ اُن کے ہاتھ پاؤں، ناپاک بچوں کے خون میں رنگے جا چکے تھے اور بقول اُن کے وہ خوش تھے کہ اب بہت جلد وہ مہذب لوگوں میں شامل کیے جانے والے ہیں۔

''شاباش!'' آقا کی بلند آواز گونجی۔

''اب آخری سوال اور اس کے بعد تم سب ہمارے اس عظیم خاندان کے اہم افراد میں شمار کیے جاؤ گے۔ تو عزیزو! میں کیسا خوش ہوں تمہارے منہ سے یہ جان کر کہ تم نے ان چھوٹے چھوٹے ناپاک بچوں کو، ہاں ناپاک بچوں کو کہ وہ بڑے ہو کر تہذیب کی مقدس آسمانی کتاب کے خلاف آوازِ احتجاج بلند کر سکیں۔ تم نے ان بچوں کو ہی ختم کر دیا۔ آنے والی اس نسل کو بڑا ہونے سے پہلے کچل ڈالو۔ کہ یہ تہذیب کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ شاباش! میرے عزیزو! اب تم مہذب لوگوں میں شامل ہونے کو تیار رہو۔ تو نوجوان! تم بتاؤ ان مسحور کن لمحات کی داستان سناؤ کہ وہ کیسے چیخے، تڑپے، چلائے۔ ہائے وہ لمحہ کتنا خوبصورت ہوگا۔ میں جاننے کے لیے بے چین ہو رہا ہوں۔ مہربانی کر کے مجھے بتاؤ۔

''تو یوں ہوا میرے آقا......'' نوجوان نے واقعے کو یاد کرنا شروع کیا کہ کیسے اس نے چھوٹے چھوٹے بچوں پر اسلحے تان لیے ہلا بول دیا۔ ان کی بوٹیوں کے بھی کئی کئی ٹکڑے کر دیے اور آہ...... وہ لڑکی...... دلخراش چیخ تھی۔ جب اس کا بھیجا ایک تیز آواز سے پھٹا تھا۔ آہ لمحے بھر کے لیے اس کے جسم میں ٹھنڈی لہر دوڑ گئی تھی۔''

''آہ! سب ضائع ہوا آہ! وہ کیسی خوبصورت صدا رہی ہوگی۔'' آقا زیرِ لب بڑبڑا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

''نوجوان تم نے وقت ضائع کر دیا۔ کچھ کمی رہ گئی ہے تمہارے اندر، ورنہ تم اس لڑکی چیخ پکار میں بھی سرور تلاش کرتے آہ! تمہاری ساری محنت ضائع ہو گئی۔ واپس جاؤ، واپس جاؤ، واپس جاؤ، واپس جاؤ۔ نوجوان اس چیز کو بھلانے کی کوشش کرو اور اس کی آہ و بکا میں شراب جیسا نشہ تلاش کرو۔ وہ نشہ جو تمہیں مہذب بنا سکے۔''

اور نوجوان دبے قدموں سے باہر نکل رہا تھا۔ کتنے افسوس کا مقام تھا۔ تہذیب کی تین صدیاں گزرنے کے بعد بھی وہ مہذب نہیں ہو سکا تھا۔

☆☆......☆☆



عائشہ شفقت



کراچی کے بارے میں اکثر سنا تھا کہ یہاں پر مافوق الفطرت بکثرت پائی جاتی ہیں۔ مجھے بھی ایسی چیزوں کو دیکھنے کا بہت شوق تھا اور ابھی بھی ہے۔

میں نے سنا ہے کہ اگر کوئی غیر مرئی شے آس پاس ہو تو ماحول میں خنکی بڑھ جاتی ہے۔ سو جب بھی اچانک ہوا سرد ہوتی میں بے اشتیاق پاپا سے پوچھتی کہ یہاں پر کوئی شے موجود ہے کیوں کہ پاپا کے پاس اگر کوئی غیر مرئی شے موجود ہو تو، انہیں فوراً احساس ہو جاتا ہے، مگر ہر دفعہ میرے سوال کا جواب نہ میں ہوتا۔

☆……☆……☆

مجھے اچھی طرح یاد ہے میں جس اسکول میں پڑھتی تھی اس کے برابر میں ہی ایک گورنمنٹ کا اسکول بھی تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ اس اسکول میں آسیب ہے۔ میری کلاس پہلی منزل پر تھی اور کلاس کی کھڑکی اس اسکول کے باغ کی جانب کھلتی تھی۔ میں جب بھی اس طرف نگاہ ڈالتی مجھے ہمیشہ جنگل جلیبی کے درخت کے پاس ایک لڑکی سر جھکائے بیٹھی دکھائی دیتی تھی۔ میرا بہت دل چاہتا تھا کہ میں جاؤں اور پوچھوں کہ وہ اکیلی کلاس چھوڑ کر یہاں کیوں بیٹھی رہتی ہے۔ مگر میری حسرت، حسرت ہی رہی۔ مجھے بہت حیرت ہوئی جب میں پانچ سال بعد اچانک اپنے اسکول گئی اور اپنی کلاس دیکھنے کی خواہش میں اس کھڑکی کے پار دیکھا تو وہی منظر جوں کا توں تھا۔ وہ لڑکی جنگل جلیبی کے درخت کے نیچے اسی حالت میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ یہ میری زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ تھا۔ لیکن میں آپ کو اپنے پاپا کے بارے میں بتادوں کہ ان کا اکثر ایسی چیزوں سے ٹکراؤ ہوتا رہتا تھا۔

ایک یادگار واقعہ میرے پاپا کے ساتھ پیش آیا۔ من و عن انہی کی زبانی بیان کر رہی ہوں۔

بچوں کے ساہیوال شفٹ ہونے کے بعد میں سرجانی آ گیا اور ایک دوست کے ساتھ کمرہ شیئر کرنے لگا۔

کسی زمانے میں جب یہاں زیادہ آبادی نہیں تھی۔ تو یہی مشہور تھا کہ یہاں غیر مرئی مخلوق کا مسکن ہے مگر اب جو انسانوں کی آبادی میں اضافہ ہوا تو شاید مخلوق نقل مکانی کر گئی۔

ایک دن میں صدر سے سرجانی گھر کی طرف آ رہا



تھا۔ موٹر سائیکل خراب ہونے کی وجہ سے اس دن میں نے فورسیٹر کو عزت بخشی۔ سواریاں سب ہی اپنی اپنی منزل پر اتر چکی تھیں۔ صرف میں ہی رہ گیا تھا۔

☆☆......☆......☆

سرجانی کی طرف جاتے ہوئے ایک موڑ پر تیرہ چودہ سال کا لڑکا کھڑا رکشے کو ہاتھ ہلا رہا ہے۔ رکشے والے نے رکشہ روک کر اس سے جگہ پوچھی۔ اس نے اگلے چوک جانا تھا۔ رکشے میں جگہ تو تھی ہی اس لیے اسے بھی بٹھالیا۔ اسے بیٹھے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ رکشہ بھاری ہونا شروع ہوگیا۔

جیسے ہی مجھے احساس ہوا میں نے مڑ کر دیکھا تو جس جگہ سے وہ بچہ بیٹھا تھا۔ وہاں سے اس کی ٹانگیں لمبی ہوتی آرہی تھیں جبکہ وہ بچہ بالکل بے خبر اردگرد سے بے نیاز بیٹھا ہوا تھا۔ جوں جوں فاصلہ بڑھتا گیا اس بچے کی ٹانگیں بھی لمبی ہوتی گئیں۔ رکشہ والا بھی اس بات سے بے خبر رکشہ چلا رہا تھا۔

جیسے اس بچے کی منزل آئی، تو اس کی ٹانگیں میرے دیکھتے ہی سکڑ گئیں اور وہ ایک نارمل انسان کی طرح بن گیا۔

☆☆......☆......☆

اترنے کے بعد وہ ایک موڑ پر ایک گڑھے میں اتر کر غائب ہوگیا۔ اس سارے عمل کے دوران مجھے خوف محسوس نہیں ہوا۔ بلکہ میں یہ سوچتا رہا کہ اس کا تعلق جنات کی نسل سے تھا یا کسی اور مخلوق سے......

رکشے والے کو اس بارے میں میں نے کچھ نہ بتایا کہ وہ کسی ڈر یا خوف سے کوئی حادثہ ہی نہ کروا بیٹھے۔ اپنی منزل پر پہنچنے کے بعد کرایہ ادا کرتے ہوئے میں نے اسے بتایا۔ تو وہ خوف سے پیلا پڑ گیا۔ یہ آج تک سمجھ نہ آیا کہ اس کا تعلق کس مخلوق سے تھا اور انسانوں کی دنیا میں کس کام سے آیا تھا۔ جو بھی ہو، قدرت کے راز نہ پہلے کوئی جان پایا ہے اور نہ شاید کبھی کوئی جان پائے۔

☆☆......☆☆



کچھ انہونی یادیں

منزل خان



آج جب میری بیوی کو ہارٹ اٹیک ہوا تو میری بڑی نواسی نانی کی خدمت کے لیے ہمارے یہاں ہی رہ گئی تھی۔ وہ کیا آئی کہ ہمارے سُونے آنگن میں جیسے بہار ہی آ گئی تھی۔ جو گھر ہمیں کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ اس میں تو جیسے اُس کی باتوں سے پھول کھل اٹھے تھے یا پھر شاید بچوں کی غیر موجودگی کی وجہ سے میں زیادہ ہی حساس ہو گیا تھا۔

میرا نام تو میرے والدین نے کچھ اور رکھا تھا مگر سب مجھے ''خان بابا'' کہہ کر پکارتے تھے۔ میری چار بیٹیاں تھیں۔ ''تھیں'' اس لیے کہ سب سے چھوٹی دونوں بیٹیاں جڑواں تھیں۔ ان میں سے ایک کا ایک خوبصورت بچی کی ولادت کے کچھ ماہ بعد انتقال ہو گیا۔ جب ہمارے جانے کے دن تھے تب جوان بیٹی چلی گئی تھی۔ ہماری تو جیسے پیروں تلے زمین ہی نکل گئی تھی۔ اب تو جیسے تیسے بس دن پورے کر رہے ہیں۔

میں بات کر رہا تھا اپنی نواسی کی، تجسس تو جیسے اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اور بات اگلوانے کے فن میں بھی وہ ماہر تھی۔ یا پھر میں نے ہی یادوں کی گٹھری اٹھائے اٹھائے زندگی کی کتاب کھول کر اس کے سامنے رکھ دی تھی۔

''نانا! آپ لوگ کراچی کب آئے تھے؟'' میری نواسی حوریہ نے پوچھا تھا۔

''بیٹا! نو عمری میں ہی اپنے ایک عزیز کی گاڑی پر کنڈیکٹر لگ گیا تھا اور یوں میرا کراچی آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ مگر مستقل طور پر شادی کے بعد بیوی اور ماں کے ساتھ یہاں آیا تھا؟'' میں نے تفصیلاً اسے جواب دیا۔

''نانا کیا آپ نے جن بھوت دیکھے ہیں۔'' حوریہ نے تجسس سے مجھے کریدتے ہوئے پوچھا تھا۔

''ہاں' بہت بار ہمارا کام مال سپلائی کرنا ہوتا ہے مختلف علاقوں میں، جس کی وجہ سے ہمارا گزر ایسے راستوں سے ہوتا تھا۔ جو بہت سنسان اور ویران ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک مرتبہ ہمیں رات کے وقت بھوک نے ستایا تو ہوٹل کے لیے نظریں اِدھر اُدھر دوڑائیں تو سامنے میدان میں مدھم سی روشنی دکھائی دی۔ ہم نے گاڑی اسی طرف موڑ دی۔ ہم اس روشنی کے جتنا قریب جاتے تھے وہ ہم سے اتنا ہی دور ہوتی جا رہی تھی۔

آخر ہم نے تنگ آ کر واپسی کا ارادہ کیا تو

احساس ہوا کہ ہم کتنا دور نکل آئے ہیں۔'' میں نے حوریہ کو جو واقعہ ذہن میں آیا سنا رہا تھا۔

''کوئی اور سنا ئیں نانا جان۔'' حوریہ نے دوبارہ ضد کی تھی۔

''جب میں چھوٹا تھا تو گاؤں میں اکثر میں اور ماں رات کے وقت ہینڈ پمپ سے پانی بھرنے جاتے تھے کیونکہ صبح ہینڈ پمپ پہ لمبی لائن ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ ہم لوگ رات میں پانی بھرنے جا رہے تھے کہ میں نے دیکھا کہ ہمارے چچا کے باغ میں ایک شادی کی تقریب ہو رہی تھی۔

میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر شادی دیکھنے گیا کہ اتنی رات گئے کس کی شادی ہو رہی ہے۔ مگر جیسے ہی میری دولہا کے عجیب و غریب چہرے پر نظر پڑی تو خوف زدہ ہو کر گھر کی جانب دوڑ لگا دی تھی۔ اس کے بعد مجھے کئی روز تک سخت بخار رہا اور ہم نے رات کو باہر نکلنے سے توبہ کر لی تھی۔

اسی طرح جوانی میں اپنے دوست کے ساتھ رات گئے گھر آ رہا تھا کہ پیچھے سے ہمیں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ جب ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک قد آور شخص جس کا سر بادلوں میں گم تھا ہمارے پیچھے چل رہا تھا۔ میں نے اپنے بڑوں سے سنا تھا جن بھوت وغیرہ لوہے کی چیز سے ڈرتے ہیں۔ اسی لیے احتیاطاً میں نے چھوٹی سی چھری جیب میں رکھ لی تھی۔ میں نے جیب سے چاقو نکالا اور گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ جیسے ہی ہم گھر کے قریب پہنچے تو ہمیں پیچھے سے آواز آئی۔

''اگر تمہارے ہاتھ میں آج چاقو نہیں ہوتا تو تم آج یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔'' میں نے جو واقعات یاد آئے وہ حوریہ کو سنا دیے۔

''اچھا نانا! کیا آپ کو قسمت پر یقین ہے؟'' اس نے پھر سوال کیا۔

''ہاں! کیونکہ جس طرح نیکی سے عمر بڑھتی ہے اسی طرح ماں کی دعاؤں سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ کیونکہ جو طاقت مجھے کئی بار موت کے شکنجے سے کھینچ لائی وہ میری ماں ہی کی دعاؤں کا اثر تھا۔''

میں نے جواب دیا تھا مگر شاید میں نے اس کی سمجھ سے ہٹ کر کوئی بات کر دی تھی۔ حوریہ جو مجھ سے کسی واقعے یا کہانی کی امید لیے بیٹھی تھی کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی تھی۔

''کیا مطلب نانا جان!'' میں اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے بولا۔

''میرا مطلب ہے کہ میں نے بہت بار موت کو شکست دی ہے۔ کراچی میں مستقل طور پر گھر لینے کے بعد میں نے اپنی گاڑی لے لی تھی۔ جس میں، میں مال سپلائی کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اپنی گاڑی سے مال اُتار کر مال گاڑی پر مال لوڈ کرنے کے بعد میں بہت تھک چکا تھا۔ سہ پہر کی کڑک دھوپ نے بدن کو اور نڈھال کر دیا تھا۔ میں تھوڑا تھکاوٹ دور کرنے کی نیت سے مال گاڑی کے ڈبے کے نیچے ستانے کے لیے لیٹ گیا۔ جلد ہی نیند نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ٹرین کے چلنے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ یکے بعد دیگرے ڈبے میرے اوپر سے گزرنے لگے جن کی کھڑکھڑاتی آواز سے میرے دماغ کی رگیں پھٹنے لگی تھیں۔ اور کچھ ہی دیر بعد میرا دماغ تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ مگر جب میں ہوش میں آیا تو خود کو اسپتال میں پایا تھا۔ دراصل بات یہ ہوئی جب میں مال گاڑی کے ڈبے کے نیچے لیٹا تو اس وقت اس کے ساتھ انجن نہیں تھا۔ میرے سونے کے بعد اسے آگے کی طرف سے لا کر ان کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا۔ اور ڈبوں کے آخر میں اُن کا دوسرا انجن موجود نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے میری جان بچ گئی تھی۔''

''نانا جان میری چھٹیاں ختم ہو گئی ہیں۔'' حوریہ نے اپنے گھر جاتے ہوئے ہمیں خدا حافظ کہا۔ اور یوں ہمارا ہنستا کھیلتا ہوا گھر پھر سے سُونا ہو گیا تھا۔

ہم دونوں میاں بیوی کبھی ایک دوسرے کو اور کبھی ویران در و دیواروں کو تکتے رہتے ہیں۔

☆☆......☆☆

ناول

کاشی چوہان

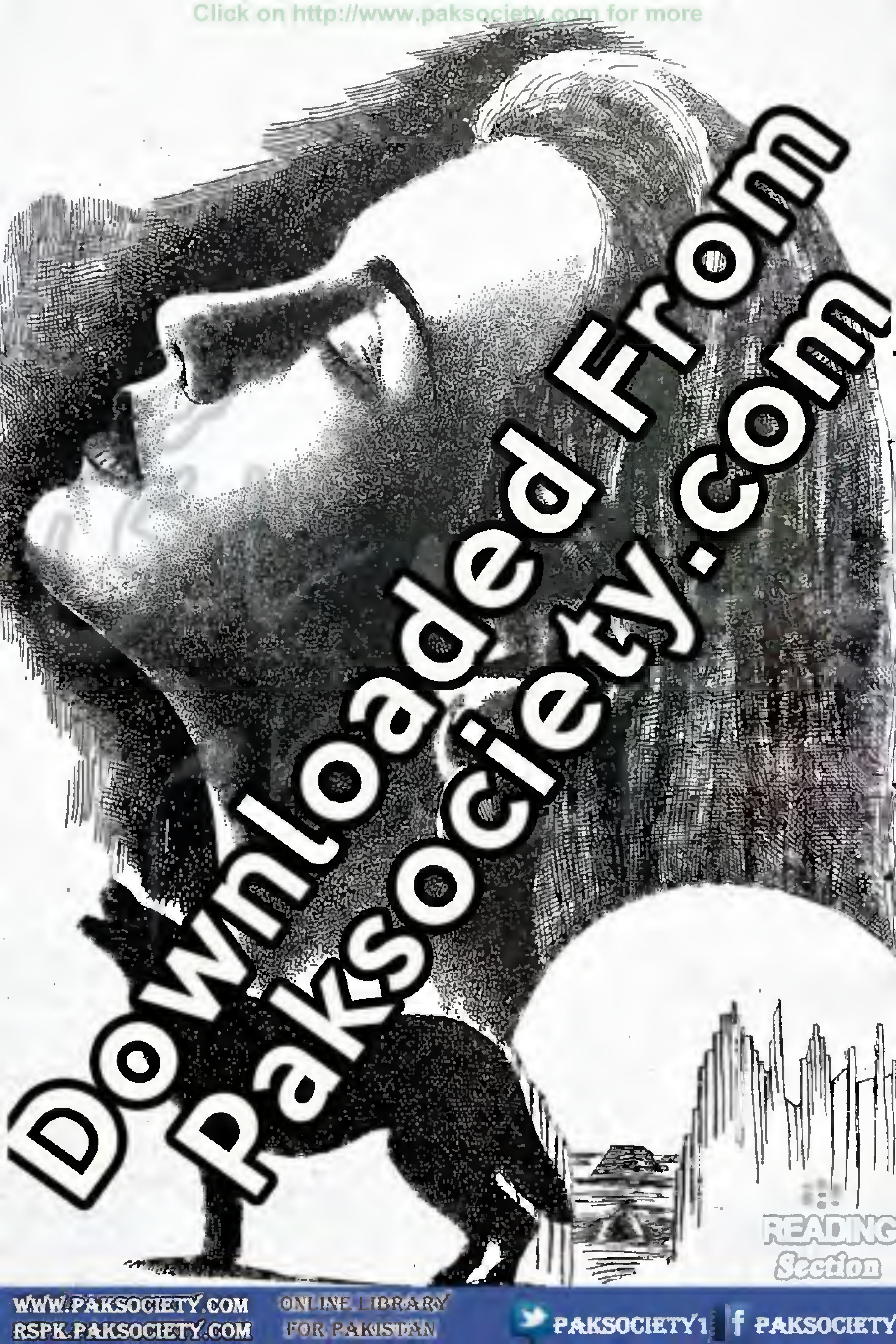
زہرِ عشق

خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور، عشق کی ایک ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

قسط نمبر: 10

اسے ایک بڑے سے کمرے میں بلا لیا گیا۔ پڑھانے والے پانچ اساتذہ، ابوریحان اور نگراں کمرے میں اور ایک اردلی کمرے کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ وہ کلاس میں داخل ہوا تو سب سے پہلے اسے اردلی نے ہی دیکھا۔ وہ ایک ایسے طالب علم کی طرح کمرے میں داخل ہوا جو کسی بھی امتحان کے وقت اپنے چہرے پر گھبراہٹ طاری کر لیتے ہیں اور کوئی انجان آدمی بھی ان کو دیکھ کر یہ سمجھ سکتا ہے کہ وہ کس مشکل میں ہیں۔ ابوریحان کے چہرے پر افسردگی اور مایوسی کی سی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ انھیں کامل یقین تھا کہ ان کا یہ ہونہار شاگرد آج اس مدرسے سے نکالا جائے گا۔ وہ تو کیا کوئی بھی ہوتا تو اسی طرح سوچ رہا ہوتا کہ کوئی طالب علم بھلا ان اسباق میں سے کسی بھی سوال کا جواب کیسے دے سکتا ہے جو اس نے پڑھا ہی نہ ہو۔ انھیں نگراں پر غصہ تھا جس نے اتنی عجلت اور جذبات میں اس طرح کا فیصلہ کر دیا اور وہ چاہتے ہوئے بھی سلمان کی کوئی مدد نہیں کر سکے۔ رات کو وہ سلمان کو تلاش کرتے رہے تاکہ اس سے اظہارِ ہمدردی کر سکیں مگر انھیں سلمان نہیں ملا تھا۔ اور سے وہ اپنا پیغام ملاقات بھجوانا نہیں چاہتے تھے کہ کہیں نگراں کو پتا چل گیا تو اسے اچھا نہیں معلوم ہوگا۔ اب انھوں نے سلمان کو ہمدردی سے دیکھا اور دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر سلمان ناکام ہوا جیسا کہ وہ جانتے تھے وہ ضرور ناکام ہوگا۔ تب وہ اس سے ملاقات کر کے کہیں گے کہ وہ یہاں سے جانے کے بعد بھی ان سے رابطہ میں رہے اور ان سے اپنا سلسلہ منقطع نہ کرے۔ وہ سلمان کی صلاحیتوں کے دل سے معترف تھے اور چاہتے تھے کہ اس غیر معمولی لڑکے کی صلاحیتوں کے کمالات اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ انھیں یقین تھا کہ یہ لڑکا جس کا نام سلمان ہے مستقبل میں کوئی نہ کوئی بڑا اور عظیم کام ضرور کرے گا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ وہ یوں اپنی آنکھوں کے سامنے اس کی بے عزتی ہوتے ہوئے دیکھیں گے اسے بے رحمی اور سنگ دلی کے ساتھ مدرسے سے نکال دیا جائے گا اور وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔ انھیں بے پناہ دکھ تھا۔

سلمان نے کلاس میں اپنی کرسی کی طرف بڑھتے ہوئے ابوریحان کی طرف دیکھا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ سلمان کی آنکھوں میں ایک ایسا یقین اور اعتماد انھیں دکھائی دیا کہ وہ خود سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکے کہ یہ


Downloaded From
Paksociety.com
READING
Section

کیسے ممکن ہے۔ ایک لڑکے کے چہرے پر گھبراہٹ ہو مگر اس کی آنکھیں بولتی ہوں کہ میں ہر امتحان کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوں۔

ابھی اسی کشمکش میں تھے کہ سلمان جو اپنی کرسی کے پاس جا کر کھڑا ہوا تھا اسے بیٹھنے کو کہا گیا۔ وہ ایسے بے آواز بیٹھا جیسے اس کا وجود ہوا سے بنا ہوا ہے۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ اس نے آج سے پہلے کبھی اس مدرسے میں اپنی جناتی صلاحیتوں کو استعمال نہیں کیا تھا مگر آج اسے اس کی ضرورت تھی۔ کیونکہ جس طرح کے حالات وہ اپنے قبیلے اور گھر میں چھوڑ کے آیا تھا ان حالات میں اور جو کچھ اس نے یہاں آ کے سنا تھا کہ اس کی صنوبر کسی اور کے عشق میں بتلا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ مدرسے میں اور کچھ عرصے قیام کرے۔ ورنہ اس نے سوچ رکھا تھا کہ اگر اس کے والدین قبیلے کو چھوڑ کر اس کے ساتھ آنے کو تیار ہو گئے تو وہ مدرسے واپس نہیں آئے گا پھر اس کا نام خارج ہو یا نہ ہو اسے پروا نہیں تھی۔

پہلا سوال خاموش کمرے میں گونجا اور کلاس روم خالی ہونے کی وجہ سے سوال اس طرح سنا گیا جیسے بار بار پوچھا گیا ہو۔ نگراں کے چہرے پر ایک تمسخرانہ مسکراہٹ کھیل گئی۔ انھیں یقین ہو گیا کہ پہلے ہی سوال میں سلمان ناک آؤٹ ہو جائے گا۔ اس طرح ابوریحان کو بھی شکایت نہیں رہے گی کہ ان کے ہونہار طالب علم کو موقع نہیں دیا گیا۔ ایک طرف ایک سلمان اپنے کمرے میں صنوبر کے لیے پریشان تھا اور مدرسے کے رہائشی یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ کل کے امتحان کی تیاری میں مشغول ہے تو دوسری طرف نگراں نے اپنی پسند کے چنیدہ اساتذہ کو اس کام پر مامور کر دیا کہ وہ ایسے مشکل سوالات بنائیں کہ یہ لڑکا جواب ان کے لیے دردسر بنتا جا رہا تھا اسے وہ مدرسے سے ہمیشہ کے لیے خارج کر دیں ویسے بھی اب وہ ذاتی پرخاش میں بتلا ہو چکا تھا اور چاہتا تھا کہ یہ لڑکا کسی بھی قیمت پر اس کے مدرسے میں نہ رہے۔

سلمان نے سوال سن کے اپنی آنکھیں بند کیں اور سوچنے لگا۔ اسے ہر سوال کا جواب دینے کے لیے پانچ منٹ کا وقت دیا گیا تھا۔ سب یہی سمجھتے رہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے یاد کر رہا ہے۔

ابوریحان کے دل میں ایک موہوم سی امید بندھنے لگی کہ یہ طریقہ اسے انھوں نے ہی بتایا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ طریقہ صوفیاء کی روایت ہے اس طرح ذہن کو یکسوئی ملتی ہے اور یکسوئی میں کبھی کبھی انسان آسمانوں کی بھی سیر کر کے آ جاتا ہے، زمین کی تو حیثیت ہی کچھ نہیں ہے۔ اس وقت انھوں نے آنکھیں بند کیے سلمان کی طرف دیکھا تو انھیں امید ہونے لگی کہ سلمان کی مدد غیب سے ہونے ہی والی ہے اور وہ اس امتحان سے خوش اسلوبی سے گزر جائے گا۔

دوسری طرف سلمان تو بس اداکاری کر رہا تھا ورنہ جناتی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے بعد اس سوال کی یا کسی بھی سوال کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ اس لیے اس نے پانچ منٹ پورے ہونے میں جب چند سیکنڈ باقی رہ گئے تو اس نے جواب کو نہایت دھیرے دھیرے اپنے لفظوں میں ادا کرنا شروع کیا اور جب جواب مکمل ہو گیا تو سب ہی حیرانی سے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔

سب سے زیادہ دیکھنے والی شکل نگراں کی تھی۔ اس کی تو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیسے ہوا۔ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسی ہی کیفیت میں جب انھوں نے ابوریحان کی طرف دیکھا تو انھوں نے اشارے سے کہا ''دیکھا میں نہ کہتا تھا یہ لڑکا غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔'' نگراں نے فوری طور پر ابوریحان کی طرف سے منہ پھیر لیا اور دوسرے سوال کی طرف متوجہ ہوئے۔

اب جو سوال پوچھا گیا اس کو سن کر تو نگراں کو پورا یقین ہو گیا کہ سلمان کا باپ بھی اس کا جواب نہیں دے سکے گا۔ سوال حساب کا تھا اور حساب کا مضمون ایسا مضمون ہے جس میں اکثر لڑکے بھی پورے نہیں اترتے ان سے کچھ نہ کچھ رہ ہی جاتا ہے۔ اس لیے نگراں کو امید تھی کہ سلمان جس نے یہ سوال ابھی تک کسی بھی ٹیچر سے سمجھا

ہی نہیں ہے وہ اسے کسی بھی قیمت پر حل نہیں کر سکے گا۔ سارے اساتذہ اس بات پر متفق تھے کہ آج سلمان سے پوچھے جانے والے دس سوالوں میں سے یہی سب سے مشکل سوال ہے۔ نگراں نے اس سوال کو پوچھے جانے والے سولات میں نویں نمبر پر سیٹ کیا تھا۔ مگر پہلے ہی سوال کا ایک دم درست جواب جب سلمان نے دے دیا تو نگراں کو اپنی فطرت کے مطابق ایک دم ہی جلال اور غصہ آ گیا اور اس نے امتحان کی ساری حکمت عملی اور



اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے نویں نمبر پر پوچھے جانے والے سوال کو پہلے کر کے سلمان کو ناکام اور نروس کر دینے کی چال چلی۔ وہ جانتا تھا اگر سلمان نے اس سوال کا ٹھیک جواب نہیں دیا تو اس کا جو اعتماد ہے وہ ریزہ ریزہ ہو جائے گا اور اس طرح وہ بعد میں پوچھے جانے والے اس سے کہیں آسان سوالوں کے جواب نہیں دے سکے گا اور یوں نگراں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ ابوریحان کو نگراں کی یہ چال بالکل پسند نہیں آئی اور انھیں یقین ہو گیا کہ نگراں مدرسے کے ضوابط سے کہیں الگ ذاتی عناد اور جلیبی میں مبتلا ہو چکا ہے اور وہ ہر قیمت پر سلمان کو مدرسے سے نکالنا چاہتا ہے۔ نگراں کا یہ مقصد جاننے کے بعد ابوریحان مایوس ہو گئے اور انھیں امتحان گاہ میں ٹھہرنا فضول معلوم ہوا۔ انھیں اب پورا یقین ہو چکا تھا کہ سلمان کچھ بھی کر لے وہ اسے مدرسے سے نکال کر ہی دم لیں گے۔ ویسے بھی سوال سن کر وہ سلمان کے چہرے پر شکستگی کی لرزتی پرچھائیں دیکھ چکے تھے۔ وقت کی ٹک ٹک انھیں سلمان کے انجام کی دلدوز کہانی سنا رہی تھی انھیں مزید یہاں رکنے کی تاب نہ رہی اور وہ کمرے سے جانے کے لیے قدم اٹھانے ہی والے تھے کہ سلمان نے سوال کو حل کرنا شروع کر دیا۔ ابوریحان سلمان کی آواز سنتے جاتے تھے اور ان کے قدم خود بخود جیسے تھم سے گئے۔

اور جب سلمان کا جواب پورا ہوا تو کمرے میں ایسا گہرا سناٹا طاری ہو گیا جو ناقابل بیان تھا۔ سلمان بھی چپ تھا اور باقی سب بھی خاموشی سے کسی اور کے بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ابوریحان نے اپنی جگہ سے اٹھ کر جا کے سلمان کی پیٹھ تھپتھپائی اور زور زور سے تالیاں بجا کر کمرے کے سکوت کو تہ و بالا کر دیا۔ ابوریحان کے توجہ دلانے پر نگراں اور باقی مدرس بھی ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹ آئے اور ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے جیسے زبان حال سے پوچھ رہے ہوں کہ اب کیا کریں؟

نگراں کی حالت ایسی ہو چکی تھی جیسے کاٹو تو جسم میں لہو کا ایک قطرہ بھی باقی نہ بچا ہو۔ وہ زخمی سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا وہاں سے چلا گیا اور باقی اساتذہ کو لگا کہ اب کوئی اور سوال کرنا فضول ہے۔ لہٰذا وہ بھی وہاں سے کھسک لیے۔ اب کمرے میں ابوریحان اور سلمان ہی باقی بچے۔ ابوریحان اسے ایک گوشے میں لے جا کر پھر سے نشست فرماں ہوئے۔

''تم نے تو کمال کر دیا سلمان۔ مگر یہ سب تم نے کیسے کیا؟'' ابوریحان نے پرجوش ہو کر پوچھا۔

''یہ سب آپ کی تربیت کا اعجاز ہے استاد جی۔ رات بھر پڑھتا رہا اور جب یہاں اس کمرے میں آنکھیں بند کرتا تو سارے جواب آپ ہی آپ میری نظروں کے سامنے کھل جاتے تھے۔ یوں سمجھیں پردہ غیب سے مدد ہوئی ہے میری'' سلمان نے وہ ہی سب کہا جو ابوریحان کو مطمئن کر سکتا تھا۔

ابوریحان اس کی بات سن کر اوپر سے تو جیسے خوش ہونے کی اداکاری کرنے لگے لیکن دل ہی دل میں وہ سوچ رہے تھے کہ اگر یہ نوجوان لڑکا سچ بول رہا ہے تو یہ میری شبانہ روز ریاضتوں کے باوجود بارگاہ ایزدی میں مجھ سے کہیں آگے جا کے کھڑا ہو گیا ہے۔ ایسا کچھ تو بے شمار ریاضتوں اور ناقابلِ بیان تپسیاؤں کے باوجود میرے ساتھ بھی نہیں ہوا کبھی۔ وہ اس کی طرف عجیب حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔ پھر جیسے ان کے پاس کوئی اور سوال نہیں تھا اس لیے بولے۔

''شکر ہے رب تعالیٰ کا تمھیں اب مدرسے نکالا نہیں جائے گا۔ میری طرف سے یہ کامیابی مبارک ہو تمھیں۔'' ابوریحان کے لہجے میں ایک ایسی سرخوشی سلمان نے محسوس کر لی تھی۔ جیسے انھیں اس کامیابی سے ایسا محسوس ہوا ہے کہ یہ سب سلمان کی نہیں ان کی اپنی فتح ہے۔ تاہم انھیں ایک فکر اب بھی تھی۔ جس کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا۔

''لیکن مجھے ڈر ہے کہ اب نگراں تمہارے بارے میں زیادہ چوکنا رہے گا۔ تمہاری تھوڑی سی بھی لغزش کو وہ معاف نہیں کرے گا۔ اس لیے محتاط رہنا اور اسے کوئی ایسا موقع نہ دینا جس سے وہ پھر سے ناراض ہو جائے۔''

''آپ فکرمت کیجیے استاد جی! اب ایسا کبھی نہیں ہوگا'' سلمان نے مصمم ارادے کے ساتھ کہا۔
''اچھا اب تم آرام کرو ساری رات کے جاگے ہو۔ باقی باتیں رات کو کرتے ہیں'' ابو ریحان نے اس سے رخصت چاہی۔ وہ بھی یہی چاہتا تھا۔ اسے تو جلد سے جلد صنوبر کے پاس پہنچنا تھا۔ اور اس کے ہونٹوں سے سننا تھا کہ آخر وہ کون ہے جس کی محبت میں وہ دیوانی ہو چکی ہے''

☆......☆......☆

''تم جب سے آئی ہو کچھ بجھی بجھی سی ہو۔ وہ پہلے جیسی بات نہیں ہے۔ کیا بات ہے اپنے شرجیل کو نہیں بتاؤ گی'' شرجیل نے اس کے قریب ہو کر پوچھا۔
''سوچ رہی ہوں۔ کیا کہوں اور پہلے کون سی بات بتاؤں؟ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں کسی مشکل میں پھنسنے والی ہوں۔ پتا نہیں جو کچھ میں نے کیا وہ ٹھیک تھا یا ٹھیک نہیں تھا۔'' اتنا کہہ کر صنوبر خاموش ہو گئی۔
''اس کا مطلب ہے تم ایک نہیں بلکہ ایک سے زیادہ پریشانیوں میں مبتلا ہو۔ ایسا کرو پہلے کوئی بھی بتا دو دوسری خود بخود سیکنڈ ہو جائے گی اور تمہیں یہ سوچنے اور الجھنے کی ضرورت نہیں رہے گی کہ پہلے کیا بتاؤں'' شرجیل نے اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا تو وہ ایک لمحے میں شانت ہو گئی اور اس کا ذہنی تناؤ خود بخود کم ہو گیا۔
''اچھا تو سنو کل رات سلمان اپنے کچھ اوباش دوستوں کو گھر اٹھا لایا تھا۔ رات گئے تک وہ لوگ ہلا گلا اور شور شرابا مچاتے رہے۔ صرف ہم لوگ ہی نہیں محلے والے بھی ان کی اس حرکت سے بہت نالاں تھے لیکن وہ شرفاء کی آبادی ہے۔ سب لوگ یہ بے ہودہ حرکت نوٹ کرنے کے بعد بھی چپ سادھے اپنے گھروں میں بیٹھے رہے۔ میرے پاپا کا نام ہے، عزت ہے ان کی، اس وجہ سے بھی وہ چپ تھے ورنہ ایسی حرکت پر پولیس کو خبر کر دینا کوئی بڑی بات نہیں تھی لیکن انھوں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ ہم سب بھی اپنے اپنے کمروں میں سہمے ہوئے اس لہولعب ہنگامے کے ختم ہونے کا انتظار کرتے رہے ہم سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا تھا اور ماما پاپا کو اپنی عزت اور صبح پوچھے جانے والے سوالوں کا بھی ڈر تھا۔ ایسے میں مجھے پتا نہیں کیا ہوا؟ مجھ میں اتنی جرأت پہلے تو کبھی نہیں رہی۔ میں خود حیران ہوں یہ سب میں نے کیا کیسے مگر بس کر دیا۔''
''کیا کر دیا......؟؟؟'' شرجیل کی حیرانی پریشانی میں بدل گئی اور وہ چپ نہیں رہ سکا۔
''میں اوپر ٹیرس پر پہنچی اور سلمان سے یہ سب کچھ بند کرنے کی بات کی۔ لیکن اس نے وہ شور شرابا کان پڑے میوزک کی آوازیں اور ہاہا بند کرنے کے بجائے مجھ سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔ میں نے اس کی سب چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکنا شروع کر دیں۔ وہ مجھے ہاتھ پکڑ کے روکنے لگا تو ماما بھی وہاں آ گئیں اور اس کے بعد پاپا بھی۔ بس پھر کیا تھا پاپا اور سلمان میں بہت بری طرح تکرار ہونے لگی۔ پاپا نے اس کے سب دوستوں کو بھگا دیا اور سلمان کی ان سب کے سامنے کافی انسلٹ کی مجھے اس وقت ڈر لگا۔ کیونکہ سلمان بہت خود سر ہے، میں ڈر رہی تھی کہ وہ کہیں پاپا پر ہاتھ نہ اٹھا دے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ سب میری وجہ سے ہوگا اور میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گی۔ لیکن شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا مگر سلمان مجھ سے اور پاپا سے بہت ناراض ہے۔ پاپا بھی اس سے بہت ناراض ہیں انھوں نے اسے عاق کرنے کی دھمکی دے دی ہے۔ گھر میں بہت ہی ٹینشن ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں کیسے اپنے گھر کی یہ ٹینشن دور کروں۔ سلمان کو کون سمجھائے گا۔''
''اوہ تو تم اس لیے پریشان ہو یہ بات ہے تو واقعی بہت ٹینشن والی۔ اس طرح سلمان کا بے عزت ہونا اور پھر تمہارے پاپا کا غصے میں آنا یہ سب تو بڑی گڑبڑ والی بات ہے۔'' وہ کچھ دیر کے لیے رکا اور پھر بولا۔ ''تم کہو تو میں سلمان سے بات کروں!''
''کیا مطلب تم کیا بات کرو گے۔ اور کس حیثیت سے کرو گے۔ وہ پاپا کو خاطر میں نہیں لاتا تو تم اس کے

لیے کیا ہو۔ سب سے پہلے تو یہی سوال ہے کہ تم اسے بتاؤ گے کیا۔ اور اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ ہمارے گھر کی بات تمہیں کیسے معلوم ہوئی۔ فرض کرو تم خود کو میرا بہترین دوست بھی ثابت کرتے ہو تب بھی وہ اس بات پر خوش ہونے کے بجائے اور ناراض ہو جائے گا کہ میں نے اپنے گھر کی بات کسی بھی دوست کو کیوں بتائی۔ بلکہ میں سمجھتی ہوں۔ اس بات سے تو میرے ماما پاپا بھی ناراض ہو سکتے ہیں۔ اس طرح سلمان کو مجھ سے اپنا بدلہ لینے کا موقع مل جائے گا۔ میں نے اس کی پارٹی خراب کی تھی اور اسے سارا غصہ بھی مجھی پر ہے۔ اس لیے تم تو اس سے بات کرنے کا سوچنا بھی مت۔'' لمبی چوڑی تقریر سننے کے بعد شرجیل ایسے ایکٹنگ کرنے لگا جیسے وہ کہیں دور سے دوڑتا ہوا آیا ہے اور اب ہانپ رہا ہے۔

''تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ ہے نا؟'' وہ ناراض ہونے لگی۔

''ارے نہیں یار تم غلط سمجھ رہی ہو میں تو تمہارے اسٹیمنا کی تعریف کرنا چاہتا تھا۔ کیا بولتی ہو اور کتنے دلائل ہوتے ہیں تمہارے پاس میرے جیسے ڈفر کو تو تم چٹکیوں میں چت کر سکتی ہو جو تم مجھے کر چکی ہو، یہ سب سننے کے بعد میں اگر چاہوں بھی تو ایسا کبھی نہیں کر سکتا کہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالوں۔ تم ٹھیک کہتی ہو میں یہ کام نہیں کر سکتا۔''

وہ اس طرح بول رہا تھا کہ صنوبر اب بھی کنفیوژ تھی کہ آخر وہ اس کا مذاق بنا رہا ہے یا واقعی اسے احساس ہو چکا ہے کہ وہ یہ کام نہیں کر سکتا۔

شرجیل صنوبر کو اچھی طرح جانتا تھا اس لیے وہ یہ بھی جان گیا تھا کہ صنوبر الجھ چکی ہے اب اگر فوری طور پر اسے اس بات کے جال سے باہر نہ نکالا گیا تو وہ دیر تک اسی میں الجھی رہے گی اور سارا وقت خراب ہو جانے کے علاوہ وہ یہ بھی بھول جائے گی کہ ابھی دو اور باتیں باقی ہیں۔

''اچھا چھوڑو اس بات کو اس کا حل بعد میں تلاش کرتے ہیں اب جلدی سے دوسری بات بتاؤ؟'' شرجیل نے اس کا دھیان کہیں اور موڑنے کی کوشش کی۔ حالانکہ وہ ڈر رہا تھا کہ اگر دوسری بات بھی اسی قسم کی ہوئی تو آج کا دن پریشانی سے اٹا ہوا ہے۔

''دوسری بات کا تعلق بھی اسی بات سے ہے۔ سلمان کے دوستوں میں ایک اوباش لڑکا فارس رحمان بھی تھا۔ جس وقت میں سلمان سے اس سب تنازعے میں الجھی ہوئی تھی تو وہ کمینہ مجھے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کھا ہی جائے گا۔ اب یا تو وہ مجھ سے اس پارٹی کے خراب ہونے کا بدلہ لینا چاہتا ہے یا پھر کوئی اور بات ہے اس کے دل میں مگر میں اس کی ان سرخ سرخ انگارہ آنکھوں کو بھول نہیں پا رہی۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ مجھے کوئی نہ کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش ضرور کرے گا۔''

صنوبر چپ ہوئی تو شرجیل نے اس بات پر اپنی کوئی بھی رائے دینے کا تبصرہ کرنے کے بجائے ایسے کہا جیسے وہ جلد سے جلد ساری بات جان لینا چاہتا ہو۔

''اور تیسری بات......؟؟''

''تیسری بات تم سے متعلق ہے'' صنوبر نے قدرے دھیمے سے کہا۔

''مجھ سے متعلق وہ کیا....؟'' شرجیل کو فارس رحمان کا نام سن کر اس کے بارے میں سوچنا شروع کر چکا تھا اب اس کا ذہن اور بھی پریشان ہو گیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا اس کے بارے میں صنوبر کے پاس کیا اور کیسی بات ہے۔

''ماما کہتی ہیں تم جس طرح بنا بتائے مجھے چھوڑ کر گئے تھے۔ اگر تم اپنے باپ کی بات مان لیتے تو میں ساری زندگی یہ بھی نہیں جان پاتی کہ آخر میری محبت کے ساتھ ہوا کیا تھا۔ تم نے مجھے کس بات کے لیے اور کیوں چھوڑا۔ اسی لیے ماما کا کہنا ہے کہ اب اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم آئندہ ایسا نہیں کرو گے۔''

''میں مانتا ہوں یہ میری غلطی تھی۔ اور تم سے اس غلطی کی معافی مانگنے کے علاوہ یہ یقین بھی دلا چکا ہوں کہ آئندہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔'' شرجیل کیا ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر کہا۔

''وہ ماں ہیں شرجیل! تمہیں اس بات پر اس طرح کا ری ایکٹ نہیں کرنا چاہیے۔ انھیں اس طرح کی بات سوچنے کا حق ہے۔ میں ان کی بیٹی ہوں اور کسی بھی انسان کو اپنی بیٹی سونپنے والے ماں باپ کو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ اچھی طرح اس کی چھان بین کر لیں۔ تمہیں اس بات کا برا نہیں منانا چاہیے۔'' صنوبر نے قدرے اپنایت سے کہا۔

''آئی ایم سوری صنوبر شاید میری آواز کچھ اونچی ہوگئی تھی۔ مجھے معاف کر دو۔ پلیز۔''

''اٹس اوکے۔ چلو اب اس بات کو بھی جانے دو۔ اور آؤ سامنے سے ناریل پانی پیتے ہیں۔'' ماحول کی تلخی کو صنوبر بھی محسوس کر چکی تھی اور اسے دور کرنے کے لیے ہی اس نے ناریل پانی کی بات کی تھی۔ دونوں دیر تک اسی موضوع پر بات کرنے پر خود کو مجبور محسوس کر رہے تھے۔ یہ ایسی باتیں نہیں تھیں جنھیں نظرانداز کر کے آگے بڑھا جاتا ان تینوں باتوں سے صنوبر کی زندگی براہ راست متاثر ہونے کا اندیشہ تھا۔

جو بھائی اپنے ماں باپ کا لحاظ نہیں کرتا اس سے کوئی بھی توقع کی جا سکتی تھی۔ وہ صنوبر کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اور یہ جو فارس رحمان کی بات صنوبر نے بتائی تھی یہ بھی ایسی بات نہیں تھی جسے کوئی اہمیت نہ دے کر آگے بڑھا جاتا۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ جب تک فارس رحمان کے ارادوں کا ٹھیک ٹھیک پتا نہ چل جائے یا اس کی طرف سے کوئی ایسی ویسی بات سامنے نہ آجائے اس بات کی اتنی اہمیت نہیں تھی جتنی صنوبر کے دل و دماغ میں بن چکی تھی۔ پتا نہیں اس فارس کے بچے نے اسے کن نظروں سے دیکھا تھا کہ اس کا ذکر کرتے ہوئے صنوبر کی آنکھوں میں خوف صاف دیکھا جا سکتا تھا۔

سلمان ابراہیم نے ان دونوں کی ساری باتیں سن لی تھیں اور ان کی محبت کے بارے میں بھی وہ جان چکا تھا۔ اس کا دل جیسے بری طرح کچلا جا چکا تھا۔ جس صنوبر کے لیے اس نے اتنا کچھ کیا تھا۔ اسے تو اس کی محبت اور اس کی قربانیوں کی خبر تک نہیں ہے تو کیا اس کی محبت یونہی راستے کی دھول بن کر رہ جائے گی اور اور وہ اپنی صنوبر کو کبھی حاصل نہیں کر سکے گا۔ اس کا دل رو رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں ویرانی جمع ہو رہی تھی۔ اس معصوم لڑکی کو اپنے محبوب شرجیل سے اتنی محبت کیسے ہوئی۔

سلمان ابراہیم کو یہ کہاں معلوم تھا کہ انسانوں میں ایسی محبتیں عام ہیں اور کہیں کہیں یہ محبتیں سچی بھی ہوتی ہیں جن میں اسیر محبت خود کو ہمیشہ کے لیے اس طرح محصور کر لیتے ہیں کہ انھیں دنیا کی کسی بھی چیز میں کوئی دلچسپی نہیں رہ جاتی اور ایسا ہی صنوبر کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ وہ شرجیل سے سچی محبت کرتی تھی اسی لیے دنیا کی ساری نعمتوں سے مالا مال ہونے کے باوجود وہ اس طرح رات رات بھر بالکونی میں بیٹھی رہا کرتی تھی جیسے اس کی دنیا اس پر ختم ہو چکی ہے۔ پتا نہیں اس کے ساتھ ایسا کیا ہوا تھا جو اس نے خود کو اپنی ہی ذات میں بند کر لیا تھا یہ شرجیل جس سے آج وہ اس طرح پیار کرتی ہے کہ اپنی ماں کی بات پر بھی توجہ نہیں دینا چاہتی۔ اسے کیوں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ کیونکہ اسے یہ بات اب بھی کسی ذریعے سے معلوم نہیں ہوئی تھی کہ صنوبر کو شرجیل چھوڑ کر کیوں گیا تھا۔ اور اب اگر وہ واپس آیا ہے تو صنوبر نے اس کی خطا کو معاف کیسے کر دیا۔ کیا خطا کی تھی شرجیل نے۔ اسے سب سے پہلے یہی پتا کرنا ہوگا۔ چاروں طرف کی پریشانی جس محبت کے لیے مول لی تھی وہ بھی اس کی نہیں تھی کسی اور کی تھی۔

دکھوں میں گھرے ہونے باوجود اس کی سوچوں نے آگے بڑھنا اور کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کسی بھی صورت صنوبر کو ایسے کسی بھی بات پر جس کے بارے میں اسے سب کچھ پتا نہ ہو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ وہ ہر وہ بات جاننا چاہتا تھا جس سے اسے یہ یقین ہو جائے کہ جس طرح صنوبر شرجیل سے محبت کرتی ہے اسی طرح شرجیل بھی

صنوبر سے محبت کرتا ہے، بے لوث اور سچی محبت۔ پتا نہیں وہ ایسا کیوں سوچ رہا تھا۔ شاید دل کے کسی کونے میں اسے یہ امید تھی کہ شرجیل کوئی بے وفا یا دھوکے باز قسم کا انسان ہوا تو وہ صنوبر کو اس سے چھین لے گا۔

ابتدائی طور پر تو اس کے دل میں اچھے اور ایثار والے جذبات اور احساسات سر اٹھاتے رہے کہ وہ صنوبر کی محبت کے لیے قربانی دے دے گا اور اسے شرجیل کی ہو جانے دے گا لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ خود کو یہ بھی بتاتا رہا کہ اگر ایسا نہ ہوا تو وہ صنوبر کو کسی بھی قیمت پر کسی اور یعنی شرجیل کی نہیں ہونے دے گا۔ جو بھی تھا سلمان بہرحال کئی مشکلوں میں ایک ساتھ پھنس چکا تھا۔

قبیلے میں قبیلے کا سردار اس کی اور اس کے خاندان کی کھوج میں لگا ہوا تھا اور کیلاش کی کوشش تھی کہ کسی طرح اس کا شک یقین میں بدل جائے تا کہ وہ سلمان ابراہیم کے خاندان کا جھوٹ پکڑ کے اسے ثابت کر سکے۔

اور ادھر مدرسے میں نگراں اس کی تاک میں تھا کہ اس نے ذرا سی بھی غلطی کی تو وہ اسے فوراً سے پیشتر دبوچتے ہوئے مدرسے سے باہر کر دے گا۔ اور سب سے زیادہ دکھ اسے اس بات نے پہنچایا تھا کہ اس کی صنوبر کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ اب وہ کیا کرے کسے بچائے اور کسے جانے دے۔ اس کا دل تو پہلے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا ایسی حالت میں وہ کس طرح ان سب محاذوں پر لڑ سکتا ہے۔ کس طرح....؟

سوچوں کی ان ہی لہروں سے لڑتے ہوئے اسے رات ہو گئی۔ سوچتے سوچتے اسے ایک اور تکلیف دہ خیال یہ بھی آیا کہ کہیں اللہ تعالیٰ نے اسے اس بات کی سزا تو نہیں دی کہ اس نے اپنی جناتی حدود کا پاس نہیں رکھا اور نہ صرف انسان بن کر ایک مدرسے میں انسانوں کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا بلکہ اسی پر بس نہیں کیا ایک انسان لڑکی سے محبت بھی کر بیٹھا۔ یہ سب باتیں جو اس نے اپنے عشق کو زندہ رکھنے اور کامیاب ہونے کے لیے کی تھیں یہ سب اس کے لیے ممنوع تھیں مگر اس نے عشق کے سمندر کے بہاؤ میں کسی بھی چیز کی پروا نہیں کی بلا بن کر اس گھر میں رہا جہاں وہ لڑکی جس سے وہ محبت کرتا ہے وہ رہا کرتی ہے۔ پھر جن کی صورت میں اس کے جسم میں حلول کر جاتا گرچہ اس کی نیت خراب نہیں تھی مگر یہ ایک شیطانی فعل ہے جو اس جیسے جن کے لیے کرنے کی ممانعت ہے اس کے بعد اپنا ہمشکل بلانا اور اس سے ایسے کام لینا جو جن کی اجازت نہیں ہے۔ اور تو اور اس نے اپنے ماں باپ کو بھی اپنے عشق کی حدت میں جلا دینے میں کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اسے یاد آنے لگا کہ اس کے ماں باپ کی زندگیوں کو خطرہ ہے اور وہ انہیں انھی ممنوعات کے لیے راضی و تیار کر رہا ہے جنہیں نہ وہ چاہتے ہیں اور نہ ہی قبیلے کی طرف سے اس طرح انسان بن کر انسانوں کی بستی میں جا کر رہنے کی انھیں اجازت ہے لیکن وہ اپنے عشق کی خاطر انھیں بھی اس آگ میں جھونک دینا چاہتا ہے جس نے اس کے جسم و روح کو خاکستر کر رکھا ہے۔

اسے لگنے لگا کہ اس کا عشق... کوئی عشق نہیں بلکہ زہر عشق ہے جو اس کے ساتھ اس کے ماں باپ اور ایسے سب لوگوں کی جان لے سکتا ہے جو اس کے قریب ہیں یا جن سے اس کا تعلق ہے۔

ایسی ہی باتیں سوچتے سوچتے وہ وہیں بینچ پر لیٹ گیا اور دنیا و مافیہا کی اسے خبر نہ رہی۔

پھر اس نے ایک خواب دیکھا بہت ہی عجیب اور بڑا ہی انوکھا اس نے دیکھا کہ ایک بزرگ جن کی صورت بہت ہی نورانی ہے وہ اسے اپنے ساتھ انگلی پکڑ کے ایک ایسے دروازے کے پاس لے جاتے ہیں جہاں سے ایسے ہی نورانی صورتوں والے لوگوں کی آمد و رفت ہے۔ یہ سب لوگ ایسے سب لوگوں سے اس قدر مختلف ہیں جو اس نے اس سے پہلے دیکھے تھے۔ اس سے رہا نہیں جاتا اور وہ بزرگ سے پوچھ بیٹھتا ہے۔

''اے نورانی صورت والے بزرگ محترم! کیا آپ مجھے یہ بتا سکتے ہیں کہ کون لوگ ہیں اور کہاں جا رہے ہیں کہاں سے آ رہے ہیں؟'' بزرگ نے اس کی بات سن کر ایک تبسم کیا اور مسکرا کر بولے۔

''یہ سب وہ لوگ ہیں جو ساری زندگی اللہ تعالیٰ کی دنیا میں اس کے بتائے ہوئے احکامات کی پابندی کرتے

رہے اور ساری زندگی دکھ اور مصیبتیں جھیلتے رہے اب جب دنیا ختم ہو چکی ہے اور روز حساب بھی گزر چکا ہے تو ایسے سب لوگوں کو ان کی تکلیفوں کا بدلہ دیا جا رہا ہے اور انھیں کائنات کی ایسی نعمتوں سے نوازا جا رہا ہے جو ان لوگوں کو حاصل نہیں ہوسکتیں۔ جنھوں نے دنیا میں خوب مستیاں کیں اور اللہ کو بھول کر اپنی دنیا اور مستیوں میں مگن رہے۔ جن کا خیال تھا کہ بس یہی ایک دنیا ہے اور ایسے ہر خیال وہ رد کرتے رہے کہ اس کے بعد بھی ایک دنیا اور زندگی ہے۔ حتیٰ کی سائنسی کرشموں سے انھیں بار بار یہ بات بتائی جاتی رہی کہ ان کی زمین پر بسنے والی دنیا ہی آخری دنیا نہیں ہے کائنات میں اور بھی کئی دنیا ئیں ہوسکتی ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے وہ ہی کیا جو ان کے دل اور مکروہ خواہشوں نے انھیں کرنے کے لیے کہا۔ اب ایسے لوگ تو بہت مشکل میں ہیں اور ایسے لوگ جنھوں نے اللہ کی بات کو ہمیشہ اولیت دی اور پیش آنے والی مشکلات اور مصیبتوں کو جھیلنے کے بعد بھی یہ فراموش نہیں کیا اللہ تعالیٰ انھیں ان کی مصیبتوں کا اجر ضرور دے گا تو آج ایسے سب ہی لوگوں کو اجر دیا جا رہا ہے اور ان کے چہرے نور سے ایسے چمکا دیے گئے ہیں کہ ان پر نظر نہیں ٹھہرتی۔ ان میں سے ہر ایک بہت خوش اور مسرور ہے انھیں یہ یاد بھی نہیں رہا کہ انھوں نے دنیا میں کیسی مشکلات جھیلی تھیں۔ جبکہ جو لوگ اس وقت داد وفریاد کر رہے ہیں اور خدا کو بھول جانے کی اپنی لغزش اور گناہ پر معافیاں مانگ رہے ہیں انھیں ان کی دنیا میں گزاری ہوا کوئی بھی دن کوئی بھی پل بھولنے نہیں دیا جا رہا۔ انھوں نے کیسے بے بس انسانوں کو ستایا ان کے راستے میں مشکلات کھڑی کیں اور ان کی زندگیاں اجیرن بنائیں۔ ان کا حق چھین کر کھا گئے۔ اپنی طاقت سے خود کو سب کچھ سمجھنے لگے۔ انھیں یاد بھی نہیں رہا کہ خدا ان کی ہر دست درازی اور ناجائز منافع کمانے اور ناجائز طریقوں سے پیسا اور مال وزر اکٹھا کرتے رہے۔ ان سب کو اب سب کچھ یاد دلایا جا رہا ہے۔''

بزرگ کی بات سن کر وہ حیران ہوا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا رہا اس کا ایک ایک پل کیسے مالک عظیم نے اپنے پاس محفوظ کیا۔ تب ہی اس کے دل میں ایک اور سوال نے جنم لیا وہ بولا۔

''عظیم بزرگ اس کا مطلب ہے یہ جنت کا دروازہ ہے اور لوگ اپنے اعمال کی وجہ سے جنت میں جا رہے ہیں؟'' بزرگ کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کھیل گئی اور وہ بولے نہیں یہ جنت کا دروازہ ہے اور نہ یہ لوگ جنت میں جا رہے ہیں۔''

''تو پھر یہ کیا ہے اور یہ جوان کی صورتوں پر اتنا نور جمع کر دیا گیا ہے یہ انھیں کون سی مشکلات جھیلنے کی وجہ سے حاصل ہوا ہے؟''

تب بزرگ نے اسے بتایا کہ یہ سب وہ لوگ ہیں جو دنیا میں محبت اور عشق کی بیماری اور مصیبتوں میں مبتلا تھے۔ انھوں نے اپنے عشق کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دی اور انھی قربانیوں کو رب تعالیٰ نے پسند فرمایا اور یہ سب اسی کا صلہ ہے۔''

یہ جواب سن کر اس کا دل خوشی سے جھومنے لگا اور اس نے دروازے کی جانب اپنے قدم بڑھا دیے تا کہ اس کے چہرے کو بھی وہی نور عطا ہو اور اس کے دامن میں بھی وہ ہی خوشیاں بھر دی جائیں جو ان سب لوگوں کو عطا کی گئی ہیں۔ عجب نہیں تھا کہ اس کا پاؤں اس دروازے کے اندر داخل ہو جاتا کہ بزرگ نے اسے پیچھے سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور بولے۔

''تم نہیں... تم اس دروازے سے اندر نہیں جا سکتے۔''

''مگر کیوں... بزرگوار؟'' وہ تڑپ کر رہ گیا۔

کیونکہ تم عشق کے امتحان میں پورے نہیں اترے اور ابھی تم اپنی منزل سے کوسوں دور ہی تھے کہ تمہارے قدم ڈگمگائے اور تم نے راستا بدل لیا، خود کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ جائز اور ناجائز کا فیصلہ خود سے کرنے لگے۔ اس لیے تمہیں جانے کی اجازت نہیں ہے۔

وہ بہت مچلا اس نے بہت شور مچایا مگر اسے اس دروازے سے اندر جانے کی اجازت نہیں ملی اور زیادہ ضد کرنے پر بزرگ نے اسے اٹھا کر اس طرح پھینکا کہ وہ پتا نہیں کتنی ہی بلندیوں سے نیچے کی طرف گرتا چلا گیا۔ تب ہی اس خوف سے اس کی آنکھ کھل گئی کہ نیچے گرتے ہی اس کی موت ہونے والی تھی۔

کچھ دیر تک وہ اسی طرح بینچ پر بیٹھا رہا اور اس خواب کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ سب کیا تھا۔ اس نے بہت سوچا مگر اسے یہ پھر بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ جو عشق کے سمندر میں غوطہ زن ہے تو یہ اس کا نیک عمل ہے جو اسے اس نورانی صورتوں والے لوگوں کے قبیلے سے جا ملائے گا یا اس کا عشق کوئی باعث عبرت فعل ہے جس کی اسے کڑی سزا دی جائے گی۔ جانے کب تک بیٹھا وہ اس طرح کی باتیں اپنے آپ سے کرتا رہا لیکن اسے کوئی تسلی بخش جواب نہیں مل سکا۔

☆......☆......☆

کئی دن تک وہ کھویا کھویا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے اب کیا کرنا چاہیے۔ کیا اسے واپس اپنے ماں باپ کے پاس چلا جانا چاہیے یا ابھی اور کچھ دن یہاں انسانوں کی دنیا میں رہنا چاہیے۔ اپنے کسی بھی ایسے سوال کا اسے کوئی جواب نہیں مل سکا۔ تب اسے ابوریحان نے بلوایا وہ ان سب دنوں میں ان سے ملنے بھی نہیں گیا تھا۔ البتہ مسلسل مدرسے میں رہنے کی وجہ سے اس کے خلاف نگراں کو کوئی ایسا قدم اٹھانے کا موقع نہیں ملا تھا جو اسے مدرسے سے نکالنے کا بہانہ بنتا۔

''کیا بات ہے سلمان کچھ دن سے تم ہم سے ملنے بھی نہیں آئے اور بلوانے پر آئے ہو تو ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہارا دل کسی بات سے پریشان ہے؟''

ابوریحان ان سب ہی معلموں سے مختلف اور جان کار انسان تھے جو اس مدرسے میں پڑھایا کرتے تھے۔ ویسے تو وہ خود بھی خلوت پسند تھے کیونکہ پہروں جو فارغ وقت انھیں ملتا تھا اس میں وہ جانے کون کون سے وظیفے اور چلے کاٹا کرتے تھے۔ انھیں کئی لوگ صاحب کشف بھی سمجھتے تھے جو دلوں کا حال بنا بتائے جان جاتے ہیں اس وقت سلمان کو بھی ایسا ہی معلوم ہوا تھا کہ شاید ابوریحان اس کے دل کا حال سمجھنے میں کسی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں مگر اسے اندر سے اس بات کا یقین بھی تھا کہ وہ ایک جن ہے اور ابوریحان ایک انسان ہیں تو وہ اس کے دل کا حال اس لیے کبھی نہیں جان سکیں گے کیونکہ انھیں تو یہ شک تک نہیں ہے کہ ان کے درمیان کوئی جن بھی موجود ہے جو انسانوں کے بھیس میں ان سے ہمکلام ہوا کرتا ہے۔ لیکن اس کی صورت سے جو اس کے دل کا حال عیاں ہو رہا تھا، اسے ابوریحان بہر حال جاننے کی اوروں سے زیادہ صلاحیت رکھتے تھے اسی لیے انھوں نے اس کے چہرے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کے دل کی حالت دگرگوں ہے۔

''نہیں استاد جی! میں ٹھیک ہوں بس ویسے ہی کچھ ریاضتوں کی وجہ سے دل اچاٹ سا ہے'' سلمان نے ان ہی کے میدان سے جواب تلاش کیا تاکہ وہ آسانی سے سمجھ سکیں کیونکہ ریاضتوں میں مصروف رہنے والوں کو اکثر پیٹ کے سخت ہونے اور دل کے اچاٹ ہونے کے عوارض لاحق ہو جایا کرتے ہیں۔

''اچھا یہ بات ہے۔ تو کیا مجھے نہیں بتاؤ گے کہ تم آج کل کون سی ریاضتیں کر رہے ہو؟'' ابوریحان نے جس دن سے اسے کلاس میں ایسے سوالوں کے جواب دیتے سنا تھا جو ان کے خیال میں کوئی بھی نہیں دے سکتا اس دن سے وہ مسلسل یہی سوچ رہے تھے کہ سلمان کے پاس ضرور کوئی ایسا کشف ہے جو اس کی غیب سے مدد کیا کرتا ہے۔ غیب سے مدد کے بغیر یہ ناممکن ہے کہ کوئی انسان ان سوالوں کو حل کر سکتا ہو جنھیں وہ جانتا تک نہ ہو۔

''یہ بات تو استاد محترم آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایسی باتیں اگر کسی دوسرے کو بتا دی جائیں تو ان کا اثر جاتا رہتا ہے۔ روح کے میدان میں ہم ایک دوسرے کے گوشہ نشین ہیں مگر ہمارا علم اور راستا ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتا ہے۔ اگر آپ روحانی میدان میں بھی میرے استاد ہوتے تو میں ہرگز کوئی بھی بات آپ سے

چھپانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ پھر بھی اگر آپ اصرار کریں گے تو از راہ تکلف اور احترام میں آپ کو ضرور بتادوں گا لیکن اس کے بعد ممکن ہے میرے پاس سے وہ کشفی قوت ہمیشہ کے لیے جاتی رہے اور میں بھی اور بہت سے طالب علموں کی طرح کوئی معمولی انسان بن کے رہ جاؤں اور پھر کبھی کسی امتحان میں اس طرح کی کامیابی حاصل نہ کر سکوں''

سلمان کی بات سن کے ابو ریحان کو اپنا مقصد تو حاصل نہیں ہوا لیکن دل اس کی بات سن کر خوش بہت ہوا۔

''ٹھیک کہتے ہو تم مجھے ایسا نہیں پوچھنا چاہیے۔ ویسے بھی ہر انسان کی اپنی شکتی ہوتی ہے۔ کوئی کسی کی شکتی کو کسی اور سے نہ تو چھین سکتا ہے اور نہ ہی استعمال کر سکتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شاگرد اپنے استاد سے آگے نکل جاتے ہیں۔ اور میں دیکھ رہا ہوں تم اللہ کی راہ میں مجھ سے آگے نکل رہے ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ میں تمہارا استاد ہوں اور تم مجھ سے اتنی محبت اور پیار کرتے ہو، میری عزت کرتے ہو۔ میرے اطمینان کے لیے یہ بھی بہت ہے۔''

ابو ریحان کی باتوں نے سلمان کا دل جیسے پگھلا کر ایک مائع میں تبدیل کر دیا۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ اس مہان انسان کو اصل بات بتا دے اور ساری حقیقت اس کے گوش گزار کر دے کہ اس کی شکتی کی وجہ اس کی تپسیاؤں کا کار نہیں ہیں بلکہ وہ تو ایک جن ہے اور جنات کے پاس ایسی شکتیاں ہوا ہی کرتی ہیں لیکن جس طرح کسی بھی انسان کو اللہ تعالیٰ بے شمار طاقت عطا کرتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ اپنی طاقت کا غلط استعمال نہ کرنا، اسی طرح کی پابندیاں ہم جنات پر بھی عائد کی جاتی ہیں کہ ہم اپنی شکتیوں کا غلط استعمال نہ کریں اور اپنے مفاد میں تو بالکل بھی نہ کریں۔ لیکن میں نے ایسا کیا ہے اور میں خدا کا گناہ گار ہوں۔ اب سمجھ نہیں آ رہا اپنے ان گناہوں کی کیا سزا دوں اپنے آپ کو۔ ایک بہت عظیم سزا تو مجھے میرے مالک نے دے دی ہے اور مجھ پر اس سے زیادہ کوئی اور سختی نہیں کی جا سکتی تھی کہ میرا دل کاٹ کر اسے میرے ہی سامنے سجا کر کسی اور کی جھولی میں ڈال دیا جائے۔

مجھے یہ سزا خدا کی طرف سے دی جا چکی ہے میری صنوبر میری نہیں ہے وہ کسی اور کی ہے کسی اور سے محبت کرتی ہے اور یہ سزا..... اب میں جی کر بھی زندہ نہیں ہوں مر چکا ہوں میں۔

مجھے اپنی زندگی کو ختم کر دینا چاہیے ویسے بھی یہ گناہ گار زندگی کس کام کی ہے میں زندہ رہا تو صنوبر کو پانے کی آرزو میرے دل میں مچلتی رہے گی اور میں ہمیشہ بے چین رہوں گا، تڑپتا رہوں گا۔ میرے ماں باپ بھی میری وجہ سے دکھی رہیں گے۔ میں اگر مر گیا، دنیا سے چلا گیا تو انھیں بھی میری وجہ سے کوئی تنگ نہیں کرے گا۔ کیلاش اور قبیلے کے سردار پھر کبھی ان سے میرے بارے میں سوال نہیں کریں گے اور وہ ہمیشہ سکھی رہیں گے۔ موت کے بھیانک سائے ان کے سر پر تلوار کی طرح نہیں لٹکیں رہیں گے۔ مجھے اپنی زندگی کو ختم کر دینا چاہیے۔ اسی میں سب کی بھلائی ہے ابو ریحان کو بھی اس صدمے سے نجات مل جائے گی کہ ان کا کوئی شاگرد ان سے آگے کیسے نکل گیا۔

سوچوں کا نہ رکنے والا ایک بپھرا ہوا طوفان سلمان کے جسم و جاں کی دنیا کی تہہ و بالا کیے دے رہا تھا۔

''تم کہاں کھو گئے سلمان! کیا پھر کوئی وجہ ہے، کوئی رابطہ ہے جو اس وقت بھی تم پر قائم ہے اور تم یہاں موجود ہو کر بھی یہاں نہیں ہو؟'' ابو ریحان نے اس سے ایسا ہی کچھ کہا مگر وہ ٹھیک سے سن نہیں سکا۔ اس نے ابو ریحان کی طرف ایک الوداعی سی نظر ڈالی اور رخصتی کی اجازت چاہی۔

''اتنی جلدی... ابھی تو آئے ہو'' وہ حیران ہوئے کہ کیا سلمان کے پاس اب ان کے ساتھ بیٹھنے کا وقت بھی نہیں رہے گا اور وہ اس طرح ان سے دور دور رہا کرے گا۔

''کتنے دن بعد...... وہ بھی بلاوے پر آئے ہو اور یوں جانے کی بات کرتے ہو۔ مجھ سے آگے نکل جانے کا

یہ مطلب تو نہیں ہے کہ اب تمہارا میرے پاس چند گھڑیوں کے لیے بیٹھنا بھی ممکن نہ رہے۔''
ان کی بات میں چھپا ہوا شکوہ سلمان نے محسوس کر لیا۔ مگر اب اس کا ابوریحان کے پاس رکنا بے معنی تھا۔
''مجھے معاف کر دیجیے استاد جی۔ بات وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ مجھے اصل میں ایک ضروری کام سے جانا ہے اور ہو سکتا ہے میں۔''
اسے لگا کہ اس سے آگے وہ جو بھی کہے گا وہ جھوٹ ہی ہوگا اس لیے اس کی زبان رک گئی جیسے اس نے جھوٹ بولنے سے انکار کر دیا۔ اور سلمان ابوریحان کو حیران و پریشان چھوڑ کر وہاں سے چلا آیا۔

☆......☆......☆

اپنے کمرے میں آ کر اس نے کمرے کی سب چیزوں پر الوداعی نظر ڈالی۔ اس کا کچھ سامان اس کمرے میں موجود تھا۔ اس کے جوتے، اس کے کپڑے اور اس کی کتابیں اور کچھ ایسی چیزیں جنھیں اس کے یہاں سے چلے جانے کے بعد یہاں نہیں ہونا چاہیے۔
وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے روم میٹ عمران سے یہ نہیں کہہ سکا کہ اس کے بعد اس کی سب چیزوں پر اس کا حق ہے، وہ انھیں استعمال کر سکتا ہے۔
پتا نہیں کون سی چیز تھی جو اسے اس طرح کی بات کہنے سے روک رہی تھی۔ اس نے سوچا چلو کیا ہوا جو نہیں کہا۔ ویسے بھی وہ واپس نہیں آیا تو یہ چیزیں خود بخود عمران کو مل ہی جائیں گی یا پھر مدرسے کا نگراں کسی ضرورت مند طالب علم کو اس کی یہ سب چیزیں دے دے گا۔ اس لیے وہ عمران سے مل کر اور بس اتنا کہہ کر کہ وہ جا رہا ہے کسی ضروری کام سے۔ وہاں سے چلا آیا۔ اب اسے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا تھا۔ اور خاتمے سے پہلے وہ ایک بار اپنی صنوبر کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے صنوبر کے گھر کی طرف چلنا شروع کر دیا۔
صنوبر کے گھر وہ اپنے انسانی بھیس میں نہیں جا سکتا تھا۔ ظاہر ہے کسی انسان کے گھر میں کوئی اجنبی کیسے داخل ہو سکتا ہے اسے لازمی کوئی نہ کسی وجہ کی ضرورت ہوگی اور وجہ اس کے پاس کوئی نہیں تھی اس لیے اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور اپنے رب سے ایک اور جرم کرنے کی اجازت چاہی۔ وہ صنوبر کے گھر میں جن بن کر ہی داخل ہونا چاہتا تھا تا کہ اس کی موجودگی کی کسی کو کوئی خبر نہ ہو سکے۔ اور وہ صنوبر کو دیکھ بھی لے۔ اسے اس بات کا دکھ ضرور تھا کہ وہ صنوبر کو یہ بھی نہیں بتا سکا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ کس قدر ادھوری اور نامکمل تھی اس کی محبت، یک طرفہ اور سوکھی پیاسی دھرتی کی طرح، جس پر آسمان نے مہربان نہ ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆......☆......☆

دکھوں اور صدموں سے چور وہ جب صنوبر کے گھر کے دروازے پر پہنچا تو اس کے قدموں میں عجیب سی لرزش طاری ہو گئی۔ ایک مرتبہ پھر اس کی محبت جوش مارنے لگی اور اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ صنوبر کو اس آدمی سے چھین لے جس کا نام شرجیل ہے۔ آخر وہ بھی تو صنوبر سے محبت کرتا ہے۔ اسے بھی تو صنوبر کو پانے کا حق ہے اور اسے یہ حق اس کی محبت نے دیا ہے۔ اس نے صنوبر کی خاطر جتنے جوکھم جھیلے ہیں اور جو تکالیف اٹھائی ہیں شرجیل نے اس کا ایک فیصد بھی نہیں جھیلا، پھر بھی شرجیل اس کی محبت کا دعوے دار ہے اور وائے قسمت کہ شرجیل کو اس کی محبت کا صلہ صنوبر کی محبت کی صورت میں مل بھی رہا ہے۔
وہ تو صنوبر کو چھوڑ کر بھاگا بھی نہیں اس پر اور اس کے خاندان پر موت منڈلاتی رہی پھر بھی اس نے صنوبر کو چھوڑنے کا خیال تک اپنے دل میں نہیں آنے دیا اور شرجیل وہ تو پتا نہیں صنوبر کو چھوڑ کر کہاں چلا گیا تھا۔ اگر وہ صنوبر کو بتا کر گیا تھا تو اس کی غیر موجودگی میں صنوبر اتنی اداس اور پریشان کیوں تھی جیسے کوئی کسی کی بے وفائی پر ہوا کرتا ہے۔
اس طرح کے بے شمار خیالات اس کے دل میں آتے جاتے رہے مگر وہ خود کو ان سے آزاد کراتا رہا کہ محبت

زبردستی کا سودا نہیں ہوتی اور صنوبر اس سے محبت نہیں کرتی ۔ اس نے اگر اسے حاصل کرنے کی کوشش کی تو یہ صنوبر کے ساتھ زبردستی ہی کہلائے گی ۔ اپنے جن ہونے کی وجہ سے وہ اگر شرجیل سے صنوبر کو چھین بھی لیتا ہے تب بھی ساری زندگی وہ صنوبر کے دل میں جگہ نہیں بنا سکے گا ۔ وہ اس کی ہو کر بھی اس کی نہیں ہوگی اور ایسی ادھوری اور اذیت بھری زندگی جینے سے حاصل بھی کیا ہے، اس لیے اس نے سارے باطل خیالات کو جھٹک دیا اور اپنے فیصلے پر قائم رہا کہ صنوبر کو دیکھنے کے بعد وہ صنوبر کی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا جائے گا ۔ اور اس دنیا سے بھی اپنا وجود مٹا ڈالے گا ۔

اس سوچ کو مستحکم اور مضبوط بنا کر اس نے صنوبر کے گھر میں قدم رکھے ۔ گیٹ پر بیٹھے چوکیدار کو پتا تک نہیں چلا کہ کوئی آصف ولا میں داخل ہوا ہے ۔ وہ خاموشی سے اندر تک چلا آیا ۔ داخلی دروازہ اندر سے بند تھا لیکن اس وقت وہ سلمان انسان نہیں بلکہ سلمان جن تھا اس لیے اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا دروازہ تو کیا وہ تو دیوار میں سے نکل کر بھی اندر جا سکتا تھا ۔

وہ صنوبر کے کمرے میں پہنچا تو صنوبر اس وقت اپنے سیل فون پر کسی سے بات کر رہی تھی ۔ وہ کچھ دیر اسے بے خود ہو کر دیکھتا رہا ۔ صنوبر اس وقت پرپل رنگ کی شرٹ اور سفید پاجامہ پہنی ہوئی تھی وہ صوفے پر نیم دراز تھی اس کے لمبے بال لٹک کر زمین کو چھو رہے تھے اور اس کی دراز پلکوں نے اس کے رخساروں پر سایا سا کیا ہوا تھا ۔ ہونٹوں پر بھی ست رنگی لپ اسٹک کا ہلکا سا شیڈ تھا اور اس کا ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر دھرا ہوا تھا ۔ وہ خود سے بے نیاز تھی مگر اس کا حسن سارے کمرے میں جیسے بکھرا پڑا تھا ۔ وہ کہہ رہی تھی ۔

”نہیں ابھی تک تو کوئی ایسی بات نہیں ہوئی ۔ سلمان نے پاپا سے معافی مانگ لی ہے مگر وہ مجھ سے بات نہیں کر رہا ۔“ اپنا نام اس کی زبان سے سن کر سلمان ابراہیم کو ایک ایسا سرور محسوس ہوا کہ اس کا دل چاہا لپک کر اس کے قدموں میں جا بیٹھے لیکن اس کے اندر سے آواز آئی کہ یہ تیرا نہیں اس کے سگے بھائی کا نام ہے ۔ ایسا کیا ہوا ہے جو سلمان اس سے ناراض ہے ۔ اس نے سنا ۔

”پتا نہیں مجھے ایسا تو نہیں لگتا کہ مگر اس کی آنکھوں میں میرے لیے اب ایک ایسی نفرت ہے جیسے وہ مجھ سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتا ہے ۔ میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں ۔ معافی مانگنا چاہتی ہوں لیکن میری ہمت نہیں ہوتی ۔ اس کا رویہ بہت درشت اور سخت ہے ۔ ماما نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے انہیں بھی جھڑک دیا تھا ۔ وہ صرف پاپا سے معافی مانگ کر خود کو اس گھر میں محفوظ بنانا چاہتا تھا کیونکہ پاپا نے اس سے کہہ دیا تھا کہ اگر اس نے اپنا رویہ نہ بدلا تو وہ اسے گھر اور جائیداد دونوں سے بے دخل کر دیں گے ۔“

پھر وہ چپ ہوگئی اور دوسری طرف کی بات سننے لگی ۔ سلمان سمجھ گیا دوسری طرف ضرور شرجیل تھا ۔ جو اسے کچھ بتا رہا تھا ۔ سلمان نے فوری طور پر اپنی جناتی شکتی کا استعمال کیا اور اسے شرجیل کی آواز بھی سنائی دینے لگی ۔ وہ کہہ رہا تھا ۔

”مجھے ڈر ہے صنوبر اسے اگر میرے اور تمہارے بارے میں علم ہوا تو وہ ہمارے لیے کوئی مشکل نہ کھڑی کر دے ۔ تم سے بدلہ لینے کے لیے سب سے آسان راستا یہی ہے کہ وہ تمہیں مجھ سے ملنے نہ دے !“

شرجیل کی آواز میں آنے والے خطرے کی آہٹ سنائی دے رہی تھی ۔ صنوبر یہ سن کر جیسے چپ ہوگئی ۔ اور کچھ دیر کے بعد اس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا ۔

وہ پریشان ہو چکی تھی ۔ اسے شرجیل کی بات درست معلوم ہو رہی تھی ۔ اس کا مطلب ہے وہ اس کی شرجیل سے شادی بھی نہیں ہونے دے گا ۔ اور اس کے راستے میں روڑے اٹکائے گا ۔ اس کے چہرے اور آنکھوں کی چمک میں کمی آگئی جیسے اچانک اس کے اندر کچھ بجھ سا گیا ہو ۔ سلمان نے سوچا میں اگر اس کے مستقبل کا پتا چلانے کی کوشش کروں تو کیا یہ ممکن ہے کہ میں یہ جان پاؤں کہ صنوبر کے ساتھ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے ۔ سلمان

کریم بڑا ہی کینہ پرور اور بے رحم فطرت کا مالک ہے۔ اس نے اگر صنوبر کو پریشان کرنے کی کوشش کی تو شرجیل صحیح سوچ رہا ہے، وہ شرجیل اور صنوبر کو کبھی ایک نہیں ہونے دے گا۔ سلمان جتنی دیر اس کمرے میں رہا صنوبر کمرے میں اِدھر سے اُدھر اٹھتی بیٹھتی رہی۔ اُس نے صنوبر کے مستقبل میں جھانکنے کی کوشش کی مگر اسے اس وقت حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب وہ صنوبر کے بارے میں ایک دن بعد کی تصویر بھی نہیں دیکھ سکا۔ اس نے بار بار کوشش کی اور ہر بار اسے صنوبر کے مستقبل کے بارے میں سیاہ اندھیرے کے علاوہ کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔

اس کا مطلب ہے اس کی شکتیاں صنوبر کے بارے میں اسے کچھ بھی بتانے سے معذور ہیں۔ اب کیا کروں؟ اس نے خود سے پوچھا۔ پھر اس کے اندر سے آواز آئی کہ جو بھی ہو صنوبر کی شادی بہر حال شرجیل سے ہی ہوگی کیونکہ اس کے ماں باپ سلمان کو صنوبر کی خوشیوں کو لوٹنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اور وہ کیوں ایسا سوچ رہا ہے اس کا اب اس بات سے کیا لینا دینا ہے۔ اس نے صنوبر کو دیکھ لیا تھا اب اسے جانا چاہیے اور واپس جا کر خود کو موت کے حوالے کر دینا چاہیے۔ یوں بھی اس کی موجودگی بے معنی ہے۔ کوئی ایسی سبیل نہیں بن سکتی کہ صنوبر جیسی لڑکی جو شرجیل سے محبت کرتی ہے وہ شرجیل کو بھول کر اس سے محبت کرنے لگے گی، اس لیے سب بے کار ہے۔ ان ساری باتوں کا کوئی مطلب نہیں ہے۔

اس نے بے دلی سے آخری بار صنوبر کی طرف دیکھا اور اپنے واپس جانے کے فیصلے پر عمل کر لینے کی ٹھانی۔ لیکن اس کا دل یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا وہ چاہتا تو ساری زندگی اسی طرح صنوبر کے آس پاس رہ سکتا تھا لیکن اس کا فائدہ کیا تھا۔ اس طرح تو اس کے بے قرار دل کو اور بھی تکلیف ہوگی۔ وہ صنوبر کو ہمیشہ اسی طرح شرجیل کے لیے پریشان دیکھے گا۔ اور مارے حسد کے اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتا رہے گا۔ یہ تکلیف اس کے لیے دنیا کی ساری تکلیفوں سے زیادہ اذیت رساں ہے اس لیے اسے صنوبر کی دنیا سے چلے ہی جانا ہوگا، یہ سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، دل ناداں نے اس کے پیروں میں جیسے زنجیریں ڈال دیں اور چیخ چیخ کر کہنے لگا کہ کم سے کم صنوبر کو اپنی محبت کے بارے میں بتا ہی دے۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا وہ اس کی محبت ٹھکرا دے گی۔ لیکن یہ سب احمقانہ اور خواہشوں کو مہمیز دینے والی باتیں تھیں، وہ اسی طرح کی کشمکش میں وہاں سے نکلا اور جیسے ہی صنوبر کے کمرے سے باہر آیا اسے سلمان کریم کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز صرف سلمان ابراہیم کو ہی سنائی دے سکتی تھی۔ ورنہ کسی بھی کمرے سے کسی کی آواز باہر سنائی دینا ممکن نہیں تھا تب ہی تو سلمان کریم ایسی بے فکری سے اپنے کسی دوست سے باتیں کر رہا تھا۔

''تم جو بھی کہو مجھے یہ بات کسی بھی طرح پسند نہیں ہوگی کہ میرے کسی دوست کی شادی میری بہن سے ہو۔ میں یہ کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کروں گا۔ سمجھ گئے زین۔'' اس نے غصے سے کہا۔

''لیکن اس میں حرج ہی کیا ہے۔ فارس نے کہا ہے وہ اپنے سارے ایسے کام اور مشاغل ترک کر دے گا جن سے اس کا کردار مشکوک ہوتا ہے'' زین نے کسی فارس کی وکالت کی۔

''اور اب تک جو اس نے اتنے بہت سے برے کام کیے ہیں۔ کتنی ہی لڑکیوں سے اس کی دوستی رہی ہے۔ پتا نہیں کیا الٹا سیدھا کرتا رہا ہے وہ اس کا کیا؟'' سلمان نے پھر اسی لہجے میں کہا۔

''یار شادی سے پہلے تو ہم سب ہی کچھ نہ کچھ مستیاں کرتے ہیں۔ اب اس کا کیا یہ مطلب ہے کہ ہم سے کوئی شریف لڑکی شادی نہیں کر سکتی یا ہم کسی شریف لڑکی کے قابل نہیں ہیں؟''

زین کی بات میں وزن تھا خود سلمان کریم نے بھی ایسے بہت سے گناہ کیے تھے جو شریف گھرانوں میں معیوب سمجھے جاتے ہیں تو کیا اب اس کے لیے سب شریف گھرانوں کے دروازے بند ہو جائیں گے، ویسے بھی مرد بچے جوانی میں ایسی حرکتیں کرتے ہی رہتے ہیں۔ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جاتے ہیں اور اپنی بیوی کے ساتھ مخلص ہوتے ہیں۔''

ایسی ہی باتوں سے زین نے سلمان کریم کو قائل کرلیا۔ سلمان کریم کے پاس اپنے دفاع میں جب کوئی دلیل نہیں ملی تو اس نے یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ جو بھی ہو ماما اور پاپا صنوبر کی مرضی کے بغیر اس کی شادی کہیں نہیں کریں گے۔''

''تو کیا ہے صنوبر کی مرضی۔ کیا تم اپنی بہن سے یہ بات معلوم نہیں کرسکتے؟'' زین نے اسے بات ختم نہیں کرنے دی۔

سلمان سوچ میں پڑ گیا کہ اب زین کو کیا جواب دے۔ اس رات کے جھگڑے کے بعد سے وہ صنوبر سے بات ہی نہیں کررہا تھا تو اتنی پرسنل بات وہ اس سے کیسے پوچھ سکتا تھا۔

''اس رات کے بعد صنوبر اور میرے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ سمجھو تو ہم ایک دوسرے سے بات نہیں کررہے۔ میں اس سے بہت ناراض ہوں۔ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا جو پاپا نے زندگی میں پہلی بار مجھ سے ایسے لہجے میں بات کی وہ تو شاید مجھے پیٹ ہی ڈالتے۔ اس لیے میں صنوبر سے ناراض ہوں اور اب تم یہ فارس کی بات لے کر بیٹھ گئے۔ اس وقت تو میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کرسکتا، اس لیے اس سے کہو فی الحال میں کچھ نہیں کرسکتا۔''

یہ کہہ کر اس نے بات ختم کردی۔ اور سلمان ابراہیم کو یہ ایک اور بات پتا چلی کہ صنوبر کا ایک اور طلب گار پیدا ہو چکا ہے اور وہ سلمان کریم کا کوئی اوباش دوست ہے۔ شرجیل کی بات چند لمحوں بعد ہی درست ثابت ہوگئی اگر سلمان کریم اپنے دوست کے حق میں ہوگیا تو وہ صنوبر اور شرجیل کو کبھی ایک نہیں ہونے دے گا کم سے کم وہ اپنی بہن کے راستے میں رکاوٹ تو ڈال ہی سکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شرجیل اور صنوبر کو ایک دوسرے سے دور کرنے میں کامیاب ہوجائے۔ ویسے بھی وہ کسی بات پر جو سلمان ابراہیم کے علم میں نہیں تھی صنوبر سے ناراض ہے۔

یہ سب سوچتے ہوئے اس نے گھر کے ڈرائنگ روم میں ایک اور تماشا دیکھا ایک خاتون جسے درشہوار مسز کمال کہہ کر بلارہی تھیں وہ اپنے بیٹے اسامہ کے لیے صنوبر کی بات کررہی تھیں۔ جس کا جواب درشہوار نے یہ کہہ کر دیا کہ میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتی کیونکہ آج کل کے بچے اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کا پرپوزل میں صنوبر کے سامنے رکھ دوں گی۔ اس نے ہاں کہا تو اس کی مرضی ورنہ میں اس سے نا کہنے کا حق چھین نہیں سکتی۔''

''تو کیا آپ نہیں جانتی کہ اس کی مرضی کیا ہے؟'' مسز کمال نے مزید تسلی کرنا چاہی۔

''اگر میری معلومات سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہیں تو اپنے دل سے صنوبر کا خیال نکال دیجیے۔ اس کی زندگی میں کوئی ہے یہ میں جانتی ہوں۔'' درشہوار نے رک رک کر کہا۔

سلمان ابراہیم کو یہ بات سن کر اندازہ ہوا کہ اب صنوبر کی اپنی ماں سے اتنی دوستی ہوچکی ہے وہ شرجیل کے بارے میں سب کچھ جانتی ہیں، ورنہ جب وہ پہلی بار اس گھر میں بلا بن کر آیا تو درشہوار اور صنوبر کے مابین اتنی بھی بے تکلفی نہیں تھی جتنی گھر کے نوکروں سے مالکوں کی ہوجاتی ہے۔ اسے یہ بات بہت پسند آئی کہ اب درشہوار کو اپنی بیٹی کا خیال تھا اور وہ اس کی پسند دے بھی واقف تھی بلکہ اسے صنوبر کے فیصلے کا بھی علم تھا۔

مسز کمال اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں اور اس طرح سلمان ابراہیم کو صنوبر کے تیسرے پرستار کے بارے میں معلوم ہوا۔ ان سب میں سب سے بدنصیب وہ ہی تھا جو اپنی بات کسی بھی ذریعے سے صنوبر تک نہیں پہنچا سکتا تھا، باقی جس کو بھی صنوبر کی چاہ تھی وہ اپنے اپنے چینل استعمال کررہا تھا لیکن اس کا یہاں اس دنیا میں کوئی نہیں تھا اس لیے وہ صنوبر کے دل ودماغ تک اپنی بات نہیں پہنچا سکا۔ اور بے نیل مرام نامراد یہاں سے ہمیشہ کے لیے جارہا تھا۔ صنوبر کے قریب رہنے کے لیے اس نے بلا بن کر درشہوار کی گرم گود میں بھی کتنا ہی وقت گزارا تھا۔ اور اب بھی عورت اس کی طرف دیکھتی بھی نہیں۔ وہ زہرخند سے ہنسا۔ وہ بھلا میری طرف کیسے دیکھ سکتی ہے۔ اسے تو

یہ بھی نہیں معلوم کہ میں یہاں اس گھر میں موجود ہوں، وہ بھی اس سے چند قدم کے فاصلے پر۔

وہ بالآخر اس گھر سے نکل آیا اور اپنی جان لینے کے فیصلے پر عمل درآمد کرنے کے راستے پر چل نکلا۔ اسے اپنی بہت ہی محبت کرنے والی ماں کا بھی خیال آیا کہ وہ جب اسے دنیا میں نہیں پائے گی تو اس کا کیا حال ہوگا۔ ابھی وہ ہفتے دو ہفتے میں اس کے لیے کس طرح بے چین ہو جاتی ہے اور جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ اب اس کا اکلوتا بیٹا اس دنیا میں نہیں ہے تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔ پتا نہیں وہ یہ صدمہ جھیل بھی سکے گی یا نہیں۔ ایسی سوچوں نے اس کا دل اور آنکھیں دونوں گیلی کر دیں اور وہ زور زور سے رو پڑا۔

کاش میں نے انسانوں کی دنیا میں آنے کی ضد نہ کی ہوتی تو آج خود کو یوں بے موت تو مجھے نہ مارنا پڑتا۔ یا خدا! یہ مجھ سے کیا ہو گیا۔ اگر انسانوں کی دنیا میں آ ہی گیا تو اس روز اپنے پدر سے کا راستہ نہ بھولا ہوتا تو صنوبر کے گھر تک نہ پہنچا ہوتا اور صنوبر کو نہ دیکھتا تو مجھے اس سے محبت بھی نہ ہوتی اور یہ محبت اس طرح زہر کی طرح میری رگوں میں نہ سماتی تو یہ عشق کے زہر کا پیالہ مجھے پینا نہ پڑتا۔ کاش میں انسان ہی ہوتا تو آج تک اپنی محبت سے اس طرح دور تو نہ رہتا۔ انسان تو اپنی محبتوں کا اظہار کرنے میں اتنی دیر نہیں کرتے، بس اسے ہی موقع نہیں مل سکا۔ موقع ملتا بھی کیسے وہ نہ تو صنوبر کے جیسے لوگوں اور اس کی کلاس کا کوئی انسان تھا اور نہ ہی اس کے ماں باپ اس طرح کے تھے محبت کا اظہار کر بھی دیتا تو سب سے پہلے اسے اپنا پتا ٹھکانہ بتانا پڑتا وہ کیا بتاتا۔ اس کا جن ہونا اس کی محبت کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوا تھا۔ اور اب اس کا اس دنیا سے چلے جانا ہی ٹھیک تھا۔

اس نے بڑے دلدوز لہجے میں رب تعالیٰ سے دعا مانگی کہ اے خدا اب مجھے کبھی پیدا کرنا تو جن بنا کے مت پیدا کرنا جن بن کر میں نے تیری دنیا میں دکھوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں پایا۔ اب مجھے انسان بنا کے پیدا کرنا میرے مالک۔''

وہ روتا رہا اور کوئی ایسا نہیں تھا کہ اس کے آنسو صاف کر سکے۔ اس کی دل جوئی کر سکے۔ پھر اس نے اپنے لبادے میں سے ایک خنجر نکالا اور خود کو ہلاک کرنے کا مصمم ارادہ کرتے ہوئے اپنے سینے میں اتارنے کے لیے بلند کیا تو اس کی حیرت کی اس وقت انتہا نہ رہی جب وہ خنجر والا ہاتھ ہوا میں اسی طرح بلند رہا اور اس کی لاکھ کوشش کے بعد بھی اس کے سینے تک نہیں پہنچ پایا۔ اس نے اپنی ساری قوت صرف کر کے اسے اپنے سینے کی جانب کھینچنا چاہا لیکن وہ ناکام رہا اور اسے یقین ہو گیا کہ کوئی ہے جس نے اس کا خنجر والا ہاتھ اس مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے کہ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہلا نہیں پا رہا۔ لیکن یہ کون ہے؟ اس نے دیکھنے کی کوشش کی پر اسے کوئی نظر نہیں آیا اس نے پھر سے کوشش کی لیکن سب بے سود۔ نہ ہی اس کا ہاتھ اس آہنی گرفت سے آزاد ہو سکا اور نہ ہی اسے پکڑنے والے کا ہاتھ یا وہ خود دکھائی دیا۔ مجبور ہو کر اس نے زور سے التجا کی۔

''تم کون ہو اور میرے ارادے کے راستے میں کیوں حائل ہو؟'' پہلی بار پوچھنے پر اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے دوسری بار پوچھا۔ پھر جواب ندارد تھا۔ اس نے دیکھا کہ خنجر اس کے ہاتھوں کی گرفت سے نکل کر کہیں اور چلا گیا تھا۔ کہاں گیا تھا یہ اسے اسی طرح دکھائی نہیں دیا جس طرح اسے وہ ہاتھ اور وہ شخصیت دکھائی نہیں دے رہی تھی، جس نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ جب بار بار پوچھنے پر بھی اس کو کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کا وہ ہاتھ اس آہنی گرفت سے آزاد ہو چکا ہے جس میں کچھ دیر پہلے خنجر تھا۔ وہ اتنا تو جان گیا کہ کوئی ہے جو اس کی اور موت کی راہ میں حائل ہے، جو اسے خودکشی نہیں کرنے دینا چاہتا مگر وہ کون ہے۔ سامنے کیوں نہیں آتا اور یہ کیوں نہیں بتاتا کہ ایسی بے مراد زندگی کو جی کر میں کروں گا کیا۔

''تم کون ہو میرے بھائی اور مجھے کیوں مرنے سے روکنا چاہتے ہو؟ اگر تم نے اب میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو میں پھر سے خود کو ہلاک کرنے کی کوشش کروں گا اور ایسا میں اس وقت تک کرتا رہا ہوں گا جب تک

موت میرا مقدر نہیں بن جاتی۔ ورنہ مجھے بتاؤ تم مجھے کیوں نہیں مرنے دینا چاہتے۔ کیوں؟''

اس بار بھی کوئی جواب نہیں آیا تو سلمان وہیں ریت اور مٹی میں لیٹ گیا اور کھلی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ شاید میرے گناہ اور جرائم ایسے ناپسندیدہ ہیں کہ آسمانی طاقتیں مجھے مرکر مکتی حاصل کرنے دینا نہیں چاہتیں۔ وہ مجھے تڑپانا چاہتی ہیں اور تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتی ہیں۔ مجھے میرے گناہوں اور خدا کی نافرمانی کی سزا اسی دنیا میں دینا چاہتی ہیں تاکہ میں اپنی آنکھوں سے اپنے دل کی دنیا کو اجڑتے ہوئے دیکھوں اور ماتم کرتا رہا ہوں۔ دل کی تکلیف سے اس قدر بے حال ہو جاؤں کہ مجھ میں اپنی کسی بھی شکتی کو استعمال کرنے کی توفیق نہ رہے۔ میں بے بسی سے پاؤں رگڑ رگڑ کر مروں کیونکہ زہر عشق کے مریضوں کا یہی مقدر ہے۔

کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے ذہن کو کچھ بھی سوچنے سے روک دیا اس کا ذہن بالکل خالی ہو گیا۔ اور وہ پرسکون ہوتا چلا گیا اسے ایسا لگنے لگا جیسے اس کے ذہن و دل پر جو بار تھا وہ تحلیل ہو گیا ہو اور اب اسے کسی بھی طرح کی کوئی تکلیف نہ رہی ہو۔ یہ ایک انوکھا تجربہ تھا جو اسے پہلی بار ہوا تھا، اس نے اپنے دل کو ٹٹولا کہ کیا اس میں سے صنوبر کا خیال بھی نکل چکا ہے..... تو اس نے محسوس کیا کہ یہ خیال موجود تو تھا پر اب اس سے ٹیسیں نہیں اٹھ رہی تھیں بلکہ ایک عجیب سا سرور اور طمانیت کا احساس اس کی رگِ جاں میں تیر رہا تھا۔ ناکامی اور نامرادی کے سارے خیالات کہیں گم ہو گئے اور اس کا وجود شانت ہو گیا۔ اس کا دل ایسے ہلکا ہو گیا جیسے اب وہاں محرومی اور مایوسی کی کوئی ایک لہر بھی باقی نہیں رہی تھی۔

اس نے کچھ دیر تک خود کو ایسے ہی رکھا بے حس و حرکت۔ سچ میں اسے یہ سب بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ یہ کیسا مزا تھا وہ اس کے بارے میں پہلے سے نہیں جانتا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی اس قسم کے احساس کا تجربہ نہیں کیا تھا۔ کیا مرنے کے بعد ایسا ہی ہوتا ہے اور کیا اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہے اگر نہیں تو پھر یہ سب کیا ہے۔ کون ہے جس نے اسے مرنے نہیں دیا اور اب ایسے دلنشیں احساس سے اس کی شناسائی کرا رہا ہے۔ دیر تک وہ مثبت خیالات کے جھولے میں جھولتا رہا اسے بہت مزا آ رہا تھا۔ یہ احساس اور لذت کچھ کچھ ایسی تھی جیسی اسے صنوبر کو دیکھنے، اُس کا دیدار کرنے سے حاصل ہوتی تھی۔

کافی دیر جب اسی طرح گزر گئی اور کوئی دوسری بات یا منظر اس کی روح کو چھو کر نہیں گزرا تو اس نے خود کو جنبش دے کر ہلانے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ پاؤں سب اس کی مرضی سے جنبش کر رہے تھے اس نے پاؤں موڑے تو وہ مڑ گئے اس نے اسی ہاتھ کو جس میں خنجر لے کر اس نے خود کو مارنا چاہا تھا اسے جنبش دی تو وہ بھی اس کے کہنے سے اوپر نیچے ہونے لگا اور یوں اسے یقین ہو گیا کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ اب اس کے ذہن سے مرنے کا خیال نکل چکا تھا اور اس بارے میں اس نے جیسے سوچنے کی کوئی ہلکی سی کوشش بھی نہیں کی۔ کوئی تو تھا جس نے اس کے ذہن سے یہ خیال نکال دیا تھا مگر اب اس تجسس نے اس کے دل میں ہلچل مچا دی تھی کہ کون ہے جو اسے مرنے سے روکنا چاہتا ہے اور کیوں؟

''یہ ہم ہیں جو تمہیں بے موت نہیں مرنے دینا چاہتے کیونکہ ہمیں یہی حکم ملا ہے!''

ایک آواز تھی جو اس کی سماعت سے ہو کر اس کی روح کی گہرائیوں میں اتر گئی۔

اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی، اس کی زبان جیسے قوت گویائی سے محروم ہو گئی۔

(ایک جن اور آدم کی محبت لیے، اسرار بھری عشق کی دنیا میں لے جانے والے سطر سطر زہر عشق لہو میں دوڑاتے، اس ناول کی اگلی کڑی ماہ جنوری میں پڑھیے)

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہر حال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 300/= روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اِس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کین منی 300/= روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)...... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)...... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)...... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II ۔ خیابانِ جامی ۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی ۔ فیز-7، کراچی

اسلام علیکم بچو!
اللہ ہم سب کو دین و دنیا دونوں میں خیر عطا فرمائے۔ چاردانگ عالم افراتفری اور حوانیت کا جو عالم ہے اللہ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ جب سچی کہانیاں کا یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا تب ماہِ صفر شروع ہو چکا ہوگا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی تمام پڑھنے والوں کو تلقین کروں گا کہ خوب صدقہ خیرات دیں...... یہ مہینہ مردوں پر بھاری ہوتا ہے۔لہٰذا صبح شام آیت الکرسی پڑھ کر گھر سے نکلیں۔ سورۃ الناس، سورۃ الفلق، سورۃ المعارج، سورۃ البقرہ ضرور پڑھیں۔ اللہ ہم سب کو اپنی امان میں رکھے اور نیک عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

☐ مسز سلیم۔ راولپنڈی

○ بیٹی! اللہ تمہارے حال پر رحم فرمائے۔ بیٹیاں بہت پیاری ہوتی ہیں اور اُن کی تکلیف ماں باپ کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ تم اپنی صحت پر توجہ دو کیونکہ جان ہوگی تو مسائل کا ڈٹ کر سامنا کرسکو گی۔ بیٹی زندگی مسلسل جدوجہد ہی ہے، بچھ کو زیادہ کرنی پڑتی ہے کچھ کو کم۔ تم ہمت مت ہارو۔ اپنے رب پر پختہ یقین رکھو وہ ضرور تمہاری سنے گا۔ چلتے پھرتے 'یا الرحم الراحیمین' بہت پڑھا کرو اور اللہ سے آسانی کی دعا مانگو۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے آگاہ کرو۔

☐ نور صدیقی۔ جرمنی

○ بیٹی نور! اللہ تمہیں اچھا رکھے۔ تمہارا ہدیہ مجھ تک نہیں پہنچا اس لیے کہ تم نے پن کوڈ دیا ہی نہیں تھا۔ دوسری اہم بات جس بچی کا تم نے ذکر کیا ہے، وہ جوان بچی ہے اس کو تم کیسے گود لے سکتی ہو۔ پھر ویزا اور دیگر معاملات، ظاہر ہے اتنی بڑی ذمہ داری میں بھی نہیں لے سکتا کہ کسی کی بیٹی کو کسی کے حوالے کردوں۔ اللہ نے تمہیں نوازا ہے تو بہتر ہوگا اس کا ماہانہ خرچ باندھ دو۔ وہ اُس کو ملتا رہے گا اور تمہیں دعائیں ملیں گی۔ کسی کی بھی مدد کرنے کا یہ سب سے اچھا اور محفوظ طریقہ ہے۔ جب کسی بھی انسان کے کھانے پینے کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو وہ برائی کا راستہ بالکل اختیار نہیں کرتا۔ لہٰذا اللہ کے بندوں کو چاہیے کہ ضرورت مندوں کو برائی کے راستے پر جانے سے بچائیں۔ انسان سب کچھ برداشت کرسکتا ہے مگر بھوک برداشت نہیں ہوتی۔ کسی جائز ضرورت مند کی امداد کرکے آپ دو نیکیاں کماتے ہیں۔ ایک تو رزق کا مسئلہ بنتے ہیں جو خالصتاً اللہ کی طاقت ہے اور دوسرا برائی سے بچاتے ہیں اور ان دونوں نیکیوں کا صلہ نسلوں کو ملتا ہے، لہٰذا درست سمت میں ضرورت مندوں کی امداد کرو۔

☐ مومنہ بتول۔ مقام نامعلوم

○ بیٹی مومنہ! بالوں اور وزن کی دوا سچی کہانیاں کے دفتر سے دستیاب ہے تم فون کرکے معلوم کرسکتی ہو۔

☐ نصرت۔ راولپنڈی

○ اسلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ بابا جی آپ کیسے ہیں امید کرتی ہوں کہ آپ ٹھیک ہوں گے۔ اللہ آپ کو صحت وتندرستی دے۔ بابا جی میں بہت پریشان ہوں۔ میرے ابو کا کاروبار نہیں چل رہا ہے میرے ابو اور بھائی پر قتل کا ناجائز الزام لگا ہوا ہے۔ بابا جی کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ میرے ابو اور بھائی کا کیس ختم ہو جائے اور ابو اور بھائی کا کاروبار چل جائے۔

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: 88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122 - 35893121-021

☆بیٹی نصرت! یہ تو ظاہر ہے کہ کاروبار کیوں نہیں چل رہا۔ تمہارے والد قتل کے الزام کی وجہ سے کاروبار کو توجہ نہیں دے پا رہے ہیں۔ کوشش کرو کہ مخالفین کے درمیان راضی نامہ ہو۔ یہ المیہ ہے کہ پاکستان میں ایک دوسرے پر جھوٹے کیس بنانا بہت آسان ہے۔ خاندان کے خاندان برباد ہو چکے ہیں۔ بہرحال نماز فجر کے بعد 14 دن سورۃ یٰسین پڑھو اور دعا کرو انشاء اللہ بہتر اسباب پیدا ہوں گے۔

□ مہوش۔ گجرات

○ پیارے بابا جان! میں آپ کے پاس دو مسئلے لے کر حاضر ہوں بہت امید ہے کہ آپ مایوس نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دونوں جہانوں میں دے گا (آمین) بابا جی! اس سے پہلے بھی میں آپ کو خط لکھ چکی ہوں، اپنے خاوند کی روزی کے لیے۔ آپ نے مجھے سورۃ یٰسین نماز مغرب کے بعد پڑھنے کو کہا تھا۔ اور ایک ماہ بعد دوبارہ خط لکھ کر پوچھنے کا کہا تھا۔ بابا جی وظیفہ ایک ماہ کیا ہے ہم دونوں میاں بیوی اپنا شہر چھوڑ کر میرے خاوند کے بڑے بھائی (جیٹھ) کے گھر گجرات میں آ گئے ہیں۔ یہاں پر میرا خاوند ایک ماہ مزدوری کرتا رہا ہے۔ پھر چھوڑ دی ہے۔ بابا جی! پتا نہیں کیا مسئلہ ہے غربت، پریشانی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ بابا جی! میں بچپن سے ہی غربت پریشانیاں دیکھتی آ رہی ہوں۔ شادی کے بعد بھی نصیب نہیں بدلے بلکہ پہلے سے بدتر حال ہے۔ ماں کو فوت ہوئے دس سال ہو گئے ہیں۔ باپ کو فوت ہوئے ایک سال ہوا ہے۔ ہم پانچ بہنیں ایک بھائی ہیں۔ سب شادی شدہ، اپنے گھر میں خوش ہیں۔ میں سب سے چھوٹی ہوں بابا جی! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میرا حق مہر کا مکان میرے سسر نے مجھ سے لکھوا لیا ہے۔ اس دن سے در در کی ٹھوکریں لکھی ہیں۔ خاوند نشئی ہے۔ مارتا بہت ہے کماتا نہیں ہے۔ یہی سوچ کر ادھر آئی ہوں کہ شاید یہ سدھر جائے اور باہر کے ملک چلا جائے۔ پھر مکان بھی بن جائے گا۔ اور دونوں بچوں کا مستقبل بھی بن جائے گا۔ بابا جی! میرے سب رشتے دار یہی کہتے ہیں کہ اس سے طلاق لے لو یہ کبھی نہیں سدھرے گا۔ میرا خاوند تو مجھے طلاق بڑی خوشی سے دینا چاہتا ہے۔ لیکن مجھے اپنے خدا پر پورا یقین ہے کہ میرے دن بدل جائیں گے۔ میرا گھر بن جائے گا۔ اور یہ سدھر جائے گا۔ بابا جی! میں طلاق نہیں لینا چاہتی۔ میرا جیٹھ اور جیٹھانی بہت اچھے ہیں انہوں نے دو ماہ ہو گئے اپنے گھر رکھا ہوا ہے۔ ہر چیز کا خیال رکھتے ہیں۔ لیکن میرا خاوند بچوں کی اور میری ذمہ داری نہیں اٹھانا چاہتا۔ عیاشی کرنا چاہتا ہے۔ پلیز بابا جی! آپ کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا واسطہ ہے آپ میرا مسئلہ حل کر دیں اور کوئی جلالی وظیفہ دیں کہ یہ میرا فرمانبردار ہو جائے اور دل لگا کر روزی کے لیے باہر کے ملک چلا جائے۔ ہم کچھ بن کر اپنے وطن لوٹیں۔ ساری زندگی آپ کو دعائیں دوں گی۔ بابا جی! میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میری جیٹھانی کی دو بیٹیاں ہیں اب تیسری بار امید سے ہے۔ دونوں میاں بیوی (جیٹھ اور جیٹھانی) کی خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو بیٹا دے۔ پلیز بابا جی! آپ کو اللہ اور اس کے رسول کا واسطہ ہے۔ آپ کوئی جلالی وظیفہ یا تعویذ دیں تا کہ ان کے ہاں بیٹا پیدا ہو۔ اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ اور اسی طرح لوگوں کی پریشانیاں دور کرتے رہیں۔

☆بیٹی مہوش! اللہ تمہارے شوہر کو عقل سلیم عطا فرمائے۔ ذمہ داریوں سے فرار انتہائی بزدلانہ عمل ہے۔ زندہ انسان بے حس نہیں ہو سکتا۔ تم نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ بعد نماز عشاء 3 تسبیح تیسرے کلمے کی پڑھو اور دعا کرو۔ اپنے ہاتھوں سے چڑیوں کو دانہ اور پانی ضرور دیا کرو۔ بھاوج سے کہو مجھ سے تعویذ منگوا لے انشاء اللہ جلد کرم ہو گا۔ تفصیل سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے لے لو۔

□ وجدان۔ مقام نامعلوم

○ بیٹی وجدان! تم لوگ جوابی لفافہ نہیں رکھو گے اور پتا بھی صاف صاف خط میں نہیں لکھو گے تو میں جواب کیسے دوں گا۔ بہرحال جو صورت حال ہے اس میں، میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ ہر نماز کے بعد 3 تسبیح 'لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم' پڑھو۔ حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور نکالو۔ انشاء اللہ خود مثبت تبدیلی دیکھو گی۔ مجھے 21 روز بعد مطلع کرو۔

□ ثمینہ گل۔ میرپور خاص

○ بیٹی ثمینہ! اللہ تمہیں مکمل شفا دے۔ تمہیں جواب براہِ راست ہی دیا جاتا مگر تم نے جوابی لفافہ بھی نہیں رکھا اور خط میں پتا بھی نہیں لکھا۔ لفافے کے پیچھے جو پتا لکھا جاتا ہے اس پر ڈاک خانے کی اتنی مہریں ہوتی ہیں کہ وہ واضح نہیں ہوتا بہرحال میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ بکری کا دودھ استعمال کرو۔ گھر میں دوسرا کوئی بھی دودھ مت استعمال کرو۔ دوسری اہم بات یہ کہ مجھ سے دانتوں اور بالوں کے لیے دوا اور تیل منگوالو۔ تمہیں دو تین خوراکوں میں ہی افاقہ ہوگا۔ اس کے علاوہ بہت مناسب ہوگا کہ مجھ سے تعویذ منگوا کر گھر میں رکھو تا کہ ہر قسم کی بدنظر اور حاسدوں سے تمام افراد محفوظ رہیں۔ تفصیلات سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے حاصل کر سکتی ہو۔

□ نشاط انجم۔ لیہ

○ محترم باباجی! السلام علیکم! میں امید کرتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے اور دُعا کرتی ہوں کہ اللہ آپ کو ہمیشہ حفظ و اَمان میں رکھے۔ (آمین!) باباجی! آج جو مسئلہ میں لے کر حاضر ہوئی ہوں' وہ میری بہن کے متعلق ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ باباجی! میری بہن کی عمر 31 سال ہے اور کافی کوشش کے باوجود اس کی بات کہیں طے نہیں ہو پا رہی ہے۔ چونکہ میں خود بھی غیرشادی شدہ ہوں اور جن مسائل کا شکار ہوں' باباجی! میں ان سے بہت خوفزدہ ہوں۔ میری عمر بھی 50 سال ہوگئی ہے لہٰذا میں آپ سے گزارش کروں گی کہ مجھے کوئی وظیفہ ارسال کر دیجیے جو کہ میں ارم کے لیے پڑھوں اور ہم اپنے اس فرض سے بخیر و خوبی سبکدوش ہو جائیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ آپ کے لیے دُعا گو۔ آپ کی بیٹی۔

☆ بیٹی نشاط! نماز کی پابندی رکھو۔ اکثر بچیاں وظائف کی پوری طرح ادا نہیں کر پاتیں۔ اس لیے میں تمہیں تعویذ کا مشورہ دوں گا۔ اس سلسلے میں سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلومات حاصل کرلو۔

□ عزیز گجر۔ فیصل آباد

☆ بیٹے عزیز! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ بیٹے! محبت ایک جذبہ ہے' یہ کوئی چیز نہیں جو حاصل کرلی جائے پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ جس شخص سے محبت کی جائے' اسے حاصل بھی کرلیا جائے۔ جس سے بھی محبت کی جاتی ہے' اس کی عزت کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ اس جذبے میں زورزبردستی نہیں چلتی۔ تم اپنے آپ کو اس قابل بناؤ کہ وہ لڑکی تمہیں پسند کرے پر جائز طریقے سے پیام بھجواؤ۔ لڑکی کو مذہب نے بھی اختیار دیا ہے کہ وہ اقرار کرے یا انکار۔ میں تمہیں بالکل اپنی اولاد جان کر نصیحت کر رہا ہوں' اپنی توجہ اپنے کام اور پھر عبادت میں رکھو' کامیاب رہو گے۔

□ رقیہ بیگم۔ کراچی

☆ بیٹی رقیہ! کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو دکھ دے کر خوش ہوتے ہیں۔ تم میری ایک نصیحت مانو' گھر کا ماحول بالکل ٹھیک رکھو' رونا دھونا بالکل بند کردو' یہ احساس ہی مت ہونے دو کہ تم دکھی ہو۔ نماز کی پابندی رکھو اور نمازِ عصر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھ کر پانی میں یا شربت پر دَم کرو اور یہ پانی شوہر کو پلا دو۔ یہ عمل نہایت مستقل مزاجی سے ۲۱ دن کرو پھر مجھے حالات سے مطلع کرو۔ میں تمہارے لیے دُعا گو ہوں۔

□ حشمت۔ گوجرہ

☆ بیٹی حشمت! بڑے دکھ کی بات ہے کہ بیٹی جیسی رحمت کو تمہارے والد عذاب سمجھتے ہیں۔ اللہ ان پر رحم فرمائے۔ تمہارا دکھ اپنی جگہ بجا ہے' بس بیٹی! اپنے معاملات اللہ کے سپرد کردو۔ ہر نماز کے بعد گڑگڑا کر حضورؐ کے صدقے دُعا کرو۔ دن بھر میں تین ہزار مرتبہ یَاوَکیلُ پڑھ کر اول و آخر درود ابراہیمی ۳-۳ بار پھر حاجت بیان کرو۔ مدت ۲۱ دن ہے۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ شاہدہ۔ سعودی عرب

☆ بیٹی شاہدہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ بچیوں پر بے جا سختی مت کرو' زورزبردستی سے معاملات بگڑ جاتے ہیں۔ بچیوں کو نرمی سے سمجھاؤ۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات کرو۔ نماز کی پابندی رکھو اور نمازِ عصر کے بعد ۴۱ بار سورۃ مومنون پڑھو اور حاجت بیان کرو۔ مدت ۴۱ دن ہے۔

□ نوما۔ خان پور

☆ بیٹی نوما! تم جس چیز کی تمنا کر رہی ہو' وہ تمہارے لیے بالکل مناسب نہیں۔ تم نماز کی پابندی کرو اور نمازِ فجر کے بعد ایک سو بار سورۃ توحید پڑھو اور دُعا کرو۔ اللہ

تمہارے دل کو سکون عطا فرمائے گا۔ مدت ۲۱ دن ہے۔

□ فوزیہ امداد۔ شکر گڑھ

☆ بیٹی فوزیہ! نمازِ فجر کے بعد نو بار آیت الکرسی پڑھ کر اپنے گرد حصار کر لیا کرو۔ یہی عمل عشاء کی نماز کے بعد کرو۔ نماز کی پابندی کرو اور کسی بھی نماز کے بعد ایک بار سورۃ یوسف پڑھ کر دُعا کرو۔ بیٹی! اچھی بچیاں آخری حد تک اپنے گھر کو بچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ میں تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گا' صبر اور استقامت سے حالات کا سامنا کرو' جلد بہتری ہوگی۔

□ نعیم خان۔ راولپنڈی

○ بزرگوار بابا جی! اَسلام و نیاز! مجھے یہ بتاتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ آپ کا ارسال کردہ وظیفہ مکمل ہونے کے تین ہفتے بعد ہی مجھے میری پسند کی ملازمت مل گئی ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ جس طرح ضرورت مندوں کی مدد کر رہے ہیں' خدا اس کا اَجر آپ کو ضرور دے گا۔

☆ بیٹے نعیم! میں بار بار سمجھاتا ہوں کہ میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس اللہ رحیم و کریم کا شکریہ ادا کرتے رہنا چاہیے کہ وہی سب کی سنتا اور مرادیں پوری کرتا ہے۔ اب نماز کی پابندی برقرار رکھنا اور اللہ کے نام پر حسبِ توفیق خیرات اور صدقہ دیتے رہنا۔

□ سندس گل۔ آزاد کشمیر

○ پیارے بابا جی! میں بہت دکھی عورت ہوں۔ جوانی میں بیوہ ہوگئی۔ دکھ اور پریشانیوں سے زندگی گزاری اور اولاد کو پال پوس کر جوان کیا۔ میں خود اَن پڑھ عورت ہوں مگر تعلیم کی اہمیت سے آگاہ تھی لہٰذا دونوں بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ آج ایک بیٹا ریاض میں بہت اچھی نوکری پر ہے اور دوسرا ٹیکسٹائل انڈسٹری میں خوب نام کما رہا ہے مگر دونوں کے پاس میرے لیے کچھ نہیں۔ انہیں شرم آتی ہے مجھے ماں کہتے ہوئے۔ میں آج بھی اسی طرح محنت مزدوری کرتی ہوں اور انہیں بددعا بھی نہیں دے سکتی۔ مجھے بتائیے کہ میں کیا کروں کہ اب محنت مشقت نہیں ہوتی اور اتنا بھی نہیں کہ کوئی حلق میں دو بوند پانی ڈال دے۔ مجھ سے کیا خطا ہوئی کہ زندگی میں سوائے چند دنوں کے سکھ نصیب نہ ہوا؟

☆ عزیزہ سندس! تمہارا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ تمہاری اولاد کو ہدایت دے ورنہ وہ بہت دکھ اٹھائیں گے۔ آج جو رویہ وہ اپنی ماں سے رکھیں گے' کل ان کی اولاد بھی یہی سب کچھ کرے گی۔ ان کے حق میں دُعا کیا کرو۔ تمہارا خط ان لوگوں کے لیے بھی نصیحت آموز ہے جو لڑکے کی آرزو میں سب کچھ کر گزرنے کو تیار رہتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ نصیحت کی ہے کہ صالح اور نیک اولاد کی دُعا کرو۔ بہرحال عزیزہ! تمہاری آزمائش کے دن اب پورے ہوئے۔ اب تمہاری اولاد کو بے انتہا سخت زندگی کا سامنا کرنا ہوگا۔ نمازِ فجر اور نمازِ عشاء کے بعد سورۃ مائدہ آیت ۲۔۳' ۴۱۔ ۴۱ بار پڑھو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ مجھے ۴۱ روز کے بعد مطلع کرو۔

□ عامر خان۔ کراچی

☆ بیٹے عامر! جنات کا وجود ہے۔ اس کا ذکر قرآنِ پاک میں بھی ہے۔ اگر تمہیں یہ احساس ہے کہ تمہارے گھر میں کوئی ایسی مخلوق ہے تو تم کوشش کرو کہ اس جگہ کو پاک صاف رکھو۔ خود بھی باوضو رہنے کی کوشش کرو۔ پانچ وقت کی نماز کا اہتمام کرو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد اکتالیس بار الحمد شریف پڑھو اور اول و آخر پہلا کلمہ گیارہ گیارہ بار اور اپنے اوپر دَم کر لو۔ یہ عمل اکتالیس دن جاری رکھو۔ انشاء اللہ کرم ہوگا۔

□ پروین صدیق۔ کراچی۔

☆ بیٹی پروین! تمہارا رجسٹرڈ خط مجھے آج یعنی ۵ نومبر کو ملا ہے۔ ممکن ہے بھائی اب تک چلا گیا ہو۔ اگر نہیں گیا ہے تو اس سے کہو کہ سورۃ لہب کا کثرت سے وِرد کیا کرے۔ بیٹی! جہاں تک پہلے مسئلے کا تعلق ہے تو تم نے یقیناً سنا ہوگا کہ کچھ لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے۔ بس اس سے زیادہ میں وضاحت نہیں کرنا چاہتا کہ تمہیں بہت دکھ ہوگا۔ اولاد ہونے کے ناتے تمہارا فرض ہے کہ ان کے حق میں دُعا کرو اور ہر وقت آیت الکرسی کے حصار میں رہا کرو۔

□ محمودہ احمد۔ کراچی

☆ بیٹی محمودہ! والدہ سے کہو کہ نمازِ عصر کے بعد ایک ہزار مرتبہ یَا وَالِیُ پڑھ کر بیٹے پر دَم کریں۔ گھر کے تمام

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرایئے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

افراد صرف ضرورت کے تحت بات کریں اور ڈرنا چھوڑ دیں۔ جہاں تک بیٹے حسنین کا تعلق ہے تو اسے کسی بچوں کے اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ کیوں کہ بچوں کو فوری علاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ رُوحانی علاج طویل اور صبر آزما ہوتا ہے۔ بھائی کے سلسلے میں مجھے ۲۱ روز کے بعد مطلع کرو۔

□ فرزین۔ملتان

☆ بیٹی فرزین! انسان ہمیشہ اپنی غلطی کا خمیازہ ہی بھگتتا ہے۔ ہم اپنی ہی حرکتوں سے رسوا ہوتے ہیں اور عزت بھی پاتے ہیں۔ تم زندگی کے کچھ اصول بناؤ۔ اچھی لڑکیاں تو ویسے بھی بلاوجہ بازاروں میں نہیں گھوما کرتی ہیں۔ نماز پابندی سے ادا کرو۔ گھر کے کاموں میں اپنے آپ کو مصروف رکھو پھر پوری توجہ اپنی تعلیم کو دو۔ تم جانتے بوجھتے گہری کھائی کی طرف بڑھ رہی ہو۔ اب کسی صورت میں اس لڑکی کے ساتھ کہیں نہ جاؤ بلکہ ترک تعلق کرلو۔ نمازِ عصر کے بعد سورۃ البقرہ آیت ۲۵۵، ۷ بار پڑھو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ وفا۔ گجرات

☆ بیٹی وفا! تمہارا مسئلہ طوالت اور مصلحت کے تحت شائع نہیں کیا جارہا۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ اس مشکل وقت میں تمہاری مدد کرے۔ نمازِ فجر اور عصر کے بعد ۱۲۱۔۱۲۱ بار پڑھو اور حاجت بیان کرو۔

مَاشَاءَ اللّٰہُ لَا حَولَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ

جو لوگ اللہ پر بھروسا رکھتے ہیں، وہ ضرور کامیاب ہوتے ہیں۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

□ عصمت۔یوکے

○ بابا جی! مجھے پردیس میں رہتے ہوئے ۲۵ سال ہوگئے ہیں۔ اولاد یہاں کے رنگ میں رنگ چکی ہے۔ باوجود کوشش کے، اب راہ راست پر نہیں آ سکتی۔ میں بہت مایوس ہوں اور چاہتی ہوں کہ اب وطن لوٹ آؤں۔ ہم دونوں میاں بیوی چاہتے ہیں کہ سارے معاملات خوش اسلوبی سے نمٹ جائیں اور ہم اپنوں میں لوٹ جائیں۔ ہماری مدد کیجیے۔ میں آخری وقت اس سرد ملک میں غیروں کے درمیان نہیں گزارنا چاہتی۔

☆ بیٹی عصمت! خدا تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ تمہارا خط مکمل شائع نہیں کر رہا ہوں۔ بہرحال بیٹی......! لوگ بہتر مستقبل کے لیے اپنوں سے دور چلے جاتے ہیں مگر عام طور پر خالی ہاتھ ہی رہ جاتے ہیں۔ میں تمہارے لیے خصوصی دُعا کروں گا۔ کوشش کرو کہ بچوں کو بھی واپس لاسکو ورنہ تم اپنے وطن میں ہوگی اور جان بچوں میں اٹکی رہے گی۔ نمازِ فجر کے بعد ۱۱ بار آیت الکرسی پڑھ کر گھر کے تمام افراد پر دَم کردو۔ نمازِ عصر اور عشاء کے بعد ۲۱۔۲۱ بار سورۃ الحمد شریف پڑھو اول و آخر ایک ایک تسبیح یَارحمٰنُ کی پڑھو پھر دُعا کرو۔ مدت ۲۱ دن ہے۔ انشاء اللہ، کرم ہوگا۔

□ رقیہ بیگم، کراچی۔

☆ بیٹی رقیہ! کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو دکھ دے کر خوش ہوتے ہیں۔ تم میری ایک نصیحت مانو، گھر کا ماحول بالکل ٹھیک رکھو، رونا دھونا بالکل بند کردو، یہ احساس ہی مت ہونے دو کہ تم دکھی ہو۔ نماز کی پابندی رکھو اور نمازِ عصر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھ کر پانی میں یا شربت پر دَم کرو اور یہ پانی شوہر کو پلا دو۔ یہ عمل نہایت مستقل مزاجی سے ۲۱ دن کرو پھر مجھے حالات سے مطلع کرو۔ میں تمہارے لیے دُعا گو ہوں۔

□ شہیلا۔حافظ آباد

☆ بیٹی شہیلا! اللہ تمہارے حال پر رحم فرمائے۔ اولاد کو ماں سے جدا کرنا نہایت برا عمل ہے۔ تم صبر اور ہمت سے کام لو۔ یاد رکھو، زیادتی کرنے والوں کو خدا بہت جلد پکڑ لے گا۔ میں تمہارے لیے خصوصی دُعا کا اہتمام کر رہا ہوں۔ بیٹی! اللہ تعالیٰ تمہاری تمہاری اولاد کو جلد تمہارے پاس لائے گا۔ تم نمازِ فجر کے بعد کھلے آسمان تلے کھڑے ہوکر ۳۰۰ بار یَاحُجَتہُ القَائِمُ پڑھو اور دُعا کرو۔ سچے دل سے عبادت کرو۔ اللہ ضرور کرم کرے گا۔ مجھے ۱۴ دن بعد پھر مطلع کرو۔

□ ثمر خان۔جیکب آباد

☆ بیٹی ثمر! خوش اور آباد رہو۔ اولاد نرینہ کے لیے تعویذ منگوالو۔ انشاء اللہ، کرم ہوگا۔ رزق میں کشادگی کے لیے ۷۲ دن تک ہر نماز کے بعد ۷۲ دفعہ یَا بَاسِطُ پڑھو اور دُعا کرو۔ خوداعتمادی اپنے اوپر بھروسا کرنے کا نام ہے۔ تم اپنی ذات میں ایک مکمل لڑکی ہو لہٰذا ہر دَم خدا

کا شکر ادا کیا کرو اور خوش رہا کرو۔ لوگوں سے ملا جلا کرو۔ بات چیت کیا کرو۔ تنہا الگ تھلگ رہوگی تو رفتہ رفتہ بات چیت کرنا بھی مشکل ہو جائے گی۔ دن میں کسی وقت بھی آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر ۲۱ بار سورۃ فاتحہ پڑھو اور اپنے اوپر دَم کرو۔ وظیفے کی مدت نہیں ہے۔ جب تک چاہو کرسکتی ہو۔

☐ رخشندہ۔کوٹ لکھپت

○ پیارے بابا جی! اللہ آپ کو لمبی حیاتی دے۔ میں نے ڈیڑھ ماہ قبل آپ سے اولادِ نرینہ کے لیے وظیفہ اور تعویذ لیا تھا۔ بابا جی! ڈاکٹر نے مجھے خوشخبری سنا دی ہے۔ بتایئے' وظیفہ اور تعویذ کا کیا کروں؟ میں اس ماہ حسب استطاعت صدقہ خیرات کرنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ کو ارسال کردوں؟

☆ بیٹی رخشندہ! خوش رہو۔ وظیفہ ترک کردو۔ تعویذ پورے نو ماہ استعمال کرنا ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم پر کرم کیا۔ نماز کی پابندی کرو۔ صدقہ خیرات ارسال کردو۔ میں جائز ضرورت مندوں میں تقسیم کردوں گا۔

☐ نوشابہ۔سکھر

☆ بیٹی نوشابہ! جو لوگ دوسروں کو دکھ دیتے ہیں' جائز حق داروں کا حق نہیں دیتے' یتیموں کا مال کھاتے ہیں' ایسے تمام لوگ زمین پر عبرت کا نمونہ بنتے ہیں۔ اللہ انہیں ڈھیل ضرور دیتا ہے لیکن جب پکڑتا ہے تو بہت سخت عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔ تم صرف اللہ سے مدد مانگو۔ تمہارا شوہر محنت کرتا ہے' بہت اچھی بات ہے۔ جو لوگ بہت محنت کرتے ہیں' ان کو صلہ بھی بہترین ملتا ہے۔ بچے چھوٹے ہیں اس لیے سہل وظیفہ دے رہا ہوں۔ نمازِ عصر اور عشاء کے بعد ۷۰۔۷۰ بار یَا بَاسِطُ پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ۴۱ دن ہے پھر وظیفہ ترک کیے بنا مجھے مطلع کرو۔

☐ حیدر علی۔صادق آباد

○ مسئلہ نمبر 1۔ میں ریٹائر ہوگیا ہوں' اپنے نوکری میں تو مکان نہیں بنا سکا۔ جو تھا' وہ بھی بک گیا۔ اب بہت پریشان ہوں' قرضہ بھی بہت ہوگیا ہے۔ کوئی ایسا وظیفہ یا عمل بتادیں جس سے یہ میری پریشانی دور ہوجائے۔ مختلف عمل کرکے ناکام ہوچکا ہوں۔ نماز باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔

☆ بیٹے حیدر! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ جو لوگ رزقِ حلال پر تکیہ کرتے ہیں' اُن سب کے حالات کم وبیش تمہارے جیسے ہی ہوتے ہیں لہٰذا فکر مت کرو۔ یہ بہت نصیب والوں کو روزی ملتی ہے۔ تم بکثرت یَا اَرحمُ الراحمین کا وِرد کیا کرو اور بروز پیر کچھ نہ کچھ رقم ضرور خیرات کردیا کرو۔ اللہ ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔

☐ نسیم بانو۔نارووال

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! میں نے دو مہینے قبل آپ کو اپنے شوہر کے بارے میں لکھا تھا۔ آپ نے جو وظیفہ پڑھنے کے لیے بتایا تھا' میں نے نماز کی پابندی کے ساتھ اکتالیس دن پڑھا لیکن کچھ اثر نہیں ہوا۔ آپ کوئی اور عمل وغیرہ بتائیں تاکہ میرے شوہر بری عادتوں' برے دوستوں اور گندی عورتوں سے بچیں۔ اپنے بچوں اور گھر کا خیال کریں۔ اپنے خدا کو پہچانیں۔ میں بہت پریشان ہوں' کبھی دل چاہتا ہے کہ خودکشی کرلوں۔ بابا جی! خدا آپ جیسے نیک لوگوں کی دُعائیں سنتا ہے۔ آپ ہمارے لیے بھی دُعا کریں۔

☆ بیٹی نسیم! وظیفہ اگر نماز کی پابندی اور پورے یقین کے ساتھ کیا جائے تو ضرور کرم ہوتا ہے۔ بہر حال نماز کی پابندی رکھو اور نمازِ عصر کے بعد سورۃ الصّٰفٰت آیت ۲۳' ۱۰۱ بار پڑھو اور نام لے کر دُعا کرو۔ اس کے علاوہ گھر میں استعمال ہونے والی چینی پر کثرت سے یَاوَدُودُ پڑھ کر دَم کردیا کرو۔ مجھے دو ماہ بعد مطلع کرو۔

☐ حنیف۔ژوب

☆ بیٹے حنیف! اللہ پر بھروسا رکھو پھر اپنے آپ پر۔ اللہ نے تمہیں مکمل انسان بنایا ہے۔ نشیب وفراز زندگی کا حصہ ہیں' مشکلات سے گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ ہمت سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ اپنے معاملات اللہ کے سپرد کردو۔ بہن سے کہو کہ وہ بھی اور تم بھی نماز کی پابندی رکھیں۔ ہر نماز کے بعد تسبیح یَاکَافِیُ یَاغَنِیُ یَافَتَّاحُ یَارَزَّاقُ کی پڑھو اور اول وآخر دُرود شریف ۳۔۳ بار پھر دُعا کرو۔ مدت ۲۱ دن ہے۔

☐ شبانہ۔ٹوبہ ٹیک سنگھ

☆ بیٹی شبانہ! تمہارا خط پڑھ کر نہایت دکھ

ہوا۔ بیٹی! صبر سے کام لو۔ خدا تمہیں اس کا صلہ دے گا۔ بیٹی! نہایت مجرب عمل بتا رہا ہوں۔ نماز کی پابندی کے ساتھ اسے ضرور کرنا۔ کامیابی عطا ہوگی۔ خیال رہے کہ دورانِ عمل کسی قسم کی بحث و تکرار سے پرہیز لازمی ہے۔ تمہیں صرف خاموشی اختیار کرنی ہے۔ روزانہ نمازِ فجر کے بعد دوسو بار یَا رَئُوفُ پڑھ کر کسی میٹھی چیز پر دَم کرو اور یہ شیرینی دن میں کسی وقت بھی شوہر کو کھلا دو۔ یہ عمل اس وقت تک کرو جب تک تمہارا شوہر پاکستان میں ہے۔ الحمد شریف اور چاروں قُل بھی پڑھ کر ضرور دَم کیا کرو۔ مجھ سے رابطے میں رہو۔ مناسب ہوگا کہ مجھ سے پہلے تعویذ منگوالو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

☐ صغیر۔ حویلیاں

☆ بیٹے صغیر! نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف کثرت سے پڑھا کرو۔ سچا مسلمان وہ ہے جس کے قول وفعل میں تضاد نہ ہو۔ تم صرف ایک کام کرو کہ لوگوں کی خامیاں تلاش کرنے کی بجائے اپنی کوتاہیاں دور کرنے کی کوشش کرو۔ ہر نماز کے بعد ایک ہزار بار توبہ استغفار پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ۴۱ دن ہے۔

☐ حمیدہ۔ شاہ کوٹ

☆ بیٹی حمیدہ! جو حالات تم نے لکھے ہیں' ان میں' میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ صبر سے حالات کا مقابلہ کرو۔ ابھی تو بہت کم وقت گزرا ہے۔ انشاء اللہ' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ نماز کی پابندی رکھو۔ کوشش کرو کہ ہر وقت باوضو رہو۔ کثرت سے سُبحَانَ اللّٰہِ یَاحَفِیظُ یَاحَافِظُ یَااللّٰہ کا وِرد کیا کرو۔ کرم ہوگا۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرنا۔

☐ شاہدہ۔ سعودی عرب

☆ بیٹی شاہدہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ بچیوں پر بے جا سختی مت کرو۔ زور زبردستی سے معاملات بگڑ جاتے ہیں۔ بچیوں کو نرمی سے سمجھاؤ۔ حسب استطاعت صدقہ خیرات کرو۔ نماز کی پابندی رکھو اور نمازِ عصر کے بعد ۴۱ بار سورۃ مومنون پڑھو اور حاجت بیان کرو۔ مدت ۴۱ دن ہے۔

☐ آفرین۔ امریکہ

☆ تمہارا خط پڑھ کر بے انتہا دکھ ہوا مگر ان حالات میں کچھ ذمے دار تم بھی ہو۔ بیٹی! اپنے شوہر کو تم خود اپنے ہاتھوں کھو رہی ہو۔ انسان کو خدا نے بہت مضبوط بنایا ہے' چٹانوں جیسا عزم رکھنے والا انسان کمزور ہو ہی نہیں سکتا۔ تم صرف یہ تہیہ کرلو کہ تمہیں اٹھ کر کھڑا ہونا ہے' دکھ درد زندگی کا حصہ ہیں' ان سے فرار ممکن نہیں۔ ہاں' ان سے لڑا جا سکتا ہے۔ جب گھر کا ماحول خراب ہوتا ہے تو سب سے پہلے شوہر گھر سے دور ہوتا ہے پھر اولاد۔ تم مکمل نقصان میں آ جاؤ گی۔ بیٹی! نماز کی پابندی رکھو اور نماز کے بعد الحمد شریف اور چاروں قُل پڑھ کر گھر کے تمام افراد پر دَم کرو۔ اب بھی حالات تمہارے قابو میں ہیں' مزید دیر نقصان دہ ہوگی۔ مجھ سے رابطے میں رہو' اپنا آپ سنبھالو' اپنا گھر سنبھالو۔ یہ سب صرف تمہارے ہاتھ میں۔ تم سے کتنے لوگ واسطے میں ہیں' انہیں دکھ مت دو۔ خوش رہو اور خوش رہنے دو۔ ایک دفعہ سوچ لو کہ سب ٹھیک ہے' تمہیں سب ٹھیک نظر آئے گا۔ اپنے بھائی کے بارے میں مجھے تفصیل سے لکھو' جو بھی ممکن ہوا' میں اس سلسلے میں کروں گا۔ اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔

☐ احسان علوی۔ خانیوال

○ بزرگوار...... اللہ سلامت رہیں۔ مجھ گناہ گار بندے سے میرے رَب نے بھی منہ موڑ لیا ہے۔ اب آپ کا ہی سہارا بچا ہے۔ بابا جی! میں بہت اچھے عہدے پر فائز ہوں۔ گھر' عزت' دولت' اولاد سب کچھ حاصل ہے مگر سکون بالکل نہیں ہے۔ ہر وقت بے چینی سی رہتی ہے۔ یہ کیفیت پچھلے تین برس سے ہے اور اب قابل برداشت نہیں رہی۔ خدارا' میری رہنمائی کریں' کہیں ایسا نہ ہو میں کوئی انتہائی قدم اٹھالوں۔

☆ بیٹے احسان! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ بے چینی اور بے سکونی کیوں ہے؟ یہ اللہ کی جانب سے آخری موقع ہے۔ اگر بے حسی طاری ہوگئی تو پھر سب ختم ہو جائے گا۔ تم رزقِ حلال ہی میں گزارہ کرو۔ لالچ اور حرص سوائے پریشانی کے کچھ نہیں دیتا۔ دین اور دنیا دونوں بچالو۔ حرام کی کمائی کا خمیازہ اولاد کو بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ وہ راہ سے بھٹک جاتی ہے۔ بصد استطاعت صدقہ و خیرات

ضرور کرو اور یہ عہد کرلو کہ حرام کمائی سے پرہیز کرو گے۔ نماز کی پابندی رکھو۔ صرف توبہ استغفار کا کثرت سے ورد کرو۔ چند دنوں میں ہی سکون محسوس کرو گے۔ مجھ سے رابطے میں رہو۔

□ آصف۔ گوادر

○ محترم بابا جی! پچھلے دو ماہ سے رزق میں کشادگی کے لیے وظیفہ لیا تھا۔ اللہ کا فضل ہے۔ میرے پھنسے ہوئے پیسے ایسی جگہ سے نکل آئے جہاں سے امید بھی نہیں تھی۔ بابا جی! میں چاہتا ہوں کہ یہ وظیفہ ہمیشہ کرتا رہوں تاکہ رزق میں برکت رہے۔ اجازت درکار ہے؟

☆ بیٹے آصف! سب سے پہلے تو کچھ رقم خیرات کردو۔ یاد رکھو صدقہ خیرات کرنے سے رزق میں بہت برکت ہوتی ہے اور صدقہ خیرات روکنے سے تنگی اور مفلسی آتی ہے۔ وظیفے کی اجازت ہے۔

□ امام بخش۔ شہدادکوٹ

☆ بیٹے امام بخش! سب سے پہلے تو نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر اور نمازِ عشاء کے بعد ایک ایک ہزار بار پڑھو اللہُ الصمد اور حاجت بیان کرو۔ یہ عمل لگاتار ۴۱ دن کرنا ہے۔ ایک دن بھی اگر نماز قضا ہوئی تو پھر نئے سرے سے وظیفہ شروع ہوگا۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

□ نمرہ۔ اسلام آباد

☆ بیٹی نمرہ! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور نمازِ عصر اور عشاء کے بعد ایک ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو۔ مدت ۱۴ دن ہے۔ وظیفہ مکمل کرکے کچھ رقم ضرور خیرات کردینا۔ انشاء اللہ جلد کرم ہوگا۔

□ خالدہ۔ شورکوٹ

☆ بیٹی خالدہ! تمہارا خط طوالت کے باعث شائع نہیں کیا جارہا ہے۔ نماز کی پابندی ازحد ضروری ہے۔ نمازِ فجر اور عصر کے بعد ۷۰۰ بار پڑھو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ اور حاجات ایک ایک کرکے بیان کرو۔ مدت اکیس دن ہے۔ اللہ پر بھروسا رکھو وہ ضرور کرم کرے گا۔

☆☆......☆☆

ہائیڈ پارک

ڈی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

حدیث نبوی ﷺ

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: ایک وقت آئے گا جب لوگ نیکی کو معیوب اور برائی پر فخر کریں گے۔ اس وقت ہر طرح کی آسائشیں میسر ہوں گی۔ ہر گھر میں ناچ گانا ہوگا۔ لوگ مختلف بیماریوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہوں گے۔ ماں اور نوکرانی میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ لوگ عمارتیں ایک دوسرے سے اونچی بنائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب ایسا زمانہ آئے تو ''رت سے استغفار پڑھنا کیونکہ یہ سب سے مفید عمل ہوگا۔

حسنِ انتخاب: عظمت مبارک علی۔ کراچی

فرمان حضرت علی کرم اللہ وجہہ

دو طرح سے دیکھنے سے چیزیں بہت چھوٹی نظر آتی ہیں۔

''ایک دور سے اور دوسرے غرور سے''

مرسلہ: زبیدہ اکرم۔ کراچی

اقتباس

پاگل! میں نے یہ بات اپنے دل میں ہی سوچی تھی اور اس نے میری طرف گھور کر دیکھا اور دھیمی آواز سے جس میں افسردگی پنہاں تھی کہا۔ ''ہاں میں پاگل ہوں لیکن پاگل بھی تو پناہ کے بغیر بالکل اجنبی اور غذا کے بغیر بھوکا رہے گا۔ کیوں کہ انسان کا دل بالکل خالی ہو چکا ہے۔'' میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے عاقبت نااندیش خیال کی معافی مانگتا ہوں کیا آپ میری درخواست قبول کریں گے؟ چلیے اور میرے غریب خانہ پر قیام کیجیے......''

''میں تمہارے دروازے کو ایک ہزار مرتبہ کھٹکھٹا چکا ہوں لیکن مجھے کوئی جواب نہ ملا۔''

اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شخص پاگل ہے اور میں نے کہا...... ''اچھا! آپ میرے ساتھ چلیں۔''

اس نے آہستہ سے اپنا سر اٹھایا اور کہا...... ''اگر تم جانتے کہ میں کون ہوں تو تم کبھی مجھے اپنے ہاں قیام کرنے کی دعوت نہ دیتے۔''

میں نے کچھ خوفزدہ ہو کر پوچھا۔ ''تم کون ہو؟''

اچانک اس کی آواز میں اس سمندر کی سی گرج پیدا ہوئی جو طوفان اپنے سینے پر اٹھائے ہوئے ہو۔ اس نے کہا۔ ''میں...... میں انقلاب ہوں اور جن چیزوں کو تو میں تہس نہس کر دیتی ہیں میں انہیں دوبارہ تعمیر کرتا ہوں۔ میں وہ طوفان ہوں جو قدیم ترین درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہوں۔''

خلیل جبران کی تحریر ''پاگل'' سے
فرح عالم، اسلام آباد کا انتخاب

اسے کہنا

اسے کہنا......!
تمہاری یاد آتی ہے
مجھے ہر پل ستاتی ہے
بہت مجھ کو رلاتی ہے
اسے کہنا
دسمبر لوٹ آیا ہے
مجھے تنہا نہیں رہنا

نہ اتنا یاد آؤ تم
نہ یوں مجھ کو ستاؤ تم
اسے کہنا
تمہاری یاد آتی ہے

ڈاکٹر علی حسنین تابش۔ چشتیاں

چھوٹا طوفان، بڑا طوفان

کشمیر کی وادیوں سے ایک خیال آج آپ کی خدمت میں پیش خدمت ہے۔ جو وہ اپنے بچوں کو پرجوش اور موٹیویٹ کرنے کے لیے ان کا حوصلہ بلند کرنے کے لیے سناتے ہیں۔''

'چھوٹا طوفان...... بڑا طوفان'

ایک بڑا طوفان تھا جو بڑے غیض وغضب والا تھا۔ اُس کی بڑی دہشت تھی۔ وہ بڑی سے بڑی چیز بھی اُڑا کر لے جاتا تھا۔ سب سے طاقتور سب سے بڑا اور بہادر اور ہمت والا تھا۔

جبکہ چھوٹا طوفان بہت ہی بزدل تھا۔ اس کے پاس ہمت بھی نہیں تھی۔ وہ ہر وقت ڈرتا رہتا تھا۔ وہ گھن گرج اور بہادری جو اس میں ہونی چاہیے تھی اُس میں بالکل نہیں تھی۔

بڑا طوفان چھوٹے طوفان کو ہر وقت ڈانٹتا رہتا تھا کہ تم اتنے بزدل کیوں ہو۔ ہمت سے کام لو۔ بہادری سے اپنا کام کرو اور چھوٹا طوفان ڈرتا رہتا اور خاموشی کے ساتھ سنتا رہتا۔

آخر کار سنتے سنتے چھوٹے طوفان کو بہت غصہ آ گیا۔ وہ جوش میں آ گیا اور اس زور سے گرجا۔ برسا اور وہ طوفان بپا کیا کہ خاص وعام سب تھرا گئے۔ اور بڑے طوفان سے بھی آگے بڑھ گیا۔

یہ کہانی سن کر چھوٹے بچوں کو بہت ہمت اور حوصلہ ملتا ہے۔ اُن میں بھی نئے نئے کام کرنے اور چیلنجز کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بڑھتی ہے۔

ہم بھی اپنے بچوں کو چھوٹی بڑی سبق آموز کہانیاں سنا کر ان کے دلوں میں کچھ بڑا کام کرنے کا فیصلہ پیدا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ بقول علامہ اقبال

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

زور قلم۔ شبانہ۔ آزاد کشمیر

اجازت

باپ: ''اگر تم میرے تیرنے تک کنارے پر ایک ہی جگہ بیٹھے رہے تو میں واپس آ کر تمہیں دس روپے انعام دوں گا۔''

بیٹا: ''اور اگر آپ واپس نہ آئے تو کیا میں ممی سے لے لوں؟''

مرسلہ: مقصود احمد بلوچ۔ حیدر آباد

نیکی

استاد: ''اگر آج کسی نے نیکی کا کام کیا ہے تو بتاؤ؟''

احمد: ''جناب میں نے کیا ہے۔''

استاد: ''اچھا' وہ کیا؟''

احمد: ''میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھے شخص سے روڈ پار نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے اس کے پیچھے کتا لگا دیا۔ جس کے نتیجے میں اس نے تیزی سے روڈ پار کر لیا۔''

مرسلہ: اشعر عتیق۔ کراچی

محبت

اگر وہ مہرباں ہوتی
تو میری آنکھ میں
نہ جھلملاتی نمی ہوتی
نہ میرے دل کی وادی میں
خزاں کا قافلہ رُکتا
اگر وہ مہرباں ہوتی
میری بے نور آنکھوں میں
ستارے قید کر دیتی
میری زخمی ہتھیلی پر
وہ بس اک پھول دھر دیتی
میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر
وہ یہ کہتی
محبت روشنی ہے، رنگ ہے، خوشبو ہے، ستارہ ہے
قسم مجھ کو محبت کی
مجھے تُو سب سے پیارا ہے
مگر وہ ایسا تب کہتی
اگر وہ مہرباں ہوتی

شاعر: ایم ارشد وفا۔ گوجرانوالہ

عقل مند

رپورٹر: ''پلیٹ فارم پر کھڑے سب سردار کیسے مرگئے؟''

سردار جی: ''اعلان ہوا کہ ٹرین پلیٹ فارم نمبر 2 پر آرہی ہے، سب نے جان بچانے کے لیے پٹری پر چھلانگ لگادی۔''

رپورٹر: ''پھر آپ کیسے بچ گئے؟''

سردار جی! ''میں خودکشی کے لیے پٹری پر لیٹا ہوا تھا، اعلان سنا تو پلیٹ فارم پر جاکر لیٹ گیا۔''

مرسلہ: محمد دیان خان۔ کراچی

دعا

ہم سب دعا تو مانگتے ہیں لیکن کیا اس طریقے سے مانگتے ہیں کہ جو اس کا حق ہے۔ کیوں کسی کی دعا قبول جلدی ہوجاتی ہے۔ آیئے آج ایک سچے واقعہ سے ہم دعا مانگنے کا صحیح طریقہ سیکھتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کے دور کا واقعہ ہے کہ وہ ایک جگہ سے گزر رہے تھے تو ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ گڑگڑا کر دعا مانگ رہا تھا۔ اس کا انہماک دیکھ کر موسیٰ نے کہا۔ ''اے پروردگار اگر اس کی حاجت پورا کرنا میرے اختیار میں ہوتا تو میں ضرور پورا کردیتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کی طرف وحی نازل فرمائی۔ ''میں تجھ سے زیادہ اس پر رحم کھاتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دعا تو مانگ رہا ہے لیکن اس کا دل اور اس کی توجہ اور خیال اپنی بھیڑ' بکریوں کے ریوڑ کی طرف ہے۔ اور میں ایسے بندے کی دعا قبول نہیں کرتا جو دعا تو مجھ سے مانگ رہا ہو لیکن اس کا دل میرے علاوہ کسی اور چیز میں متوجہ ہو۔''

موسیٰ نے یہ بات اس دعا مانگنے والے آدمی کو بتائی تو اس نے اپنا دل ہمہ تن اللہ کی طرف متوجہ کردیا تو اس کی حاجت پوری ہوگئی۔

لہٰذا ہمیں بھی چاہیے کہ دعا مانگتے وقت مکمل طور پر اللہ کے حضور حاضر ہوں پوری توجہ اور رقت کے ساتھ دعا مانگیں پھر دیکھیں کیسا فضل وکرم ہوتا ہے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ تو مانگنے کو پسند فرماتے ہیں۔ وہ رات کے آخری پہر عالم بالا سے پکارتے ہیں کہ ہے کوئی مانگنے والا میں اس کی مراد پوری کروں۔

ہمیں اپنے خیال کو پوزیٹو رکھنا چاہیے کیونکہ 24 گھنٹوں میں ایک لمحہ ایسا ضرور آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ بندے کی مراد پوری فرماتے ہیں۔ اس لیے ہمیں ہر وقت اچھی بات منہ سے نکالنی چاہیے تاکہ جو بھی لمحہ قبولیت کا ہو ہماری بات پوری ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے اور ہماری دعائیں قبول کرے۔ آمین۔

حسنِ خیال۔ نزہت ناز۔ کراچی

تیری یاد

ہجوم ہو، تنہائی ہو
کچھ معلوم نہیں ہوتا
ایک منتظر سمندر کے جیسے
مدتوں سے منتظر ہوں
مگر اس کے باوجود بھی
لہریں خاموش رہتی ہیں
کشتیاں اپنا رخ موڑ لیتی ہیں
سب ادھورے سے ہوجاتے ہیں
کسی کول کر بھی کنارا نہیں ملتا
کچھ کنارے پر آکر بھٹک جاتے ہیں

انیل حسین قمر۔ سندھ یونیورسٹی، جامشورو

جنگلی لڑکی

مصوری کے شوقین صاحب نے جنگل میں ایک لڑکی کو دیکھا اور فوراً اس کی تصویر بنانے کا ارادہ کرلیا۔ جنگلی لڑکی کو گڑ اور چنے دے کر ماڈل بننے پر راضی کیا اور درخت کی ایک اونچی شاخ پر بٹھا کر اس کی تصویر بنانے لگے۔

ایک گھنٹے بعد لڑکی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ تو صاحب نے ذرا منہ بنا کر کہا۔

''میں نے تو سنا تھا کہ جنگلی لڑکیاں بڑے صبر اور برداشت والی ہوتی ہیں۔ تم تو ایک گھنٹے میں ہی گھبرا گئیں۔'' لڑکی نے مصور کی بات سن کر شاخ سے چھلانگ لگادی۔

''تم اس شہد کے چھتے پر پانچ منٹ بھی بیٹھ کر دکھا دوں تو مانوں۔''

مرسلہ: ایم افضل آزاد۔ساہیوال

ٹھنڈے ہاتھ

جانتے ہو وقت کی گرد نے سب دُھندلا دیا۔ وہ خواب جو کبھی آنکھوں میں سجے تھے۔ وہ احساس جن میں تم سنگ تھے۔

ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے دور آتی جاتی سمندر کی لہروں کو دیر تک تکا کرتے تھے ہم۔ اور جب سورج جانے کی تیاری میں ہوتا تو میرے چہرے کے رنگوں میں شفق رنگوں کی سرخی بھی مل جایا کرتی کہ ڈوبتے سورج کا منظر ہمیشہ سے میری کمزوری رہا ہے۔

اور یاد ہے...... تم کہا کرتے اندھیرا بڑھ جائے گا۔ چلو واپس۔ مگر میں ان لمحوں کو مٹھیوں میں قید کر لینا چاہتی تھی کہ یہ وقت کہیں بھاگ نہ جائے کیونکہ ایک پل کو تمہاری جدائی مجھے قبول نہ تھی۔

اور جب سورج مغرب میں چھپنے کو لمحہ لمحہ آنکھوں سے اوجھل ہوتا تو میں تمہارا ہاتھ اور مضبوطی سے تھام لیتی۔ جیسے سورج نہیں تم مجھ سے دور ہو رہے ہو۔

آج بھی سورج مغرب میں ڈوب رہا ہے مگر میرا دل بھی ڈوبا جاتا ہے کہ تم ساتھ نہیں...... بس ایک بات یاد ہے مجھے کہ تمہارے ہاتھوں کی ٹھنڈک مجھے روح تک محسوس ہوتی تھی۔ اور شاید ٹھنڈے ہاتھ بے وفائی کی علامت ہوا کرتے ہیں۔ اب یقین آیا مجھے......

زورِ قلم: عظمیٰ شکور۔اسلام آباد

غزل

جو ہم سے روٹھ جاتے ہو یہ تم اچھا نہیں کرتے
خود اپنا دل جلاتے ہو یہ تم اچھا نہیں کرتے
بہت مضبوط ہو اپنی انا میں، مجھ سے نہ مل کر
بکھر کر ٹوٹ جاتے ہو یہ تم اچھا نہیں کرتے
بس اک میری محبت کے لیے سب سے اُلجھ جانا
ہزاروں غم اٹھاتے ہو یہ تم اچھا نہیں کرتے
مری یادوں میں کھونا ٹھیک ہے لیکن مری جاناں
زمانہ بھول جاتے ہو یہ تم اچھا نہیں کرتے
جو تم کو خون سے لکھے تھے ہم نے خط محبت میں
کتابوں میں چھپاتے ہو یہ تم اچھا نہیں کرتے
کہیں مر ہی نہیں جائے خوشی پا کر تیرا عادل
مری بانہوں میں آتے ہو یہ تم اچھا نہیں کرتے

شاعر: عادل حسین۔کراچی

اقوالِ زریں

☆ اپنے بچوں پر خرچ کرنا صدقہ ہے۔
☆ ماں باپ کی خدمت کرو اولاد تمہاری خدمت کرے گی۔
☆ حرام وہ گناہ ہے جس سے دعا قبول نہیں ہوتی۔
☆ سلام کرنے سے محبت بڑھتی ہے۔
☆ مجلسوں کو درود شریف سے زینت دو۔
☆ گناہ سے سچی توبہ کرنے والا جنتی ہے۔
☆ حلال روزی تلاش کرنا جہاد ہے۔

مرسلہ: محمد ندیم عباس میواتی۔پتوکی

ڈر لگتا ہے

اَن کہے جذبوں کی گہرائی سے ڈر لگتا ہے
مجھ کو اے جانِ جاں! رسوائی سے ڈر لگتا ہے
وحشتیں گھیر سی لیتی ہیں اندھیروں میں مجھے
مجھ کو تاریکی سے، تنہائی سے ڈر لگتا ہے
چھین لے جاتی ہے اس دل کا سکون اور قرار
مجھ کو برسات کی رعنائی سے ڈر لگتا ہے
جاگ اٹھتی ہیں مرے دل میں امنگیں لیکن
گونجتی پیار کی شہنائی سے ڈر لگتا ہے
ہو نہ جائے کہیں الفاظ سے غلطی سر زد
اس لیے قافیہ پیمائی سے ڈر لگتا ہے

شاعر: عماد حسین انصاری۔کراچی

سنہری باتیں

☆ اپنی ہار مت روؤ کیونکہ تمہاری ہار کسی کی جیت کا سبب بنی ہے۔
☆ زندگی کا مقصد پھولوں سے سیکھو جو کانٹوں کے درمیان رہ کر بھی مسکراتے ہیں۔
☆ دنیا میں اچھا دوست قسمت سے ہی ملتا ہے اور اگر ایسا دوست کھو جائے تو اس کا غم تا عمر رہتا ہے۔

☆اپنی کامیابی کی امید رکھو کیونکہ ہر بڑا کام پہلے ناممکن ہی ہوتا ہے۔

مرسلہ: عامر بشیر خان۔ نیو کراچی

رابطے

میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ یہ وقت کی کوئی چال تھی یا ہمیں ہی رفاقتیں نبھانی نہ آئیں۔ اب کس کو دوش دوں' کس کے سر الزام دھروں؟ کہنے کو جی تو نہیں چاہتا مگر کیا کروں کہ یہی حقیقت اور سچائی ہے کہ رابطے توڑنے میں ہم تینوں نے اپنا اپنا کردار بخوبی نبھایا ہے۔ وقت نے' میں نے اور تم نے......

تینوں ایک دوسرے کے مجرم ہیں' وقت اپنی چال چلتا رہا' تم اور میں بھی اپنی اپنی چال چلنا چاہتے تھے۔ وقت کی تو خیر بات ہی کیا ہے' یہ تو سدا سے ہرجائی رہا مگر تم...... تم تو ایسے ہرگز نہ تھے' تمہاری تو خیر بات ہی کچھ اور تھی کیوں کہ تم اپنے حسن پر نازاں ٹھہرے اور میں...... میں تو تھا ہی اپنی بے رحم انا کا قیدی۔ اس طرح سبھی بے قصور ٹھہرے مگر رابطے ٹوٹ گئے۔ یہ ٹوٹنے ہی تھے' سو ٹوٹ گئے۔

مرسلہ: عبدالغفار عابد۔ چیچہ وطنی

انمول موتی

☆احسان ہر کسی کے ساتھ بہتر ہے لیکن ہمسائے کے ساتھ بہترین ہے۔ (حضرت مجدد الف ثانیؒ)

☆گری ہوئی چیز اطلاع کے بغیر قبضے میں کر لینا' لوٹنے کے مترادف ہے۔ (حضرت امام غزالیؒ)

☆ کسی سے بدلہ لینے میں جلدی نہ کرو اور کسی کے ساتھ نیکی کرنے میں تاخیر نہ کرو۔ (حضرت شفیق بلخیؒ)

☆زندگی میں تین چیزیں نہایت سخت ہیں۔ (1) خوف موت (2) شدت مرض (3) ذلت قرض۔ (بو علی سینا)

☆علم ایسا پھول ہے جو جتنا کھلتا ہے' اتنی ہی خوشبو دیتا ہے۔ (حضرت امام شافعیؒ)

مرسلہ: شاہانہ احمد۔ کراچی

چھوٹی سی کہانی

جب بھی میں ٹوٹ کر بکھری ہوں
مہرباں وقت نے سمیٹا ہے
اُس کی کس بات کا کروں اعتبار
ہر بات پہ وہ قسم اٹھا لیتا ہے
آتے جاتے راستے میں ملتا ہے
اب پل کو رکتا ہے اور چل دیتا ہے
گھاؤ بہت گہرا تھا دل کا گو کہ
پھر بھی صبر کے مرہم میں لپیٹا ہے
ابھی تو خوشیوں کا جہاں ہوا تھا آباد
دیکھ کر مجھ کو اک آسیب نے آ لپیٹا ہے
کتنا بھی کروں میں جبر خود پر
جب بھی آنکھ روتی ہے تو یہ دل بھی رو دیتا ہے
نہیں کمزور ہم اپنے ارادوں میں صائمہ
یہ تو دل ہے جو بے وقت دغا دیتا ہے

شاعرہ: صائمہ بشیر۔ سرگودھا

محنت کا پھل

شام ہوئی ایک غریب کسان پھٹے پرانے اور بوسیدہ لباس میں ملبوس ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کے دروازے پر آ ٹھہرا۔ دروازہ کھٹکھٹایا اور پٹ کھلنے پر مسکراتا ہوا اندر آ گیا اور آگ کے نزدیک اپنے بچوں کے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی وفا شعار بیوی نے پرانا دسترخوان بچھا کر معمولی سا کھانا سامنے رکھا۔

سب نے مل کر کھانا کھایا اور پھر ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کے سامنے سب مل کر بیٹھ گئے۔ رات کے ابتدائی حصہ گزرنے کے بعد سب اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے اور میٹھی نیند کی آغوش میں مدہوش ہو گئے۔ رات گزر گئی صبح کی روشنی چاروں طرف پھیلنے لگی۔ غریب کسان اپنے مالکِ حقیقی کا نام لے کر جاگ اٹھا۔

بیوی نے بچوں کے ساتھ مل کر باسی روٹی کے چند نوالے جلدی جلدی نگل لیے اور کندھے پر ہل رکھ کر کھیت کو روانہ ہوا تاکہ اپنی پیشانی کے پسینے سے اسے سیراب کر کے اپنی محنت کا پھل ان سرمایہ داروں کے دسترخوان پر چن دے۔ جنہوں نے گزشتہ رات شراب کی بدمستی اور ناچ گانے والی رنگینیوں میں بسر کی۔

خلیل جبران کی کتاب۔
آنسوؤں اور مسکراہٹ۔ امجد علی، چیزل آباد کا انتخاب



قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمایئے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں
نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

عائشہ اکرام..........کراچی
میرے لیے تو زمیں پر بس ایک ذات ہے تو
اسی لیے تو میری پوری کائنات ہے تو

پونم..........کراچی
ہر ایک خواب ہے میرا تجھی سے وابستہ
یہ بات سچ ہے مگر اس کا اعتبار نہ کر

صائمہ رشید..........کراچی
وہ جس کے ساتھ کی خواہش اڑان بھرتی ہے
اسی کا نام نہیں ہاتھ کی لکیروں میں

ندا..........کراچی
یوں جو تکتا ہے آسمان کو تُو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا؟
مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا؟

نیہا..........کراچی
گلہ کرے بھی اگر دل تو کیا کرے اس سے
کہ پہلے جیسے مراسم نہیں رہے اس سے
مجھے خیال تھا اس کا' اسے زمانے کا
خدا کرے کہ زمانہ وفا کرے اس سے

اقراء افضل..........کراچی
میرے خوابوں میں بھی تو' میرے خیالوں میں بھی تو
کون سی چیز تجھے تجھ سے جدا پیش کروں؟

عندلیب..........کراچی
مرحلے شوق کے دشوار ہوا کرتے ہیں
سائے بھی راہ کی دیوار ہوا کرتے ہیں
صرف ہاتھوں کو نہ دیکھو' کبھی آنکھیں بھی پڑھو
کچھ سوالی بڑے خوددار ہوا کرتے ہیں

رضوانہ کوثر..........لاہور
مل ہی جائے گا کبھی' دل کو یقیں رہتا ہے
وہ اسی شہر کی گلیوں میں کہیں رہتا ہے
جس کے ہونے سے معطر تھے درو بام تیرے
اے مکاں بول کہاں اب وہ مکیں رہتا ہے؟

اسماء.....ساؤتھ افریقہ
پلکوں کے بند توڑ کر دامن پہ آ گرا
اک آنسو میرے ضبط کی توہین کر گیا

سیما اعوان..........پشاور
اک اداسی کرتی جائے گی سرائیت روح میں
اس قدر وابستگی اچھی نہیں ہے شام سے

ثناء مغل..........کراچی
سرد آنکھوں میں خواب رکھ جاتا
رت جگوں کے عذاب رکھ جاتا
میری تنہائی کے سرہانے وہ
یاد کی اک کتاب رکھ جاتا

نازیہ ناصر خان..........کراچی
حیات اک مستقل غم کے سوا کچھ بھی نہیں شاید
خوشی بھی یاد آتی ہے تو آنسو بن کے آتی ہے

ہما شیخ.....ایبٹ آباد
اپنی تنہائیوں میں ڈھونڈ مجھے
دور رہ کر بھی تیرے پاس ہوں میں

عفت اقبال......... کراچی

خلوصِ دل سے مری بات سن رہا تھا کوئی
مرے لیے تو یقیناً یہ معجزہ تھا کوئی
اگرچہ خواب ہے لیکن وہی جگہ ہے یہ
مرے خیال میں مجھ کو جہاں ملا تھا کوئی

رباب فاطمہ......... حیدر آباد

صحنِ خیال میں تیری یادوں کی بھیڑ تھی
پلکوں کی رہگزر کے سوا راستہ نہ تھا

سحر افتخار......... کراچی

مری وحشتوں کو بڑھا دیا ہے جدائیوں کے عذاب نے
میرے دل پہ ہاتھ رکھو ذرا میری دھڑکنوں کو قرار دو
تمہیں صبح کیسی لگی میرے خواہشوں کے دیار کی؟
جو بھلی لگی تو یہیں رہو اسے چاہتوں سے نکھار دو

شاہین ناز......... کراچی

آنکھ کو اشک بہانے دو
دل کا درد مٹانے دو
غم کی دھول خیالوں پر
بادل بن کر چھانے دو

سلمان ضیاء......... کراچی

پت جھڑ کے ٹوٹے ہوئے پتوں کے ساتھ
موسم کبھی تو بدلے گا اگر کبھی ہو
اس کے لیے تو میں نے یہاں تک دعائیں کیں
میری طرح سے کوئی اسے چاہتا بھی ہو

ممتاز......... سکھر

میرا تعجب کچھ عجب نہیں ہے
وہ شخص پہلا سا اب نہیں ہے
وفا کا کیا گلہ کروں میں اس سے
وہ میرا کب تھا جو اب نہیں ہے

ظلِ سحر......... کراچی

دیکھا نگاہ بھر کے تو بینائی چھن گئی
سورج تھا آئینے میں کہ چہرہ انا کا تھا

حمیرا ارم......... سکھر

شکوے بھی ہزاروں ہیں، شکایت بھی بہت ہے
اس دل کو مگر اس سے محبت بھی بہت ہے
آ جاتا ہے ملنے وہ تصور میں سرشام
اس شخص کی اتنی سی عنایت بھی بہت ہے

فرحین آغا......... اسلام آباد

سوئے تو شب کے قافلے آنکھوں میں چل پڑے
جاگے تو جیسے خواب کا موسم ٹھہر گیا
اس نے کہا کہ آنکھ میں گہرا غبار کیوں؟
میں نے کہا عذاب کا موسم ٹھہر گیا

ردا ایوبی......... کراچی

تیری یادیں بھی اک اک کرکے رخصت ہوتی جاتی ہیں
بچھڑتے جا رہے ہیں ہم سفر آہستہ آہستہ

انعم اقبال......... کراچی

بچھڑے ہوئے لوگوں پہ ترس کھاؤ کسی دن
ایسا ہو کہ نہ یاد آؤ کسی دن
ساون کے بناء جیسے ہوجاتی ہے بارش
ایسے ہی میرے پاس چلے آؤ کسی دن

صبا رانی......... لاہور

کچھ بھی نہیں ہے خاص ان دنوں
تم جو نہیں ہو پاس ان دنوں
تم آ جاؤ تو بہل جائے شاید
دل بہت اداس ہے ان دنوں

☆☆☆

کوپن برائے



دسمبر 2015ء

میرا یہ پسندیدہ شعر "سچی کہانیاں" کی نذر ہے

نام:

پتا: